لندن کی ایک رات، گریز اور اداس نسلیں:
تہذیبی اور نوآبادیاتی مطالعہ

تحقیقی مقالہ پی ایچ ڈی اردو

۲۰۱۷ء

محقق

رخسانہ بی بی

رول نمبر:

رجسٹریشن نمبر: 20-FLL/PHDURDU/F10

نگران

پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال

شعبہ اردو، ایف ۔سی کالج یونیورسٹی،

لاہور

International Islamic University
CENTRAL LIBRARY
Islamabad

شعبۂ اردو

کلیۂ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Accession No TH-19426

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Rukhsana Bibi**

Title of the Thesis: " لندن کی ایک رات" "گریز" اور "اداس نسلیں" تہذیبی اور نو آبادیاتی مطالعہ "

Registration No: 20-FLL/PHDURDU/F10

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee: *Prof.Dr. Munawar Iqbal Ahmad*
Dean Faculty of Language & Literature IIUI

Chairperson Department of Urdu: *Dr. Najeeba Arif*
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner: *Dr.Robina Shahnaz*
Department of Urdu NUML, Islamabad

External Examiner: *Dr.Abid Sial*
Department of Urdu NUML, Islamabad

Internal Examiner: *Dr. Najeeba Arif*
Chairperson Urdu Department IIUI

Supervisor: *Dr. Najeeb Jamal*
Urdu Department, Islamia University, Bahawalpur

صداقت نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ **رخسانہ بی بی** رجسٹریشن نمبر 20-FLL/PHDURDU/F10 نے اپنا مقالہ بعنوان **لندن کی ایک رات، گریز اور اداس نسلیں: تہذیبی اور نوآبادیاتی مطالعہ**" برائے پی۔ایچ ڈی اُردو، میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ اس موضوع پر کہیں اور اس طرح کا کام نہیں ہوا اور یہ سرقے سے پاک ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال

فہرست ابواب

تفصیل	صفحہ نمبر
سرورق	۱
صداقت نامہ	۲
فہرست ابواب	۳
تفصیل ابواب	۴
ابتدائیہ	۶
باب اول: تہذیب ونوآبادیات: بنیادی مباحث	۹
باب دوم: سجاد ظہیر کا تہذیبی ونوآبادیاتی شعور بحوالہ لندن کی ایک رات	۸۸
باب سوم: عزیز احمد کا تہذیبی ونوآبادیاتی شعور بحوالہ گریز	۱۳۸
باب چہارم: عبداللہ حسین کا تہذیبی ونوآبادیاتی شعور بحوالہ اُداس نسلیں	۱۹۵
باب پنجم: لندن کی ایک رات، گریز اور اداس نسلیں کا تہذیبی ونوآبادیاتی تناظر میں تقابلی مطالعہ	۲۶۱
باب ششم: مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات	۳۴۲
کتابیات	۳۵۹

تفصیل ابواب

باب اول:	تہذیب ونوآبادیات: بنیادی مباحث	۹
	(ا) تہذیب، ثقافت، کلچر، تمدن: تصورات ونظریات	۹
	(ب) پاک وہند کی تہذیب	۲۶
	(ج) نوآبادیات: تصورات ونظریات	۴۴
	حوالہ جات/ حواشی	۸۰
باب دوم:	سجاد ظہیر کا تہذیبی ونوآبادیاتی شعور بحوالہ لندن کی ایک رات	۸۸
	(ا) سجاد ظہیر: احوال وآثار	۸۸
	(ب) لندن کی ایک رات کا تہذیبی ونوآبادیاتی مطالعہ	۹۴
	ا۔مشرقی تہذیب	۱۰۹
	۲۔مغربی تہذیب	۱۱۳
	۳۔نوآبادیاتی اثرات	۱۲۱
	حوالہ جات/ حواشی	۱۳۳
باب سوم:	عزیز احمد کا تہذیبی ونوآبادیاتی شعور بحوالہ گریز	۱۳۸
	(ا) عزیز احمد: احوال وآثار	۱۳۸
	(ب) گریز کا تہذیبی ونوآبادیاتی مطالعہ	۱۴۲
	ا۔مشرقی تہذیب	۱۶۹
	۲۔مغربی تہذیب	۱۷۲
	۳۔نوآبادیاتی اثرات	۱۸۰
	حوالہ جات/ حواشی	۱۸۹
باب چہارم:	عبداللہ حسین کا تہذیبی ونوآبادیاتی شعور بحوالہ اُداس نسلیں	۱۹۵
	(ا) عبداللہ حسین: احوال وآثار	۱۹۵
	(ب) اداس نسلیں کا تہذیبی ونوآبادیاتی مطالعہ	۲۰۰
	ا۔مشرقی تہذیب	۲۱۵
	۲۔مغربی تہذیب	۲۳۵

	۳۔نوآبادیاتی اثرات	۲۳۹
	حوالہ جات/حواشی	۲۵۵
بابِ پنجم:	لندن کی ایک رات ، گریز اور اداس نسلیں کا تہذیبی ونوآبادیاتی تناظر میں تقابلی مطالعہ	۲۶۱
	(ا) فصل اول:	۲۶۱
	ا۔پس منظر	۲۶۱
	۲۔سیاسی وسماجی صورتِ حال	۲۶۳
	۳۔تہذیب	۲۷۴
	۴۔نوآبادیات	۲۷۶
	(ب) فصل دوم: متذکرہ ناولوں کے اسالیب پر تہذیبی ونوآبادیاتی اثرات	۲۹۰
	ا۔تکنیک	۲۹۰
	۲۔اسلوب	۳۱۹
	۳۔مغربی اور مشرقی ناول نگاروں سے تقابل	۳۲۶
	حوالہ جات/حواشی	۳۳۲
بابِ ششم:	مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات	۳۴۲
	ا۔مجموعی جائزہ	۳۴۲
	۲۔نتائج	۳۵۳
	۳۔سفارشات	۳۵۸
	کتابیات	۳۵۹

ابتدائیہ

دنیا میں زبانوں کی بڑی جامعات میں کئی برسوں سے تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ بطور مضمون پڑھایا جا رہا ہے، ایک طرح سے دیکھا جائے تو عالمی گاؤں میں یہ اپنی شناخت کے ساتھ ساتھ دوسروں کی پہچان کا ایک ذریعہ ہے۔ نوآبادیاتی استعمار اب اپنا روپ بدل کر ملٹی نیشنل کمپنیوں کی شکل میں عالمی گاؤں میں کمزور تہذیبوں کی شناخت ختم کرنے کے درپے ہے۔ اس ضمن میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم نہ صرف اپنی تہذیبی شناخت سے واقف ہوں بلکہ ہمیں دیگر تہذیبوں کے ساتھ اپنی تہذیب کا تقابل بھی کرنا چاہیے۔ اردو میں اس نوع کے تہذیبی تقابلی مطالعات کا چلن ابھی زیادہ نہیں ہوا۔ وہ مغربی ممالک جس زرعی دور سے نکل کر صنعتی دور میں داخل ہو گئے تھے وہی دراصل نوآبادیات کے بانی ہیں، جن میں برطانیہ، فرانس اور امریکہ جیسے ممالک سرفہرست ہیں۔ اور آج بھی عالمی گاؤں میں ان کا ہی حکم چلتا ہے۔ نوآبادیات کا یہ عفریت اب اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ یہ تہذیبوں پر اثر انداز ہونے سے زیادہ ان کے خاتمے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ تیسری دنیا کے کمزور ممالک ان کا ہدف ہیں۔ موجودہ دور صنعتی دور کے بعد کا زمانہ ہے جسے پوسٹ انڈسٹریل ورلڈ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نوآبادیاتی دور میں خام مال اور سستی مزدوری زبردستی وصول کی جاتی تھی۔ اب اس کی شکل بدل گئی ہے اب ہم یہ کام اپنی مرضی اور ضرورت سے کرتے ہیں۔ اب اسے درآمد اور برآمد کا نام دیا جاتا ہے۔ اس درآمد اور برآمد میں سب سے زیادہ نقصان علم و ہنر کے شعبے میں ہوا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ملکی سطح پر ہم ایک ڈاکٹر یا انجینئر بنانے کے لیے لاکھوں روپے صرف کرتے ہیں۔ جب ان پیشہ ورانہ مہارت کے حامل افراد میں سے کوئی بھی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کرتا ہے، اسے برآمد کر دیا جاتا ہے۔ اس جدید نوآبادیاتی استعمار سے بچنے کا واحد حل اپنی تہذیب سے وابستگی ہے۔

یہ مقالہ صرف لندن کی ایک رات، گریز اور اداس نسلیں کے تہذیبی اور نوآبادیاتی مطالعے تک محدود نہیں، بلکہ اس میں متذکرہ ناولوں کا ان عنوانات کے تحت تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ جس میں فکری اور فنی حوالے سے ان کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو میں تجزیاتی مطالعات انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، سندی مقالوں سے ہٹ کر غیر سندی مطالعات میں شاعری میں کلیم الدین احمد کا غزل اور نظم پر کام اور میراجی کا ''اس نظم میں'' کے علاوہ جزوی کام تو ملتے ہیں جن میں کسی غزل یا نظم کا تجزیہ کر لیا گیا ہو، نثر میں البتہ ڈاکٹر سہیل عباس کا باغ و بہار کا لسانی تجزیہ کا ایک عمدہ مثال ہے۔ لیکن ابھی اتنے جامع کام سامنے نہیں آئے جو کسی روایت کی صورت اختیار کر لیں۔ اس مقالے میں تقابلی مطالعہ کے لیے تنقیدی اور تحقیقی حوالے دیے گئے ہیں اور تجزیاتی مطالعہ کے لیے متن سے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ اس مقالے کا دائرہ کار ہندوستان

کے برطانوی نوآبادیاتی دور میں انگریزوں کے حق اوران کی مخالفت میں لکھے جانے والے مواد کے ساتھ ساتھ، جامعہ عثمانیہ کے تراجم، ہندوستانی اور مغربی مصنفین کی تصانیف کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب تہذیبی ونوآبادیاتی شعور کے حوالے سے ہے۔اس باب کی دو فصلیں ہیں، پہلی فصل میں بنیادی مباحث تہذیب، ثقافت، کلچر، تمدن: تصورات ونظریات اوران کے مفاہیم کی وضاحت مشرقی اور مغربی تناظر میں کی گئی ہے، دوسری فصل میں پاک وہند کی تہذیب کی تاریخ اور یہاں پہ موجود اسلامی تہذیب، گنگا جمنی (ہنداسلامی) تہذیب، اور مغربی تہذیب کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس باب میں تہذیبی و نوآبادیاتی شعور کے بنیادی مباحث کی ضمن میں نوآبادیات : تصورات ونظریات، پاک وہند کی نوآبادیاتی نظام اورنوآبادیات : تصورات ونظریات کے ذیلی عنوانات کے تحت تعریف، پس منظر، نوآبادیات جدید عہد میں، اورنوآبادیات؛ سیاسی پہلو میں تاریخی حوالے سے ہسپانیہ، پرتگال، ڈچ، فرانس، اور برطانوی نوآبادیات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔نوآبادیاتی حوالے سے جن مباحث کا جائزہ لیا گیا ہے، ان میں نوآبادیاتی نظام کا نیا دور، نوآبادیوں کے لیے کشمکش، نوآبادیات ؛ معاشی پہلو، برطانوی سامراج کا عروج، امریکہ کی بغاوت، سامراجی دور کے اثرات، آبادکاری کی نئی لہر، نیا سامراجی دور، سامراجی دور کی معیشت، تحریک آزادی کی ابتدا، پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کا اثر سامراجی نظام پر، نوسامراجیت اور ہندوستانی نوآبادیات شامل ہیں۔اس باب کے آخر میں حوالہ جات/حواشی ہیں۔

دوسرے باب کا عنوان ہے ''تہذیبی ونوآبادیاتی شعور''۔ یہ باب سجاد ظہیر کے احوال وآثاراورلندن کی ایک رات کے تہذیبی ونوآبادیاتی اثرات سے متعلق ہے، اس باب کی دو فصلیں ہیں، پہلی فصل میں سجاد ظہیر کے احوال وآثار بیان کیے گئے ہیں اوردوسری فصل میں لندن کی ایک رات کا تہذیبی ونوآبادیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔جس میں مشرقی تہذیب، مغربی تہذیب اورنوآبادیاتی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس باب کے آخر میں حوالہ جات/حواشی ہیں۔

تیسرے باب کا عنوان ''عزیز احمد کا تہذیبی ونوآبادیاتی شعور'' ہے۔اس باب کی دو فصلیں ہیں، پہلی فصل میں عزیز احمد کے احوال وآثاراوردوسری فصل میں گریز کا تہذیبی ونوآبادیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔جس میں مشرقی تہذیب، مغربی تہذیب اورنوآبادیاتی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس باب کے آخر میں حوالہ جات/حواشی ہیں۔

چوتھے باب کا عنوان ''عبداللہ حسین کا تہذیبی ونوآبادیاتی شعور'' ہے۔اس باب کی دو فصلیں ہیں، پہلی فصل میں عبداللہ حسین کے احوال وآثاراوردوسری فصل میں اداس نسلیں کا تہذیبی ونوآبادیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔جس میں مشرقی تہذیب، مغربی تہذیب اورنوآبادیاتی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس باب کے آخر میں حوالہ جات/حواشی ہیں۔

پانچویں باب کی دو فصلیں ہیں، پہلی فصل میں لندن کی ایک رات، گریز اور اداس نسلیں ا تہذیبی

ونوآبادیاتی تناظر میں تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے،جس میں پس منظر،سیاسی وسماجی صورت حال،تہذیب اورنوآبادیات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔اس فصل میں جن ذیلی عنوانات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ان کے عنوانات میں پس منظر،سیاسی وسماجی صورت حال،تہذیب،اورنوآبادیات کے ضمن میں زراعت،صنعت وتجارت،زبان اور تعلیم،اورعدالتی نظام شامل ہیں۔دوسری فصل میں متذکرہ ناولوں کے اسالیب پرتہذیبی ونوآبادیاتی اثرات کے ضمن میں تکنیک، اسلوب کے ساتھ ساتھ مغربی اورمشرقی ناول نگاروں سے تقابل کیا گیا ہے۔اس باب کے آخر میں حوالہ جات/حواشی ہیں۔

چھٹا باب مجموعی جائزہ،نتائج وسفارشات پرمشتمل ہےاورآخر میں کتابیات ہے۔

میں امید کرتی ہوں کہ مستقبل میں نوآبادیات اورتہذیبوں کے تقابلی مطالعات پر ہونے والے کاموں کے لیے یہ مقالہ ایک اہم ماخذ ثابت ہوگا۔

سپاس گزاری:

سرکاری،غیرسرکاری اورنجی کتب خانوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ان کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنے کے لیے کئی دفتر درکار ہیں۔میں ایسے تمام احباب کی دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں جنھوں نے اس ''طلسم ہوش ربا'' کو مسخر کرنے کی لوح کی فراہمی میں میری مدد کی۔

ڈاکٹر نجیب جمال نہ صرف اسلامی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کے لیے مبارک ثابت ہوئے بلکہ یگانہ پر کام کرنے والے اس یگانہ روزگار نے میرے مقالے کو بھی کئی زاویوں سے پرکھنے میں میری مدد کی۔میں استاد محترم ڈاکٹر نجیب جمال کی نوازشات کا تذکرہ کروں تو وہ بھی ایک مقالے کی شکل اختیار کرلے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف چیئرپرسن شعبہ اُردو کی بھی میں شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری رہنمائی کی۔اس کے علاوہ جن کرم فرماؤں کا ساتھ رہا ان میں ڈاکٹر عزیز ابن الحسن ، ڈاکٹر ناصر عباس نیئر، ڈاکٹر محمد ارشد اویسی، ڈاکٹر ارشد معراج، ڈاکٹر صباحت مشتاق، ڈاکٹر حمیرا اشفاق شامل ہیں، کی بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے دائرۂ اختیار میں رہتے ہوئے میری ہر ممکن رہنمائی کی۔اپنے شوہر اور بچوں کی بھی احسان مند ہوں کہ انھوں نے مجھے وہ وقت خرچ کرنے کی اجازت دی جوان کا حصہ تھا۔

آخر میں اپنی والدہ کا ذکر کرنا چاہوں گی جنھوں نے میری ہمت بندھائی ورنہ کئی بار تو میں اسے بارگراں سمجھ کر تھک ہار کے بیٹھ گئی تھی۔اوران کی دعاؤں سے میں مقالہ مکمل کرنے میں کامیاب ہوئی۔یہ مقالہ میں ان کے نام معنون کرتی ہوں۔

عرفیہ۔" (۲)

ترجمہ: تہذیب اور ھذب کی اصل درختوں کی کانٹ چھانٹ کرنا ہے تا کہ نمو پائیں اور اُن کی خوب صورتی میں اِضافہ ہو، بعدازاں ہر شے کی صفائی، اِصلاح اور عیوب سے پاک ہونے کے لیے اِس کا اِستعمال ہونے لگا، یہاں تک کہ اِس کی حقیقتِ عرفیہ بن گیا۔

لسان العرب میں یوں ہے۔

"اصل التهذیب تنقیة الحنظل من شحمه و معالجعه حبه حتی تذیبو مرارته و یطیب لا کله" (۳)

ترجمہ: تہذیب کی اصل حنظل کو اندر کی تمام چیزوں سے صاف کرنا اور اس کی کڑواہٹ دور کر کے دانہ کو اس قابل بنانا کہ کھانے والے کے لیے خوش گوار ہو جائے۔

تہذیب یا ثقافت کے تسلسل واستحکام کا انحصار اس کے نظام اقدار پر ہوتا ہے۔ اگر کسی معاشرے میں اقدار کا جامع نظام موجود نہ ہو تو اس میں تیزی سے تغیرات صورت پذیر ہو رہے ہوتے ہیں اور اس ثقافت کے لوگ شناخت کے زوال کا شکار ہو رہے ہوتے ہیں۔ تہذیب و کلچر کی تشکیل میں جو عناصر کلیدی کردار ادا کرتے ہیں وہ مذہب اور عقیدہ ہیں۔ اردو ادب کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس میں تہذیب و ثقافت کے مباحث کا آغاز انیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے ہوتا ہے جب تذکرۂ گلشن مصنف اس پر اپنا اظہار خیال کرتے ہیں۔ اس حوالے سے سبطِ حسن کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"تہذیب کی اصطلاح اردو تصانیف میں ہمیں سب سے پہلے تذکرہ گلشن ہند، صفحہ ۱۲۹ (۱۸۰۱ء) میں ملتی ہے (۔۔۔) سرسید احمد خاں غالباً پہلے دانشور ہیں، جنھوں نے تہذیب کا وہ مفہوم پیش کیا جو انیسویں صدی میں مغرب میں رائج تھا۔ انھوں نے تہذیب کی جامع تعریف کی اور تہذیب کے عناصر وعوامل کا بھی جائزہ لیا۔" (۴)

خلیفہ عبدالحکیم نے بھی اس بیان کی تصدیق کی ہے۔

"ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے اور اب اردو میں یہ لفظ پچیس تیس سال سے استعمال ہونے لگا ہے۔ اس بھی اس کا استعمال عام نہیں۔" (۵)

ہر لفظ کے ایک یا ایک سے زائد معنی ہوتے ہیں، لیکن جب اس لفظ کو بطور اصطلاح بھی استعمال کیا جانے لگے تو اس کے مفہوم میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ یہی صورت حال اردو میں لفظ ثقافت کی بھی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے لغوی اور اصطلاحی معنی کو الگ الگ پرکھ کر اس کی تعریف متعین کی جائے۔ سلطان محمد صابر اس لفظ کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں۔

''ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے، اوراس کا مادہ 'ث ق ف' ہے۔''(۶)

عربی میں اس لفظ کے معنی ہیں درست کرنا، سنوارنا اور بل نکالنا ہیں۔ تیر کو آگ میں تپا کر سیدھا کرنے کو 'ثقیف' کہتے ہیں۔ 'ثَقَفَ' کے معنی ہیں سر کہ کا تیزاب بن جانا، عقل و سمجھ میں غالب آنا، نیزہ مارنا، سیدھا کرنا، شائستہ بنانا اور تعلیم دینا۔ ثقافت کا مادہ اپنی مختلف صورتوں میں قرآن مجید میں ملتا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں۔

''الثقف کے معنی کسی چیز کو پالینے اور کسی کام کے کرنے میں مہارت کے ہیں، ثقفت کذا کے اصل معنی مہارت نظر سے کسی چیز کو تاڑ لینے کے ہیں۔ پھر مجازاً کسی چیز کو پالینے پر بولا جانے لگا، خواہ اس کے ساتھ نگاہ کی مہارت شامل ہو یا نہ ہو، قرآن حکیم میں ہے۔

وَ قتَلُو هُم حَيثُ ثَقِفتُمُو هُمَ (البقرہ۲:۱۹)

ان کو جہاں پاؤ قتل کردو۔

فَاقَّا تَثقفنهم فِي الحَربِ (۸:۵۷)

اگر تم انہیں لڑائی میں پاؤ۔(۷)

اردو لغت (تاریخی اصول پر) میں ثقافت کے یہ معنی ملتے ہیں۔

''کسی قوم یا گروہِ انسانی کی تہذیب کے اعلیٰ مظاہر جو اس کے مذہب، نظامِ اخلاق، علم و ادب اور فنون میں نظر آتے ہیں۔''(۸)

فیروز اللغات طبع ششم ۱۹۷۶ء میں اس لفظ کے معنی تہذیب، کلچر لکھے گئے ہیں۔ فیروز اللغات عربی اردو مطبوعہ ۱۹۶۸ء میں مادہ 'ث ق ف' کے ذیل میں ثقافت کے لغوی معنی عقل و سمجھ، تعلیم و تربیت اور کلچر تحریر کیے گئے ہیں۔

عربی لفظ 'ثقافت' کا لغوی مفہوم زِیرک، سبک، چالاک ہونا ہے، اِس کا مادہ 'ثَ قِ فَ' ہے جس کے لغوی معنی ہیں: سیدھا کرنا، مہذب بنانا، تعلیم دینا۔(۹)

جبکہ المعجم المفصل الادب کے مطابق: (ترجمہ): ثقافت کثرت سے اِستعمال ہونے والی اِصطلاح ہے جس کے کئی معنوں میں 'تمدُّن' اور 'شہر' شامل ہیں۔ نیزے کو سیدھا کرنا، نیز تیز فہمی اور مہارت کے معنوں میں مستعمل ہے۔(۱۰)

اُردو میں کلچر کے لیے 'تہذیب' اور 'ثقافت' دونوں الفاظ اِستعمال کیے جاتے ہیں اور 'کلچر' کا لفظ بھی مُستعمل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادارت میں شائع ہونے والی قومی انگریزی اردو لغت مطبوعہ ۱۹۹۲ء میں انگریزی لفظ Culture کے معنی ثقافت، تہذیب، کلچر، کاشت، گروہ یا فرد کی اکتسابی اہلیت یا قابلیت جس کے ذریعہ وہ عام مسلمہ جمالیاتی اور ذہنی ذوق کی

شناخت اور تحسین کر سکتا ہے۔تہذیب کا جمالیاتی و ذہنی حاصل، کسی قوم یا عہد کے حوالہ سے تہذیب کا ایک خاص ارتقائی درجہ یا حالت (۔۔۔) متمدن بنانا بیان ہوئے ہیں۔(۱۱)

پاکستانی کلچر میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

''کلچر معاشرے کے مجموعی طرز عمل میں ظاہر ہوتا ہے اور طرز عمل معاشرے کے ان بنیادی اداروں سے متعین ہوتا ہے جنھیں ہم مذہب، معیشت، فنون و ہنر، سیاست، زبان، علم اور سائنس وغیرہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔''(۱۲)

فیض احمد فیض کلچر کی تاریخ یوں بیان کرتے ہیں۔

''آج کلچر کا جو مفہوم ہمارے ذہن میں ہے۔وہ آج سے دو سو برس پہلے کسی کے ذہن میں نہ تھا۔ایک دھندلا خاکہ اگر کسی نے پیش کیا تو وہ ابن خلدون یا ابن مقدوم ہیں۔''(۱۳)

اُردو میں کلچر کے لیے تہذیب کا لفظ طویل عرصے تک مُستعمل رہا ہے اور اب بھی اِستعمال ہوتا ہے لیکن اِس کے ساتھ ساتھ ثقافت کا لفظ بھی اِستعمال کیا جاتا ہے اور انگریزی لفظ کلچر بھی اِن دونوں مذکورہ الفاظ کے ساتھ شامل ہو چکا ہے۔ تہذیب وہ معاشرتی ترتیب ہے جو ثقافت کو تخلیق کرتی ہے۔تہذیب کسی بھی معاشرے کے طرزِ فکر و احساس کی عکاس ہوتی ہے۔اس لیے پیداوار کے طریقے، سماجی رشتے، رسوم و روایات، علم و ادب، عقائد و رسوم اور خاندانی تعلقات وغیرہ سب تہذیب کی مختلف جہتیں قرار پاتی ہیں۔تہذیب درحقیقت کسی گروہ کے اقدار کا ایسا شعور ہے جس کے مطابق وہ اپنی زندگی کی تشکیل کر رہے ہوتے ہیں۔ان اقدار میں تضاد نہیں بلکہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔اسی بنیاد پر کلچر یا تہذیب کا لفظ متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔اس بات کی تصدیق فیض احمد فیض کے اس قول سے بھی ہوتی ہے:

''۔۔۔ہم کلچر کو تین چار معنوں میں استعمال کرتے ہیں اوّل تو شخصی معنوں میں، ایک شخصی صفت کے طور پر کہ۔۔۔وہ مہذب ہے، شائستہ ہے۔۔۔کلچر کا لفظ عام طور پر محض فنون کے لیے استعمال کیا جاتا ہے یعنی وہ خاص قسم کی جمالیاتی تخلیقات جو کوئی معاشرہ پیدا کرتا ہے۔ اس میں مصوری ہے، شاعری ہے، فنِ تعمیر ہے۔۔۔عموی طور پر معاشرہ جس طریقے سے اپنی زندگی بسر کرتا ہے، اس کے رہن سہن میں جو چیزیں داخل ہیں، وہ بھی کلچر ہے۔''(۱۴)

فیض احمد فیض نے کلچر کی عمومی تعریف بیان کی ہے، بالخصوص پہلے دو معنوں میں اُن کی بیان کردہ تعریف اِصطلاحی مفہوم سے مُطابقت نہیں رکھتی۔فنون کلچر کا محض ایک جزو ہیں۔تاہم تعریف کا آخری حصہ اِصطلاحی مفہوم سے قریب تر ہے لیکن اپنی وُسعت اور عمومیت کے باعث کلچر کی واضح تصویر کشی میں ناکام ہے۔کلچر کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں فیض

احمد فیض لکھتے ہیں:

''کلچر کی دو صورتیں ہیں۔۔۔ ایک اس کی ظاہری صورت اور دوسری اس کی باطنی صورت۔ باطنی صورت وہ ہے جسے ہم ذہنی کہہ سکتے ہیں۔ ظاہری صورت سے آگے بھی دو پہلو یا اس کے دو اجزا ہیں، ایک اس کا شعوری جزو ہے اور دوسرا اس کا غیر شعوری جزو۔''(۱۵)

کلچر کی درج بالا دو صورتیں مادی اور غیر مادی کلچر کہلاتی ہیں۔ مادی کلچر عمارات، آلات، کتابوں، ملبوسات، زیورات، برتنوں، نمونہ ہائے فنون وغیرہ، جبکہ غیر مادی کلچر افکار، عقائد، معیارات، اصول، اخلاق، قواعد وغیرہ پر مُشتمل ہوتا ہے۔ ماہرینِ عمرانیات کے مطابق کسی کلچر کے ارکان کی فکر، جذبات اور طرزِ عمل کی تشکیل میں کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں مثلاً: علامات، زبان، اقدار اور معیارات وغیرہ۔ سیّد عابد حُسین تہذیب یا کلچر کی تعریف درج ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے، جسے وہ اپنے اجتماعی ادارات میں ایک معروضی شکل دیتی ہے جسے افراد اپنے جذبات ور جحانات، اپنے سبھاؤ اور برتاؤ میں اور اُن اثرات میں ظاہر کرتے ہیں جو وہ مادی اشیا پر ڈالتے ہیں۔''(۱۶)

سیّد عابد حسین تہذیب کے مادی و غیر مادی دونوں پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور آگے چل کر لکھتے ہیں:

''بعض اوقات تہذیب کا لفظ۔۔۔ زیادہ مجرّد اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے یعنی زندگی کا مکمل نصب العین جو کسی قوم کے سامنے ہو، ان معیاروں کا ہم آہنگ تصور جن پر وہ اپنی اور دوسروں کی زندگی پرکھتی ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مغرب کی تہذیب کی بنا مادیّت پر ہے اور مشرقی تہذیب کی روحانیت پر تو تہذیب کا یہی مفہوم ہمارے پیشِ نظر ہوتا ہے۔''(۱۷)

درج بالا صورت میں مفہوم کے مُجرّد اور وسیع ہونے کے باعث تہذیب کے تصوّر کی کوئی واضح تصویر بن کر سامنے نہیں آتی اور یہی اُلجھن بیشتر تعریفوں کے ضمن میں درپیش ہوتی ہے۔ ماہرین کی ایک بڑی تعداد مجرّد مفہوم پیش کرتی نظر آتی ہے جن میں وہ ماہرین بشریات بھی شامل ہیں جنھوں نے تہذیب کا تصوّر متعارف کرایا۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے یہ خیال ہے:

''کلچر کے آسان معنی ہیں۔ طرزِ زندگی جو کسی قانونی جبر کے بغیر، رضا کارانہ معاشرے کے سب افراد میں کم و بیش مشترک حیثیت رکھتی ہے اور حسن کی شان رکھتی ہے۔ جس سے زندگی زیادہ بامعنی اور پُر راحت بن جاتی ہے۔''(۱۸)

ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے کلچر کی تعریف بیان کرتے ہوئے اِس میں فنون و تفریحات، اِنفرادی و مجلسی آداب اور ذوقیات کی دیگر شکلوں کو بھی شامل قرار دیا ہے جو جبری نہیں۔(۱۹)

یعنی ایک مخصوص کلچر پر عمل پیرا افراد کسی قائدے یا قانون کے تحت ان آداب و رسومات کی پابندی پر مجبور نہیں ہوتے۔ سیّد عبداللہ کلچر کو تمدّن سے متمیّز کرتے ہوئے تمدّن کو اُن مظاہر پر مبنی قرار دیتے ہیں جو کسی جبری و قانونی تنظیم یا منصوبہ بندی کے نتیجے میں اُبھرتے ہیں۔(۲۰)

ممتاز ایرانی سکالر ڈاکٹر حداد عادل اپنی کتاب تمدّنِ برھنگی، برھنگی ٔ تمدّن میں کلچر کی تعریف بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''کلچر وہ مجموعۂ نقطۂ نظر ہے جس کی رو سے کوئی معاشرہ دنیا کو دیکھتا ہے اور یہ نقطۂ نظر انہی معنی میں ہے جس اعتبار سے وہ معاشرہ انسانی وجود اور اس کی ہستی کا قائل ہے۔ نیز بطورِ کلی پوری دنیا پر حاوی ہے اور تمام انفرادی و اجتماعی اقدار و اطوار کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔''(۲۱)

عموماً شائستہ، تعلیم یافتہ فرد کو مہذب یعنی کلچرڈ تصوّر کیا جاتا ہے، جو ذوقِ لطیف رکھتا ہو اور مُہذب زندگی کی نفیس اشیاء سے واقف ہو۔ تاہم کلچر کی توضیح آسان نہیں کیونکہ یہ انگریزی زبان کے اُن چند الفاظ میں شُمار ہوتا ہے جن کا مفہوم بیان کرنا بہت مُشکل تصوّر کیا جاتا ہے۔ ریمنڈ ولیمز نے لکھا ہے:

''لفظِ کلچر انگریزی زبان کے چند پیچیدہ ترین الفاظ میں سے ایک ہے۔''(۲۲)

اِس لفظ کی پیچیدگی کے اسباب کا جائزہ لینے سے پہلے ایک نظر اس کے مفہوم کے اِرتقا پر ڈالنا بے محل نہ ہوگا۔ میریم-ویبسٹر ڈکشنری کے مطابق:

"cul·ture noun

1. the beliefs, customs, arts, etc., of a particular society, group, place, or time.

2. a particular society that has its own beliefs, ways of life, art, etc."(۲۳)

کلچر لاطینی زبان کے لفظ Cultura سے مُشتق ہے جس کا مادہ Colere ہے۔ Colere کثیر المعنی لفظ ہے، اِس کے مُتعدّد معانی میں Inhabit,Cultivate,Protect اور Honour with worship شامل ہیں اور Cultura اِن میں سے Cultivation یا Tending کے مفہوم پر مبنی ہے۔(۲۴)

وقت کے ساتھ ساتھ کلچر کے مفہوم میں وُسعت آتی گئی اور ۱۸۰۵ء میں اِسے تمدّن کا ذہنی پہلو کے معنی میں اِستعمال کیا گیا، جبکہ لوگوں کے مجموعی رسوم اور کامیابیاں کے معنوں میں اِستعمال کا ثبوت ۱۸۶۷ء سے ملتا ہے۔(۲۵)

لفظ کلچر کے مفہوم کی وُسعت و گہرائی میں اضافہ جاری رہا اور بعدازاں اسے اِصطلاح کے طور پر اِستعمال کیا جانے لگا جس سے یہ نئے مفاہیم سے آشنا ہوا۔ فلپ بیگ بی(Philip Bagby) نے کلچر اینڈ ہسٹری (۱۹۵۸ء) میں لکھا ہے: ''اِس لفظ کا اِستعمال اٹھارہویں صدی میں فرانسیسی مصنفین Voltair اور Vanvenargues نے کیا۔ اُن کے نزدیک ذہنی تربیت و تہذیب کا نام کلچر تھا۔ جلد ہی اچھے آداب، آرٹ، سائنس اور تعلیم وغیرہ بھی اِس میں شامل ہو گئے۔''(۲۶)

جبکہ قدیم وقتوں میں Cicero نے *Tusculan Disputations* میں قدرے مختلف یا مجازی معنوں میں کلچر کا لفظ اِستعمال کیا تھا۔(۲۷)

کلچر کا لفظ بطورِ اِصطلاح اُنیسویں صدی کے وسط میں ماہرینِ بشریات کی تحریروں سے اُبھرا۔ برطانوی ماہرِ بشریات سر ایڈورڈ برنٹ ٹائلر :Edward Burnett Tylor(1832-1917) نے اوّلین بار ۱۸۷۱ء میں اپنی کتاب *Primitive Culture* میں ایک اِصطلاح کی حیثیت سے اِس لفظ کا اِستعمال کیا اور اِس کی تعریف بیان کی۔ ٹائلر کی بیان کردہ تعریف دو وجوہات کی بنا پر اہمیت کی حامل ہے: اوّل، یہ تعریف ایک طویل عرصے تک رائج رہی اور دوم، اِسی سے بشریات کے علم کی بُنیاد بھی پڑی۔(۲۸)

کلچر کے اِصطلاحی مفہوم کے اِرتقا کے سلسلے میں ''اِنسائیکلو پیڈیا امریکانا'' کے مقالہ نگار John W. Bennett نے لکھا ہے کہ ۱۹۱۰ء تک امریکی ماہرین کلچر کو مخصوص قبائلی معاشروں کو متخصص کرنے والے اِمتیازی اوصاف کے مجموعوں کا حوالہ دینے کے لیے اِستعمال کرنے لگے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں روتھ بنی ڈکٹ نے کلچر کو فکر و عمل کا ایسا نمونہ قرار دیا جو کسی قوم کے لوگوں کی سرگرمیوں میں جاری و ساری ہوتا ہے اور اُنہیں دوسری قوموں کے لوگوں سے مُتمیّز کرتا ہے۔ بعدازاں کلچر نے ایک ایسی اِصطلاح کا روپ اِختیار کر لیا جو ماحول سے مُطابقت پذیری یا فطرت کو اِنسانی خواہشات و مقاصد کے مُطابق ڈھالنے کے اِمتیازی اِنسانی طریق کو بیان کرنے کے لیے اِستعمال ہونے لگی۔ تاہم ایک امر پر تمام ماہرین مُتفق ہیں کہ کلچر توریثی نمونہ ہائے عمل اور جبلّتوں کے برعکس طرزِ عمل اور مطابقت پذیری کے اِکتسابی طریقوں پر مُشتمل ہوتا ہے۔(۲۹)

ایڈورڈ ٹائلر کے بعد مُتعدّد ماہرین نے کلچر کی تعریفیں بیان کیں لیکن کوئی ایک تعریف بھی ایسی نہیں جسے جامع و مانع یا مُتفق علیہ قرار دیا جا سکے۔ یہ تعریفیں باہم مُتناقض بھی ہیں اور مُتماثل بھی، کچھ بے حد وسیع ہیں، کچھ بہت محدود، باہمی مُناسبت بھی رکھتی ہیں اور مُغائرت بھی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تعریف کے ضمن میں ابہام، اِنتشار اور ژولیدگی کی صُورت

پائی جاتی ہے۔ دو امریکی ماہرینِ بشریات الفریڈ کروبر اور کلائیڈ کلک ہون نے ۱۹۵۲ء میں ایک کتاب مُرتّب کی جس میں کلچر کی تعریف اور تصوّر کا تجزیاتی جائزہ لینے کے لیے چھے سو کُتب سے اِستفادہ کرتے ہوئے ۱۶۱ تعریفیں جمع کیں۔ (۳۰)

تاہم یہ کوشش بھی کلچر کی تعریف کے تعین کے ضمن میں مددگار ثابت نہ ہو پائی، حتّٰی کہ خود مُرتّبین بھی ایسی تعریف پیش کرنے میں کامیاب نہ ہو پائے جو کلچر کے تصوّر کو واضح کرتی ہو۔ کروبر اور کلک ہون نے جن کُتب کا جائزہ لیا اُن میں سے آدھی سے زائد میں کلچر کی تعریف ہی موجود نہ تھی۔ (۳۱)

یہ امر اِس اعتبار سے خاصی حیرت کا باعث ہے کہ زیرِ بحث موضوع کی تعریف تک بیان نہیں کی گئی۔ فاضل مُرتّبین لکھتے ہیں کہ بقیہ کُتب میں کلچر کی کوئی واضح تعریف نہیں دی گئی۔ (۳۲)

بشریات کے ماہرین ایک طرف غیر واضح، نامکمل اور مُبہم تعریفیں بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں اور دوسری جانب سرے سے کوئی تعریف بیان کرنے سے ہی گُریزاں نظر آتے ہیں۔ کلچر کے تصوّر میں وقت کے ساتھ ساتھ بے شُمار تبدیلیاں آئیں لیکن غیر واضح تعریفوں نے اِس کے تصوّر کو ابہام کا شکار بنا دیا۔ الفریڈ کروبر نے کلچر کی تعریف میں قطعیّت اور جامعیّت کی عدم موجودگی کا ذمے دار ماہرینِ بشریات کو ٹھہرایا ہے جو ڈیٹا Data اکٹھا کرنے، ترتیب دینے اور اِس کی درجہ بندی کے عمل میں ہی مصروف رہتے ہیں۔ (۳۳)

فلپ بیگ بی (PHILIP. BAGBY) نے اپنی کتاب کلچر اینڈ ہسٹری میں لکھا ہے کہ علمِ بشریات کی اِصطلاح کے طور پر کلچر کا مفہوم نہ تو اِبتدا میں واضح تھا اور نہ اب ہی واضح ہے۔ (۳۴)

بیگ بی کی رائے کو انسائیکلوپیڈیا آف لینگویج اینڈ لنگوئسٹکس کے یہ الفاظ تقویت دیتے ہیں جو کلچر کی تعریف کے ضمن میں درپیش مشکلات کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں:

> "Despite a century of efforts to define culture adequqtely, there was in the early 1990s no agreement among anthropologists regarding its nature."(۳۵)

اِس رائے میں اِتنا اِضافہ ضُروری ہے کہ کم و بیش ربع صدی مزید گُزر جانے کے بعد بھی صورتِ حال میں ہنوز کوئی تبدیلی نہیں آئی اور کلچر کی تعریف ابہام کی گرد میں پوشیدہ ہے۔ کلچر کی بے شمار تعریفوں کی موجودگی کی چند در چند وجوہات میں سے ایک انسائیکلوپیڈیا امریکانا کے مقالہ نگار نے اِن الفاظ میں بیان کی ہے:

> "The reason is that culture is heterogeneous. The term is not analogous to "cell" in biology, since it refers not to a single item of

reality, but to innumerable items at different levels of generality: ideas, sentiments, values, objects, actions, tendencies and accumulations."(۳۶)

کلچر مختلف الاصل اشیا اور تصوّرات کا مجموعہ ہونے کے باعث کسی واحد تصوّر کی عکاسی نہیں کرتا۔ اِس کی مُرکب ماہیت اِس کی توضیح میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے اور لفظ کلچر سے ذہن میں ایک مُعین اور واضح تصویر نہیں بنتی۔ یہ صورتِ حال مزید اُلجھ جاتی ہے جب کلچر اور سویلزیشن کے تصوّرات خلط ملط کر دیے جاتے ہیں، ان الفاظ کے غیر واضح اِستعمال کے سبب مفہوم کے ضمن میں بے شمار اُلجھنیں اور پیچیدگیاں در آئی ہیں۔ کروبر اور کلک ہون نے اِس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ '' ویبسٹر زان ابریجڈ ڈکشنری '' کلچر اور سویلزیشن کے الفاظ کو ایک دوسرے کے مفہوم میں استعمال کرتی ہے۔ جیسے کلچر کو سویلزیشن کی ایک خاص حالت یا فروغ کی ایک منزل بتایا گیا ہے، جبکہ سویلزیشن کو سماجی کلچر کا فروغ یا حالت قرار دیا ہے۔۔۔ تاہم بعض اوقات سویلزیشن کو فروغ یافتہ یا ہائی کلچرز تک محدود قرار دے دیا جاتا ہے۔ سماجی سائنسوں میں بھی یہی صورتِ حال ہے، بعض مُصنفین بتکرار' کلچر، یا سویلزیشن' اور 'سویلزیشن، یا کلچر' لکھتے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ سویلزیشن کو ایسے مُعاشروں کا کلچر بھی تصوّر کیا گیا ہے جو شہروں پر مبنی ہوں۔ اِس تصوّر میں لفظ سویلزیشن کا اِشتقاق کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ نیز ایسے کلچر جو خواندگی پر مبنی ہوں، اُنہیں بھی سویلزیشن قرار دیے جانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ مثلاً چینی سویلزیشن جبکہ اسکیمو کلچر وغیرہ۔(۳۷)

بظاہر اِن دونوں میں اِمتیاز قائم نہ کرنے یا نہ کر پانے کی بنا پر مُترادف تصوّر کرتے ہوئے کلچر اور سویلزیشن کے الفاظ کا اِستعمال کیا جاتا رہا، جس کے نتیجے میں ابہام پیدا ہوا۔ جیسا کہ پچھلی سطور میں لکھا جا چکا ہے، ماہرینِ بشریات نے ان اِصطلاحات کی نامکمل یا غیر واضح تعریفیں بیان کی ہیں یا پھر کوئی تعریف بیان ہی نہیں کی، جوزف ڈریو نے الفریڈ کروبر کا شمار بھی اِسی دوسرے زُمرے میں کیا ہے۔(۳۸)

الفریڈ کروبر نے کلچر اور سویلزیشن کو ایک قرار دینے کی روش کو اپنایا۔ اِس ضمن میں وہ دونوں اِصطلاحات میں کسی اِمتیاز کی گنجائش کے اِمکان کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں:

By many anthropologists, ever since Tylor, the words "civilization"and "culture" are often used to denote the same thing; and always they denote only degrees of the same thing.(۳۹)

کروبر نے ایک اور جگہ لکھا ہے: میں دیگر کئی ماہرینِ بشریات کی مانند سویلزیشن کو کلچر کے مُترادف اِستعمال کرتا

ہوں۔مزید لکھا ہے کہ سویلزیشن کو ترقی یافتہ یا شہری کلچر کے معنوں میں وسیع پیمانے پر اِستعمال کیا جاتا ہے۔(۴۰)

کلچر کو مختلف معنوں میں برتنے سے اِس کے تصوّر کی تفہیم میں جو مشکلات پیدا ہوئیں اس کے بارے میں Kevin Avruch نے لکھا ہے کہ اِس اِصطلاح کو اِبتدا ہی سے کم از کم تین مختلف مفاہیم میں برتا گیا اور اب بھی یہی تینوں معنی متداول ہیں۔مذکورہ مفاہیم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

''ا۔میتھیو آرنلڈ نے ۱۸۶۷ء میں ''کلچر اینڈ انارکی'' میں قرار دیا ہے کہ کلچر خُصوصی علمی اور فنکارانہ کوششوں یا اُن کے نتیجے سے تعلق رکھتا ہے، جسے آج کل 'عوامی کلچر' کے مقابلے میں 'ہائی کلچر' کہا جا سکتا ہے۔آرنلڈ کی تعریف کے مُطابق کسی سماجی گروہ کا محض ایک محدود حصہ ہی تہذیب یافتہ کہلا سکتا ہے۔

۲۔ ایڈورڈ ٹائلر نے ۱۸۷۰ء میں اپنی کتاب "Primitive Culture" میں جو تعریف بیان کی وہ کسی حد تک آرنلڈ کی تعریف کا جواب تھی۔ٹائلر کے مُطابق تمام سماجی گروہوں کے سارے افراد کلچر کی خُصوصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اِسے لوئیس ہنری مورگن کے طریق پر "savagery" through "barbarism" to "civilization" یعنی 'وحشی پن سے ہوتے ہوئے بربریت اور پھر تہذیب تک' کی اِرتقائی صورت میں ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ ٹائلر کی تعریف کے مطابق عامۃ الناس بھی کلچر رکھتے ہیں جسے وہ کسی معاشرے کے فرد کی حیثیت سے حاصل کرتے ہیں۔

۳۔بیسویں صدی میں فرانز بوس نے کلچر کا تیسرا مفہوم پیش کیا جو ٹائلر کے ردِّعمل میں سامنے آیا۔بوس نے مختلف لوگوں اور معاشروں کے متعدّد متنوع الاقسام کلچروں کی اِنفرادیت پر زور دیا ہے۔بوس نے 'ہائی' اور 'لو' کلچر کے تصوّر کو مُسترد کرنے کے علاوہ کلچر کو وحشی اور مُتمدّن کے پیمانے سے ناپنے سے بھی انکار کر دیا۔''(۴۱)

درجِ بالا تینوں مفاہیم کی باہمی تفاوت سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ماہرین بشریات نے اِبتدا ہی سے مختلف راستوں پر چلتے ہوئے کلچر کے مُتنوع تصوّرات پیش کیے۔یہ اختلافِ رائے کلچر کی تعریف میں وُسعت بھی لایا اور اِسے مبہم بنانے کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوا۔ اِبہام کی گرد نے اِس اِصطلاح کی تعریف وتوضیح میں مُشکلات کا عنصر شامل کر دِیا۔

برطانوی انتھروپولوجسٹ ٹائلر نے ۱۸۷۱ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب *Primitive Culture* میں کلچر کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''وسیع بشریاتی مفہوم میں، تہذیب یا تمدُّن ایسا پیچیدہ کُل ہے جس میں معلومات، عقائد، فن، اخلاقیات، قوانین، رسوم ورواج اور ایسی کوئی بھی استعداد اور عادات پائی جائیں جو فرد نے بطور رُکنِ معاشرہ حاصل کی ہوں۔''(۴۲)

درج بالا تعریف میں دو نکات بالخصوص قابلِ توجہ ہیں:

۱۔ ٹائلر نے کلچر اور سویلزیشن کو الگ الگ قرار نہیں دیا،

۲۔ یہ تعریف اینتھر و پولوجی کی ایک شاخ، ایتھنوگرافی کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔

ٹائلر سے قبل کلچر یا سویلزیشن کے الفاظ کو اِصطلاح کا درجہ حاصل نہ تھا، اوّلین بار ٹائلر نے اِس خاص مفہوم میں ان الفاظ کو اِستعمال کر کے اِصطلاح کا درجہ دے دیا۔ جبکہ کلچر اور سویلزیشن کی علیحدہ علیحدہ شناخت آنے والے وقتوں میں مُتعین ہوئی۔ اِس تعریف میں ٹائلر نے کلچر کو اِنسان سے مخصوص قرار نہیں دِیا تاہم اِسی کتاب *Primitive Culture* میں آگے چل کر صراحت سے کلچر کو اِنسان سے مخصوص قرار دیا ہے۔ کلچر کی یہ تعریف ایک طویل عرصے تک علمِ بشریات میں رائج رہی اور آج بھی جبکہ اِس اِصطلاح کے مفہوم میں وسعت اور تبدیلی آ گئی ہے، ٹائلر کی بیان کردہ تعریف تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔

کلچر اور سویلزیشن کو ایک ہی تصوّر قرار دینے کا رُجحان ٹائلر کے بعد آنے والے ماہرینِ بشریات کے ہاں بھی موجود رہا ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے الفریڈ کروبر بھی اِسی خیال کے حامی ہیں اور اِن دونوں اِصطلاحات میں کسی اِمتیاز کی گنجائش کے اِمکان کو مسترد کرتے ہیں۔

کلچر کی تعریف بیان کرتے ہوئے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ T.S.Eliot: (1888-1965) نے لکھا ہے:

''کلچر آداب کی شائستگی کا نام ہے، یعنی مدنیت اور اِنسانیت'' (۴۳)

جبکہ آگے چل کر لکھا ہے:

''ایک خاص مقام پر رہنے والے مخصوص افراد کا طرزِ حیات'' (۴۴)

اِیلیٹ کا کہنا ہے کہ لوگ آرٹ، معاشرتی نظام، رسوم، مذہب وغیرہ کو کلچر سمجھتے ہیں حالانکہ یہ چیزیں کلچر نہیں بلکہ وہ کچھ ہیں جن سے کلچر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ (۴۵)

آسوالڈ سپینگلر Oswald Spengler: (1880-1936) نے خُصوصی طور پر تہذیب کی کوئی تعریف بیان نہیں کی، تاہم درج ذیل جملے تعریف کے ضمن میں اِستعمال کیے جا سکتے ہیں:

''تہذیبیں نامیے ہیں اور تاریخ ان کی اجتماعی سوانح حیات۔''

''تہذیب ماضی اور مستقبل کی تمام تاریخ کا اہم ترین مظہر ہے۔'' (۴۶)

سپینگلر کے مُطابق ترقی پذیر تہذیبیں آگے چل کر سامراجی تمدّنوں میں بدل جاتی ہیں جو پھلتی پھولتی ہیں اور آخر کار ٹُوٹ پُھوٹ کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جمہوری طرز کی حکومتیں پلوٹو کریسی میں اور پھر سامراج میں ڈھل جاتی ہیں۔

برونسلا میلی نوفسکی :Bronislaw Malinowski(1884-1942) کے مطابق ''زندہ رہنے کے مجموعی سلیقے کا نام ثقافت ہے، جو ہر قسم کے ذہنی، معاشرتی اور مادی آلات پر مشتمل ہے۔'' (۴۷)

فیلکس۔ایم۔کیزنگ:Felix M.Keesing(1902-1961) کے مطابق کلچر: ''اکتساب کردہ، معاشرتی طور پر منتقل شدہ طرزِ عمل کی کلّیت کا نام ہے۔'' (۴۸)

کلچر کا تعلق جبلّت یا وراثت سے نہیں ہوتا بلکہ یہ اکتسابی ہوتا ہے۔ فرد اپنے ماحول اور مُعاشرے سے کلچر اِکتساب کرتا ہے، ایک نسل دوسری نسل کو کلچر منتقل کرتی ہے تاہم یہ منتقلی جینیاتی نہیں ہوتی بلکہ سیکھنے اور سکھانے کے عمل پر مشتمل ہوتی ہے۔ بچہ اپنے والدین سے بالوں اور آنکھوں کا رنگ اور قد وقامت وغیرہ جیسے خواص جینیاتی طور پر وِراثت میں حاصل کرتا ہے لیکن کلچرل خواص اُن سے اِکتساب کرتا ہے اور یوں ایک دوسری نوع کی وِراثت منتقل ہوتی ہے۔ ٹالکوٹ پارسنز کی بیان کردہ کلچر کی تعریف بھی اِسی تصوّر پر مبنی ہے۔

> "Culture...consists in those patterns relative to behavior and the products of human action which may be inherited, that is, passed on from generation to generation independently of the biological genes."(۴۹)

ٹالکوٹ پارسنز:Talcott Parsons(1902-1979) نے بھی کلچر کو وراثت میں ملنے والی خاصیت قرار دیا ہے لیکن یہ وراثت جینز کے ذریعے منتقل ہونے والی نہیں بلکہ ایک نسل اپنی اگلی نسل کو سکھاتی ہے اور اِس طرح یہ منتقلی عمل میں آتی ہے۔ تاہم کلچر کی منتقلی ماحول سے بھی ہوتی ہے جس میں بعض اوقات والدین کے کلچر کو اپنانے کے بجائے ماحول کے زیرِ اثر ایک نیا کلچر اپنا لیا جاتا ہے۔ بالخصوص ترکِ وطن کر کے دوسرے ممالک میں آباد ہونے والوں کو اِس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

کلائیڈ کلک ہون:Clyde Kluckhohn(1905-1960) کے مطابق کلچر: ''وہ نظامِ حیات ہے جو ایک گروپ کے لوگوں میں نظامِ اقدار کی شکل میں مُشترک طور پر موجود ہوتا ہے۔'' (۵۰)

کلچر کسی گروہ کے مشترکہ طرزِ عمل سے مشروط ہوتا ہے، اِنفرادی طور پر کیے جانے والے افعال کتنی ہی باقاعدگی یا پابندی سے کیوں نہ کیے جائیں کلچر کی ذیل میں شمار نہیں ہوتے۔ گروہی سطح پر انجام پانے والے افعال کسی قانون کے تحت لازمی یا جبری قرار نہیں دیے جاتے بلکہ اُنہیں معاشرے میں قبولیت کی بنیاد پر اقدار کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

ولیم۔اے۔ہیوی لینڈ:William A. Haviland نے کلچر کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کلچر ضوابط یا معیارات کا ایسا مجموعہ ہے جس پر کسی معاشرے کے ارکان کے عمل پیرا ہونے کے نتیجے میں ایسا طرزِ عمل جنم لیتا ہے جسے یہ ارکان موزوں اور قابلِ قبول تصوّر کرتے ہیں۔''(۵۱)

بالفاظِ دیگر کلچر سے مُراد محض مشاہدے میں آنے والا طرزِ عمل نہیں بلکہ اِس کے پس پشت وہ اقدار اور عقائد ہیں جن سے یہ طرزِ عمل جنم لیتا ہے اور معاشرتی سطح پر اِسے قبولیت حاصل ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً آداب و تعظیم کے لیے انگریزوں کا سر سے ہیٹ اُتارنا، جاپانیوں کا جھک جانا، ہندوؤں کا ہاتھ جوڑنا وغیرہ ایسے افعال ہیں جو ان مخصوص معاشروں میں ایک خاص معنی رکھتے ہیں اور ارکانِ معاشرہ سے قبولیت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ اِسے بجا طور پر 'تہذیب' کا مجرّد اور وسیع مفہوم قرار دیا جا سکتا ہے۔ کلچر کے مادّی پہلو کو نظر انداز کر دینے سے اِس کی واضح تصویر اُبھر کر سامنے نہیں آپاتی اور محض ایک رُخ نظر آتا ہے۔

مجموعی طور پر کلچر کی مختلف تعریفوں سے جو تصویر اُبھرتی ہے اس کے مطابق کلچر آداب کی شائستگی اور زندگی گُزارنے کا طریقہ ہے جو ہر قسم کے ذہنی، مُعاشرتی اور مادّی آلات پر مُشتمل ہوتا ہے۔ کلچر مادّی اور غیر مادّی دو پہلوؤں پر مُشتمل ہوتا ہے، اِس کی نوعیت جبلّی نہیں ہوتی بلکہ اِکتسابی ہوتی ہے۔ کلچر کسی گروہ کے مجموعی طرزِ عمل سے وجود میں آتا ہے جس میں باقاعدگی ہوتی ہے، اِنفرادی یا ذاتی عمل کتنا ہی باقاعدہ کیوں نہ ہو کلچر نہیں کہلاتا۔ معلومات، عقائد، فن، اخلاقیات، قواعد و ضوابط، رسومات، رواج، قوانین، اقدار اور رِوایات سے کلچر کی تشکیل ہوتی ہے۔

انگریزی زبان کے لفظ سویلزیشن کے لیے اُردو میں تہذیب یا تمدُّن کے الفاظ مُستعمل ہیں۔ تمدُّن عربی کا لفظ ہے، اِس کا مادّہ 'م دن' سے ہے، جس کے معنی ہیں مُتمدّن بنانا، شہری بنانا۔ (۵۲)

تمدُّن کے لُغوی معنی ہیں: شہری بنانے کا عمل، شہر میں سکونت اختیار کرنا۔ (۵۳)

القاموس العصری کے مطابق اِس کے معنی 'پاک صاف کرنا، شائستہ کرنا اور مُتمدّن کرنا' کے ہیں۔ (۵۴)

'تمدُّن' کا لفظی مفہوم جاننے کے لیے ایک نظر اُردو لُغات پر ڈالتے ہیں: نُور اللغات کے مطابق 'تمدُّن' سے مراد ہے:

(ع) شہر میں بود باش کرنا۔ شہر کا انتظام کرنا

طرزِ مُعاشرت۔ رہنے سہنے کا انداز (۵۵)

''اُردو لغت (تاریخی اُصول پر)'' 'تمدُّن' کے معنی یوں بتاتی ہے:

۱۔ شہری بود و باش، (کسی ایک جگہ) مل جُل کر رہنا، سماجی زندگی، Civilization

۲۔ شائستگی، تہذیب۔

۳۔ رہنے سہنے کے خاص طریقے، طرزِ معاشرت (۵۶)

سر سیّد احمد خان نے سویلزیشن کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سویلزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا ترجمہ ہم نے تہذیب کیا ہے۔ مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعالِ ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور صرفِ اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے برتنا، جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی حاصل ہوتی ہے اور تمکن اور وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔'' (۵۷)

سر سیّد احمد خان کی بیان کردہ تعریف پر ناقدین کو اعتراض ہے کہ اُنہوں نے تہذیب اور تمدُّن کی تعریفوں میں اِمتیاز روا نہیں رکھا اور انہیں ملا جُلا کر ایک تعریف کی صورت میں ڈھال لیا ہے۔ اِس ضمن میں محض یہی کہنا کافی ہوگا کہ مُتعدّد مغربی ماہرینِ بشریات بھی تہذیب اور تمدُّن کی تعریفوں میں اِسی روش کے مقلّد نظر آتے ہیں۔ سر سیّد احمد خان نے سویلزیشن کا تصوّر مغرب سے مُستعار لیا۔ اُن کے عہد میں یہ تصوّر نیا نیا رائج ہوا تھا اور ابھی اِس کے خدوخال کی تشکیل کا آغاز ہی ہوا تھا۔ اُس زمانے میں بیشتر مغربی ماہرین بھی سویلزیشن اور کلچر کو ایک ہی تصوّر قرار دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سر سیّد احمد خان بھی سویلزیشن کی تعریف بیان کرتے ہوئے حدِ فاصل قائم نہیں رکھتے اور تمام مادّی و غیر مادّی پہلوؤں کا احاطہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

محمد مجیب نے تمدُّن اور تہذیب کو ہم معنی اِستعمال کرتے ہوئے تمدُّن کی تعریف کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

''تمدن یا تہذیب کے معنی ہیں انسان کا اپنی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو تربیت دینا اور انہیں کام میں لانا۔ جماعتوں کی تہذیب، اشخاص کی محنت، صلاحیت، ذوق یا فکر کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ۔۔۔ افراد کی تہذیب مشتمل ہوتی ہے اس مادی، ذہنی اور اخلاقی دولت پر جس کے وہ مالک ہوں اور محنت پر جس کے بارآور ہونے سے ان کی یہ دولت بڑھتی ہے۔ جماعت کے تہذیبی سرمائے میں اس کے تمام افراد برابر کے حصہ دار نہیں ہوتے۔ اس سے فائدہ اٹھانے یا اس میں اضافہ کرنے کی صلاحیت بھی سب میں برابر نہیں ہوتی۔'' (۵۸)

محمد مجیب نے تمدُّن کو گروہ یا معاشرے کی سطح کے علاوہ فرد کی سطح پر بھی بیان کیا ہے۔ اُن کے مُطابق افراد کی تہذیب سے ہی معاشرے یا گروہ کی تہذیب یا تمدُّن کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ فرد کی صلاحیتوں، شخصی کردار، ذہانت اور مال و دولت وغیرہ کو اُس کی تہذیب قرار دیتے ہیں جس میں اُس کی قابلیت اور محنت سے اِضافہ ممکن ہوتا ہے۔ یہ اِضافہ نہ صرف

ذاتی سطح پر فرد کی ترقی کا سبب بنتا ہے بلکہ مجموعی طور پر اِجتماعی تہذیب یا تمدُّن کی ترقی کا باعث بھی ثابت ہوتا ہے۔ محمد مجیب کے اِن خیالات کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ تہذیبیں اور تمدُّن بڑے پیمانے پر اور نسبتاً زیادہ تیزی سے وسعت اور ترقی پائیں گے جنہیں زِیادہ قابلیت رکھنے والے، باصلاحیت، وسائل سے مالا مال اور محنت کے عادی افراد کی کثیر تعداد میسّر ہو۔

خلیفہ عبدالحکیم بھی اُن ماہرین کے ہم خیال ہیں جو تمدُّن سے مُراد شہری زِندگی لیتے ہیں۔ وہ تمدُّن کی وضاحت اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''تمدُّن حقیقت میں وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں لوگ شہروں میں رہنے لگتے ہیں۔ شہری زندگی میں مختلف پیشے ہوتے ہیں اور تقسیمِ کار سے ہر کام اور ہر فن کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔۔۔۔رسوم ورواج ترقی کرتے کرتے منضبط قوانین کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ دولت اور سامانِ حیات میں افزونی ہوتی ہے۔۔۔علوم وفنون کی ترقی سے زینت کے سامان مہیا ہوتے ہیں۔ انسانی عقل بھی مدنیت ہی سے ترقی پاتی ہے۔'' **(۵۹)**

خلیفہ عبدالحکیم تمدُّن کو شہری زِندگی قرار دیتے ہیں جو دیہات یا قصبات کی زِندگی سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اور اِس میں ایک شخص کسی ایک مخصوص پیشے میں مہارت حاصل کرتا ہے اور اپنے سارے کام خود کرنے کے بجائے کام کو مختلف افراد میں بانٹ دیا جاتا ہے جو اپنی مہارت کے شعبے میں ہی کام کرتے اور خدمات فراہم کرتے ہیں۔ یہ شہری زندگی باقاعدہ قوانین کے تحت معاملات چلاتی ہے۔ تمدُّن کی تعریفوں کا مُفصّل جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ ماہرین کی اکثریت شہری زِندگی کو تمدُّن قرار دیتی ہے۔ اُن کے نزدیک جب کوئی تہذیب شہروں میں پائی جائے، تمدُّن کہلاتی ہے۔ کچھ ماہرین تہذیب اور تمدُّن میں صرف پھیلاؤ، وُسعت اور سائز کا فرق دیکھتے ہیں، اُن کے مطابق تمدُّن، تہذیب کی وُسعت یافتہ صُورت ہوتے ہیں۔ ماہرین تمدُّن کو تہذیب کی ترقی یافتہ شکل بھی قرار دیتے دکھائی دیتے ہیں اور بعض کے مطابق یہ تہذیب کی مادّی صورت ہے جبکہ تہذیب، تمدُّن کی ذہنی صُورت ہے۔ جبکہ تہذیب اور تمدُّن کو ایک ہی تصوّر قرار دینے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بالکل واضح ہے کہ لُغات میں تمدُّن کے عُمومی مفاہیم بیان کیے گئے ہیں اور اِس سے شہری زِندگی مُراد لی جاتی ہے۔ اِصطلاحی معنوں کی وضاحت میں لُغات خاموش نظر آتی ہیں۔ مذکورہ بالا انگریزی ڈکشنری میں بیان کردہ معنی اِصطلاحی معنوں سے قریب تر ہیں۔

'کلچر' کا لفظ اُردو میں مُستعمل ہے، اِس کے برعکس انگریزی لفظ 'سویلزیشن' اُردو میں رائج نہیں ہو پایا۔ اُردو میں اِس کے لیے 'تہذیب' اور 'تمدُّن' کے الفاظ مُروّج ہیں۔ زیرِ نظر مقالے میں سویلزیشن کے لیے 'تمدُّن' کا لفظ اِستعمال کیا

گیا ہے۔تاہم اِقتباسات میں جہاں جہاں تہذیب کا لفظ اِستعمال ہوا ہے، اصل کو برقرار رکھا گیا ہے۔

تمدُّن سے مُراد شہری زِندگی لی جاتی ہے۔ جب کوئی تہذیب زِیادہ ترقی یافتہ شکل کو پہنچ جاتی ہے تو اس کی یہ حالت تمدُّن کہلاتی ہے۔ تمدُّن اپنے اِصطلاحی مفہوم کے مطابق ملنے جُلنے، رہنے سہنے کے طریقے، شخصی اور گروہی آزادی، اِنفرادی، اِجتماعی اور اِنسانی حُقوق وفرائض کی ادائیگی کے قاعدوں اور طریقوں پر مُشتمل ہوتا ہے۔ اِصطلاحاً تمدُّن کے ذیل میں اِنسانی کوششوں سے تخلیق ہونے والی ساری اشیا شامل ہوتی ہیں مثلاً آلات، اوزار، عمارات، مُجسمے، آلاتِ موسیقی وغیرہ اور ایسی تمام اِیجادات جو اِنسان اپنی سہولیات میں اِضافے اور زندگی کے لوازمات وضروریات کی تکمیل کے لیے اِیجاد کرتا یا بناتا ہے نیز تمام سماجی اِدارے بھی اِسی زُمرے میں آتے ہیں اور یہ سب تمدُّن کے مظاہر کہلاتے ہیں۔ تمدُّن کی تشکیل اِنہی مظاہر سے ہوتی ہے۔ تمدُّن اِنسانی تہذیب کی مادّی اور آلاتی شکل ہے جسے سائنس، ٹیکنالوجی اور محنت کی تقسیم کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انگریزی میں تمدن کے کچھ مفاہیم درج ذیل ہیں۔ انگریزی کی میریم -ویبسٹرڈ کشنری سویلزیشن کا مفہوم یوں بیان کرتی ہے:

"civ·i·li·za·tion noun

-the condition that exists when people have developed effective ways of organizing a society and care about art, science, etc."(۶۰)

آرنلڈ ٹائن بی (Arnold Toynbee) نے تمدُّن کا درج ذیل مفہوم بیان کیا ہے:

''تمدُّن تاریخی مطالعے کے قابلِ فہم میدان ہیں۔۔۔ جو زمان ومکان میں قومی ریاستوں، شہر یا شہری ریاستوں یا دیگر کسی بھی سیاسی سماجوں کے مقابلے میں زیادہ وُسعت کے حامل ہوتے ہیں۔''(۶۱)

تمدُّن کی تشکیل کے بارے میں ٹائن بی کا کہنا ہے:

''نئی روحانی بصیرتیں نئے مذہب کو جنم دیتی ہیں اور بالآخر نئے تمدُّن کو۔''(۶۲)

آسوالڈ سپینگلر (Oswald Spengler): نے تہذیب کی طرح تمدُّن کی بھی بطورِ خاص کوئی تعریف بیان نہیں کی، تاہم کچھ جملے ایسے ہیں جو اُن کے تصوّرِ تمدُّن کو سمجھنے کے لیے اِستعمال کیے جا سکتے ہیں۔ سپینگلر نے تمدُّن کو اپنی بیان کردہ اعلیٰ یا عظیم تہذیبوں کی آخری صورت قرار دیا ہے اور لکھا ہے: ''تمدُّن، تہذیب کا لازمی مقدر ہے۔ وہ اِنتہائی خارجی و مصنوعی کیفیات جن کی کوئی ترقی یافتہ اِنسانی نسل اہل ہو سکتی ہے، زیرِ تکمیل شے کے بعد آنے والی شے ہے۔''(۶۳)

آسوالڈ سپینگلر (Oswald Spengler): نے تمدُّن کی اِصطلاح ایک خاص معنی میں اِستعمال کی ہے اور اپنی 'عظیم تہذیبوں' کی آخری اِنحطاط پذیر اور غیر تخلیقی سٹیج کو تمدُّن قرار دیا ہے جو اِن تہذیبوں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

''تمدُّن سے مُرادشہروں کی تہذیب ہے، جبکہ شہر اجتماعی رہائش کی جگہ ہیں جہاں کے رہنے والوں کی اکثریت خوراک کی پیداوار کے عمل میں شامل نہیں ہوتی۔تمدُّن ایک ایسی تہذیب ہے جس میں شہر پائے جائیں۔''(۶۴)

بیگ بی کی بیان کردہ تعریف کی روشنی میں تہذیب اور تمدُّن میں فرق 'شہری زندگی' کا ہے، یعنی جب کوئی تہذیب شہروں میں پائی جائے، تمدُّن کہلائے گی۔ بیگ بی کی طرح بیشتر ماہرینِ بشریات تمدُّن کو شہری زندگی قرار دیتے ہیں اور اُن کی پیش کردہ تعریفیں غیر واضح اور مُبہم بھی ہیں۔

''تہذیب سویلزیشن افراد کی اعلیٰ ترین ثقافتی گروہ بندی ہوتی ہے اور ثقافتی تشخص کی وہ وسیع ترین سطح ہوتی ہے جو افراد کو جانداروں کی دیگر انواع سے مختلف بناتی ہے۔اس کی تعریف مشترک معروضی عوامل مثلاً زبان، تاریخ، مذہب، رسوم ورواج، اداروں اور افراد کی داخلی (موضوع) ذاتی پہچان کے ذریعے بھی کی جاسکتی ہے۔''(۶۵)

سیموئیل پی ہنٹنگٹن کے نزدیک سویلزیشن نہ صرف افراد کو افراد سے بلکہ دیگر انواع سے بھی مُتمیّز کرتی ہے۔ ہنٹنگٹن نے مذہب کو بھی سویلزیشن کے عوامل میں شامل کیا ہے اور وہ اپنی کتاب ''تہذیبوں کا تصادم'' میں دُنیا کی اہم تہذیبوں کے نام بیان کرتے ہوئے بعض کو مذاہب کی بُنیاد پر شناخت کرتے دکھائی دیتے ہیں مثلاً اِسلامی تہذیب، ہندو تہذیب وغیرہ، جبکہ دُوسری طرف مغربی تہذیب کو جغرافیائی حوالے سے پہچان دیتے ہیں۔ ہنٹنگٹن کی اِس تقسیم پر اعتراضات بھی اُٹھائے گئے ہیں اور امرتیا سین Amartya Sen نے اِس نوع کی تقسیم کو متنازع قرار دیا ہے اور اپنی کتاب تشخّص اور تشدّد میں سوال اُٹھایا ہے کہ کیا اِنسانوں کو مذہب اور تہذیب کی بُنیاد پر منقسم سویلزیشن میں بانٹا جانا چاہیے۔ ماضی میں ایک طویل عرصے تک مغربی تہذیب کی شناخت مذہب کی بنیاد پر کی جاتی رہی تھی اور اِسے عیسائیت یا Christendom کے نام سے پہچانا جاتا تھا تاہم روشن خیالی کی مُتعارف کردہ سیکولرائزیشن نے اِس پہچان کو بدل ڈالا اور اب یہ تہذیب مغربی تہذیب کے نام سے جانی جاتی ہے۔

میتھیو میلکو (Matthew Melko) نے لکھا ہے کہ ''تمدُّن بڑی اور پیچیدہ تہذیبیں ہوتے ہیں اور عموماً ماحول پر نسبتاً زیادہ کنٹرول، بڑے پیمانے پر زرعی سرگرمی اور جانوروں کو سدھانا، تمدُّن کو سادہ تر تہذیبوں سے مُتمیّز کرتا ہے۔''(۶۶) میلکو (Melko) کی تعریف کے مطابق تمدُّن اور تہذیب میں نُمایاں فرق محض حجم کا ہوتا ہے یعنی تمدُّن تہذیبوں کے مقابلے میں زِیادہ بڑے اور زِیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اِن میں وہ ساری سرگرمیاں نسبتاً بڑے پیمانے پر انجام دِی جاتی ہیں جو تہذیب کا حصہ ہوتی ہیں۔ اِس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ تمدُّن دراصل تہذیب کی ترقی یافتہ شکل ہوتے ہیں۔

تمدُّن کی تعریف بیان کرتے ہوئے سٹیفن بلاہا(Stephen Blaha) نے لکھا ہے:

''کم از کم کئی ہزار لوگوں پر مُشتمل ایک گروہ جو مُشترک تہذیب رکھتا ہو، عموماً ایک مُشترک زبان، ایک جغرافیائی مقام، کچھ اہم یادگار عمارات، فنِ تعمیر اور ایک سیاسی ڈھانچا جو ضروری نہیں کہ متحد ہو۔''(۶۶)

موریرا(Dario Fernandez-Morera) کے مطابق تمدُّن شہر یا شہروں پر مشتمل ہوتا ہے جس میں ایک خاص حد تک باقی رہنے والی یادگاریں ہوتی ہیں جبکہ تہذیب اِن سے محروم ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ مایا سویلزیشن کی مثال دیتے ہیں جس میں شہر اور یادگاریں دونوں موجود تھیں، دُوسری طرف پولی نیشیائی اِن عناصر سے عاری ہونے کے باعث محض کلچر تشکیل دیتے ہیں۔(۶۸)

بیشتر ماہرین نے تمدُّن کو شہری زندگی پر مبنی تہذیب قرار دیا ہے اور موریرا بھی اِسی خیال کے حامی ہیں۔

فیلپ فرنینڈیز ارمسٹو(Felipe Fernandez-Armesto) نے تمدُّن کی تعریف کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہم ایک ایسی دُنیا میں داخل ہو رہے ہیں جس میں کوئی شے حتمی نہیں اور تعریفیں فریب کن دکھائی دیتی ہیں، ایک مسلسل جاری عمل پر مبنی دُنیا جس میں کوئی عمل تکمیل تک نہیں پہنچتا اور معنی کبھی گرفت میں نہیں آ پاتے۔ وہ تمدُّن کی رِوایتی تعریفوں پر تنقید کرتے ہوئے انہیں اِنتہائی غیر لچکدار، بناوٹی اور مصنوعی قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تعریفیں Overdefined اور ثبوت سے ماخوذ ہونے کے بجائے اس پر ٹھونسی گئی معلوم ہوتی ہیں۔(۶۹)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو تمدن مدینہ یعنی شہر سے ہے، لوگوں کا آپس میں مل کر رہنا اور کسی بستی کو بسانا، یہ سول لائزیشن ہے، اس تمدن میں جن اقدار کا فروغ ہوتا ہے وہ کلچر یا تہذیب ہے۔ تمدن کے بغیر تہذیب کا وجود ممکن نہیں۔

(ب) پاک و ہند کی تہذیب

پانچ ہزار سال قبل مسیح چار بڑی تہذیبیں اس دنیا میں تھیں، مصر کی ہیروغلیفی، عراق کی میسوپوٹیمیا، یورپ کی کریٹ اور سندھ کے دراوڑ۔

برصغیر پاک و ہند مختلف تہذیبوں کا مسکن رہا ہے۔ ایک ہی وقت اور ایک ہی زمانہ میں کبھی کئی تہذیبیں بنتی، بگڑتی، پھیلتی اور سکڑتی رہیں اور کبھی ایک ہی تہذیب ان مراحل سے گزر گئی۔ یہ خطہ اپنے جغرافیائی محل وقوع، طبعی حالات اور ان کے توسط سے وسائل زندگی کی افراط کے باعث بیرونی قوتوں کو تسخیر کی دعوت دیتا رہا۔ لہٰذا باہر سے آنے والے گروہوں کا ایسا تانتا بندھا کہ اس خطے کی ابتدائی تاریخ اور ابتدائی تہذیب تک پہنچنے کے لیے محققین کو دلچسپیوں کے انبار نظر آئے اور تحقیق و تلاش کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو کسی مقصود تک پہنچ کر بھی جاری رہتا نظر آتا ہے۔ تہذیبی عروج و زوال کی تاریخ سے یہ اندازہ

ضرور ہوتا ہے کہ برصغیر میں جو قوم یا گروہ داخل ہوا وہ یہاں کے قدیم باسیوں کی تہذیب کا حصہ بن گیا یا پھر واپس لوٹ گیا۔ وحید عشرت لکھتے ہیں:

''برصغیر میں جو قوم بھی وارد ہوئی یا جو گروہ بھی آیا۔ وہ یا تو اس زمین کے قدیم باسیوں کے نظریات و افکار کی دلدل میں کھو کر رہ گیا یا اسے یہاں سے رخصت ہونا پڑا۔''(۷۰)

برصغیر کے شمال مشرق سے اقوام یہاں داخل ہوتی رہیں اور یہاں اپنی فتوحات کی داستانیں رقم کرتی رہیں۔ ان کے یہاں آنے سے ایک جانب تو تباہی اور بربادی کے ہولناک مناظر دکھائی دیے تو دوسری جانب وہ اپنے ساتھ ایسی تہذیبی اقدار لائیں جس سے یہاں کی تہذیبوں کو نہ صرف نئی وقت اور توانائی ملی بلکہ زیادہ قوی اور مؤثر تہذیبوں کے ابھرنے کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ پروفیسر ایشوراٹوپا ان تہذیبی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''قدیم ہندوستان نے اپنی تہذیب کی نشو ونما، سماجی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مخصوص اصولوں پر کی تھی۔ اس کو اس اعتبار سے حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے اپنے آپ کو ان بدلنے والی ضروریات زندگی کے ہمیشہ مربوط رکھا۔''(۷۱)

اس طرح برصغیر پاک و ہند کی ابتدائی تہذیبوں کا مزاج 'رہو اور رہنے دو' بن گیا۔ جس سے باہمی رواداری کو فروغ حاصل ہوا اور یہ رواداری برصغیر کے ہر تہذیبی گروہ کی زندگی میں بنیادی قدر کے طور پر پھیل گئی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک طبقاتی نظام بھی اپنے پنجے گاڑے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اس نظام میں کم از کم دو طبقے ممتاز رہے ہیں۔ ایک اعلا طبقہ جو اگرچہ تعداد میں کم رہا مگر سماجی حیثیت میں اس کا رتبہ بلند تسلیم کیا گیا اور تہذیبی فوائد اسی کے گرد اکٹھے ہوتے رہے۔ اس طبقہ نے تہذیب کی اعلا اقدار کو فروغ دیا اور علوم وفنون، اداروں کے قیام وترقی کے لیے کاوشیں کیں۔ دوسرا طبقہ عوام الناس کا ہے جو اس بلند طبقہ کا محض غلام بن کر رہا اور اسی کے احکامات کی تعمیل کو اپنی زندگی کا مقصد تصور کرتا رہا۔ ان دو طبقوں کی موجودگی میں تیسرا عنصر غیر ملکی اثرات تھے۔ ان تینوں کی آمیزش سے بعد میں برصغیر کی تہذیب کا خمیر اٹھا مگر طبقاتی نظام ان بیرونی تہذیبوں پر بھی اثر انداز ہوا، جو یہاں داخل ہونے سے پہلے ایسا کوئی نظام نہیں رکھتی تھیں۔ ان میں سے ایک ذات پات کی تقسیم تھی جس کے بارے میں ڈاکٹر جعفر حسن لکھتے ہیں:

''ذات پات کا اثر مسلمانوں اور عیسائیوں میں بھی اتنا سرایت کر چکا ہے کہ 'ذات والے عیسائی' 'نیچ ذات والے عیسائیوں' سے شادی بیاہ کرنے میں تامل، انکار اور مخالفت کرتے ہیں اور ایسی بے جوڑ شادیوں کے موقع پر ہنگامہ کرتے ہیں۔''(۷۲)

جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ برصغیر میں باہر سے آنے والی تہذیبوں نے نہ صرف اپنے تہذیبی اثرات

یہاں کی تہذیب پر مرتب کیے بلکہ یہاں کی تہذیبی اقدار بھی اپنے اندر جذب کرنے سے محفوظ نہ رہ سکیں۔

برصغیر پاک و ہند کی تہذیب کی تاریخ کو کئی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اولین پہلے دور کا عرصہ ابتدائی برفانی عہد سے لے کر آخری برفانی عہد تک ہے۔ جب موسم بہت ٹھنڈا اور ناقابل برداشت تھا، ہر طرف برفانی ہوائیں چلتی تھیں اور جینا بہت مشکل تھا۔ اس دور میں برصغیر میں موجود انسان ابھی ابتدائی نیم حیوانی زندگی گزار رہا تھا۔ رشید اختر ندوی لکھتے ہیں:

''وہ نرا جانور تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر آوارہ اور سرگرداں پھرتا رہتا تھا۔ اس کی زندگی کا تنہا مقصد اس وقت خوراک تھی۔ وہ جنگلی جانوروں کے پیچھے، انھیں لقمہ تر بنانے کے لیے بالکل اسی انداز میں دوڑنا، جس طرح جنگلی درندے شکار کے پیچھے اب بھی لپکتے ہیں۔'' (۷۳)

اس دور کے آدمی نے بھی اپنے آثار چھوڑے ہیں یہ آثار نیم گڑھے پتھر کے اوزار ہیں، نسلاً اس دور کے آدمی دو طرز کے تھے۔ ایک لمبے سر والے اور دوسرے چوڑے سر والے۔ لمبے سر کی نوع انسانی شروع شروع میں یورپ پھیلی اور پروٹو نارڈک (Proto-Nordic) اور پروٹو میڈیٹیرین (Proto-Mediterranean) کے قالب میں ڈھلی۔ یہی نسل ترکستان، چین، جنوبی سائبیریا وغیرہ میں پروان چڑھی اور کئی نام پائے۔ اسی نسل کا تیسرا وطن امریکہ اور پھر افریقہ تھا۔ ہندوستان کے پہلے آبادکار یہی لمبے سر والے لوگ تھے، جو ترک وطن کرتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔ انہی کی اولاد میں سے منڈا قبائل اور پروٹو دارویڈین (Proto-Dravidian) ہیں، یہیں سے دراوڑ نکلا ہے یہ اصل میں دریا آور تھے۔

دوسری طرف چوڑے سروں والی نسل اس وقت جب کہ لمبے سروں والی نسل پھیل رہی تھی اگرچہ تعداد میں کم تھی لیکن لمبے سروں والی جیسی تھی۔ یہ نوع بشری دنیا کی سطح مرتفع، یورپ کے جنوبی حصوں اور مغربی ایشیا میں پروان چڑھی۔ یہ ہندوکش کو عبور کر کے بنگال، بمبئی اور میسور تک جا پہنچی۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاتا ہے کہ اس نوع نے منگول نسل کو بھی جنم دیا۔ رشید اختر ندوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''یہ بھی بہت ممکن ہے کہ اس عہد کی ابتدا میں بڑے سروں والی اس نوع نے چوڑی اور ابھری ہوئی ہڈیوں والے چہروں، چپٹی ناکوں اور نیلگوں آنکھوں والی منگول نسل کو جنم دیا اور اسے یہ شکل مشرق ایشیا میں آباد ہونے کے سبب نصیب ہوئی۔'' (۷۴)

برفانی عہد کے اس انسان کو برصغیر میں گزرے یا آباد ہوئے کتنا عرصہ گزرا ہے اس کا جواب یقین سے تو نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پہلا برفانی عہد پانچ لاکھ سال پر پھیلا ہوا تھا۔ جبکہ دوسرا، تیسرا اور چوتھا برفانی عہد مجموعی طور پر اندازاً چھ لاکھ سال پر محیط ہوگا۔ پہلی نسل کول اور منڈا لوگوں کے ہاتھوں مغلوب ہوئی جو اسٹریلیا سے لے کر مغربی بنگال تک پھیل چکے تھے۔ اگرچہ اس پر مؤرخین کا شدید اختلاف ہے کہ منڈا زبان بولنے والے کول اور ڈراویڈین

ایک ہی نسل کے افراد ہیں یا دونوں کی نسلیں الگ الگ ہیں۔لیکن اس پر ضرور متفق ہیں کہ ڈراویڈین نے ہی ابتدائی برفانی زمانے کے اختتام کے بعد یہاں کی سیاسی زندگی میں اہمیت حاصل کر لی اور اقتدار کی طرف بڑھے۔

ڈراویڈین نے تہذیبی اعتبار سے اپنے قدم کافی آگے تک بڑھائے۔وحشی جانوروں کو قابو کیا۔چوپائیوں کو پانی ضرورت کے لیے استعمال کیا۔زراعت اور کھیتی باڑی کی داغ بیل ڈالی۔جنگلوں اور غاروں کی زندگی ترک کر کے بستیاں بسا کر رہائش اختیار کی اور مصر، بابل وغیرہ سے اپنے تجارتی تعلقات قائم کیے۔یوں برصغیر میں ابتدائی تہذیبی عمل شروع ہوا جو بہت سادہ تھا۔یہ تہذیب دنیا کے ان چار تہذیبوں میں ایک تہذیب ہے،سندھ کے دراوڑ، مصر کے ہیروغلیفی، یورپ کے کریٹ، اور عراق کی میسوپوٹیمیا پانچ ہزار سال قبل مسیح کی تہذیبیں ہیں۔

چودھویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ آریا ہندوستان میں آنا شروع ہوئے اور ان کی آمد کا سلسلہ چھٹی صدی قبل مسیح تک جاری رہا۔یہ قوم خود ایک تہذیب کی مالک تھی اس تہذیب نے یہاں کی پہلے سے موجود تہذیب سے باہمی میل جول کے ذریعہ وہ غلبہ حاصل کر لیا جو ویدک تہذیب کے روپ میں نہ صرف ظاہر ہوئی بلکہ یہاں راج کرنے لگی۔ڈاکٹر تاراچند ویدک تہذیب کے مختلف ادوار کی تقسیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "In the first place, Indian history may be broadly divided into three epochs- ancient, medievel and mordern ; the first begining from the earliest times to the eighth century of the christian era. The second consisting of the one thousand years following the eight century , and the third commencing with the nineteenth century and still running."(۴۵)

پہلے دور میں آریائی اور غیر آریا ایک دوسرے سے دست و گریبان رہے۔یہ صورت حال صرف سیاست اور معاشی معاملات میں نہ تھی بلکہ تہذیبی سطح پر بھی بہت واضح دکھائی دیتی ہے۔باقاعدہ سکونت اور آبادکاری کا سلسلہ قائم ہوا۔مذہبی افکار اور بھجنوں کے ذریعے معاشرتی زندگی میں تبدیلیاں آنی شروع ہوئیں۔تخلیق کائنات، تقدیر انسانی اور معاشرتی نظام کے متعلق تصورات اور افکار منظر عام پر آنے لگے اور ان کے ایسے وسیع اثرات مرتب ہوئے کہ یہاں کے اصلی باشندے بھی اس نئے نظام میں شامل ہو گئے۔پانچ سو سال قبل مسیح میں ایرانی تہذیب یہاں آئی اور دو سو سال تک یہاں مسلط رہی۔ایرانی اپنے ساتھ بہت سی صنعتیں اور فنون لے کر آئے۔رسم الخط اور سکہ لائے۔یہ سب چیزیں یہاں کی تہذیب میں شامل ہو گئیں۔بدھ مت کی بنیاد پڑی اور اس کا دور شروع ہوا یہ ایک ہزار قبل مسیح تک رہا۔اس دور میں تہذیبی سطح بہت بلند

TH-19426

ہوئی۔ نئے علوم وفنون منظر پر آئے۔ اعلاتخلیقی کام شروع ہوئے اور اخلاقی ضابطوں پر عمل کو تہذیبی زندگی کا اصول بنایا گیا۔ بدھ مت کے زمانے میں جو تہذیبی ترقی ہوئی اس کا ذکر کرتے ہوئے سید علی بلگرامی، گستاولی بان کی تصنیف کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

''یہ بدھ مت کا زمانہ ہے۔ اس میں حکومت اور بدھ مت کا زور وشور رہا۔ علوم وفنون کو رونق ہوئی۔ شاعری، طب، صرف ونحو، نجوم، فلسفہ وغیرہ کی تالیف وتصنیف کا بازار گرم رہا۔'' (۷۶)

موسیقی، مصوری، نقاشی، سنگ تراشی، اور طرز تعمیر کو بہتر بنایا گیا۔ تین سو سال قبل مسیح میں یونانی آئے۔ وہ اپنے 'فنکار' اپنے لباس اور سامان آرائش اپنے ساتھ لائے۔ اس طرح یونانی تہذیبی اثرات کا عمل دخل یہاں شروع ہوا۔ جس کی وجہ سے سنگ تراشی میں نئی جہتیں ابھریں اور یہ فن اپنی اعلا منازل کو چھونے لگا۔

چھٹی صدی عیسوی میں خاندان گپتا کے توسط سے ہندو تہذیب ابھری جو سیلون تک پھیل گئی۔ قومی زندگی میں بڑی کامیابیاں حاصل کی گئیں۔ بدھ مت اور جین مت کی ترقی رک گئی اور رفتہ رفتہ یہ مذاہب ختم ہو کر رہ گئے۔ مذہبی ادب میں کام ہوا۔ مہابھارت، رامائن اور پورانوں کو دوبارہ مرتب کیا گیا۔ کالی داس، وِنڈن، بان، بھادری جیسے بلند پایہ شعرا سامنے آئے۔ فلکیات اور ریاضیات کو ترقی دی گئی۔ فن تعمیر، مصوری اور سنگ تراشی عروج کو پہنچے، لیکن ہرش سلطنت کے زوال کے ساتھ یہ دور ختم ہو گیا اور پھر جدید برہمنی دور سامنے آیا جو پانچ سو عیسوی سے محمود غزنوی کی فتح تک رہا۔

اسلام کی آمد اور اسلامی تحریکات کے زیر اثر فنون میں تبدیلی واقع ہوئی، ادب میں سنسکرتی تعلیمات کو زوال آیا، دیسی زبانوں کو فروغ ملا، جن میں اردو بھی شامل ہے۔ طب، ریاضی اور فلکیات میں عرب تصورات داخل ہوئے اور پوری تہذیبی زندگی میں ایسی تبدیلی آئی کہ ایک نئے تہذیبی دور کا آغاز ہو گیا۔ یہ دور آٹھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد مغرب کی تہذیب یہاں پہنچی، جس نے یہاں کی تہذیب کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔

اسلامی تہذیب:

اسلامی تہذیب کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں، اس کے عقائد، اس کا نظام اخلاق، سیاست اور امور سلطنت، معاشی مسائل کے حل کے لیے نقطہ نظر، غلامی اور حقوق نسواں کے معاملات کا حل وغیرہ۔ اسلامی تہذیب کی ان تمام جہتوں کی بنیاد قرآن پاک ہے۔ قرآن کے مطابق مسلمان وہ ہے جو غیب پر ایمان لائے، حیات مابعد پر ایمان لائے۔ پروردگار عالم کو 'عقل اول وکل' تسلیم کرے اور اس پر ایمان لائے۔ کیونکہ وہی اور صرف وہی حقیقت ہے۔ وہ خالق ہے مخلوق نہیں۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ موجود نظر نہیں آتا مگر ہر جگہ موجود ہے۔ اس کائنات میں جو کچھ ہے خدا ہی نے پیدا کیا ہے۔ اسی نے موت کو پیدا کیا ہے اور زندگی کو بھی۔ فطرت کا سارا نظام اس کی دسترس میں ہے اور وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔

اس مابعدالطبیعات نے جو نظام وضع کیا ہے وہ اسلام کا تہذیبی نظام ہے۔اور فلسفہ توحید ہی وہ اصل قوت ہے جو اس تہذیبی نظام کو نہ صرف مربوط رکھتا ہے بلکہ اتنا اعلا اور ارفع بناتا ہے کہ یہ مثالی تہذیب کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔اس تہذیبی نظام نے دین اور دنیا میں ایسا اعلا توازن پیدا کیا ہے جو اس نظام کی تشکیل سے پہلے کسی تہذیب اور اس کے نظام میں نظر نہیں آتا۔

اللہ کی وحدانیت کے تصور نے فکری اور تخلیقی قوتوں کو بیدار کیا۔ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امن و آشتی کی ضمانت مہیا کی۔انسانی قوت کردار کو ابھارا۔انسانی مساوات کا تصور پیش کیا۔اس طرح یہ وہ بنیادی نظریہ قرار پاتا ہے جس کے گرد زندگی کے دیگر معاملات گھومتے رہتے ہیں۔اس تصور اور عقیدہ سے انسانوں کے درمیان اتحاد، یک جہتی، مساوات اور کردار کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے جو اسے منفی تہذیبی رویوں سے دور رکھتی ہے۔اگرچہ وحدت کا خیال یونانی، چینی اور ہندو فلسفے میں بھی موجود ہے۔جس کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر جعفر حسین کہتے ہیں۔

> ''پروٹسٹائی فرقوں نے یورپ میں اور برہمو سماجیوں یا آریا سماجیوں نے ہندوستان میں نہ صرف وحدت پر اصرار کیا بلکہ مورتیوں کو عبادت گاہوں سے ہٹا دیا۔مورتیوں کی مخالفت سے نہ صرف مذہبی تخیل میں بلکہ عبادت گاہوں کی فن تعمیر میں سادگی اور سادگی کی بدولت خود بخود پیدا ہونے والا صاف ستھرا پن نمودار ہوا۔''(۷۷)

مگر اس کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام نے جس شدت سے خدائی وحدت کے تخیل کا پرچار کیا وہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔وحدت پر اصرار اسلام نے شرک اور کئی خداؤں کے تصور کو غیر مقبول بنایا اور توحید کے نظریہ کو ایک ایسا اہم مقام عطا کیا جو تہذیبی عمل میں قوت متحرکہ بن گیا۔

اسلامی تہذیب میں انسان عزت اور رتبہ میں برابر ہیں اور مسلمان اللہ تعالیٰ کی نیابت کا اہم ترین فریضہ ادا کرنے کا پابند ہے، کسی کو کسی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں سوائے اس کے کہ کوئی اپنے اچھے اعمال کے باعث خدا کے نزدیک پسندیدہ قرار پائے۔انسان کو اس غرض سے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اپنے رب کی عبودیت کو شعوری طور پر قبول کرے اور اسلام کی اس مابعدالطبیعات پر عمل پیرا ہو جا اسلامی تہذیب کی اساس ہے اور جو دنیا کی دوسری تہذیبوں کی مابعدالطبیعات سے زیادہ قوی، پائیدار اور سائنسی ہے۔

اسلامی تہذیب نے جہاں ہر انسان کو مساوی گردانا ہے وہاں انسان کو عدل و انصاف کی اس قدر سے بھی سرفراز کیا ہے جس میں عدل زندگی کے ہر شعبے میں ہر ایک کے لیے بلا تفریق عورت، مرد، رنگ و نسل، جاہ و مرتبہ اور معیار نجابت و شرافت انسانی معاشرے کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے۔کیونکہ اسلام کے نزدیک وہ تہذیب قائم ہی نہیں رہ سکتی جو عدل و

انصاف میں بھی مساوات کے اصول لاگو نہ کرے۔

توحید، عدل و مساوات اور انسانی مرتبہ کے بعد حصول علم، اسلامی تہذیب کا روشن ترین پہلو ہے۔ کیونکہ علم ایک طرف تو انسانی عمل کی گمراہی کو روکتا ہے دوسری جانب توحید کے فکری پہلو کی اہمیت اور فضیلت بھی اسی سے واضح ہوتی ہے۔ اور انسانوں کے درمیان عدل و مساوات بھی اسی وقت قائم رکھا جا سکتا ہے جب دل و دماغ علم کی روشنی سے منور ہو چکے ہوں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری جانے والی پہلی وحی میں سلسلہ کلام حصول علم پر تاکید سے شروع کیا۔ علم جہاں اسلامی تہذیب کے فروغ کا ذریعہ ہے، وہاں انسان کی تخلیقی اور تجزیاتی فکر کو بلند کرنے کا وسیلہ بھی ہے۔ اس کے حصول سے عصبیت کے جراثیم دامن گیر نہیں ہوتے۔ زندگی کے مسائل کی جانب متوازن اور معقول رویہ اختیار کرنے کی بنیاد پڑتی ہے۔ مظاہر فطرت کا بغور مشاہدہ کرنے، قوانین فطرت کی ریاضت اور جانچ پڑتال کی ترغیب پیدا ہوتی ہے۔

اخلاق حسنہ بھی اسلامی تہذیب میں انتہائی اہمیت کے حامل ہیں، کیونکہ انسان اس وقت تک اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہو سکتا جب تک وہ ان خلاقی اقدار کو نہ اپنائے جو خیر، نیکی، پاکیزگی اور احسان کا باعث ہوں۔ کیونکہ یہ اخلاق حسنہ ہی ہیں جو کسی تہذیبی نظام، انسان کے معاشرتی رویوں میں وہ قوت پیدا کرتے ہیں جو اس تہذیب کے مطلوب و مقصود کی طرف اسے لے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں:

> ''اسلامی ثقافت کی غایت اس دنیا اور آخرت میں حسنہ کا پانا اور اپنے اللہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) کی دید و رضا یا احسان و رضوان کی نعمتِ عظمیٰ حاصل کرنا ہے۔'' (۷۸)

اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہر مسلمان کو نہ صرف خود نیک بننا چاہیے بلکہ دوسروں کو بھی نیکی کی تعلیم دیتے رہنا چاہیے۔ تاکہ عمل صالح کا سلسلہ اطراف و جوانب میں اسی طرح جاری رہے کہ اس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہونے پائے۔

تہذیب معتقدات، اختیاری اور ارادی تخلیقی افعال کا نتیجہ ہوتی ہے اس لیے اس مقصدیت کا ہونا لازمی ہے۔ اسلامی تہذیب زندہ، متحرک اور ارتقائی نظام ہے۔ اس لیے اس کا مقصد ایسے انسان پیدا کرنا ہے جنھیں قرآن مجید نے صدیقین، صالحین اور شہدا قرار دیا ہے۔ اسلامی تہذیب کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے قاضی جاوید کہتے ہیں:

> ''اسلامی تعلیمات کا منتہائے مقصود ایک عادلانہ سماج کی تشکیل ہے جس میں انسان کے ہاتھوں انسان کے سماجی، معاشی، مذہبی، سیاسی اور انفرادی استحصال کا خاتمہ ہو جائے گا۔'' (۷۹)

اس مقام پر یہ نکتہ انتہائی اہم اور حافظہ میں محفوظ کیے جانے کے قابل ہے کہ اسلامی تہذیب صدیقین، صالحین اور شہدا تو پیدا کر سکتی ہے لیکن انبیا علیہ السلام پیدا نہیں کر سکتی، کیونکہ پیغمبر کسی تہذیب کے بانی تو ہو سکتے ہیں کوئی تہذیب انھیں

پیدا نہیں کر سکتی ۔انبیا کا انتخاب ۔ان کی پیدائش کے وقت اور مقام کا تعین رب کائنات کرتا ہے ۔دین کی بنیاد ہمیشہ ایک شخص رکھتا جسے نبی یا رسول کہتے ہیں اور اس تہذیب کی بانی وہی شخصیت ہوتی ہے جو اس دین کی بنیاد رکھتی ہے۔اس اصول کی صداقت کو جانچنے کے لیے اگر اسلام کو پیش نظر رکھ کر یہ دیکھا جائے کہ اسلامی تہذیب کیسے وجود میں آئی ؟ تو تاریخ ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر سب سے پہلے مسجد کی تعمیر کی ۔اسے مسلمانوں کی تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا۔اسی تہذیب کی بنیاد قرآن مجید کے اعلا اصولوں پر رکھی ۔اس پورے تہذیبی نظام نے واضح کیا کہ اسلام کی تہذیب کا منبع قرآن ہے اس کا ماڈل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہے۔

اسلامی عقائد کے مطابق نبوت کا سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جاری نہیں لہٰذا اسلامی تہذیب آخری الہامی، مکمل، مثالی اور سائنسی تہذیب ہے جو اس سے پہلے اور بعد کی تہذیبوں سے اس لیے بہترین کہ ان تہذیبوں نے اسلامی تہذیب کے چند اجزا کو تو اپنے معاشرتی نظام میں کسی نہ کسی طور جاری رکھا تھا مگر مکمل طور پر اس کے تمام نظام وانتظام کے تحت نہیں اپنایا تھا۔اسلامی تہذیب کے فروغ کے لیے نظام صلوٰۃ وزکوٰۃ ،نظام روزہ وحج اور نظام مساجد قائم کیا گیا جو اس تہذیب کے اصولوں کو نافذ کرتا ہے ۔اسلامی تہذیب کا پورا نظام فطرت اور عقل کے مطابق کارفرما رہتا ہے بشرطیکہ اسے اس کے تمام سیاق وسباق کے ساتھ اپنایا جائے ۔اسلامی تہذیب کا نظام اپنے بنیادی فکری نظریے،عقائد اور اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے جب آگے بڑھتا ہے تو کسی سماج کو مکمل طور پر نیست ونابود نہیں کرتا۔ردوقبول کے ذریعے صرف ان عناصر کی بیخ کنی کرتا ہے جو اسلامی تہذیب کے ان اعلیٰ مقاصد سے ٹکراتے ہیں اور اسلامی افکار سے متصادم ہوتے ہیں ۔لہٰذا اسلام جب عرب سے نکلا تو اس نے ایران ، روم، مصر، اسپین، برصغیر اور دوسرے خطوں کی تہذیبوں کو مٹایا نہیں ، بلکہ ان میں مزید آرائش و تزئین پیدا کی ۔اس سے بڑھ کر یہ بنیادی کام کیا کہ نظریہ اور فکر کی وحدت قائم کی ۔ پروفیسر محمد عثمان اس باب میں لکھتے ہیں:

> ’’تصورات کا جو سرمایہ اس میدان میں مسلمانوں نے بہم پہنچایا، جدید عہد سے پہلے وہ سرمایہ اسلامی ثقافت کے سوا کسی اور کو نصیب نہ تھا۔‘‘(۸۰)

اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ اسلامی تہذیب نے ہر جگہ سماجی زندگی کو اس طرح تبدیل کیا کہ اس کے عالمین مشرق ومغرب، شمال وجنوب میں ایک لباس، ایک وضع قطع، ایک زبان، ایک جیسے رسم ورواج پر عمل پیرا ہو گئے ۔ایک جیسے علوم وفنون کو ترقی دی ۔ایک ہی جیسی خوراک اور غذا کو اپنایا۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلامی تہذیب نے ان تہذیبوں کو نظریہ توحید، تصور مساوات انسانی، نبوت پر ایمان، اعمال کی جواب دہی، یوم سزا و جزا پر ایمان، اور انسانی عدل وانصاف کے اصولوں سے اس طرح مالا مال کیا کہ جو قدریں ان اصولوں سے ٹکراتی تھیں وہ از خود خارج ہو گئیں اور وہ تمام اقدار، روایات، رسم ورواج اور تہذیبی عناصر جو اسلام سے متصادم نہیں تھے انھیں نہ صرف برقرار رکھا بلکہ انھیں اختیار کر لیا اور جہاں ضرورت محسوس کی ترمیم

واضافہ سے کام لیا۔ڈاکٹر وحید قریشی اپنی کتاب پاکستانی قومیت کی تشکیل نو میں اس پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''وہ جہاں بھی گئے بس گئے۔ان مقامات اوران علاقوں کواپنا وطن سمجھا بلکہ واپسی کے مکانات کو خارج کرنے کے لیے اپنی کشتیاں جلادیں۔جغرافیائی حدود کی یہ نفی مقامی عناصر کے انجذاب کا باعث ہوئی۔انھوں نے ہر علاقے کی روایات، ہر علاقے کی زبان، رسم ورواج اور سماجی زندگی کے جملہ مظاہر کو اختیار کیا۔ اس طرح جس ملک میں بھی گئے۔اس کی تمدنی زندگی، مادی حقائق اور زبان وبیان کی جملہ روایات کو بھی اپنا لیا۔''(۸۱)

اس لیے عرب، مصر، ایران، انڈونیشیا، برصغیر پاک وہند وغیرہ میں اسلامی تہذیب کی موجودگی کے باوجود سب کی انفرادیت برقرار ہے اوران کی الگ الگ شناخت کی جاسکتی ہے۔اسلامی تہذیب نے اپنے نظام فکر سے لے کر اپنی قوت متحرکہ اور فعالیت سے ہر اس خطہ کو نوازا جہاں یہ پہنچا اور جہاں اس کے عاملین نے اس تہذیبی نظام کو اس کی روح کے ساتھ قبول کیا۔یہی وجہ ہے کہ ایک ہزار برس تک اس تہذیب کے انسانی اخلاق وعمل کو مرتب کر کے اسے بہترین انسان کے مرتبہ تک پہنچادیا۔باہمی یک جہتی، اخوت ومحبت ایک دوسرے کے لیے ایثار وقربانی کے ثمرات معاشرہ میں ہر سطح تک بلاتفریق پہنچے۔جس سے تحفظ جان ومال وملکیت کا اقتدار قائم ہوا۔عدل وانصاف سب کے لیے یکساں اور آسان ہوا۔رسم ورواج اور روایات میں فکری تبدیلیاں واقع ہوئیں۔علوم وفنون میں نئی نئی راہیں کھلیں، سائنس اور تحقیقی عمل میں نئے باب کا اضافہ ہوا۔وہ فنون جو اس تہذیب کے منظر پر آنے سے پہلے لہو ولہب سمجھے جاتے تھے، فکری بلندی، اخلاقی نکھار اور راحت و اطمینان فراہم کرنے لگے۔مگر جب بعد میں اس کے عاملین نے دوسری تہذیبوں سے مرعوب ہو کر اپنے تہذیبی نظام کو ترک کرنا شروع کیا تو اس تہذیب کے اثرات بھی کم ہوتے چلے گئے۔مگر یہ نکتہ اپنی جگہ بے حد اہم رہا کہ اسلامی تہذیب اور اس کی اقدار کبھی تبدیل نہیں ہوئیں البتہ اس کے عاملین کے رویے میں ضرور تبدیلی آئی، اور جب ایسا ہوا تو اس کے فوائد سے بھی انہی کو محروم ہونا پڑا۔

گنگا جمنی (ہنداسلامی) تہذیب:

سندھ میں محمد بن قاسم کی فتوحات سے قبل بھی برصغیر میں مسلمانوں کی آمد ورفت جاری تھی اور یہ سلسلہ مسلمانوں نے ہی شروع نہیں کیا تھا بلکہ تجارتی مقاصد کے لیے اسلام سے پہلے بھی عرب ہندوستان آتے رہتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی اس خطے سے تجارتی تعلقات میں انھیں بڑے فوائد تھے۔قاضی جاوید اس کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہزاروں سال قبل ہند اور عرب کے درمیان تجارتی تعلقات قائم ہوگئے تھے۔عرب جہاز ران ہند کی

مختلف بندرگاہوں سے ہوتے ہوئے اس کے پورے ساحل کا چکر لگا کر سری لنکا، برما اور چین کی بندرگاہوں تک جایا کرتے تھے۔"(۸۲)

مسلمان بھی عربوں کی تقلید میں یہاں آتے رہے۔محمد بن قاسم اور اس کے بعد محمود غزنوی کی فتوحات صرف فاتحین کی کامرانیوں کی داستانیں نہیں بلکہ ہندوستان میں ایک نئی تہذیب اس کے نظام کی بھی آمد تھی۔ان فتوحات نے بے شمار مقامی باشندوں کو حلقہ اسلام میں شامل کر دیا، کیونکہ اسلامی تہذیب جس فکر اور جن اقدار کو لے کر آئی تھی وہ یہاں پہلے سے موجود تہذیب کے مقابلے میں ہمہ گیر، زندگی سے قریب تر اور یہاں کی آبادی کے خوابوں کی تعبیر تھی جو مسلسل ظلم کی چکی میں پستی چلی آ رہی تھی۔اسلامی تہذیب نے یہاں کی موجودہ تہذیب پر جہاں اپنے مثبت اثرات مرتب کیے وہاں مقامی تہذیب سے بہت کچھ حاصل کر کے ردوقبول کے ذریعے اپنے دامن کو بھی وسعت دی۔اس ردوقبول کے ذریعہ ایک ایسی تہذیب برصغیر میں ابھری جس پر اسلامی تہذیب کی چھاپ تو تھی مگر یہ عرب، شام، مصر اور ایران کی اسلامی تہذیب سے اس طرح مختلف تھی کہ اس میں برصغیر کی مخصوص فضا بھی موجود تھی۔یہی تہذیب ہندو مسلم، ہند اسلامی اور گنگا جمنی تہذیب کے ناموں سے جانی پہچانی جاتی ہے۔بنیادی طور پر یہ تہذیب اسلامی تہذیب ہی تھی کیونکہ اسلامی اساسی نظریہ فکر اور اقدار ان عناصر پر غالب رہیں کو مقامی تہذیب سے اس میں داخل ہوئی تھیں۔مگر یہ غلبہ اس وقت نسبتاً کمزور ہو گیا جب بنیادی اصولوں سے انحراف کر کے ایسی صورتیں بھی اس تہذیب کا حصہ بنانے کی کوششیں کی گئیں جو اسلامی تہذیب کے بنیادی اصولوں سے متصادم تھیں۔اسلامی تہذیب نے اس خطہ میں داخل ہو کر مکمل طور پر توڑ پھوڑ نہیں کی بلکہ اپنے فکری نظام کے ذریعے یہاں کی معاشرتی زندگی میں اس طرح نظم پیدا کیا کہ وہ اپنے ماضی سے لاتعلق ہو کر نہ رہ جائے۔وہ تمام رسم و رواج اور تہذیبی اقدار جو اسلامی نظریے کے خلاف نہیں تھیں انھیں برقرار رکھا۔نظریاتی سطح پر توحید، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت، یوم آخرت، الہامی کتابوں، پیغمبروں اور فرشتوں پر ایمان لانے، عبادات پر عمل پیرا ہونے، معاشرتی عدل وانصاف، شرف انسانیت کے بنیادی اصولوں کو زندگی میں نافذ کرنے کا درس دیا۔ہندو تہذیب اور مذہب میں متضاد عقائد اور اقدار کو جذب کرنے کی اتنی بڑی صلاحیت ہے کہ اسلام سے پہلے آنے والی تہذیبیں اور مذاہب ہندو تہذیب اور مذہب میں جذب ہو کر ختم ہو گئیں لیکن مسلم تہذیب نے اپنے وجود کو اس طرح منوایا کہ ہندو مذہب میں اسلامی عقائد کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ایسے بہت سے مفکرین اور تحریکیں سامنے آئیں جنھوں نے اسلامی نظریے اور تہذیب سے متاثر ہو کر وحدانیت کے تصور کو اجاگر کیا۔ڈاکٹر تاراچند کی تحقیق تمدن ہند پر اسلامی اثرات کے مترجم محمد مسعود احمد ترجمہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"انمالور، شنکر، رام نج (۱۰۰۶ء) نمبارک، مادھو (۱۱۹۹ء-۱۲۷۸ء) وشنوسوامی، پلائے لوک اچاریہ اور

ویدانت ویسک۔ان لوگوں نے بھگتی کا پرچار کیا۔ان کے نظریات اور انداز فکر اسلام کے مرہون منت نظر آتے ہیں (۔۔۔) لنگا یتوں اور سدھاریوں پر بھی اسلام اثر انداز ہوا۔لنگا یتوں کا خدا کے متعلق یہ تصور ہے کہ وہ مطلق اور غیر مرئی نور ہے۔ان کے ہاں ذات پات کی تفریق بھی نہیں ،اور ازدواجی زندگی میں لڑکی کی اجازت اور مرضی ضروری ہے۔خاوند کو طلاق کی اجازت ہے۔بیواؤں کے ساتھ حسن سلوک کیا جاتا ہے اور مردوں کو دفن کیا جاتا ہے۔''(۸۳)

اسی کے تسلسل میں رامانند (جو رامانج کا چیلا تھا)،تلسی داس، رامانند کے چیلوں ،اننتا،نند کبیر، بھاوانند، شوکھا،سرسورا، پدماوتی،نرہری،رائے داس، دھنا،سین اور سرسورا کی بیوی نے اپنے گرو کے اس مشن کو آگے بڑھایا۔انھوں نے ایک ایسے مذہب کی طرح ڈالنے کی کوشش کی جو ہندو،مسلمان اور دوسرے مذاہب کے لیے قابل قبول ہو۔مغل بادشاہ اکبر کا دین الٰہی بھی ایسی ہی تحریک تھی اور یہ سلسلہ گرونانک تک جاری رہا۔بنیادی طور پر سب اسلام کے نظریہ حیات اور تہذیبی اقدار سے متاثر ہوکر ان کوششوں میں مصروف تھے۔مگر بعد میں ان سب کی کاوشیں الگ الگ عقائد کی شکل اختیار کر گئیں اور پھر یا تو ہندومت میں ضم ہوگئیں یا پھر ختم ہوگئیں مگر اسلامی تہذیب نے ایک خاص وقت تک اپنے تشخص کو الگ ہی رکھا۔ارشد کریم سید لکھتے ہیں:

''مسلمان پہلے آنے والے آبادکاروں سے مختلف تھے۔مسلمانوں سے پہلے جو قومیں آئیں وہ سب ہندو مذہب میں جذب ہوگئیں ،لیکن مسلمان اپنے ساتھ ایک نیا مذہب 'اسلام' کے نام سے اور ایک نئی تہذیب جو اسلام کے ہی اصولوں پر مبنی تھی لے کر آئے جو ہندو مذہب سے مختلف تھی۔چنانچہ ہندو مذہب مسلمانوں کو اندر جذب نہ کرسکا۔''(۸۴)

دوسری جانب رفتہ رفتہ مسلمانوں نے بھی یہاں کی تہذیب کے بہت سے اثرات قبول کر لیے۔مگر اسلامی تہذیب ہر اعتبار سے زیادہ قوی تھی،لہٰذا اس نے مقامی تہذیب کو دیا تو بہت کچھ مگر لیا نسبتاً کم ہے۔سید محمد تقی اس بارے میں کہتے ہیں:

''کھانے پینے ،رہنے سہنے،آرائش وزیبائش ،لباس وطعام،تعمیرات وحرب وضرب،کھیل کود،علوم و فنون،غرض زندگی اور حیات کے بہت سے پہلو ہندوستان کی قدیم تہذیب میں موجود نہ تھے۔نو وارد تمدن ہی نے پرانے باشندوں کو ان سے متعارف کرایا۔''(۸۵)

لباس میں شلوار،غرارہ،شرارہ وغیرہ مسلمانوں نے متعارف کرائے ،کیونکہ ہندو تہذیب میں ان سلے کپڑے پہننے کا رواج تھا۔ہندو گوشت خور زیادہ نہیں تھے ،مسلمان چونکہ گوشت خور تھے اس لیے انھوں نے بریانی، سیخ کباب اور اس طرح کے کھانوں کو متعارف کرایا۔تعمیرات میں گنبد اور مینار بھی مسلمان اپنے ساتھ لائے تھے۔

ہندو مسلم تہذیب کے فروغ میں مسلمان اولیاء کرام اور صوفی حضرات نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔وہ اپنی اپنی

ولایت میں جہاں کہیں پہنچے اپنی تعلیمات، اپنی موسیقی، اپنی زبان، اپنی خطاطی، اپنی شاعری اور دیگر فنون بھی ساتھ لے گئے جس نے وہاں کی آبادی پر گہرے تہذیبی اثرات مرتب ہوئے۔ مسلمان چونکہ مختلف ممالک سے آئے تھے اس لیے وہ اپنے ساتھ ان ممالک کے تہذیبی اثرات بھی ساتھ لائے، عرب، ایران، ترکی اور افغانستان وغیرہ کے مقامی تہذیبی اثرات نے برصغیر کی مسلم تہذیب میں پہلے ہی ایک رنگارنگی پیدا کر دی تھی۔ دوسری جانب رفتہ رفتہ مسلمانوں نے بھی ہندوستانی تہذیب کے کچھ اثرات قبول کیے۔ کئی ایسی چیزیں اپنی تہذیب میں داخل کر لیں جو اسلامی فکر اور نظریے سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ جس سے مسلمانوں کی اپنی تہذیبی زندگی میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ مذہب اور اخلاق میں گمراہ کن عقائد اور نظریات داخل ہو گئے، مسلمان تعلیم سے بیگانہ ہو گئے اور جدید علوم وفنوں سے بیزاری کا اظہار کرنے لگے۔ ایسے رسم ورواج اپنا لیے جو دینی، اخلاقی، اقتصادی اور ثقافتی اعتبار سے بہت ہی زیادہ نقصان دہ تھے۔ ذات پات کی تفریق، چھوت چھات کے اثرات سے مسلمانوں میں ذاتیں اور برادریاں بن گئیں۔ دوسری قوموں سے تعلقات کو برا سمجھا جانے لگا۔ رواداری ختم ہو گئی۔ اس کی جگہ تعصب نے لے لی۔ عورتوں کو کمتر سمجھ کر انھیں حقوق سے محروم کیا جانے لگا۔ اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کر کے رسم ورواج کو ہی اصل اسلامی تعلیمات سمجھا جانے لگا۔ شادی بیاہ، خوشی اور غم کی تقریبات میں ایسے قواعد وضوابط اختیار کر لیے گئے جن میں ہندوانہ اقدار شامل تھیں۔ نذر نیاز، قبر پرستی، تعویز گنڈے وغیرہ اسی ہندوانہ ثقافت کی دین ہیں۔ غرض ان دونوں ثقافتوں کی آمیزش سے ایک ایسا ملغوبہ تیار ہوا جو نہ مکمل اسلامی تھا نہ مکمل ہندوانہ۔ جو آج بھی اس خطے کے ہندو اور مسلمانوں میں پسندیدہ ہے۔ ہندو مسلم تہذیب نے مسلمانوں اور برصغیر پر جو عنایات کیں ان کا نقطہ عروج اردو زبان ہے۔

مغربی تہذیب:

مسلمان چونکہ گرم ملکوں سے آئے تھے، اس لیے ہندوستان کی سرزمین پر انھیں وہی مشرقیت ملی جو ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ اس لیے مسلمانوں کے آنے سے بھی ہندوستان کی مشرقیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لیکن انگریز یورپ سے آئے تھے جو ٹھنڈے ملکوں پر مشتمل تھا، ان کی تہذیب یکسر مختلف تھی، اس تہذیب میں مادی پہلو زندگی کا سب سے بڑا سچ تھا۔ اب ایک نئی تہذیب، یعنی مغربی تہذیب بھی ہندوستان مزاج میں شامل ہونے جا رہی تھی۔

یورپ کے ملکوں سے ہندوستان کا سابقہ ۱۴۹۸ء سے شروع ہوتا ہے جب کہ واسکوڈ گاما نے راس امید کے پاس سے گزرنے والا بحری راستہ دریافت کیا۔ اس سے پہلے ہندوستان اور یورپ کے ملکوں میں عرب وشام کے ذریعے تجارت ہوتی رہتی تھی مگر براہ راست کسی قسم کے تعلقات نہیں تھے۔ صرف یونانیوں سے عہد قدیم میں ہندوستان کو دوبارہ واسطہ پڑا۔ ایک دارائے اعظم کے زمانے میں جب ہندوستان کا شمال مغربی حصہ اور یونانیوں کا ایشیائے کوچک کی نوآبادیاں

دونوں ایرانی سلطنت میں شامل تھیں، دوسرے سکندر اعظم کے حملے کے بعد جب کہ یونانی سردار کچھ عرصے تک ہندوستان کے ایک حصہ پر حکومت کرتے رہے۔ مگر یہ تعلق اتنے دن رہا اور اس نے دونوں ملکوں کی تہذیبی زندگی پر اتنا کم اثر ڈالا کہ ہم اسے نظر انداز کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان اور یورپ کے تعلقات کا آغاز پندرھویں صدی عیسوی سے ہوا۔ اس وقت سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک پرتگال، ڈنمارک، ہالینڈ، فرانس اور انگلستان کے تاجروں کی سیاسی اور تجارتی جدوجہد ہندوستان میں جاری رہی۔ مگر اس کے بعد رفتہ رفتہ اور سب قومیں ایک ایک کر کے سامنے سے ہٹ گئیں اور انگریزوں کے لیے میدان صاف ہوگیا۔ انھوں نے نہ صرف ہندوستان کی بحری تجارت پر پورا قبضہ کرلیا بلکہ ہندوستان کے انتشار اور بدامنی سے فائدہ اٹھا کر بڑے بڑے علاقوں پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ مگر جہاں تک تہذیبی زندگی کا تعلق ہے اٹھارھویں صدی کے آخر تک وہ خود ہی ہندوستان سے متاثر ہوتے رہے۔ اپنا کوئی اثر ہندوستان پر ڈالنے کی نہ ان میں اہلیت تھی اور نہ انھیں کوئی فکر تھی۔ ۱۷۷۳ء یعنی جب سے کہ برطانوی پارلیمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی نگرانی اپنے ہاتھوں میں لی اور بہتر دل و دماغ کے انگریز کمپنی کی سول سروس میں آنے لگے مغربی تہذیب کے ذہنی اور مادی پہلوؤں کے اثرات ہندوستان پر پڑنے لگے۔ لیکن ایک تو ان کا دائرہ محدود تھا اور پھر اس محدود دائرے میں بھی وہ عام ہندوستانی زندگی میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ کر سکے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب سارے ملک پر چھا گئی اور اس نے ہندوستانیوں کی ساری تہذیبی زندگی کو درہم برہم کر دیا۔ مغربی تہذیب کے وہ پہلو جو خاص اس سے کا خاصہ تھے، ہندوستانی تہذیب جو گنگا جمنی تہذیب میں ڈھل چکی تھی پر بھی اثر ہوئے۔ ان اثرات میں مغربی مزاج کا ایک خاص حصہ ہے۔ انھیں دیکھیں تو کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔

۱۔ مغربی تہذیب میں مذہب فرد کا ذاتی معاملہ تھا۔ یونان اور روما دونوں کی حیات اجتماعی کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ ریاست پر قائم ہوئی جو جماعت کی قوت ارادی کا مظہر ہے۔ یورپ میں عیسائی کلیسا کو جو اختیارات تھے، آہستہ آہستہ ریاست نے انھیں محدود کر کے مذہب کو نجی معاملہ بنا دیا۔ اس سے تجربے، مشاہدے اور عقل کی وہ قوتیں جو مذہب کے تابع تھیں، آزاد ہوگئیں۔ اب اجتماعی زندگی کا مرکز ریاست تھی۔ مذہب کو انفرادی چیز سمجھ کر سیاست سے الگ کر دیا گیا۔ فرد کو مذہبی اور ذہنی آزادی اور ایک حد تک سیاسی آزادی دی گئی۔ علم کی بنا عقل اور تجربے پر رکھی گئی اور اس کا مقصد تسخیر فطرت اور مادی تمدن کو ترقی دینا تھا۔

۲۔ مغرب سرد ممالک پر مشتمل ہے، اس لیے لوگ جہاں جفاکش ہوتے ہیں وہاں بہت چست اور چوکس بھی ہوتے ہیں۔ موسم کی سختی کی وجہ سے ان میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ انھیں اپنی زندگی کو

قائم رکھنے اور آرام دہ بنانے کے لیے فطرت کی قوتوں سے سخت کش مکش کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے اس کے تصورِ حیات میں عمل کو فکر و احساس سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ فکر و احساس کا وہ امتزاج، فطرت سے ہم آہنگ ہونے کا وہ شعور جس سے قدیم ہند کا مذہبی فلسفہ وجود میں آیا، اہلِ یورپ میں موجود نہیں تھا۔ ان کے یہاں تو جذبات اور خیالات دونوں کو عمل اور ارادے کا تابع ہونا پڑا۔

۳۔ انگلستان میں ہر طرح کے جانور کثرت سے تھے اور کسی زمانے میں درندے بھی بہت تھے اس لیے شکار انگریزوں کا خاص مشغلہ رہا اور اس نے ان کی سیرت پر بہت اثر ڈالا۔ اس نے ان کے اندر جفاکشی، عزم و احتیاط، صبر اور وہ مخصوص چیز پیدا کر دی جو ان کی اصطلاح میں 'اسپورٹس مینس سپرٹ' شکاری یا کھلاڑی کی آن کہلاتی ہے۔ یعنی جب تک کامیابی کی خفیف سی امید باقی ہو حریف کو دل و جان سے پچھاڑنے کی کوشش کرنا۔ لیکن جب ناکامی کا یقین ہو جائے تو کھلم کھلا ہار مان لینا اور اسے پر وقار سکون کے ساتھ برداشت کرنا۔ اس کے لیے جو ہمت، دلیری، اخلاقی جرأت اور ضبط درکار ہے وہ انگریز قوم میں بدرجۂ اتم موجود تھا، خصوصاً ضبط کے معاملے میں تو دنیا کی کوئی قوم انگریزوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن اس ضبط میں ان کی جسمانی اور اخلاقی مضبوطی کے علاوہ ان کی ذہنی اور جذباتی سستی کو بھی بہت دخل تھا۔ اور شمالی قوموں کی طرح ان میں بھی تخیل کی کمی تھی اور ان کے احساس کی رو قلب کی گہرائی میں خاموشی اور آہستگی سے بہتی تھی۔ وہ ہر محرک کا اثر دیر میں قبول کرتے تھے اور یہ اثر خواہ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو دیکھنے والے کو خفیف معلوم ہوتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انھیں قدرتی طور پر اپنے جذبات پر قابو حاصل تھا اور ان کے لیے قول و فعل میں ضبط سے کام لینا آسان تھا۔ اس ضبط کا اظہار سب سے زیادہ طنز و مزاح کے ذریعے سے ہوتا ہے جو انگریز قوم اور اس کے ادب کی نہایت نمایاں خصوصیات سمجھی جاتی تھیں۔ انگریزوں کا طنز عموماً بات کو بڑھا کر یا گھٹا کر کہنے پر مشتمل ہوتا۔ جہاں دوسرے اپنی تکلیفوں اور مصیبتوں پر جھنجھلاتے یا روتے ہیں وہاں انگریز عام طور پر اپنے غم و غصے کو طنز کے پردے میں چھپا کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذمت کے موقع پر وہ مبالغہ آمیز تعریف سے اور تعریف کے موقع پر بہت ہی خفیف اظہارِ ناپسندی سے کام لیتے۔ خصوصاً اپنی صفات اور کارناموں کے بیان کرنے میں انگریز کا حجاب، تامل اور طنز آمیز انکسار مشہور ہے۔ غرض ان کے طنز کا مقصد عموماً دوسروں پر حملہ کرنا نہیں بلکہ اپنے جذبات پر پردہ ڈالنا ہوتا تھا۔ اور اگر کبھی اسے آلۂ حرب کے طور پر استعمال بھی کرتے تو نفرت کے زہر میں بجھا کر نہیں بلکہ مزاح کے چھینٹوں سے ٹھنڈا کر کے۔ مزاح کا بھی سب سے اہم مصرف انگریزوں کے یہاں یہی تھا کہ جو چیز ناگوار ہے اس کے مضحک پہلو کو نمایاں کر کے تلخی اور مایوسی کے جذبات کو دھیما کیا جائے۔ دوسرا کام اس سے یہ لیا جاتا تھا کہ جو شخص فکر و عمل کے بندھے ٹکے راستے یا اخلاق و معاشرت کے رسمی معیار سے انحراف کرے، خواہ وہ مجنون ہو یا حکیم

،مجرم ہو یا مصلح، اسے تضحیک کی زنجیر میں جکڑ کر پھر پرانی ڈگر پر لانے کی کوشش کی جائے۔غرض انگریزوں کا ضبط اپنی بہترین شکل میں حکیمانہ اعتدال اور درویشانہ صبر، اور بدترین شکل میں دہقانی جمود اور بے حسی کو ظاہر کرتا تھا۔

۴۔انگریزوں کی بنیادی صفات میں روایت پرستی موجود تھی۔الگ تھلگ جزیرہ ہونے کی وجہ سے اور باقی تہذیبوں سے دور رہنے کی وجہ سے ان میں فرد کا اپنی تنہائی کو اہم سمجھنا، اور اپنی پرائیویسی پر زور دینا۔مشرق میں فرد معاشرے میں گھل مل جانا پسند کرتا ہے اور مجلسی زندگی پسند کرتا ہے۔دیکھا جائے تو ایک لحاظ سے مغرب کی زندگی جو عمل سے مملو ہے اسے دہقانیت سے مشابہ قرار دے سکتے ہیں۔اس روایت پرستی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کی ریاست کا کوئی دستور اساسی لکھا ہوا موجود نہیں تھا بلکہ محض روایات کی شکل میں تھا اور یوں بھی امور عامہ کی تنظیم کے لیے تحریری ضوابط بہت کم تھے۔زیادہ تر رواج عام اور روایات قدیم کی پابندی کی جاتی تھی۔اور ان بن لکھے قوانین کا انگریز دل سے احترام کرتے تھے۔دہقانیوں کی طرح وہ مذہبی اصول، اخلاقی ضوابط، معاشرتی رواج اور خاندانی دستور میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے سب کو یکساں واجب التعمیل سمجھتے تھے۔ان کی کم آمیزی، دیر آشنائی، اجنبیوں سے وحشت، ان کا یہ خیال تھا کہ ان کی ریاست دنیا کی واحد ریاست اور ان کی تہذیب دنیا کی واحد تہذیب ہے اور ان کا تصور حیات وہ معیار ہے جس پر ساری دنیا کو پرکھنا چاہیے۔ان چیزوں نے ان میں ایک خاص طرح کی تنگ نظری اور خود پسندی پیدا کر دی تھی۔

۵۔انگریزوں کا سپاہیانہ اصول یہ تھا کہ حریف غالب سے عزت کا اور برابر والے سے انصاف کا برتاؤ کرنا اور جب وہ ہتھیار ڈال دے تو اس کے ساتھ حقارت آمیز رحم کے ساتھ پیش آنا۔گویا ان کی نظر میں طاقت حق تھی۔عہد وسطی میں انگلستان کا ضابطہ اخلاق بھی دیگر یورپی ممالک کی طرح طبقہ امراء تک محدود تھا۔وہ ایک دوسرے سے حالت امن اور حالت جنگ میں ہمیشہ شریفانہ اور منصفانہ برتاؤ کرتے تھے لیکن نچلے طبقوں کو اس برتاؤ کا مستحق نہیں جانتے تھے بلکہ ان کے مقابلے میں طاقت کو حق سمجھا جاتا تھا۔عہد جدید میں رفتہ رفتہ قومی اتحاد کے احساس نے طبقہ واری احساس کو کسی قدر کمزور کر دیا اور قوم کا ہر فرد قانونی اور اخلاقی حیثیت سے مساوی قرار دیا گیا۔جہاں تک بیرونی اقوام کا تعلق تھا، دیگر یورپی قوموں سے جو انگریزوں سے گورے رنگ کی مشابہت رکھتی تھیں، شرافت اور انصاف کے سلوک کی مستحق سمجھی جاتی تھی مگر ایشیا اور افریقہ کی قومیں جن کا رنگ کالا تھا، ان کے دوسرا معیار تھا۔کمزور قومیں نیم مہذب یا غیر مہذب کہلاتی تھیں اور ان کے ساتھ سختی یا ذلت کا برتاؤ ہوتا تھا۔لیکن جو قومیں تلوار کے زور سے اپنا مہذب ہونا منوا لیتیں وہ عزت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔گویا انگریز صرف طاقت کو حق سمجھتا تھا۔

۶۔انگریزی تہذیب میں نرمی، لوچ اور شائستگی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، اس کی وجہ بھی جذبات پر قابو تھا۔

۷۔معاشی پہلو کے حوالے سے دیکھا جائے تو ٹھنڈے ملکوں میں غذا کی وہ کثرت اور فراوانی نہیں ہوتی جو گرم ممالک میں ہوتی ہے۔انگریز قوم نے چونکہ زراعت کے متبادل کے طور پر صنعت میں زیادہ ترقی کی اس لیے جہاز رانی اور دیگر صنعتوں کے فروغ اور معاشی ترقی نے انھیں خام مال کی تلاش میں نوآبادیات کی تلاش پر سرگرم کیا۔جس نے نہ صرف جہاز رانی کی صنعت کو فروغ دیا بلکہ بحری قزاقوں کے بڑے بڑے کارناموں پر ابھارااور اپنی قومی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور حریفوں سے ٹکر لینے کا حوصلہ دیا۔روایتی بے حسی نے انھیں دیگر اقوام کو غلام بنا کر تجارت کرنے کے لیے بھی کسی اخلاقی معیار کو سامنے نہ رکھنے دیا۔عیسوی مذہب کو انھوں نے ترک نہیں کیا مگر اس سے ان کو قلبی تعلق نہ رہا۔مادیت پرستی میں اب ان کا مطمح نظر اب محض دیندار تاجر ہونا نہیں تھا بلکہ برطانوی قوم کو آزاد،مہذب اور خوش حال بنانا تھا۔اس کی سیادت روئے زمین پر قائم کرنا،اس کی تہذیب کو اور اس کے مخصوص جمہوری اداروں کو پھیلانا۔اس تحریک نے جو انگلستان کے اندر جمہوری قومیت اور باہر برطانوی سامراج کے روپ میں ظاہر کیا۔

ہندوستان میں جب تک وہ تاجر رہے تب تک ہندوستانی تہذیب انگریزی تہذیب کے اثرات سے محفوظ رہی ،لیکن جب انگریز حکمران ہوا تو اس نے برصغیر کی تہذیب میں تبدیلیاں لانا شروع کیں۔انگریزی زبان پہلے ذریعہ تعلیم اور پھر سرکاری زبان بنادی گئی۔مشرقی تعلیم پائے ہوئے لوگوں پر روزی اور عزت کے دروازے بند ہونے لگے۔جیسے جیسے انگریزی حکومت کا دائرہ پھیلتا گیا اور یہ پالیسی نئے نئے علاقوں میں نافذ ہوتی گئی ان لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی جو اپنی ملکی تہذیب اور تعلیم کی کساد بازاری اور اپنی کس مپرسی کی وجہ سے انگریزی حکومت سے بیزار تھے۔بڑھتی ہوئی سیاسی شورش کو دبانے کے لیے ہندوستانیوں کو جمہوریت اور آزادی کی اصلیت کی بجائے اس کی پرچھائیوں سے مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی۔برصغیر کا ادب زبانی ادب تھا،غزل گو،مرثیہ گو،داستان گو وغیرہ اس زبانی ادب میں مجمع بازی کا ڈر تھا اس لیے متبادل کے طور پر انگریزی طرز کا وہ ادب روشناس کروایا گیا جو صرف فردِ واحد کے مطالعہ تک محدود تھا،پریس نے جہاں انگریزوں کی ذاتی ضرورتوں کو پورا کیا،جیسے عیسائیت کی تبلیغ میں معاون ثابت ہوا وہاں اس کے سیاسی پہلو یعنی مجمع بازی سے بھی فائدہ اٹھایا گیا،گو اس کے دیگر علمی و ادبی فوائد سے یکسر انکار کرنا ممکن نہیں،لیکن انگریزی تہذیب میں مقصدیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

اختیار کامل انگریزوں نے اپنے پاس رکھا،نچلی سطح پر صرف ان لوگوں کو شریک اقتدار کیا گیا جن کی وفاداری پر انگریزوں کو یقین کامل تھا۔

مغربی تہذیب چونکہ مادیت کی تہذیب تھی اس لیے مادی وسائل ریل،تار وغیرہ کو ملک میں پھیلایا گیا جس سے

ہندوستانیوں کے دل میں حیرت اور تعریف کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔لیکن وہ ابھی تک اپنی پرانی تہذیب سے مطمئن تھے۔ان کو یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کا سیاسی انحطاط دراصل ذہنی اور اخلاقی انحطاط کا نتیجہ ہے۔ان کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں، ان کے ادب اور فنون لطیفہ میں حقیقت کی روح کم اور تصنع کا رنگ زیادہ تھا۔اور مجموعی طور پر ان کی تہذیب اس قدر جامد ہوگئی تھی کہ اس میں نشو ونما پانے کی اور اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق کرنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔وہ مغربی تہذیب سے اس لیے دور بھاگتے تھے کہ انھیں معلوم تھا کہ مغربی تہذیب کے نمائندے یا تو نفع کمانے والے تھے جو ان کی آزادی اور دولت چھیننا چاہتے تھے یا عیسائی مبلغ جو ان کی عزیز ترین ملک یعنی مذہب کے درپے تھے۔

انگریزی تسلط نے بالآخر ہندوستانیوں کو ذہنی طور پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔اس کی ایک وجہ تو ہندوؤں کی تاجر ذہنیت تھی جو انگریزوں کی تاجر ذہنیت سے مماثل تھی، اور دوسرے ہندوؤں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ نیا حاکم کون ہے، ان کے لیے غلامی کا دور ابھی ویسا ہی تھا جیسا مسلمانوں کے زمانے میں تھا۔اس دور میں مشکل وقت مسلمانوں کے لیے تھا جنھیں ایک طرف اپنی حکومت کے خاتمے کا صدمہ تھا اور دوسرے طرف اپنا مذہب بھی خطرے کا شکار ہوتا دکھائی دے رہا تھا، عیسائی مبلغین کو بزور بازو روکنا مسلمانوں کے بس کی بات نہیں تھی کہ انھیں انگریز حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی۔مسلمانوں میں وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مصالحت کی کوششوں میں سرسید کا حصہ نمایاں ہے۔اب یہ نئی تہذیب جو اپنی قدیم تہذیب سے انحراف یا مصلحت آمیز تھی، مکمل طور پر انگریزی یا مغربی تہذیب نہ تھی بلکہ اس تہذیب کا چربہ تھی۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ جس چیز کو ہدف بنایا گیا تھا، وہ تعلیم تھی، نئی تعلیمی اور تہذیبی تحریک ہندوستانی تہذیب کی تحریک سے جسے اکبر نے شروع کیا تھا اس امر میں مشابہت رکھتی تھی کہ اس کی تہہ میں بھی سیاسی مقصد تھا اور اس کا مرکز بھی ریاست کو قرار دیا گیا تھا۔اکبر کی طرح انگریز بھی یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں سیاسی وحدت پیدا کریں یعنی ہر فرقے اور طبقے کے لوگوں کو ایک ریاست کی وفادار رعایا بنا کر اتحاد کے رشتے میں مربوط کر دیں۔انھوں نے بھی اس کے لیے یہ ضوری سمجھا کہ مشترک تعلیم کے ذریعے ملک کے اونچے اور متوسط طبقوں کو ایک مشترک تہذیب کے رنگ میں رنگ دیں۔قدیم مسلم تعلیم میں مسجد مکتب تھا یا ہندو ودیا شالا، اسے ختم کر کے انگریزی نظام تعلیم مسلط کر دیا گیا، جس میں مفت کی جگہ فیس کا نظام متعارف کروایا گیا۔مسلمان چونکہ یہاں آ کر بس گئے تھے اس لیے انھوں نے ہندوستان کو اپنا ملک سمجھا جبکہ انگریز صرف اسے اپنی نوآبادیات بنا کر رکھنا چاہتا تھا اس لیے جیسے مسلمان اہل کمال، علماء، فضلاء، فلسفی اور فن کار یہاں آ کر آباد ہوئے تھے، ایسی کوئی کوشش انگریزوں نے نہیں کی۔انگریزوں کے لیے ایک دور افتادہ کالونی، ناموافق آب و ہوا، اور ناآشنا آبادی میں کوئی کشش نہیں تھی۔

ہندوستان میں انگریزی تہذیب اس طرح گھل مل نہیں سکی جیسے اسلامی تہذیب گھل مل گئی تھی، اس لیے یہاں انگریزی تہذیب کا فروغ اہل فن کے ہاتھوں نہیں بلکہ اتائیوں یعنی سرکاری اور غیر سرکاری انگریزوں کے ہاتھ سے ہوئی جو وضع قطع، معاشرت اور خیالات میں انگلستان کے باسی فیشنوں کی بری بھلی نقل سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح جو تہذیب وجود میں آئی اس کو مغربی یا ولائتی تہذیب کے مقابلے میں دساوری تہذیب کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ انگریزوں کو بھی یہاں کی عوام کی تربیت کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ صرف یہاں کے مادی وسائل سمیٹنے میں مصروف تھے۔ ایسے میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کی تہذیب کو ان کی زندگی میں مجسم دیکھنے کی کوشش کی تو انھیں دور سے صرف اس کی ظاہری اور سطحی چیزیں ہی نظر آئیں یعنی ان کی وضع اور لباس، ان کے رہنے سہنے کا طرز ان کا اکل کھرا پن، ان کی مادیت پرستی، ان کی مذہبی تشکیک، اور انہی چیزوں کے حاصل کرنے میں وہ اپنی ساری کوششیں صرف کرتے رہے۔ انگریزی سیرت کی بنیادی صفات یعنی سازگاری، خودداری، ضبط، ارادے کی مضبوطی، اخلاقی جرأت، کھلاڑی کی آن، 'جنٹلمین' کی شان اور اس کے علاوہ وہ عہد جدید کی خصوصیات جو انگریزوں اور یورپ کی دوسری قوموں میں مشترک تھیں یعنی علمی تحقیق کی روح، زندگی کی بنیاد عقل اور تجربے پر رکھنا، تسخیر فطرت کے ذریعے زندگی کو خوشگوار بنانا۔

انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان کی اجتماعی اور تہذیبی زندگی کا محور شاہی دربار تھا۔ نظم ونسق، عدل وانصاف اور وضع قانون کے علاوہ سماجی اصلاح، اخلاقی احتساب، خیرات وحسنات، علم وحکمت اور فنون لطیفہ کی سرپرستی، صنعت و دستکاری، طرز معاشرت اور وضع ولباس کا تعین غرض کہ کل تہذیبی وظائف بادشاہ کی قیادت میں انجام پاتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ریاست جس کا مظہر بادشاہ تھا صرف سیاسی ادارے کی حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ ایک مکمل تہذیبی ادارے کی۔ اس ریاست کا مرکز ثقل ملک کے اندر تھا اور اس کا مقصد ملک کی فلاح و بہبود۔ اب جو ریاست انگریزوں نے ہندوستان میں قائم کی وہ ہر اعتبار سے ہندوستان کی روائتی ریاست سے مختلف تھی۔ حقیقت میں وہ ریاست نہیں بلکہ ایک ماتحت حکومت تھی جو اقتدار اعلا سے محروم تھی۔ یہ اقتدار برائے نام بادشاہ برطانیہ مگر دراصل برطانوی قوم کو حاصل تھا اور اس کی نمائندہ جماعت برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے اسے استعمال کیا جاتا تھا۔ مقنّنہ، عاملہ اور عدالت کے وظائف پارلیمنٹ کی نگرانی میں وائسرائے اور سول سروس کے ارکان ادا کرتے تھے۔ جو ابتدا میں سب کے سب بدیسی تھے۔ یہ بدیسی اپنے آپ کو نسلی اور تہذیبی حیثیت سے دیسیوں سے برتر سمجھتے تھے اور اس برتری کا ہر ممکن طریقے سے اظہار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ دیسی کا لفظ ہی ایک حقارت کا کلمہ بن گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں حاکم ومحکوم میں وہ ذہنی اور روحانی قرب نہیں پیدا ہو سکتا تھا جس کے بغیر اچھی ریاست اور اچھی حکومت کا وجود میں آنا محال ہے۔

مغربی تہذیب کی جو چیزیں یہاں کی تہذیب میں شامل ہوئیں ان میں سیاسی شعور، معاشی ترقی ،صنعتیں ، بنک ، تحقیق کا نیا طریق، زراعت کا محکمہ ،نہری نظام ،زرعی فارم،مویشیوں کی افزائش نسل کے فارم ، وغیرہ شامل ہیں ۔گویا سیاست اور معیشت کے میدان میں دساوری انگریزی تہذیب نے ہندوستانی تہذیب کو عہد جدید کے رجحانوں سے آشنا کردیا۔انگریزی تہذیب نئے مسلمانوں کے نقوش مٹانے کے لیے فارسی کو پس پشت ڈالا تو اس کی جگہ اردو کوفروغ حاصل ہوا۔اگر انگریزی تہذیب حقیقی معنوں میں رائج ہو جاتی تو گنگا جمنی تہذیب کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملتا۔انگریزی تہذیب کی البتہ کچھ خوبیاں جو اس تہذیب میں سرایت کر گئیں ان میں حقیقت نگاری، عالمی ادب سے دلچسپی وغیرہ شامل ہیں۔اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہندوستان، ہندوستان سے ذہنی طور پر نکل کر عالمی گاؤں میں آ گیا۔(۸۶)

(ج) نوآبادیات: تصورات ونظریات

اردو ادبی اردو لغت میں نوآباد اور نوآبادی کے مفاہیم

نوآباد: (ف ۔ص) نیا آباد کیا ہوا۔

نوآبادی: (ا،مث) وہ بستی جو نئی بسی ہو،محکوم ملک ۔(۸۷)

فیروزسنز انسائیکلو پیڈیا میں زیادہ تفصیل ملتی ہے۔

نوآبادی (colony) غیر ملکیوں کی کسی بیرونی اور نسبتاً غیر آباد ملک میں آبادکاری جہاں وہ اپنے خوردونوش اور رہائش کا معقول بندوبست کرلیں اور اپنے اصلی ملک سے تعلقات منقطع نہ کریں ۔تاریخ میں سب سے پہلے فونیشیا اور یونان کے باشندوں نے بحیرۂ روم کے اردگرد اپنی نوآبادیات قائم کیں ۔موجودہ اقوام نے سترھویں صدی میں نوآبادیات کا سلسلہ شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں انگلستان ،فرانس، ہالینڈ ،بلجیم، ہسپانیہ،اور پرتگال کی نوآبادیات کا ایک جال دنیا کے مختلف مقامات پر بچھ گیا۔(۸۸)

انگریزی لغات میں اس پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔نوآبادیات کا عمل صدیوں کی تاریخ پر محیط ہے۔انگریزی میں نوآبادیات Colonialism کو کہتے ہیں۔اس لفظ کی وضاحت انگریزی کی مشہور لغت *Longman* میں ان لفظوں میں کی گئی ہے:

i.Control by one power over a dependent area of people.

ii.A policy advocating or based on such control.(۸۹)

اس تعریف کے مطابق محض کسی محکوم قوم یا رقبے پر اقتدار کو نوآبادیات کہتے ہیں جو عام حکومتی عمل سے کسی طرح بھی

منفرد نہ ہے۔لیکن اس تعریف میں استعماری طرز حکومت یا قبضے کو دیگر قبضوں سے الگ پہچاننا بھی ناممکن ہے۔معروف انگریزی لغت *Oxford English Dictionary* نے Colonialism کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے:

> "A settlement in a new covntry, a body of people who settle in a new locality, forming a community subject to or connected with their parent state; the community so formed, consisting of their original settlers and their descendants and successors, as long as the connection with the parent state is kept up."(۹۰)

یہ تعریف تو طویل بھی ہے لیکن دلچسپ بھی ہے اس میں مرکزی ریاست کی بنیادی حیثیت پہ زور دیا گیا ہے۔اس تعریف کے مطابق مختلف آبادکار جب کسی نئی زمین کو آباد کریں لیکن اُن کا تعلق آبائی ریاست سے برقرار رہے تو یہ نوآبادیات ہے۔اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ تعریف میں نوآبادیات گان (Colonized) کا ذکر گول کر دیا گیا ہے اور تعریف Parent State کے نوآبادکاریوں کو ہی مرکز بنا دیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ تعریف محض یورپی آبادکاری کے عمل کو ہی سامنے لاتی ہے۔یہ عمل کیسے ممکن ہوا اور اتنا عرصہ کیسے برقرار رہا اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ایک ادب کی ماہر "Gina Wisker" نوآبادیات کے بارے میں کچھ یوں رائے دیتی ہے:

> "Colonialism means the settlement of people and so the colonization of lands by powers from other, vsually economically richer, more powerful lands."(۹۱)

اب تک جتنی بھی تعاریف بیان کی گئیں ہیں وہ زیادہ تر یورپی آبادکاری کو نوآبادکاری قرار دیتی ہے۔اس عمل کو اگر دیکھا جائے تو اس میں عمل پیرا مغربی یورپ کے بیشتر ملک شریک تھے۔خصوصاً وہ ممالک جن کے پاس بحری طاقت بہت زیادہ تھی جن کا اولین مقاصد سمندری راستوں کی تلاش اور تجارت کے واسطے نئی منڈیوں تک رسائی حاصل کرنا تھا۔جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے گئے اور قبضہ گروپ میں بدلتے گئے۔یہ قبضہ کسی ایک خطے میں نہیں کیا گیا اور نہ ہی اِن لوگوں کا ٹاکرا کسی ایک قوم یا قبیلے سے ہوا۔اُنہوں نے ہر طرح کے لوگوں کو قابو کرنے کے لئے اپنی حکمت علمی کو تبدیل کرتے رہے۔یہی حکمت عملیاں اور حربے اصل میں اُس غیر فطری قبضے کو پانچ صدیوں تک برقرار رکھا۔

پس منظر:

اگر ہم انسانی فطرت میں نوآبادکاری پہ غور کریں تو انسان کی اولین تہذیبی مصروفیات کی ابتدائی حالتوں کا جائزہ لینا

چاہیئے۔انسان نے سب سے پہلے اپنی بقا کو محفوظ کرنے کی طرف توجہ دی جس مین پہلے پہل خوراک پہ زور دیا۔ یہ انسان تب آزادانہ ازدواجی تعلقات میں بندھے ہوئے تھے۔اور بچوں کی تربیت سارے گروہ پہ لاگو تھی۔ ہزاروں سالوں میں مختلف اوقات کے تین برفانی ادوار نے وسائل سے انسان کو دور کر دیا تھا اور انسانی بقاء کے لئے نئی مہارتوں کی ضرورت تھی۔جسکی وجہ سے انسان میں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔اور حصول بقاء کے لئے اِن گروہوں کا اتحاد بھی مجبوری بن گیا۔

مطلب کہ انسان کا علیحدگی میں اپنا بہت مشکل ہے۔اب جب مختلف گروہ آپس میں ملے اور اتحاد ہوئے تو سب سے ضروری ان گروہ کے درمیان نظم ونسق کو برقرار رکھنا تھا جس کے واسطے طاقتور سردار کا ہونا لازمی تھا جو قبلہ کے نظم ونسق اور خوراک کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ جب رفتہ رفتہ اس قبیلے کے سردار اور بزرگ مرنے لگے تو آنے والے نئے سردار اور رعایا نے بزرگوں کی روحوں کی پرستش کرنا شروع کر دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ گروہ،قبائل،قوموں،ملکوں اور معاشروں میں بدل گئے۔ بادشاہت،غلامی،مذہب،سیاست، معاشرت،ثقافت،معیشت اور مختلف اداروں پہ مشتمل ابتدائی شکلیں بننے لگیں۔ باہمی تعاون ضابطوں اور قوانین کے تحت پہلی سلطنت حمورابی معرض وجود میں آئی اور پھر مختلف قدیم تہذیبوں نے ظہور کے بعد تجارت کو فرید فروغ دیا۔اور اس طرح طاقتور اور تجارتی ذہن کا پھیلاؤ ہوا اور نوآبادیاتی سوچ جو کہ قدیم تھی اور فرق کئے۔

سومیر اور بابل کے بیوپاریوں نے (اس دور کے) اِن خطرات کی پرواہ نہ کی اور اناطولیہ،سندھ،کنعان،مصر اور ایران مختصر یہ کہ اس وقت کی پوری مہذب دنیا کا استحصال کرتے رہے۔خام مال کی خریداری اور مصنوعات کی فروخت اِن کا بنیادی مقصد ہوتا تھا۔دنیا کی اہم تجارتی منڈیوں میں ان کی نوآبادیاں قائم تھیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاشرہ منظم ہوتا گیا اور عسکری ادارے بھی تنظیمی مراحل طے کرنے لگے۔ پوری تاریخ انسانی میں طاقت کے بل بوتے پہ قبضہ کا عمل جاری وساری رہا۔اہرام مصر کی تعمیر کی خاطر فرعونوں نے کئی قوموں کو پامال کیا اور اپنا مقصد پورا کیا۔آریا قوم جنوبی ایشیاء اور ایران،ترکی کے علاوہ یورپ میں بھی بار بار آئے۔دورِانسانی میں ہر طاقت ورقوم کمزوروں پہ حاوی رہی ہے۔اس کی ایک بہت بڑی مثال اسپارٹا اور ایتھنز کی ہے۔اسپارٹا نے ایتھنز پہ اس کی تجارتی حیثیت دیکھتے ہوئے قبضہ کیا تھا،تب ہی یونانی تہذیب کی جڑیں مضبوط ہوئی تھیں۔اعلیٰ دماغ لوگ بھی اسی تہذیب نے پیدا کئے۔جدید فلسفے کی بنیاد بھی یونان نے ہی رکھی۔تب تک دیومالاؤں اور دیوتاؤں کی دھرتی کنعان میں یہودیوں نے چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں کو قائم کر لیا ہوا تھا۔یہودیوں میں حق حکمرانی کا تصور ابھرا کیوں کہ یہودیوں کا خدا جنگ اور طاقت کا خدا تھا۔انھوں نے عام لوگوں کا استحصال کرنا شروع کر دیا،عیسائیوں نے اُن کی جگہ لینے کی کوشش کی لیکن جلد ہی

عیسائیت رومتہ الکبریٰ کے ایوانوں تک پہنچ گئی اور انہی حاکمیت قائم کی۔

یونانی تہذیب میں خلا پیدا ہو گیا۔ جسے روم کی شہری ریاست نے سکندرِ اعظم کی وفات کے بعد پُر کیا۔ روم کی سلطنت نے بھی پھلنا پھولنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ رومن سلطنت اپنے عہد کی سب سے بڑی نوآبادیاتی طاقت بن گئی۔ قدیم ترین جاگیرداری سماج کلیسا جس کا تعلق مغرب سے تھا وہ جنگجو اور محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والے تھے۔ محنت کش طبقہ زرعی طبقے سے تھا۔ عیسائیت حضرت عیسیٰؑ کے ایک سو سال بعد رومن تہذیب پہ چھا گئی۔ یہ تہذیب یہودیوں کے ظلم و جبر کے خلاف تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ اپنا مقصد بھول گئے۔ عیسائیت کو اب عربوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا کہ اس قسطنطین نے ٹیکس بہت بڑھا دیا تھا اور غلاموں کی جو کمی پڑ گئی تھی اسے پورا کرنے کے لئے اس نے کسانوں کو غلام بنانے کی کوشش کی۔

غلامی کے تصور کو مسلم عہد میں ختم کر دیا گیا جس کی بنیاد پہ معاشی نظام قائم کیا گیا تھا۔ دنیا کی فتح اور کامیابی کو بھی اتحاد قرار دیا گیا اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنے کا حکم دیا گیا۔ اس فلسفے نے فتح حاصل کرنے کا حوصلہ دیا جس کے ذریعے مسلمانوں نے مضبوط تر ریاستوں پہ بھی فتح حاصل کر لی۔ دورِ خلیفہ میں سب سے زیادہ فتوحات حضرت عمرؓ کے دور میں ہوئیں۔ ان فتوحات سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کی وجہ سے حضرت عمرؓ کے عہد میں خوشحالی بڑھ گئی۔ جنگ جلولا وجدائن میں ایرانیوں کو شکست ہوئی۔ اس جنگ میں ساٹھ ہزار مسلمان سپاہیوں کو فی کس دس ہزار درہم ملے اور مالِ غنیمت لوگوں میں تقسیم کیا گیا:

> ''قصرِ شاہی میں صدیوں سے جمع شدہ دولت، زر و جواہرات ذخیرے اور نہایت ہی قیمتی سامان بطور مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ یہ تمام زر و جواہرات اور تاریخی نوادرات حضرت سعدؓ نے حضرت عمرؓ کے پاس مدینہ منورہ بھجوا دیئے۔'' **(۹۲)**

اب اسلام کی فتوحات کا دور شروع ہوا اور مسلمانوں نے بہت سی مقبوضات میں اضافہ بھی کیا۔ اسلام اور عیسائیت کے رمیان صلیبی جنگوں کا آغاز بھی ہوا اور ان کی وجہ سے تجارت میں کافی فرق پڑا۔

بارہویں اور تیرہویں صدی میں عرب کی طرف سے ہفتہ وار بازار لگتے تھے جو کہ جرمنی، اٹلی اور انگلستان کے میلوں میں لگتے تھے جو رفتہ رفتہ پروان چڑھتے گئے۔ تجارتی دنیا میں انقلاب کرنسی کی ایجاد نے برپا کیا۔ جب تجارتی عمل تیزی سے بڑھنے لگا تو آبادکاری میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ اب انہیں منظّم رکھنے کے لئے انتظامی ڈھانچہ بنایا گیا۔ آہستہ آہستہ تجارتی انجمنیں، عقائد، قوانین، طرزِ معاشرت اور ذاتی تعلقات پروان چڑھنے لگے۔ دیہات زرعی پیداوار جبکہ شہر تجارتی اور صنعتی پیداوار کا مرکز بن گئے۔ تجارت کے بل بوتے پہ بہت سے ملکوں میں صنعت و حرفت میں ترقی ہوئی، بہت سے ملکوں اجارہ داری ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔ جبکہ تجارتی سرمایہ درانہ مفادات نے دنیا میں مختلف نوآبادیاں بنائیں۔

نوآبادیات، جس کا آغاز تجارت سے ہوا جب یورپی قوموں کا ایشاء، افریقہ، امریکہ اور بیشتر حصوں پہ قبضہ تھا۔رفتہ رفتہ تجارت کا یہ عمل آگے بڑھا تو قبضے کی شکل اختیار کر گیا۔انسان تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔لیکن نوآبادیات سلطنت عثمانی یا اندلسی سلطنت کے یورپ پہ قبضے اور فتوحات سکندر سے بالکل مختلف ہے۔یورپی ملکوں نے دنیا کے تقریباً اسی فیصد پی مقبوضات کیں اور زمانی اعتبار سے یہ قبضو پندرھویں صدی سے شروع ہو کر بیسویں صدی تک جا پہنچا۔

> "The overseas empires of western Europe shaped the history of all continents and the people of the world during the half millennium from their origins in the mid fifteenth contury totheir final dissolution in the mid to late tweenth century. The colonial empires of western europe claimed possession at one time or another all of the Americas and Australia, ninety nine persent of polynesia, ninty percent of Africa and nearly fifty percent of Asia."(۹۳)

۱۵۰۰ء میں جدید نوآبادیات کا آغاز ہوا جب یورپی اقوام نے افریقہ اور امریکہ کے لئے نئے سمندری راستے دریافت کئے جس کی وجہ سے صرف بری ہی نہیں بلکہ بحری طاقت بھی حاصل ہوگئی۔اس دور مین بہت سے اقوام کے ساتھ ساتھ فرانسیسی اور انگریز قومیں بھی اُبھری جنہوں نے فتوحات کا نیا دور شروع کر دیا۔یوں پوری دنیا میں فتوحات اور نوآبادت کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔اور مغربی اقوام کو بھی اپنی ثقافت دنیا میں دیکھانے کا موقع ملا۔

''زبان، ادب، ثقافت، علم وحکمت وغیرہ زندگی کا کوئی شعبہ شاید ہی ایسا ہو جس پہ نوآبادیات اثر انداز نہ ہوئی ہو۔ اسی لئے یہ عمل ثقافتی اقتدار کی ایک مثال ہے۔(۹۴)

اس عمل سے دنیا کا بیشتر حصہ متاثر ہوا۔

اگر امریکہ دو یا تین صدی اور دریافت نہ کیا جاتا تو یورپ کے لیے کیا نتیجہ پیدا ہوتا؛ بلاشبہ یورپ کے لیے یہ امر نہایت تکلیف دہ ہوتا۔خصوصاً اس وجہ سے کہ غریب اور ظلم رسیدہ اشخاص جن پر آزادی، حوصلہ مندی اور کام کی راہیں بند تھیں۔اس مصیبت سے نجات نہ پاتے۔عوام کی بہتری اور فلاح نہ ہوتی اور خودساختہ ظل اللہ کے وقار میں فرق نہ آتا۔وہ انگریزی آبادی بھی قائم نہ رہتی جو انقلابِ امریکہ سے پیدا ہوئی، ممکن ہے کہ انقلابِ فرانس رونما ہی نہ ہوتا یا اس کی شکل کچھ اور ہوتی جو تمام زیادتیوں کے باوجود آزادی اور رحم کا علم بردار تھا اور جس نے بلاشبہ تمام یورپ اور نوآبادیوں کے حالات کو نہایت بہتر

بنا دیا۔

امریکہ کے اصلی باشندے جن کو اہل یورپ نے ظلم و ستم کا شکار بنایا۔ ان پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں ان کی تلافی ممکن نہیں۔ شمالی یورپ کی وحشی اقوام سے مغربی سلطنت روما کو تاخت و تاراج ہوئے ایک ہزار برس کا زمانہ گزر چکا ہے اور اس کی جگہ نئی نئی سلطنتیں ظہور پزیر ہو گئی تھیں، لیکن علم جغرافیہ میں کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ مغربی دنیا کا اب تک کوئی نشان نہ تھا اور ہندوستان اور یورپ کے درمیان بحیرۂ قلزم کے راستے تجارت ہوتی تھی۔ پندرھویں صدی کے آغاز سے شاہان کیسٹیل کی طرف سے اول اول بحری دریافتوں کو تحریک کا موقع ملا۔ ان بادشاہوں نے جزائر کنسیری میں فتوحات اور نوآبادیات قائم کر کے بحر اوقیانوس کے جانب غرب دیگر جزائر کی تلاش کا راستہ کھول دیا۔ اس سے سواحل افریقہ کے ساتھ تجارت کو فروغ ہوا اور شہر سیول کو جو شان و عظمت اور دولت حاصل ہوئی اس کا سبب یہ تھا کہ وہ افریقہ کی پیداوار اور غلاموں کی فروخت کے لیے ایک بڑی منڈی بن گیا تھا اور اس لیے سواحلِ اندلس پر بحری مہمات کا غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا تھا۔(۹۵)

نوآبادیاتی تسلط اصل میں جدید سامراجیت کا آغاز تھا، اس سے پہلے یورپ ایک پس ماندہ براعظم تھا۔ معیشت بڑی حد تک خود مکتفی تھی۔ معاشی زندگی جیسے جیسے ترقی کرنے لگی تو باہر کی منڈیوں کی ضرورت میں اضافہ ہوا۔ پہلی صلیبی جنگ (۱۰۹۶ء۔۱۰۹۹ء) کی وجہ سے پہلی مرتبہ یورپ کا مشرق سے ربط قائم ہوا بلکہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ جنگیں لڑی ہی اس لیے گئیں کہ یورپ کے لیے تجارتی منڈیاں حاصل کی جائیں۔ شروع میں یہ تجارت اٹلی کی شہری ریاستوں کے ہاتھ میں رہی۔

اسی زمانے میں ان ملکوں نے بحیرۂ روم کو پار کر کے افریقہ سے بھی تجارتی تعلقات قائم کیے۔ تجارت اور نو آبادیات کی دوڑ میں پرتگال سب سے آگے تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا ملک تھا۔ اس کا سمندری ساحل بہت لمبا تھا اور پڑوس کے علاقوں میں اس کا پھیلنا ممکن نہیں تھا۔ حالات نے اسے مجبور کیا کہ وہ سمندری راستوں سے نئے علاقوں کی تلاش کرے، چنانچہ پہلی منزل میں اس نے افریقہ کے مغربی ساحل کے علاقوں اور جزیروں پر اپنا اثر قائم کرنا شروع کیا۔ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما افریقہ کا چکر کاٹ کر ہندوستان پہنچ گیا اور وہاں سے واپسی پر مسالوں سے ایک جہاز بھر کر لے آیا۔ اس کے بعد سے ہندوستان آنے جانے کا ایک باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا۔

۱۵۰۵ء میں مینویل کی حکومت نے ایک نئی پالیسی کی ابتدا کی۔ اب اس سمندری سفر کا مقصد صرف تجارت ہی نہیں تھا بلکہ فتوحات کو بھی اس کے ساتھ جوڑ لیا گیا۔ ۱۵۰۵ء اور ۱۵۱۵ء کے درمیان مشرقی افریقہ کے ساحل کے بھی کئی علاقے پرتگال کے زیر اثر آئے ہندوستان کے ایک علاقہ دیو پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا اور اس طرح اس نے تجارت کے اس پورے راستہ پر اپنا کنٹرول قائم کر لیا۔ ۱۵۱۰ء میں پرتگالیوں نے گوا پر قبضہ کر لیا جو بعد میں پرتگال کے مشرقی کے مقبوضات کا صدر

مقام بنا دیا گیا۔ اس کے بعد ہی ۱۵۱۱ء میں ملایا میں وہ داخل ہوئے۔ ایران کی بندرگاہ ہرمز پر ان قبضہ ہوگیا اور خلیج فارس پر ان کا کنٹرول قائم ہوگیا۔ فتوحات کا یہ سلسلہ سیام سے ہوتا ہوا چین میں کنیٹن تک جاری رہا۔ کچھ پرتگال جاپان بھی جا پہنچے لیکن جاپانی حکومت نے ان کے قدم نہیں جمنے دیے۔(۹۶)

واسکوڈی گاما کے ہندوستان پہنچنے سے چھ سال پہلے یعنی ۱۴۹۲ء میں کولمبس جزائر بہاما، کیوبا اور ہسپانیولا تک پہنچ چکا تھا جن پر اس نے ہسپانوی حکمرانوں فرڈیننڈ دوم اور آئزابیلا کی حکمرانی کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ سمجھتا تھا کہ کیوبا ہندوستان میں ہے اور اس نے ہسپانیولا کو جاپان تصور کیا تھا۔ کولمبس نے امریکہ تک چار سمندری سفر کیے اور یہ سیاحتیں اسے کئی جزیروں اور موجودہ وینی زویلا کے ساحل وسطی امریکہ اور پناما تک لے گئیں۔ آخری دم تک وہ یہی سمجھتا رہا کہ یہ سب علاقے ایشیا میں ہیں۔ اسی زمانہ میں ہسپانیہ کے کئی باشندوں نے جنوبی امریکہ کے ایک بڑے حصہ کو دریافت کرلیا تھا۔ ان کی دسترس نیاما سے لے کر برازیل تک رہی۔ ان علاقوں میں آباد ہونے کی پہلی کوشش ہسپانیوں نے ہی کی۔ انھوں نے ۱۵۱۲ء تک جزائر غرب الہند پر مکمل قبضہ کرلیا تھا۔ اور بعض جزیروں کو آباد کرنے کی کوشش کی تھی۔

۱۵۱۹ء میں ہسپانوی کیوبا کے راستے میکسیکو میں فاتحانہ داخل ہوئے اور انھیں بے حساب سونا چاندی اور دوسری دولت ہاتھ لگی۔ یہاں سے انھوں نے میکسیکو اور موجودہ شمالی امریکہ کے دوسرے علاقوں میں بھی مہمیں بھجیں۔ چنانچہ ۱۵۵۰ء میں ہسپانیوں نے اس علاقے میں ایک وسیع سلطنت قائم کرلی۔(۹۷)

پرتگال میں ٹارڈی سیلاس میں معاہدے کے تحت اپنی سلطنت کو وسعت دی تھی۔ ۱۵۱۴ء میں پوپ نے فرمان جاری کیا تھا جس کے مطابق دوسرے تمام ملکوں پر یہ پابندی لگا دی گئی تھی کہ پرتگال کے علاقوں میں مداخلت نہ کریں۔ چنانچہ تقریباً سو سال تک پرتگالی مشرق میں بغیر کسی مداخلت کے اپنی تجارت اور دوسرے کاروبار کرتے رہے۔ پرتگالیوں کا اصلی کاروبار تجارت تھا اور تجارتی راستہ پر واقع بندرگاہوں اور قلعوں پر ان کا قبضہ تھا۔ اس لیے ان کے علاقوں کو ابھی سلطنت کا نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ ان کا وائسرائے گووا میں رہتا تھا اور اس کے نائب ایک طرف افریقہ کے مختلف علاقوں میں اور دوسری طرف چین کے جنوب کے جزیرے مکاؤ میں متعین تھے۔ اس کام کے لیے پرتگالی سپاہی بہت کم لائے جاتے تھے۔ زیادہ تر مقامی آبادی سے فوج بھرتی کی جاتی تھی۔ اور مقامی حکمرانوں اور راجواڑوں سے معاہدے کرلیے جاتے تھے۔ یہی طریقہ بعد میں برطانیہ اور فرانس نے بھی اختیار کیا۔ پرتگال کو بحر ہند پر کبھی بھی مکمل اقتدار حاصل نہ ہوسکا، اس لیے کہ اس کے پاس کوئی بڑا بحری بیڑہ نہیں تھا۔

بحر ہند پر مکمل اختیار نہ ہونے کی وجہ سے پرتگال ایک طاقتور اور مال دار ملک نہ بن سکا۔ اس کے علاوہ اس پوری

تجارت اور سرگرمی پر مرکزی کنٹرول نہ تھا۔ ہر جگہ تاجر انفرادی طور پر یا گروہ بنا کر تجارت کرتے اور اپنے لیے دولت اکٹھی کرتے۔

شروع میں پرتگالیوں نے ایشیا کے مقامی باشندوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی لیکن اتنی بڑی آبادی کا مذہب تبدیل کرانا ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ مقامی باشندوں سے مساویانہ سلوک نہیں کرتے تھے۔ انھیں اپنے سے ادنا تصور کرتے تھے اور اس لیے وہ ان کے دلوں میں جگہ نہیں بنا سکے۔ جہاں تک سمندر پار کے مغربی علاقوں کا تعلق ہے، برازیل کے مشرقی ساحل پر پرتگال کا قبضہ تھا، لیکن پرتگالی حکومت نے کافی عرصہ تک اس پر بہت کم توجہ کی البتہ کچھ پرتگالی انفرادی طور پر تجارت کرتے رہے اور بعض آ کر وہاں بس بھی گئے۔

۱۵۸۰ء میں اسپین کے بادشاہ فلپ دوم نے پرتگال کے تخت پر قبضہ کرلیا۔ برائے نام آزاد رہتے ہوئے پرتگال عملاً اسپین کا صوبہ بن گیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر اسپین کی دشمن یورپی سلطنتوں نے پرتگالی سلطنت پر دھاوا بول دیا اور مشرق میں پرتگال کی طاقت کو ختم کر دیا۔

اسپین نے امریکہ میں جو علاقے فتح کیے تھے ان پر تقریباً تین سو سال تک اس کا اقتدار رہا۔ پرتگالیوں کے برعکس ہسپانیہ کی حکومت نے اپنے مقبوضات کا انتظام باقاعدہ، سوچے سمجھے منصوبوں کے تحت چلایا۔ بلکہ آئزابیلا (Isabella) کے دور ہی میں (۱۵۰۴ء) حکومت نے نئی دنیا کے لیے ایک مرکزی تجارتی ادارہ قائم کیا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں دولت اور سونا سرکاری خزانہ میں پہنچتا رہے۔ شروع میں یہ پالیسی کامیاب رہی لیکن چوں کہ اسپین صنعتی طور پر ابھی اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا اس لیے دولت کے عوض مصنوعات وہ کافی مقدار میں نہیں بھیج سکا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تجارتی مقابلہ بڑھنے لگا اور دوسرے ملکوں کا مال چوری چھپے آنے لگا۔

نظم و نسق چلانے کے لیے ان علاقوں میں وائسرائے بھیجے جاتے تھے۔ ہسپانوی بڑی تعداد میں آ کر ان علاقوں میں بسنے لگے۔ مقامی آبادی کو جنھیں انڈین کہا جاتا تھا تقریباً غلام بنا لیا گیا اور چرچ یا حکومت کبھی صورت حال کو بدلنے کی کوشش کرتی بھی تو فرموں اور کمپنیوں کے مالک اس کی سخت مخالفت کرتے اور اکثر بغاوت بھی کر دیتے۔ آہستہ آہستہ یہاں بسے ہوئے ہسپانیوں اور اسپین سے آنے والے حکمرانوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی گئی۔ (۹۸)

امریکہ اور ایشیا کے تجارتی راستوں کی دریافت سے پہلے یورپ ایک غیر ترقی یافتہ براعظم تھا۔ اس کی دنیا محدود تھی۔ افریقہ اور ایشیا سے تجارت کا مرکز صرف بحیرۂ روم تھا، لیکن اس نئی دریافت نے سارے یورپ کی کایا پلٹ دی۔ شروع میں پرتگال کے کچھ لوگوں نے خوب دولت کمائی لیکن ایشیا سے تعیّشات کی جو چیزیں آتی تھیں وہ بہت قیمتی تھیں، لہٰذا پرتگال کا سونا اور چاندی ان ممالک کی طرف جانے لگا اور پرتگال کی معیشت ترقی نہ کر سکی۔

اسپین کی صورت مختلف تھی۔شروع میں امریکہ کے جو علاقے اسپین کے ہاتھ آئے۔وہاں سے کچھ زیادہ دولت ہاتھ نہیں لگی۔لیکن جب ۱۵۲۰ء میں میکسیکو میں اور ۱۵۴۰ء میں بولیویا میں سونے کی کانوں میں کھدائی شروع ہوئی تو بڑی تعداد میں سونا اسپین آنے لگا۔اس کے علاوہ ٹیکسوں سے یافت بھی برابر بڑھتی رہی۔یہ دولت اسپین کی معیشت میں زبردست تبدیلی کا باعث ہوئی۔ملک کے اندر بے حساب سونا اور چاندی جمع ہوگئی،اور باہر سے بڑے پیمانے پر مصنوعات درآمد ہونے لگیں۔اس کا اثر اسپین کی صنعتوں پر بُرا پڑا۔جب دولت جمع ہوئی تو ہسپانوی بادشاہوں کو توسیع سلطنت اور لڑائیوں کے لیے شہ ملی۔سونے اور چاندی کی درآمد نے سارے یورپ کی معیشت میں انقلاب پیدا کر دیا۔اس سے پہلے بھی یورپ میں صنعتیں ترقی کر رہی تھیں اور بنک کاری رواج پا رہی تھی لیکن سونے اور چاندی کی درآمد نے مال کی معیشت کو تیزی سے ختم کر دیا اور زر بنک کاری نے اس کی جگہ لے لی۔تجارتی میدان میں وسطی اور جنوبی یورپ اور خاص طور پر اطالوی ریاستوں کی اجارہ داری ختم ہونے لگی اور ان کی جگہ ہالینڈ،بلجیم اور بالخصوص برطانیہ اور فرانس لینے لگے۔یورپ میں ساری دنیا سے ہر قسم کا مال،چائے،کافی،سوتی کپڑا،تمباکو وغیرہ بڑی مقدار میں آنے لگا۔(۹۹)

جس زمانے میں پرتگالی اور ہسپانوی سلطنتیں یورپ اور ایشیا میں اپنی تجارت بڑھا رہی تھیں اور نوآبادیاں قائم کر رہی تھیں اس وقت یورپ کے دوسرے ممالک اس دوڑ میں شریک نہیں تھے۔اس کی ایک خاص وجہ تھی۔پوری سولہویں صدی میں شمالی یورپ کے ممالک اسپین سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔فرانس مذہبی جنگوں میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔برطانیہ کے شاہی خاندان نے اسی زمانے میں اسپین کے شاہی گھرانے سے ازدواجی رشتہ قائم کیا تھا۔ساتھ ہی پرٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کے مابین کش مکش جاری تھی اور انگلستان اسپین کے خلاف کسی مقابلہ میں شامل ہونا نہیں چاہتا تھا،لیکن یہ رخ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔

انگلستان نے ۱۵۸۸ء میں فلپ دوم بادشاہ اسپین کے بحری بیڑے کو جو انگلستان پر حملہ آور ہوا تھا شکست دی اور اسے کمزور کر دیا۔لیکن اسپین کی طاقت پر کاری ضرب ہالینڈ نے لگائی اور وہ چند ہی سال میں دنیا کی بہت بڑی طاقت بن گیا۔اسے اسپین کے امریکی مقبوضات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔اس کی نظر پرتگال کے مقبوضات اور تجارت پر تھی چنانچہ اس نے چند ہی سال میں پرتگال کی مشرقی تجارت پر قبضہ کر لیا۔اور اس کے بعد (۱۶۲۴ء۔۱۶۵۴ء) برازیل پر حملہ کر دیا۔وہ افریقہ کے پرتگالی مقبوضہ انگولا کے ایک حصہ پر بھی قابض ہو گیا جہاں سے غلام برازیل بھیجے جانے لگے تھے۔

۱۶۰۲ء میں ہالینڈ نے ایک بہت اہم اور دوررس قدم اٹھایا۔ایک کمپنی ''ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے نام سے قائم کی۔اس کمپنی کو نہ صرف بڑے پیمانے پر تجارت کرنے کے حقوق دیے گئے بلکہ اسے یہ بھی اختیار دیا گیا کہ دوسرے ملکوں کے مقامی

راجاؤں اور حکمرانوں سے معاہدہ کرے۔ مقبوضہ بندگاہوں اور قلعوں میں فوجی دستے رکھے۔ اور ان میں گورنر اور جج مقرر کرے۔ کمپنی نے اپنا مرکزی دفتر جاوا میں بنتام کے مقام پر قائم کیا۔ بعد میں اسے جکارتہ میں منتقل کردیا گیا۔ اس کے دو بنیادی مقاصد تھے ایک تو اس علاقہ کی پوری تجارت جو پہلے مقامی باشندوں کے ہاتھ میں تھی اپنے ہاتھ میں لے لے اور دوسرے تمام مدِ مقابل قوموں خاص طور پر پرتگالیوں، انگریزوں، ہسپانیوں وغیرہ کو اس علاقے سے نکال باہر کردے۔ پرتگالیوں کے ساتھ تمام لڑائیوں میں ڈچ کو کامیابی ہوئی اور انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی انھوں نے یہاں سے مار بھگایا۔ اس طرح پورے علاقے کو نہ صرف ڈچ سلطنت کا حصہ بنالیا بلکہ یہاں کی پوری تجارت پر بھی کنٹرول حاصل کرلیا۔ یہ کنٹرول قائم کرنے میں ظلم، زبردستی اور تشدد کا حربہ استعمال کیا گیا۔ ۱۶۲۱ء میں باندہ کے باشندوں نے مزاحمت کی تو ڈھائی ہزار باشندوں کو تہِ تیغ کیا۔ اپنے منافع کی مقدار بڑھانے کے لیے لونگ اور دوسرے مسالوں کی پیداوار پر بھی انھوں نے کنٹرول قائم کیا۔ مولاکاس کے لوگوں نے ان کی مرضی کے خلاف درخت لگائے تو ۶۵ ہزار درخت کٹوا دیے گئے۔

ڈچ سلطنت کا مرکز بٹاوا میں تھا اور چین، جاپان، ہندوستان اور سیلون کا مال یورپ یہیں سے ہو کر جاتا تھا۔ ڈچ کو چین کی تجارت پر کبھی کنٹرال حاصل نہ ہوسکا۔ اس لیے کہ جزیرہ مکاؤ پر پرتگالیوں کا قبضہ تھا۔ ڈچ نے جاوا میں کافی کی کاشت کو بھی رواج دیا اور چند ہی سال میں اس کی کاشت بڑے پیمانے پر ہونے لگی اور اسے جنوبی امریکہ کو بھیجا جانے لگا۔

ڈچ حکمرانوں کے پاس جو علاقے تھے وہ ان کے اغراض کے لیے کافی نہیں تھے۔ انھیں ہمیشہ نئے علاقوں کی تلاش رہتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے نیوزی لینڈ کے بعض حصوں اور تسمانیہ (آسٹریلیا) کا بھی پتہ چلایا۔ بحرالہند میں ماریشس پر قبضہ کیا جو بعد میں فرانسیسیوں اور پھر انگریزوں کے ہاتھوں چلا گیا۔ ہالینڈ سے اس کے مشرقی مقبوضات بہت دور تھے؛ اس لیے راستہ میں اس نے کیپ ٹاؤن (جنوبی افریقہ) پر قبضہ کرلیا اور اسے استعمال کرتا رہا۔ ان مقبوضہ علاقوں میں ڈچ باشندوں نے آبادکاری کی کوئی بڑی کوشش نہیں کی۔ یہاں ان کے افسر، سپاہی، باغوں اور کانوں کے نگران کار اور ان کے خاندان ہی رہتے تھے۔ انھیں صرف یہاں کی قدرتی دولت مثلاً مسالوں اور معدنیات سے ہی دل چسپی تھی۔

مشرق کی طرح مغرب کے لیے بھی ۱۶۲۱ء میں ایک ڈچ ویسٹ انڈیا کمپنی قائم کی گئی۔ جس کی سرگرمیاں جنوبی بحراوقیانوس میں گیانا۔ ویسٹ انڈیز، نیونیدرلینڈ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ کمپنی اتنی کامیاب نہیں تھیں جتنی کمپنی برائے مشرق ہوئی تھی۔ البتہ اس نے شمالی امریکہ کے بعض حصوں میں ڈچ نوآبادیات قائم کیں۔ جو بعد میں انگریزوں کے قبضہ میں چلی گئیں۔ (۱۰۰)

سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں جب یورپ کے ملکوں نے دوسرے ملکوں میں آبادکاری شروع کی اس

وقت ان سب میں فرانس آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک تھا۔سب سے زیادہ مال دار تھا۔اوراس کا بحری بیڑہ سب سے زیادہ طاقت ورتھا۔اس طرح وہ یورپ کا سب سے بڑا سامراجی ملک بن سکتا تھا لیکن ایسا نہ ہوسکا۔اس لیے کہ فرانس یورپ کی سیاست میں بہت زیادہ الجھ گیا۔چنانچہ فرانس کے امکانات انگلستان کے تصرف میں آ گئے۔

۱۵۲۴ء میں فرانس نے آبادکاری کی مہم بہت معمولی طور پر شروع کی۔اورامریکہ،کنیڈا اور جنوبی امریکہ کے کچھ علاقوں میں چھوٹی چھوٹی نوآبادیاں قائم کیں۔اس کے بعد فرانسیسی جنوبی بحراوقیانوس کے کئی جزیروں میں بھی پہنچے۔۱۶۲۴ء تک تقریباً چودہ جزیرے فرانس کے قبضہ میں آ چکے تھے۔اور سات ہزار سے زیادہ سفید فام باشندے یہاں بس چکے تھے۔یہ لوگ زیادہ تر گنے کی کاشت کرتے تھے۔اس دور میں افریقہ سے غلام بھی آنے شروع ہوئے۔(۱۰۱)

اس دور میں جب ہالینڈ جیسے چھوٹے سے ملک کی کمپنی ایشیا سے زرکثیر سمیٹ رہی تھی تو یورپ کا سب سے طاقتور ملک فرانس کیسے چپ رہتا چنانچہ فرانس نے بھی ایک ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۶۲۴ء میں قائم کی اور بحر ہند میں مدغاسکر پر قبضہ کر کے اسے تجارت کا مرکز بنانے کی کوشش کی اور بعد میں قریب کے جزیرے ماریشس پر بھی تصرف کرلیا۔جہاں تک ہندوستان کا تعلق تھا وہاں انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی پہلے ہی اپنا کاروبار شروع کر چکی تھی۔اور پھر یہ اورنگ زیب کی حکمرانی کا دور تھا اس لیے یہاں زیادہ کامیابی ممکن تھی۔صرف پانڈیچری اور چند مقامات پر فرانس کے مرکز قائم ہوسکے۔۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوگیا اوراسی کے ساتھ مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ملک تیزی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹنے لگا۔انگریز اور فرانسیسی دانستہ یہاں کی سیاسیات میں الجھ گئے اوران میں آپس میں بھی ہندوستان پر تصرف کی دوڑ شروع ہوئی۔۱۷۴۰ء تک فرانس کو برتری حاصل ہوگئی۔فرانسیسی گورنر ڈوپلے نے انگریزوں کے اقتدار کے مرکز مدراس پر قبضہ کرلیا۔لیکن لڑائی،دیسی حکمرانوں کے ساتھ سازشوں اوران کی امداد وغیرہ کا خرچ اتنا زیادہ تھا کہ کمپنی کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔فرانسیسی حکومت نے اس مسئلے میں کوئی خاص دل چسپی نہیں لی۔آخرکار فرانس کو انگریزوں کے مقابلے میں میدان سے ہٹنا پڑا۔اس زمانے میں فرانس نے کناڈا کے علاقوں میں،جسے انھوں نے نیوفرانس کا نام دیا،آبادکاری شروع کی اور بڑی تعداد میں فرانسیسی وہاں جاکر بسنے لگے۔وہاں سے انھوں نے مسی سپی اورارکناس کے خطوں میں پھیلنا شروع کیا۔اور خلیج میکسیکو اور لوزیانا کا علاقہ فرانس کے اثر میں آ گیا۔

نئے علاقوں کی کھوج میں انگریز ویسے دوسرے ملکوں سے پیچھے نہیں تھے۔اور ۱۴۹۷ء سے پہلے برسٹل کے کچھ ملاح نیوفاؤنڈ لینڈ پہنچ گئے تھے۔لیکن حقیقی دل چسپی بہت بعد میں شروع ہوئی۔۱۵۸۸ء میں انگریزی بحری بیڑے نے اسپین کے بیڑے کو شکستِ فاش دی اوراسی کے بعد برطانیہ نے امریکہ کا رخ کیا اور وہاں آبادکاری شروع کی۔۱۶۰۰ء میں لندن کے

تاجروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی۔ وہ ایسٹ انڈیز میں ڈچ کمپنی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ ۱۶۱۱ء میں اس نے مسولی پٹنم اور ۱۶۳۹ء میں مدراس حاصل کر لیا۔ ۱۶۱۱ء میں چارلیس دوم کو پرتگالی ملکہ کے جہیز میں بمبئی مل گیا اور اس نے یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا۔ اسی زمانے میں مغل سلطنت کا زوال شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ برطانوی کمپنی نے فرانس اور پرتگال کو میدان سے ہٹا دیا اور وہ اپنے حلقۂ اثر اور مقبوضات کو برابر بڑھاتی رہی۔

انگریز شروع میں ہندوستان سے مسالے درآمد کرتے تھے۔ اور اس کے بعد برطانیہ کے غریب طبقے کے لیے ہندوستان کا سوتی کپڑا بڑی مقدار میں آنے لگا۔ امراء کے لیے اعلا قسم کی ململ اور کم خواب اور جامدانی کی بھی درآمد ہونے لگی۔ چند سال میں سوتی کپڑے کی درآمد اتنی بڑھ گئی کہ انگریزی صنعت کی حفاظت کے لیے ۱۷۲۱ء میں قانون بنانے پڑے۔

اسی دور میں انگریزوں نے مغرب کی طرف بھی رخ کیا اور ویسٹ انڈیز کے کئی جزائر میں وہ آ کر بسنے لگے۔ جن میں ہرموڈا، باربوڈا اس وغیرہ کو اہم مقام حاصل تھا۔ ۱۶۵۵ء میں کرامویل نے ہسپانوی جمائکا پر قبضہ کر لیا اور یہ اس علاقے کی برطانوی نوآبادیوں کا مرکز بن گیا۔ شروع میں یہاں انگریز آتے رہے لیکن بعد میں یورپ کے کئی اور علاقوں میں لوگ آ کر بسنے لگے وہ یہاں کی قدرتی دولت کو استعمال کر کے نفع کماتے تھے۔ ان جزائر کے علاوہ امریکہ میں نہ صرف انگریز بلکہ یورپ کی دوسری قوموں کے لوگ بھی بڑی تعداد میں آنے اور آبادیاں بسانے لگے۔ ۱۷۶۳ء تک امریکہ کی مختلف نوآبادیات کی آبادی تیرہ لاکھ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ ان میں سے تین لاکھ نیگرو تھے۔ جو افریقہ سے غلام بنا کر لائے گئے تھے۔ ان تمام نوآبادیوں کی معیشت بڑی حد تک زراعت پر مبنی تھی۔ ساحلی علاقوں پر جہاز سازی کی صنعت بھی ترقی کر رہی تھی۔

> ''یہ نوآبادیات دراصل یورپی ممالک کو مال دار بنانے کا ایک ذریعہ تھیں۔ یہاں سے زرعی پیداوار اور کچا مال یورپ جاتا اور وہاں سے مصنوعات یہاں درآمد ہوتی تھیں۔'' (۱۰۲)

اٹھارھویں صدی میں ویسٹ انڈیز اور امریکہ میں جب سفید فاموں کی نوآبادیات ترقی کرنے لگی اور گنا، تمبا کو اور دوسری منفعت بخش اشیاء کی کاشت بڑھنے لگی تو اب بڑھتے ہوئے منافع کی شرح باقی رکھنے کے لیے سستے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ پہلے غریب سفید فام لوگوں سے کام چل جاتا تھا۔ پھر مقامی رنگ دار باشندوں کو غلام بنا کر استعمال کیا جانے لگا۔ اس سے بھی کام نہیں چلا تو پھر افریقہ کے باشندے غلام بنا کر یہاں لائے جانے لگے۔ پہلے یہ کام پرتگالیوں نے شروع کیا۔ انھوں نے افریقہ کی اپنی نوآبادیوں سے غلام یہاں لانے شروع کیے۔ زاں بعد انسانوں کے استحصال میں سب ہی شکر یک ہو گئے۔ اور اب یہ تجارت بڑے پیمانے پر ہونے لگی۔

انگریزوں کے بردہ فروشی کی پہلی مہم ۱۵۲۶ء میں جان ہاکنس کی سربراہی میں شروع ہوئی۔ اس نے اپنا ''مال'' یعنی جہاز بھر کے غلام ہسپانوی انڈیز میں بیچے اور پھر آہستہ آہستہ اس کاروبار کے لیے بڑی بڑی کمپنیاں قائم ہو گئیں مثلاً

مرچنٹ ٹریڈنگ ٹو افریقہ (Merchant Trading to Africa) نامی کمپنی جو ۱۷۵۰ء میں قائم ہوئی تھی اس کے ڈائریکٹر لندن، لیور پول، برسٹل وغیرہ میں تھے۔ صرف اس کی برسٹل کی شاخ کے غلاموں کی تجارت کے لیے ۲۳۷ جہاز تھے۔ ۱۷۶۳ء میں ہر سال تقریباً ڈیڑھ سو جہاز لگ بھگ چالیس غلام افریقہ سے ویسٹ انڈیز اور امریکہ لے جاتے تھے۔ صرف جزیرہ جمائکا نے ۱۷۰۰ء اور ۱۷۸۶ء کے درمیان چھ لاکھ سے اوپر غلام خریدے۔ یہ تجارت برسوں جاری رہی اور کبھی کسی نے مخالفت نہیں کی اور کبھی بھی مخالفت ہوئی بھی تو اس لیے کہ کہیں سیاہ فاموں کی آبادی سفید فاموں سے بڑھ نہ جائے۔

۱۶۸۹ء-۱۸۶۳ء کے درمیان برطانیہ اور فرانس میں چار جنگیں ہوئیں۔ اگرچہ یہ یورپ میں ہوئیں لیکن ان کا اثر پورے نوآبادیاتی نظام پر پڑا۔ اسپین بھی ان جنگوں میں شریک تھا۔ کبھی برطانیہ کا حلیف بن کر اور کبھی فرانس کا۔

۱۷۰۱ء سے ۱۷۱۴ء تک اسپین میں تخت کی وراثت کے لیے لڑائی ہوئی۔ جس میں برطانیہ اور فرانس دونوں الجھ گئے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر برطانیہ کے قبضہ میں جبرالٹر آ گیا اور شمالی امریکہ میں نیوفاؤنڈ لینڈ اور فرانسیسی اکاڈیہ پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اسی کے ساتھ اسے اسپینی امریکہ کو غلام مہیا کرنے کا ٹھیکہ بھی مل گیا۔

۱۷۳۹ء تک آسٹریا کے تخت کی جانشینی کے جھگڑے میں اور ملکوں کے ساتھ فرانس اور برطانیہ بھی الجھ گئے اور فرانس اور برطانیہ کی لڑائی کے نتیجہ کے طور پر انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں بندرگاہ مدراس مل گئی۔

فرانس اور انگلستان کے درمیان سات سالہ جنگ میں جو ۱۷۵۴ء تک جاری رہی، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں فرانسیسیوں کو شکست دی۔ اور ۱۷۶۰ء میں پانڈیچری پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۵۷ء میں کلایو کی سرکردگی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے پلاسی کی جنگ میں کامیابی حاصل کی اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کا دور شروع ہو گیا۔

امریکہ اور کینیڈا کی برطانوی و فرانسیسی جنگوں میں انگریزوں کی فتح ہوئی۔ ۱۷۵۹ء اور ۱۷۶۱ء کے درمیان برطانیہ نے فرانس سے لوئس برگ، کیوبک، مانٹریال، ہوانا اور منیلا چھین لیے۔ ۱۷۶۳ء کے پیرس معاہدے کے تحت شمالی امریکہ میں دریائے مسی سپی کے مشرق کا پورا علاقہ انگریزوں کے ہاتھ آیا۔ فرانس کو دریا مسی سپی کا مغربی علاقہ اسپین کے حوالے کرنا پڑا۔ اس طرح یہ دور برطانیہ کی توسیع سلطنت کی مہم میں نہایت اہم ثابت ہوا۔ ایک طرف ہندوستان کی فتح کا دروازہ کھل گیا اور دوسری طرف امریکہ کے بڑے حصہ پر قدم جم گئے اور صرف یہی نہیں بلکہ چلتے چلاتے افریقہ میں سنے گال کا علاقہ بھی اس کے قبضہ میں آ گیا۔ نوآبادیوں کو اس جنگ کے اختتام پر برطانیہ سب سے بڑی نوآبادیاتی طاقت اور سب سے مال دار بیرونی علاقوں کا مالک بن چکا تھا۔ اب اس کے پاس دنیا کا سب سے بڑا بحری بیڑہ بھی تھا۔ جو اس وسیع و عریض سلطنت کی حفاظت کے لیے ضروری تھا۔ (۱۰۳)

شروع میں جب مغربی ملکوں نے ایشیا، افریقہ اور امریکہ میں جو نوآبادیاں قائم کیں تو اس وقت نوآبادیوں کے ساتھ ان کے معاشی تعلقات بہت ابتدائی نوعیت کے رہے۔ ان نوآبادیوں اور مقبوضات سے یورپی ممالک زیادہ تر مسالے، چائے، کافی وغیرہ درآمد کرتے تھے۔ لیکن ۱۷۶۰ء کے بعد جب یورپ میں صنعتی انقلاب آیا اور صنعتیں قائم ہونے لگیں تو اس نوآبادیاتی پالیسی میں بنیادی تبدیلی آئی۔ مغربی ممالک اپنی نوآبادیوں سے زرعی پیداوار درآمد کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کی مشین کی بنی ہوئی چیزیں، ان علاقوں میں برآمد کرنے لگے اور جیسے جیسے صنعتی ترقی میں تیزی آئی صنعتی مال کی نکاسی کے لیے منڈیوں کی تلاش بھی تیز ہوگئی۔ اسی کے ساتھ ان صنعتی ممالک کو اپنی نوآبادیات سے مسالوں اور غلاموں کی درآمد سے اتنی دل چسپی نہیں رہی بلکہ وہ اب اپنی صنعتوں کے لیے کچا مال مثلاً روئی، اون، جوٹ، تیل والے بیج اور رنگ وغیرہ درآمد کرنا چاہتے تھے۔ تجارت کی نوعیت میں اس بنیادی تبدیلی کا اثر پوری نوآبادیاتی پالیسی پر پڑا۔ چنانچہ ان نوآبادیات کی معیشت صنعتی ملکوں کی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش شروع ہوگئی اور اس نے ساری دنیا کے سماجی ڈھانچے میں زبردست تبدیلی پیدا کردی۔ یورپ کے صنعتی انقلاب سے پہلے نوآبادیات میں یورپی ممالک کی پالیسی یہ تھی کہ:

۱۔ ایسے علاقوں پر قبضہ کرنا جہاں سے انھیں کچی دھاتوں (چاندی، سونا وغیرہ) غلام اور زرعی پیداوار وافر مقدار میں مل سکتی ہو۔

۲۔ شمالی امریکہ کے ساحلوں پر سفید باشندوں کی نوآبادیاں قائم کرنا۔

۳۔ تجارتی راستہ پر واقع اہم مقامات پر قبضہ کرنا۔ وہاں قلعے تعمیر کرنا اور ان میں فوجی دستے متعین کرنا تاکہ ان تجارتی راستوں کی دوسرے ملکوں سے حفاظت کی جاسکے۔

اس پالیسی کا اثر ظاہر ہے کہ دوسرے ملکوں پر کافی پڑا۔ اور یہاں کی دولت سمٹ کر یورپ جانے لگی لیکن اس کی وجہ سے ان نوآبادیاتی یا مقبوضہ ملکوں کی معاشی یا سماجی زندگی بنیادی طور پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ایشیا اور افریقہ کے ان ممالک میں سماج کی بنیاد چھوٹے چھوٹے دیہات پر تھی جو زرعی اور صنعتی پیداوار میں خود مکتفی تھے۔ اور یہاں باہر کے مال کی کھپت کے لیے بہت ہی کم گنجائش تھی۔

یورپ کی صنعتی ترقی کے بعد جب اسے اپنے صنعتی مال کی برآمد کے لیے منڈی کی ضرورت پیش آئی تو مقبوضات (Colonies) کا معاشی ڈھانچہ اس بات کے لیے ناموزوں ثابت ہوا۔ اپنے مال کی نکاسی اور ان نوآبادیات سے منافع حاصل کرنے کے لیے پورے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی لازمی تھی۔ چنانچہ یورپ کے ان صنعتی ملکوں نے ایشیا اور افریقہ کے اپنے مقبوضات میں چند بنیادی تبدیلیاں کیں۔ مثلاً زمین کی ملکیت کے پورے نظام کو بدل ڈالا۔ جہاں زمین پر ذاتی

ملکیت کا طریقہ رائج نہیں تھا وہاں کسانوں اور زمینداروں اور جاگیرداروں کا طبقہ پیدا کیا۔ اس کے علاوہ سفید فام نوآباد کاروں نے زمینوں کے بڑے بڑے قطعوں پر قبضہ کر کے چائے، ربر، سیسم وغیرہ کے باغات لگانے شروع کیے۔ اس کے علاوہ ان باغات اور بڑے زرعی فارموں وغیرہ میں کام کرنے کے لیے کم اجرت کے مزدوروں کی ایک فوج جبراً تیار کی۔ افریقہ میں تو ان کی حیثیت بالکل غلاموں کی سی تھی۔ مقامی صنعتوں کو دبایا اور تباہ کیا گیا اور کچھ صنعتی پیداوار برآمد کی گئی۔ سکہ اور ٹیکس کا ایک نظام قائم کیا گیا تاکہ زر کا چلن بڑھے اور صنعتی ملکوں کے مال کے لیے منڈی قائم ہو سکے۔

اس نئی نوآبادیاتی پالیسی پر کس طرح عمل کیا گیا اس کی بہترین مثال ہندوستان ہے۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے صدیوں سے ہندوستان سوتی کپڑا دوسرے ملکوں کو بھیجا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ہندوستان سے کپڑے کی درآمد کو روکنے کے لیے انگلستان میں زبردست درآمدی ٹیکس لگائے گئے تھے۔ لیکن انگریزی راج قائم ہونے کے بعد انیسویں صدی کے وسط تک نہ صرف ہندوستان کے کپڑے کی برآمد ختم ہو چکی تھی بلکہ برطانیہ کے کپڑے کی برآمد کا ایک چوتھائی حصہ ہندوستان آتا تھا۔

سماجی اور معاشی نظام میں اس وقت تک ایسی بنیادی تبدیلی نہیں کی جا سکتی تھی جب تک پورا سیاسی ڈھانچہ نہ بدل جائے اور مقامی آبادی میں سے زمینداروں، جاگیرداروں، سرکاری افسروں اور فوج کا ایک ایسا طبقہ نہ پیدا کر دیا جاتا جس کا مفاد بیرونی حکمرانوں کے ساتھ وابستہ ہو۔

ان نوآبادیوں اور محکوم ملکوں سے جب دولت سمٹ کر صنعتی ملکوں میں آنے لگی تو صنعتی ترقی میں بھی کافی تیزی آ گئی۔ اب نئی منڈیوں کی تلاش شروع ہوئی تو نوآبادیاتی نظام کے ابتدائی دور میں توسیع مملکت صرف ساحلی علاقوں اور اہم بندگاہوں تک محدود تھی لیکن اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں اس کی نوعیت بدل گئی۔ اب سلطنتیں ساحلوں کی بجائے ان ملکوں کے اندرونی علاقوں میں پھیلنے لگیں۔ یہ کام کئی طریقے سے کیا گیا مثلاً افریقہ، امریکہ اور جنوبی امریکہ کے بہت سے علاقوں میں صنعتی ممالک کے لوگ پوری طاقت سے داخل ہوئے۔ مقامی آبادی کو ہلاک کر دیا یا انھیں ایک چھوٹی سی جگہ میں محصور کر دیا اور ان علاقوں میں سفید فام لوگوں کی نوآبادیاں قائم کر دیں۔ بچے کھچے سیاہ فام لوگوں کو غلام بنا کر کھیتوں، کارخانوں اور کانوں میں لگا دیا گیا۔ یا پھر ایشیا کے اکثر ملکوں کی طرح مقامی آبادی کو مغلوب کر کے ایک ایسا سیاسی نظام قائم کیا گیا جو سامراجی لوٹ گھسوٹ کی ساری ضروریات کو پورا کر سکے۔

یورپ کے یہ مٹھی بھر لوگ جو کسی زمانے میں ایشیا والوں سے زندگی کے ہر شعبہ میں پیچھے تھے، خاص طور پر تکنیکی میدان میں یکا یک اس لیے چھا گئے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے وہاں پہلے ترقی کی اور اس ترقی یافتہ تکنیک کو صنعتوں اور فوج میں استعمال کر کے انھیں باقی دنیا پر زبردست برتری حاصل ہو گئی۔ (۱۰۴)

یورپی ملکوں میں نوآبادیاتی پالیسی کی ابتدا پرتگال نے کی تھی؛ اس دوڑ میں ہالینڈ، اسپین، فرانس اور برطانیہ شریک ہوتے گئے لیکن اٹھارھویں صدی کے وسط تک اس میدان میں برطانیہ نے سب پر سبقت حاصل کر لی۔ اس کی بڑی وجہ سات سالہ جنگ میں فرانس کی شکست اور برطانیہ کی فیصلہ کن فتح تھی۔ عہد نامۂ پیرس کے ذریعہ فرانس کو اپنی پوری نو آبادیاتی سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا اور برطانیہ کے لیے فتوحات کا راستہ کھل گیا۔ اس نے ہندوستان میں اپنی پیش قدمی تیز کردی۔ شمالی امریکہ کی ریڈ انڈین آبادی کے خلاف مہم تیز کر کے کناڈا اور شمالی امریکہ کے مغربی علاقوں میں اپنی سلطنت کو پھیلا دیا۔ سمندر پر زبردست کنٹرول کی وجہ سے برطانیہ نے جنوبی امریکہ پر اسپین کی تجارتی اجارہ داری ختم کردی۔ ایشیا اور افریقہ کے نئے علاقوں کی تلاش شروع کی اور جنوبی بحرالکاہل مشرقِ بعید، جنوبی اوقیانوس اور افریقہ کے ساحلی علاقوں کی طرف رخ کیا۔

ابتدا میں مقصد نئے علاقے فتح کرنا نہیں تھا بلکہ دور دراز علاقوں میں بحری مرکز قائم کرنا تھا تا کہ ان علاقوں کی تجارت پر قبضہ کیا جاسکے۔ لیکن اکثر جگہ یہ مرکز آئندہ فتوحات کا پہلا قدم ثابت ہوئے۔

برطانیہ کو فتوحات کی اس مہم میں ہمیشہ یکساں طور پر کامیابی نہیں ہوئی۔ مختلف علاقوں میں برطانیہ، فرانس، اسپین، پرتگال اور ہالینڈ وغیرہ کی آپس میں سخت رقابت کارفرما رہی۔ فتوحات کے اس دور میں برطانیہ کو سب سے بڑا دھکا اس وقت پہنچا، جب امریکہ کی تیرہ ریاستوں نے بغاوت کردی۔ یہ سب پہلی برطانوی سلطنت کا حصہ تھیں۔ اسی زمانہ میں سلطنت کے دوسرے اہم جزو آئرلینڈ میں بھی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔

امریکہ کی آزادی نے برطانوی سامراج کے منصوبوں کو ٹھنڈا نہیں کیا بلکہ اس کی توجہ اب ایشیا اور مشرق بعید پر اور زیادہ مرکوز ہوگئی۔ آسٹریلیا میں آبادکاری کی مہم نے زور پکڑا۔ سب سے بڑھ کر ہندوستان کی فتح کو مکمل کرلیا گیا۔ ۱۸۱۵ء تک برطانوی سلطنت تمام براعظموں میں پھیل گئی، جن میں کناڈا، جزائرغرب الہند، افریقہ کے علاقے ہندوستان اور آسٹریلیا شامل تھے۔

نصف صدی کے اندر دنیا کے اتنے وسیع علاقے پر قبضہ پانے کے بعد برطانیہ اور اس کی سلطنت کا نہ صرف رقبہ بڑھ گیا بلکہ اس کی معاشی اور سیاسی پالیسی میں بھی زبردست تبدیلی آگئی۔ اب تک برطانوی معیشت کی بنیاد تجارت پر تھی اور اب اس کا اصل مرکز صنعتیں بن گئیں۔ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کی معیشت کی بنیاد تجارت کی اجارہ داری تھی اور ان کے اہم اجزاء نوآبادیات کے زرعی فارم اور باغات، تجارتی کمپنیوں کی اجارہ داری اور غلامی کی تجارت تھی۔ اب اس نئے دور میں جبکہ برطانیہ ساری دنیا کے لیے مال تیار کرنے والا کارخانہ بن رہا تھا۔ یہ ماحول مناسب نہیں تھا۔ اس کے لیے تجارتی

کمپنیوں کی اجارہ داری ختم کرنے اور آزاد تجارت کے فروغ کی ضرورت تھی۔ یہ اتنا آسان بھی نہیں تھا، تجارتی کمپنیوں کا اثر ورسوخ بہت تھا۔ اور اسے ختم کرنے میں سخت اندرونی کش مکش کا سامنا رہا۔ چنانچہ ہندوستان کی تجارت کی اجارہ داری کہیں ۱۸۱۳ء میں ختم ہوئی اور چین کی ۱۸۳۳ء میں اور ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد ختم ہوا۔

ان نئی ضروریات کا تقاضہ یہ تھا کہ افریقی غلاموں کی تجارت کو ختم کیا جائے۔ غلاموں کی تجارت روکنے کے بجائے ، برطانیہ نے مغربی افریقہ کے اور علاقوں مثلاً سِرّ لیون، گیمبیا اور گولڈ کوسٹ پر ۱۸۰۸ء اور ۱۸۲۱ء کے درمیان قبضہ کرلیا اور افریقہ کے پورے مغربی ساحل پر اپنا فوجی کنٹرول مسلط کردیا۔

برطانیہ کی بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی کا یہ تقاضہ تھا کہ آزاد تجارت کو فروغ حاصل ہوا اور اسی کے ساتھ اگلی منزل یہ تھی کہ پوری برطانوی سلطنت پر مرکزی کنٹرول مضبوط ہو، چنانچہ اس کے تحت اب تجارتی مرکزوں کا ایک جال پوری سلطنت میں بچھ گیا۔ برطانوی بنکوں کا کاروبار محکوم اور مقبوضہ ملکوں میں پھیلنے لگا اور ان کی دولت نہ صرف تجارت کے ذریعے بلکہ ان محکوم ملکوں کی کانوں، کارخانوں، یہاں متعین برطانوی فوجوں، افسروں اور کاروبار کرنے والوں کے ذریعے برطانیہ میں سمٹ کر اکٹھی ہونے لگی، اور برطانیہ ایک زبردست معاشی، فوجی اور بحری طاقت بن گیا۔ اس کا اثر صرف اپنے مقبوضات ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کے باہر بھی محسوس کیا جاسکتا تھا۔ دوسری سلطنتوں کے کمزور ہونے سے برطانیہ کی طاقت اور بھی بڑھ گئی تھی۔

۱۸۰۰ء تک مختلف یورپی ملکوں کا دنیا کے پچپن فی صد رقبے پر قبضہ یا کنٹرول تھا، اور ۱۸۷۸ء تک یہ رقبہ سڑسٹھ فی صد ہوگیا۔

انیسویں صدی کے شروع میں اسپین کی سلطنت ٹوٹنے لگی اور پندرہ سال کی بغاوتوں اور لڑائیوں کے بعد ۱۸۲۵ء تک جنوبی امریکہ میں اسپین کا کوئی مقبوضہ باقی نہ رہا۔ صرف کیوبا اور پیورٹو ریکو پر اس کا قبضہ تھا۔ جنوبی امریکہ کے علاقے برطانیہ کے قبضے میں تو نہیں آئے لیکن معاشی طور پر وہاں بھی اس کا اثر بہت بڑھ گیا۔

دنیا کے مختلف حصوں میں جب یورپی ملکوں کی سلطنتیں مضبوطی کے ساتھ قائم ہوگئیں تو یورپی باشندے بڑی تعداد میں یہاں منتقل ہونے اور بسنے لگے۔ اس لیے کہ یہاں دولت کمانے کے بے شمار مواقع تھے۔ اندازہ ہے ۱۸۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان سو سال میں ساڑھے پانچ کروڑ یورپی باشندے مختلف نوآبادیات میں جا کر بس گئے۔ سب سے بڑی تعداد امریکہ گئی۔ ان تمام علاقوں میں جہاں یہ نوآبادیاں قائم ہوئیں، سفید فام باشندوں کو مقامی باشندوں پر ہر طرح فوقیت حاصل تھی۔ ایک تو یہ ایک ترقی یافتہ صنعتی ملک سے آئے تھے اور اس لیے زراعت، کان کنی وغیرہ میں ترقی یافتہ تکنیک استعمال کرسکتے تھے، دوسرے انھیں اپنی حکومتوں کا تحفظ حاصل تھا جس کی مدد سے انھوں نے مقامی لوگوں کی زمینوں پر قبضہ

کرلیا۔انھیں بے دخل کر کے ان کا قلع قمع کر دیا یا قیدی بنا کر انھیں ان آبادیوں کی ترقی کے لیے غلاموں کے طور پر استعمال کیا۔(۱۰۵)

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں یورپ کے ترقی یافتہ سامراجی ملکوں کی پالیسی میں اہم تبدیلی آئی۔اس دور میں ایک طرف تو سامراجی طاقتوں (Colonial Powers) کی تعداد میں اضافہ ہوا، دوسرے ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کو محکوم بنانے کی رفتار بہت تیز ہوگئی۔اس سے پہلے کے دور میں ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ مقبوضہ علاقوں کے اندرونی حصے میں اپنا نظم و نسق پھیلایا جائے اور اپنا کنٹرول مضبوط کیا جائے لیکن انیسویں صدی کے آخر میں جب یورپ نے کافی صنعتی ترقی کر لی تھی اور اس کی فوجی طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔نئے علاقوں کی رفتار کی طرف توجہ مرکوز کی جانے لگی۔چنانچہ چند ہی سال کے اندر، ان سامراجی طاقتوں نے پورے افریقہ، ایشیا کے بڑے حصے اور بحرالکاہل کے اکثر جزائر کو ہڑپ کرلیا۔انیسویں صدی کے پہلے ۷۵ سال میں سامراجی ملکوں نے ہر سال اوسطاً ۸۳ ہزار مربع میل پر قبضہ کیا تھا۔۱۸۷۰ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان دولاکھ چالیس ہزار مربع میل ہر سال ان کے قبضے میں آئے اور ان علاقوں پر ان کا پوری طرح فوجی اور معاشی اقتدار قائم ہوگیا۔۱۹۱۴ء تک دنیا کا پچاسی فی صد رقبہ سامراجیوں کا محکوم بن چکا تھا۔اور سیاسی اور معاشی اقتدار تو ان ملکوں میں بھی پھیل گیا تھا جن پر براہ راست قبضہ نہیں تھا۔بہت سے ملکوں سے خاص قسم کے معاشی رشتے قائم کیے گئے اور قرضوں کے پھندوں میں جکڑ کر ہر قسم کی فوجی اور معاشی رعائتیں حاصل کر لی گئی تھیں، مثلاً چین وغیرہ میں۔

سامراجیت کی اس دوڑ میں برطانیہ، فرانس اور پرتگال علاوہ اب روس، جرمنی، اٹلی، بیلجیئم اور امریکہ بھی شامل ہو گئے تھے۔ایشیا میں جاپان اسی سامراجی حلقے میں شامل تھا۔ترقی یافتہ ممالک جس رفتار کے ساتھ نئے نئے علاقے حاصل کر رہے تھے تو لازمی تھا کہ اس سے آپس میں رقابت بڑھتی۔ایک دفعہ جب ساری دنیا سامراجی ملکوں میں بٹ گئی اور کوئی نیا علاقہ فتح کرنے کے لیے باقی نہ رہا تو آپس میں یہ کش مکش بھی لازمی طور پر تیز ہوگئی اور تیز صنعتی ترقی نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ کوئی ملک اس دوڑ میں پیچھے نہیں رہ سکتا تھا۔مثلاً بیسویں صدی کے شروع تک برطانیہ سب سے بڑا سامراجی ملک بن چکا تھا۔اس کے پاس سب سے طاقت ور بحری بیڑہ تھا لیکن وہ بھی اس مقابلے میں سست قدمی سے کام لینا نہیں چاہتا تھا۔جرمنی، اٹلی وغیرہ جو اس میں بہت بعد میں داخل ہوئے تھے کہ ان کے لیے اس مسابقت سے الگ رہنا اور بھی ممکن نہیں تھا۔ان ملکوں میں بھی صنعتی ترقی بہت تیز ہوگئی تھی۔اور انھیں بھی اپنے مال کی نکاسی اور اپنا سرمایہ باہر لگانے کے لیے منڈیوں کی ضرورت تھی۔

صنعتی انقلاب کے کچھ عرصے بعد صنعتی ترقی اس منزل پر پہنچ گئی جہاں بنیادی صنعتوں کے بڑے بڑے کارخانے

قائم کرنا ضروری ہوگیا۔اس کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کی ضرورت تھی۔یہ اسی وقت ممکن تھا کہ بنک کاری دنیا میں اپنا جال پھیلا کر خاطر خواہ ترقی کرتی۔علاوہ ازیں بڑی صنعتوں کے لیے کچے مال کے وسائل کی توسیع درکار تھی۔یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہوسکتا تھا جب کچا مال رکھنے والے زیادہ سے زیادہ ملک صنعتی ممالک کے قبضۂ اختیار میں آجاتے تاکہ وہ ان وسائل کو ترقی دے کر اپنے کارخانوں کو چالو رکھ سکتے۔کارخانوں کی ترقی کے ساتھ بڑے بڑے شہر ابھرنے لگے۔شہروں میں غذا پیدا نہیں ہوتی۔اب غذا کے بڑے وسائل پر کنٹرول حاصل کرنا بھی ناگزیر ہوگیا اور ان میں ایسی معیشت رائج کرنے کی ٹھانی گئی جس کی مدد سے ترقی یافتہ ملکوں کو سستے داموں وافر مقدار میں زرعی کچا مال، کانوں سے نکالی ہوئی کچی دھاتیں، کوئلہ اور غذا کا سامان برابر ملتا رہے؛ اور اس طرح محکوم ملکوں کی پوری معیشت کو سامراجی ملکوں کی ضروریات کا پابند کردیا گیا۔

اس نئے صنعتی ڈھانچے نے ساری دنیا میں نہ صرف ایک پیچیدہ معاشی، سیاسی، اور سماجی نظام کو جنم دیا بلکہ دنیا کی تجارت کو بھی ایک شکنجہ میں کس دیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترقی یافتہ ملکوں میں آپس میں سخت تجارتی مسابقت نے فوجی تیاریوں کی شکل اختیار کرلی۔ہر ترقی یافتہ ملک اپنے بحری بیڑے کی طاقت کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں لگ گیا۔برطانیہ کا بیڑہ بہت بڑا تھا لیکن نئی تکنیک کی ترقی کی مدد سے جرمنی جیسے ملکوں نے ایسے بیڑے بنالیے تھے جو تھے تو چھوٹے لیکن ان کی فوجی طاقت اور صلاحیت بہت زیادہ تھی۔

بین الاقوامی صورت حال میں اس تبدیلی اور آپسی مسابقت کا نتیجہ یہ نکلا کہ انیسویں صدی کا امن کا دور ختم ہوگا اور آپسی رقابتوں اور پھر جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔افریقہ کے بٹوارے کے لیے جنگیں، جنوبی افریقہ کی بوئر جنگیں، چین و جاپان کی جنگ، اسپین اور امریکہ کی جنگ، اور روس و جاپان کی جنگ اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔یہ کش مکش ۱۹۱۴ء تک اپنی انتہا پر پہنچ گئی اور جنگِ عظیم چھڑ گئی۔اس میں ایک طرف برطانیہ، فرانس اور روس تھے جن کے قبضہ میں محکوم ملکوں کا بڑا حصہ تھا اور دوسری طرف جرمنی اور اس کے حلیف تھے جو اس غیر مساوی تقسیم کو بدلنا چاہتے تھے اور اس میں حصہ دار بننا چاہتے تھے۔اس لڑائی میں برطانیہ اور فرانس کو فتح ہوئی اور جرمنی کو ان علاقوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا جو اس کے پاس تھے اور اتحادیوں نے نہ صرف جرمنی ہی کے علاقے آپس میں بانٹے بلکہ جرمنی کے حلیف ترکی کے مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے تمام علاقے ہتھیا لیے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب اتحادی ملک دنیا کی تقسیم جدید میں لگے ہوئے تھے۔محکوم ملکوں میں قوم پرستی اور آزادی کی لہر اٹھ رہی تھی۔اسے تقویت دینے میں روس کے انقلاب نے زبردست رول ادا کیا۔یہاں پہلی مرتبہ عوام نے مل

کر ایک سامراج کا تختہ الٹ دیا تھا۔ پہلی مرتبہ محکوم ملکوں کے عوام نے یہ دیکھا کہ سامراجیوں کی طاقت ناقابل تسخیر نہیں ہے۔ اسے شکست دی جاسکتی ہے اور آزادی حاصل کی جاسکتی ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے ملبے سے جو آزادی کی چنگاری بھڑکی تھی وہ تیز تر ہوتی گئی اور آخر کار دوسری جنگِ عظیم کے بعد تمام محکوم ملکوں نے آزادی حاصل کر لی۔

پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ، فرانس اور اس کے حلیفوں کو فتح ضرور ہوئی اور انھوں نے جرمنی کے محکوم علاقوں کو آپس میں بانٹ بھی لیا لیکن اس کی وہ حیثیت باقی نہ رہی جو جنگ سے پہلے تھی۔ اس لڑائی کے بعد امریکہ سب سے طاقت ور ملک بن چکا تھا۔ جاپان کی بحری طاقت بہت بڑھ چکی تھی اور ان دونوں کی وجہ سے سمندر پر سے برطانیہ کا کنٹرول بہت کم ہو گیا۔ اس جنگ میں برطانیہ معاشی طور پر بہت کمزور ہو گیا تھا اور امریکہ نے جنگی سامان یورپ کو بیچ کر خوب دولت اکٹھا کر لی تھی۔ وہ اب بنک کاری کا مرکز بن گیا تھا اور تیزی کے ساتھ اپنا معاشی جال، برطانیہ کو میدان سے ہٹا کر، ساری دنیا میں پھیلا رہا تھا۔ برطانیہ کو جنوبی امریکہ کی زندگی سے خاص طور پر بے دخل کر دیا گیا اور یہ علاقہ پوری طرح امریکہ کے معاشی اثر میں آ گیا۔

دوسری طرف جنگ کے بعد جاپان نے مشرق بعید سے مغربی اثر کو ختم کرنا شروع کر دیا اور چند ہی سال میں چین کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ یورپ میں جنگ کے بعد جرمنی نے پہلے دبی زبان سے اپنی نو آبادیاں مانگنے کی کوشش کی اور اس کے بعد فاشزم کے جھنڈے تلے اس نے یورپ اور افریقہ میں اور جاپان نے ایشیا میں سامراجی نظام کا نقشہ اپنے حق میں بدلنے کی کوشش کی اور عارضی طور پر کامیابی بھی حاصل کی لیکن دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹ء۔۱۹۴۵ء) میں دونوں کو شکست ہوئی۔ جس نے استعماری نظام پر کاری ضرب لگائی۔ ساری دنیا میں قومی آزادی کی لہر اس شدت سے اٹھی کہ وہ تمام علاقے آزاد ہو گئے جن پر جنگ کے دوران جرمنی، اٹلی اور جاپان نے قبضہ کیا تھا بلکہ فاتح ممالک مثلاً برطانیہ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ تحریک آزادی کی لہر کے سامنے جمنا ان کے لیے ممکن نہ رہا اور ایک کے بعد دوسرا ملک آزاد ہوتا گیا۔ فاشزم کی شکست اور سوویت یونین کی فتح اور آزادی کی جنگ میں اس کی امداد نے آزادی کے اس دھارے کو اور بھی تیز کر دیا۔ جنگ کے آخر میں دنیا کا جو نقشہ ابھرا وہ کچھ اس قسم کا تھا:

۱۔ امریکہ اور دوسری طرف سوویت یونین دنیا کے دو نظاموں کے نمائندے، دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن کر ابھرے۔

۲۔ پرانے سامراجی ملکوں کے لیے اپنی نو آبادیوں اور مقبوضات کو باقی رکھنا ناممکن ہو گیا۔

۳۔ آزادی کی تحریکیں اتنی تیز ہو گئیں کہ ان کا روکنا کسی سامراجی طاقت کے بس کا نہ رہا، اور یہ آزادی کی تحریکیں صرف قوم پرستانہ نہیں تھیں بلکہ ان میں اکثر سامراج دشمن تھیں۔ اکثر نے بیرونی سرمایہ کو قومی ملکیت بنا کر بیرونی اقتدار کو ملک سے

بے دخل کر دیا اور پرانی سامراجی معیشت کا خاتمہ کر دیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد آزادی کی لہر جب بہت تیز ہوگئی تو کسی بھی سامراجی ملک کے لیے کسی دوسرے ملک پر براہ راست کنٹرول رکھنا ممکن نہیں رہا، چنانچہ بالواسطہ کنٹرول کے طریقوں کو رائج کرنے کی کوشش کی گئی۔طریق یہ تھا کہ ان ملکوں میں ایک ایسی حکومت قائم کی جائے جو سیاسی طور پر تو آزاد ہو لیکن اسے معاشی امداد دے کر اور فوجی معاہدوں میں گھیر کر اس طرح جکڑ دیا جائے کہ وہ کوئی بنیادی، معاشی اور سماجی تبدیلی نہ لا سکے۔اور ترقی یافتہ صنعتی ممالک اسے کم اجرت کے مزدوروں، سستے مال کا وسیلہ اور صنعتی مال کی منڈی بنا کے رکھ سکیں۔ساتھ ہی بڑھتی ہوئی آبادی اور شوسلزم کی تحریک کے خلاف بھی اسے استعمال کیا جائے۔لیکن اب زیادہ سے زیادہ ملک اس نوسامراجیت کے خلاف متحد ہو کر قدم اٹھا رہے ہیں۔پچھلے برسوں میں غیر جانبدار ملکوں کی تحریک نے زبردست ترقی کی ہے اور اب وہ متحد ہو کر مغرب کے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کی نابرابری کی معاشی پالیسی یا نوسامراجیت کی پالیسی کے خلاف سخت جدوجہد کر رہے ہیں۔

روس کی شکست وریخت کے بعد دنیا کی واحد عالمی طاقت امریکہ بن گیا، لیکن جنگی جنون میں مبتلا ہونے کے بعد اور مختلف ممالک پر قبضہ کی بے سود کوششوں نے اسے بھی بدحواس کر دیا ہے۔ایشیا میں پاکستان اور بھارت کا ایٹمی طاقت بن جانا، چین اور دوسرے سابق محکوم ملکوں کی معاشی ترقی اور بعض پس ماندہ ملکوں میں تیل کی دریافت سے اس جدوجہد کو نئی طاقت ملی ہے اور امید ہے کہ یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک نوسامراجیت کا خاتمہ نہ جائے اور دنیا میں انصاف، مساوات اور آزادی کی بنیاد پر معاشی رشتے قائم نہ ہو جائیں۔(۱۰۶)

ہندوستانی نوآبادیات:

یورپین ممالک جغرافیائی لحاظ سے بہت مضبوط تھے۔اور سیاسی اعتبار سے بھی سمندری راستوں کا فائدہ اٹھانے لگے۔یورپیوں نے افریقی ساحلوں اور بندگاہوں پہ قبضہ کرتے ہی نوآبادیات کا آغاز کر دیا۔جنوبی افریقہ، جنوبی امریکہ اور مشرقی ایشیاء کی طرف پیش قدمی بحری راستوں کے ذریعے ہوئی۔ڈچ اور انگریز پرتگال نے سولہویں صدی میں مشرقی اجارہ داری کو چیلنج کر دیا اور پھر ڈچ نے پرتگیزیوں کو بھگا کر 1800ء میں جاوا اور سائیلون کا کنٹرول سنبھال لیا۔وہاں کے جزیرے کے حکمران کو تابع کر لیا اور وہاں پر ہر کسی کے لنگر انداز ہونے پہ پابندی لگا دی۔(۱۰۷)

نوآبادیات کا مطالعہ اصل میں ان حربوں اور حکمت عملیوں کا مطالعہ ہے جن کی مدد سے یورپی ملکوں کا دنیا کے اسی فیصد رقبے پہ قبضہ ہوا اور اس کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ ان ملکوں کی ثقافت، معاشی ڈھانچے، سیاسی طریقہ کار اور زبان وادب آزاد ہونے کے باوجود نہ تو اپنی شناخت قائم کر پائے ہیں اور نہ ان اثرات سے نکل پائے ہیں۔اسی طرح انگریزوں

کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے آپ کو ہندوستان میں مضبوط کیا اور 1857ء میں مرکزی سرزمین پہ فتح کا جھنڈا گاڑا۔ انہوں نے نوآبادیاتی کالونیاں بنائیں اور آبائی وطن کے لئے وسیع پیمانے پر اجارہ دارانہ کاروبار کیا۔ ویسے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورے تو سترھویں صدی سے ہی شروع ہو گئے تھے اور اس تجارتی کمپنی نے حکومتی حیثیت تک کا سفر اٹھارویں صدی کے نصف تک مکمل کیا۔ اس عمل کا باقاعدہ آغاز جنگِ پلاسی سے ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ حکمت عملی اپنائی کہ جو علاقہ بھی فتح کرنا ہوتا سب سے پہلے وہاں کے منتخب افراد سے تعلقات قائم کئے جاتے تھے۔ کیونکہ یہ افراد اُس علاقے میں لوگوں کے اندر اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ ان افراد کے تعاون سے مقامی آبادی میں موجود حکمران کے خلاف فضا قائم کی جاتی تھی اور مقامی آبادی کی رائے کمپنی کے حق میں لی جاتی تھی۔(۱۰۸)

شروع میں انگریز جب تاجر کی حیثیت سے ہندوستان آئے تو یہاں کے جواہرات، لباس، پان دان، مرغن غذاؤں، دستر اخوان، پالکیوں اور ہاتھیوں کے استعمال والے کلچر سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ اہلِ مغرب ہندوستان کے جادو میں پھنس گئے۔ وہ ہندوستان کی دولت، تہذیب اور خوش حالی سے شدید متاثر ہوئے۔ اُنہوں نے آہستہ آہستہ اس کلچر کو اپنانا شروع کر دیا اور ہندوستانی عورتوں سے شادیاں کرنا شروع کر دیں۔ مقامی زبان سے اتنے متاثر ہوئے کہ شاعری بھی کرتے رہے۔ لیکن جیسے ہی انگریز اقتدار کی خاطر یہاں آیا تو ہندوستانی تہذیب، کلچر اور لوگ گھٹیا، کم تر اور پسماندہ نظر آنے لگے تب اس کمپنی نے اپنے لوگوں کو غیر عیسائی اور ہندوستانی کلچر ترک کرنے حکم دیا۔ ان کے نزدیک:

> ''اگر لوگ ہندوستانی کلچر میں ضم ہو گئے تو ان کا تعلق بھی انگلستان سے ختم ہو جائے گا اور شاید ان کا وہی انجام ہو جو کہ ہندوستان میں مغلوں کا ہوا کہ وہ ہندوستانی ہو کر وسط ایشیاء سے اپنی جڑیں کھو بیٹھے اسی وجہ سے یہ کمپنی کے مفاد میں تھا کہ فرق نہ صرف قائم رہے بلکہ اس میں شہرت بھی آئے۔''(۱۰۹)

اگر نوآبادیاتی عمل کو گہرائی میں جا کر دیکھیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مقامی افراد کی شناخت کو گُم کیا اور مقامی ثقافتوں کے بارے مصنوعی تصورات پھیلائے۔ (Oriental Knowledge) بنیادی طور پر ایسا حربہ تھا جس نے نوآبادیات کو ممکن بنانے میں اچھا کردار ادا کیا۔ مشرق اور ہندوستان کے ماضی کو اس علم کے ذریعے بگاڑ کے پیش کیا گیا۔ مثلاً اودھ اور صوبجات شمالی و مغربی کے بارے ولیم کروک(William Crook) کی رائے یہ تھی:

> "Even in the best days of the muglal rule no effective measures had been Taken to develop its resovrces, to secure internal peace, to protect the people from outrageous oppression"(۱۱۰)

حقیقت تو یہ تھی کہ اس وقت سیاسی اور معاشی تعاون بگڑ چکا تھا اور انگریز مکمل طور پہ قابض ہو چکے تھے۔ ہندوستان

کی سیاست اور معشت تباہ ہو گئی تھی۔ جب یہ کمپنی سیاسی و معاشی طور پہ مضبوط ہوئی تو اس کے عزائم میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ کمپنی کے ملازمین نے عام لوگوں سے دوری اختیار کی اور خود کو اعلیٰ مذہب یافتہ سمجھنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ مذہبی مناظرے کرنے شروع کر دیئے اور پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا اور سب کو دوسرے درجے کے شہری ہونے کا احساس بھی دلانا شروع کر دیا۔

ہندوستان کے ماضی کی تشکیل نو کے بارے بات کرتے ہوئے یورپی مؤرخین نے یہاں کے بادشاہوں کی عیش پرستی دکھانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ یہاں یورپیوں کے آنے سے پہلے عمدہ حکومت ایک خواب تھا۔ یہ سلطنتیں اپنی مثال آپ تھیں ان میں کوئی قانون تھا نہ آئین۔

> "The history now given to the public, presents is with a striking picture of the deplorable condition of a people subjected to arbitrary sway: and of the instability of empire itself, when it is founded neither on law nor upon the opinions and attachments of mankind in a government like that of india public spirit is never seen and loyalty a thimy unknown."(۱۱۱)

اب ایسی حکومت جہاں قانون ہی نہ ہو، اس مین امن و امان کا رہنا اور ایمانداری کا نام و نشان ہونا ممکن ہی نہ تھا لیکن پھر بھی اس کا قائم رہنا معجزہ ہی تھا۔ سلطنت برطانیہ کے عہدیداروں نے مغلوں کی طرز پر دربار لگانے شروع کر دیئے، اُنہیں نے بھی جاگیریں تقسیم کیں اور اپنی مرضی کے لوگوں کو صاحب بہادر کا خطاب دیا۔ انیسویں صدی میں ایک مثالی ریاست کے تصور نے سب کچھ بدل ڈالا۔ لاتعداد کارلوِریشنیس بنائیں گئیں۔ صحت و تعلیم اور دیگر ادارے بنائے گئے ساتھ ہی سڑکوں اور نہروں کے بنانے کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ عوامی سہولتیں مہیا کی گئیں اور عوتوں کو ووٹ دینے کا حق بھی دیا گیا۔ اپنی اصلاحات نے انگریزوں کی حکومت کو سنہری دور بنا دیا۔ جو کہ اصل میں سرمایادرانہ ترقی کے زیر اثر آبادی ڈھانچے کو مضبوط بنا کر اپنے معاشی مفادات کو بہتر اور تیز کران چاہتے تھے۔

ہندوستان میں برطانوی عہدے کو تین مراحل میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے مرحلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی جو کہ تجارتی سرمایہ داری کے ذریعے ہندوستان میں داخل ہوئے اور وسعت اختیار کرنے گئے۔ انہوں نے مختلف علاقوں پہ دھاندلی، جبر اور دھوکے سے اپنی اجارہ داری قائم کی۔ پر برطانیہ کی حکومت آئی تو انہوں نے کمپنی کا تجارتی اارہ داری ختم کر دی۔ دوسرے مرحلے میں صنعتی اجارہ داری کا آغاز ہوا اور برطانوی پارلیمنٹ میں آزاد تجارت کے حق میں آوازیں اُٹھنے لگیں

کیوں کہ:

''آزاد تجارت کے لئے کمپنی کی اجارہ داری کا خاتمہ ضروری تھا۔ ساتھ یہ بھی ضروری ہوگیا تھا کہ ہندوستان سوتی کپڑا برآمد کرنے والا ملک نہ رہے بلکہ انگلستان میں قائم ہونے والے کارخانوں سے تیار شدہ کپڑا درآمد کرے۔''(۱۱۲)

سلطنت برطانیہ کا ایسٹ انڈیا کمپنی کو کمزور کرنے کا مقصد یہ تھا کہ انگلستان سے آنے والے سرمایہ دار طبقے کے لئے ہندوستان پر حکومت کرنے کے دروازے کھولنا تھا۔ اس طرح برطانوی سرمایہ داروں نے ہندوستان پر اپنی اجارہ داری مسلط کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ پورا کرلیا، اس کے بعد تسیر آخری مرحلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ برطانوی بادشاہت نے لے لی۔

جب سلطنت مغلیہ کو زوال ہوا تو ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگیا۔ کچھ ریاستوں کو نے خود مختاری کا اعلان کیا جس کی وجہ سے مغلیہ حکومت اور مغلوں کی شان وشوکت میں بہت کمی میں واقع ہوئی۔ حفاظتی دستے صرف بادشاہ کے پاس ہوتے تھے اور مرکز جاگیرداروں سے پیسہ دے کر فوج حاصل کرتا تھا۔ جیسے ہی ریاستوں نے مرکز سے علیحدگی اختیار کی ساتھ ہی ساری لاتعلقی ک ابھی اعلان کر دیا مطلب ریاستوں نے ٹیکس دینے سے بھی انکار کر دیا۔ اسی وجہ سے مرکز کمزور ہوگیا اور افراتفری اور انتشار کا عالم پیدا ہونے لگا۔

''ان حالات میں منصب داروں اور امراء نے اپنی حیثیت اور مراعات کو قائم رکھنے کے لئے اور اپنی جاگیروں سے زبردستی و تشدد کے ساتھ ٹیکس وصول کرے کے لیے اپنی اپنی فوجیں رکھنا شروع کر دیں جو ان کی ذات کے ساتھ وفادار ہوتیں تھی۔ مگر یہ امراء اپنے فوجیوں کو پابندی سے تنخواہ نہ دیتے تھے۔ اور تنخواہ کے مطالبے پہ ان سے کہا جاتا کہ فلاں گاؤں لوٹ کے لاؤ۔''(۱۱۳)

اِن کے ایسے حملہ کرنے پر بیرونی طاقت بھی اپنا زور دیکھا جاتی جسکی وجہ سے ہندوستانی سیاست و معیشت تباہ و برباد ہوگئی۔ امن وامان نام کا رہ گیا ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کا بازار ہر طرف گرم ہونے لگا۔ انگریزوں نے ریاست میں نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا سراج الدولہ نے انگریزوں کو ریاست سے باہر نکالنے کے لیے حملہ کر دیا اور اِن کی قاسم بازار کی فیکٹریوں کو گرا کر فتح حاصل کر لی۔ انگریزوں پہ سختی کی گئی کہ وہ بس تجارتی سرگرمیوں میں ہی حصہ لیں۔ ورنہ اُنہیں اس سرزمین سے نکال دیا جائے گا، اس پابندی کے نتیجے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندستان میں مزاحمت کا اندازہ ہوا اور فوجی طاقت کا بھی۔

یہ وہ وقت تھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے برطانوی حکومت کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہوئی یہ اگر کمپنی ہندوستان میں منافع بخش کاروبار کرنا چاہتی ہے تو اسے ہر شعبے میں یکساں حصہ لینا ہوگا۔ اس مطالبے کے بعد برطانیہ نے ایسٹ اندیا کمپنی

کو ہدایات دیں کہ مقامی لوگوں کو تربیت دی جائے اور اُنہیں ہر طرح کی سہولت سے نواز جائے اور یہ وسائل بھی ہندوستان سے ہی پیدا کیئے جائیں۔ انہیں وجاہات کی بنا لوگوں کا رجحان بادشاہ کی غلامی سے ہٹ گیا اور لوگ کمپنی کے غلام بننا پسند کرنے لگے۔ انہیں طریقوں پہ عمل کرتے ہوئے کمپنی اور بھی مضبوط اور مستحکم ہوگئی۔

جنگ پلاسی کے بعد کمپنی اور بھی مضبوط ہوگئی۔ اس لڑائی میں انگریزوں کی نواب سراج الدولہ پر فتح نے کمپنی کو تجارتی اور سیاسی قوت بنا دیا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس جنگ کا ہندوستانی سیاست پہ گہرا اثر پڑا اور بنگال میں سراج الدولہ کے نانا علی وردی خان نے مرتے وقت اسے نصیحت کی کہ مغربی قوموں کی اس قوت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا جو انہیں ہندوستان میں حاصل ہیں۔ سب سے پہلے انگریزوں کی قوت کو توڑنا۔۔۔۔ اُنہیں سپاہی رکھنے اور قلعہ تعمیر کرنے کی اجازت نہ دینا۔ اگر ایسا ہوا تو بنگال تمہارا نہیں۔

اس کے بعد جب سراج الدولہ تخت نشین ہوا تو انگریزوں نے اس کے دربار میں شازشیں کرنا شروع کر دیں اور رفتہ رفتہ انگریزوں نے کامیابی حاصل کر لی۔ میر جعفر کو خوشخبری سنائی گئی کہ نواب کی جگہ سربراہی اسے عطا کی جائے گی۔ اسی لالچ میں آکر جنگ کے دوران میر جعفر انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔ اور کچھ گھنٹوں کی لڑائی کے بعد نواب کو شکست سے دو چار ہونا پڑا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے سیاسی اور معاشی نظام پہ کنٹرول بڑھا لیا تھا۔ سازشوں کا سہارا لے کر ریاست میں اقتدار کی لڑائیاں کروانا اور اِن کے دل وسائل پہ قبضہ کر لینا اِن کی لئے معمولی بات تھی۔ میر جعفر نے کچھ دیر حکمرانی کی لیکن پھر انگریزوں نے اسے ہٹا کر میر قاسم کو ریاست کا حکمران بنا دیا۔ اس سے معاہدہ کیا گیا کہ وہ کمپنی کو بنگال سے کثیر رقم فراہم کرے گا۔ تجارتی منافع بھی کمپنی کو ہی دیا جاتا تھا۔ اسی طرح کمپنی نے خود کو اور زیادہ مضبوط کر لیا تھا۔

پلاسی اور بکسر کی لڑائیوں نے انگریزوں کے لئے حکمرانی کے راستے اور بھی ہموار کر دیئے تھے۔ اور اب ہندوستان میں سب ریاستیں اِن کی گرفتا میں تھیں سوائے میسور کے۔ اب اک نئے عہد میں داخل ہوتا ہندستان نظر آرہا تھا۔ مدارس اور بنگال کے ساحلی علاقوں میں انگریزوں کی تعداد اور ان کا اثر و رسوخ بہت حد تک بڑھ چکا تھا۔ انگریز اپنے ذرائع آمدن کو استعمال کرتے ہوئے شمالی ہند کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جبکہ جنوب کی جانب انہوں نے فرانسیسوں اور ولندیزیوں کو شکست سے دوچار کر دیا ہوا تھا۔ ہندستان میں برطانوی نوآبادیات اپنے نظام کو مضبوط کر رہی تھی جبکہ دوسری طرف مشرقِ وسطیٰ میں عالم اسلام پر بھی اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے میں کامیاب ہو رہی تھی۔ اس کے واسطے اُنہیں میسور پہ قبضہ کرنا لازمی تھا تو انہوں نے ٹیپو سلطان اور نظام کیت درمیان سازشیں کر کے لڑائی کرادی۔ نظام کو یہ سازش کی کی میسور کی طاقت سب کے لئے

نقصان دہ ہے اور یہ کہ یہ ریاست مختلف مما لک سے رابطوں میں ہونے کی وجہ سے جدید ٹیکنالوجی کی خواہش مند بھی تھی۔

پلاسی کی فتح کے بعد بکسر کی لڑائی ۱۷۶۴ء میں بھی انگریزوں کی فتح نے مغلیہ حکومت یا شمالی ہند کو انگریز کا باج گزارا بنا دیا۔ اب محض جنوبی ریاست حیدرآباد (نظام) مرہٹے اور میسور کے حکمران حیدر علی ان کی راہ میں رکاوٹیں تھیں، لیکن ان میں سے نظام نے انگریزوں کے ساتھ دوستانہ اور مفاہمانہ مراسم کو ترجیح دینے میں عافیت سمجھی۔ مرہٹے ان ہی دنوں پانی پت میں شاہ ابدالی کے ہاتھوں اپنی متحدہ قوت کو کھو بیٹھے تھے اور جنوب میں سمٹی ہوئی ایک منتشر سی قوت کے طور پر باقی رہ گئے تھے، ان دنوں کے مقابلے میں ٹیپو سلطان ایک تازہ اور توانا طاقت کے طور پر ابر رہا تھا۔

ٹیپو سلطان انگریزوں کی اس حال کو سمجھ رہا تھا اسی لئے اُس نے اِن کے خلاف جنگ کو جاری رکھا۔ آخر کار انگریزوں نے ٹیپو کی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور صلح کو ترجیح دیتے ہوئے عہد نامہ منگلور اپہ عمل کیا۔ کیونکہ انگریزوں کو ٹیپو سلطان سے جنون کی جانب اور پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوجی قوت سے خطرہ لاحق تھا۔ لیکن انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو مرہٹوں اور نظام کی مدد سے شکست دے دی۔ کمزور مرکز اور معاشی انتشار کے باعث صوبے آزادی اختیار کر گئے اور ریاستوں کی شکل اختیار کر گئے۔ کمپنی نے یہاں ایک اور چال چلی اور کئی ریاستوں کے فوجی نظام کو اپنے ذمے لے لیا۔ کیونکہ اُن کے اخراجات بھی ریاست کے ذمے ہی ہوتے تھے۔ فوج کمپنی کے ہاتھ ہونے کے باعث ریاست کا فوج پہ اثر و رسوخ ختم ہو چکا تھا۔ اودھ نے اپنی فوجی طاقت ختم کر دی اور اس کی یہ ضرورت بھی کمپنی نے ہی پوری کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مکمل طور پہ ہندوستان کی اہم ریاستوں غلبہ حاصل کر لیا تھا اور اِنہیں اپنے ماتحت کر لیا تھا۔ یہ کمپنی پہلے مقامی حکمرانوں کو لڑائی میں الجھا دیتی اور انہیں مرکزی طور پہ کمزور کر دیتی تھی اور پھر خود حملہ کر کے کامیابی حاصل کر جاتی تھی۔ اور ایک صدی کے اندر اندر اس کمپنی نے پورے ہندوستان پہ قبضہ کر لیا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے سرمائے حصول کی کاوشوں نے اسے تجارتی مراعات ہی نہیں بلکہ بنگال میں ریونیو اکٹھا کرنے کا حق بھی دلایا۔ بنگال جیسے زرخیز صوبے کو لوٹنے میں کوئی کثر نہ چھوڑی گئی۔ لوگوں سے زبردستی لگان لیا گیا اور کمپنی نے لوگوں نے تھوڑے بہت غلے پہ بھی اجارہ داری حاصل کر لی۔ اس اجارہ داری نے وہاں کے لوگوں کو اگلی فصل کے لئے رکھے گئے بیج کو بھی فروخت کرنے پہ مجبور کیا جسکے نتیجے میں ۱۷۷۰ء میں ہندوستان کی تاریخ کا سب سے پہلا قحط پڑا جس میں تقریباً ایک کروڑ سے زائد لوگ بھوک کا شکار ہوئے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی رشوت اور بدعنوانیوں کی داستان انگلستان تک پہنچی تو برطانوی پارلیمنٹ نے تمام معاملات کو برطانوی حکومت کی گرفت میں دینے اور اسے بہتر طور پہ چلانے کے لئے ایک ''ریگولیٹنگ آبلٹ'' بھی تیار کیا۔ جس سے ہندوستان میں نوآبادیاتی تمرنی دور کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے کا

عرصہ انگریزوں کی سیاسی اور اقتصادی ہنگامے اور بد نظمی کا عہد تھا۔ اور اہل ہند پہ اس کے اثرات ہونے شروع ہو چکے تھے۔ پہلے پہل تو انگریزوں نے ہندوستان کو تجارت کے لئے استعمال کیا اور اب ہندوستان کو برتانیہ کا حصہ بنا دیا تھا۔ اسی بنا پر سیاسی اور فوجی طاقت کو مزید بڑھایا گیا اور تجارتی سرگرمیوں کو بھی تیز کیا گیا۔

صنعتی انقلاب کی راہیں ہموار کرنے کے لئے برطانیہ نے مختلف ممالک کی نوآبادیوں کو لوٹ لیا۔ صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوا جب تجارتی پیداوار صنعتی پیداوار میں تبدیل کی گئی۔ صنعتی پیداوار میں اضافے کی صورت میں منڈیوں کی ضرورت پیش آتی تو ہندوستانی صنعت کو ختم کر دیا گیا۔ وہاں یہ کام کرنے والے کاریگروں پہ ظلم کئے گئے تا کہ مقامی صنعت کو نقصان ہو اور ہندوستان منڈیوں پہ بھی برطانیہ کا ہی راج ہو۔ ہندستان دینا کا سب سے سستا خام مال تیار کرتا تھا۔ جو کہ انگریزوں کی ہی نوآبادی تھی۔ اسی وجہ سے برطانوی سرمایا داروں کے لئے صنعتی اخراجات نہ ہونے کے برابر تھے اور وہ مضبوط ہوئے۔

اٹھارھویں صدی کے آخری تین عشروں میں برطانیہ کو دو انقلابات کا سامنا کرا پڑا، پہلا تو انگلستان کو ۱۷۷۶ء میں امریکہ سے آزادی ملی اور دوسرا ۱۷۸۹ء میں انقلاب فرانس رونما ہوا، فرانس کا مستحکم ہونے میں بھی نوآبادیوں کا استحصال شامل ہے۔ جسکی وجہ سے جاگیرداروں کی طرف سے بغاوت کی گئی۔ انقلابِ فرانس تین بڑے نعروں پہ مشتمل تھا جو کہ مساوات، عدل اور آزادی تھے لیکن اصل میں یہ نعرے صرف اور صرف سرمایہ داروں کے تھے، کیوں کہ انقلاب فرانس تو جاگیرداروں کے خلاف تھا۔

انقلاب کے نام پہ بہنے والا خون سرمایہ داروں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا۔ اب نیبولین کے عہد کا آغاز ہو رہا تھا تو یورپ میں اپنی حاکمیت کو قائم کرنے کے لئے جنگیں کی گئیں جسکی وجہ سے یورپ میں معاشی بحران کا دور دورہ گیا۔

۱۸۰۰ء کے آغاز میں یورپین سلطنیں زوال کا شکار ہوئیں۔ ہسپانوی، پرتگیزی اور فرانسیسی نوآبادیاں جو کہ امریکہ میں تھیں انہوں نے نیولین جنگوں کے بعد آزادیاں حاصل کر لیں۔ ڈچ بھی انہیں بڑی سلطنت کھو بیٹھے اور اب وہ دوسری غیر ملکی کالونیوں سے کاروبار کرتے تھے۔ انگریزوں نے بھی شمالی امریکہ کی اصل نوآبادیاتی کالونی کھودی جو ۱۷۷۶ء میں آزاد ہوئی لیکن پھر بھی ایک نوآبدیاتی طاقت رہی۔

انگلستان نے جو امریکی نوآبادی قائم کی تھی اُسے برقرار رکھنے میں وہ ناکام ہو گیا۔ امریکہ نے آزادی حاصل کر لی اور اب انگلستان کو ایسے علاقے کی ضرورت تھی جو زرخیز ہوتا تا کہ اُس کی ہر طرح کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ امریکہ کے بعد ہندستان کی سرزمین بہت زرخیز تھی لہذا ہندوستان کی زمین کو کاشتکاری کے لئے استعمال کیا گیا۔ اور ہندوستان میں ہی دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام بنایا گیا۔ کاشتکاری کے لئے مختلف علاقوں سے لوگوں کو زرعی علاقے میں آباد کیا گیا۔

برطانیہ اُس وقت اپنی نوآبادیات قائم رکھنے میں ناکام ہوا جب امریکی عوام نے اپنے اوپر نوآبادیاتی تسلط کے خلاف آواز اُٹھائی۔ ہندوستان مین جو سب سے بڑا نہری نظام بنایا گیا اُس کے پیچھے بھی بہت سے مقاصد تھے۔ برطانوی افواج کے لئے خوراک کی ضروریات کے بارے منصوبہ بندی کی گئی اور پنجاب کو "GRAINRY" کہا گیا۔ ابھی تک ہندوستان میں وراثتی جاگیروں کا تصور موجود نہ تھا اسی لئے تمام تر زمین ریاست کی ملکیت ہوتی تھی۔ جسے حکومت ہی سنبھالتی تھی۔ اس نوآبادیاتی عمل نے کسانوں پی بُرا اثر ڈالا۔

لارڈ کارن والس نے بدوبست دوامی کا ایک اصول بنایا جسکی وجہ سے جاگیرداری کی ایسی شکل بنی جو کہ آج تک موجود ہے۔ اس کی وجہ سے جاگیرداروں نے خود کو محفوظ سمجھا کیونکہ انہیں انگریزوں کے ساتھ مِل کر عام آدمی کا استحصال کرنے کو مِل رہا تھا۔ جبکہ اس پہلے وہ بااختیار نہیں تھے۔ کیونکہ اُن کی موت کے بعد زمین واپس حکومت کے ہاتھوں میں ہی چلی جاتی تھی۔ اولاد کا حق اُس جائیداد میں سے تب ہی ملتا تھا اگر حکومت کو رحم آجاتا تھا نہیں تو وہ زمین حکومت کے ہاتھ ہی رہتی تھی۔ اور آہستہ آہستہ زمین کی خرید و فروخت بھی شروع ہوگئی تھی اور زمینی جائداد وراثت میں بھی دی جانے لگی اور ہندو شانی معاشرہ جدید بیداواری تعلقات سے محروم ہونے لگا جسکی وجہ سے ترقی اور ارتقائی عمل روک لیا گیا۔

بنگالی ہندوؤں نے انگریزوں کے ہاں نوکریاں شروع کر دیں جسکی وجہ سے متوسط تنخواہ دار طبقہ پیدا ہوا۔ اس طبقے نے نوآبادیاتی طبقے کی تعلیم میں دلچسپی ظاہر کی کیونکہ اُنہیں مستقبل میں انتظامی امور سنبھالنے کا نظر آرہا تھا۔ ٹھیک اسی طرح خاص طبقے نے تاجروں کے ہاں جنم لیا۔ انہوں نے انگریزوں کی فوج کے ٹھیکے لئے اور اسی طرح مقامی تاجروں نے سرمائے کی شکل بدلی۔ کوسٹل ایریا میں مسلمانوں کا بھی ایک چھوٹا سا طبقہ پیدا ہوگیا جو کہ ترقی کا خواہاں تھا۔ اور یہ دستہ زوال پذیر ہوگیا جب مسلمانوں سے حکمرانی چھین گئی اور انہوں نے نئے علوم سے بھی دوری اختیار کر لی۔ ہندو اس کے بالکل برعکس تھے انہوں نے چھوٹے چھوٹے ٹھیکے لینے شروع کر دیئے اور اِن کی مدد سے کارخانے لگائے۔ (۱۱۴)

لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے کیوں کہ:

> ''اگر صنعت کار غلام بنا کر رکھا جائے تو مصنوعات نشونما نہیں پاسکتے۔ اس نظام کا بدترین نتیجہ یہ تھا کہ کمپنی کے ملازموں نے تو ہندوستان کے صنعت کاروں پر اختیار حاصل کرلیا تھا لیکن دوسرے یورپیوں نے زیادہ اختیار حاصل کر لئے تھے اور ان کے استعمال میں زیادہ سختی برتتے تھے۔'' (۱۱۵)

سرکاری طبقہ کسی حد تک ایسٹ انڈیا کمپنی سے لگاؤ رکھتا تھا کیونکہ مغلیہ دور میں اُنہیں اتنے تحفظ حاصل نہ تھے جتنے کہ اُس دور میں تھے۔ اگر ایک جولاہا کپڑا تیار کرتا ہے تو وہ دربار یا صوبائی حاکم کی اجازت کے بغیر اسے منڈی میں بیچنے کا حق نہ رکھتا تھا۔ اگر حاکم کو کپڑا پسند آتا تو رقم بھی وہی ادا کرتے لیکن کب اس بات کا اندازہ نہ تھا جسکی وجہ سے سرمایہ داری کو

بہت نقصان ہوا۔ کاروباری گردش آ کر جاتی تھی اور تاجر دیوالیہ ہو جاتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اس کے بالکل برعکس تھی وہ تاجر کو رقم موقع پہ ادا کرتے تھے۔ رقم کم دے دیتے تھے لیکن نقد دیتے تھے۔ جسکی وجہ سے تاجروں کو محسوس ہوا کہ یہ کمپنی ان کی خیر خواہ ہے اسی وجہ سے تجارتی طبقہ کمپنی کے حق میں تھا۔ ۱۸۱۳ء میں کمپنی کی اجارہ داری ختم ہونے کے باوجود ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوسرے انگریز تاجر بھی ہندوستان میں تجارت کرنے لگے۔ اب مختلف تاجروں کے ذریعے صنعتی سرمایہ ہندوستان سے نہایت کم قیمت پہ خام مال اکٹھا کر رہا تھا اور کاشتکاری کے شہر کے مظلوم کاریگروں کا مجبور کیا جا رہا تھا۔ اس ساری صورتحال میں کمپنی کی حکمت عمل ایسی رہی کہ جدید ہتھیاروں سے لیس فوج کو منظم کیا جائے جو کہ مخالفین کو ختم کرنے کے لئے استعمال ہو۔ حکمرانی کی خاطر دربار میں سازشیں کروائیں گیں اور ریاستوں کو آپس میں لڑوایا گیا۔ امراء کو خریدا گیا تا کہ سیاسی طاقت بھی مل سکے۔ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ عوام کو سراج الدولہ دے لارڈ کلائیو بہتر لگنے لگ گیا تھا کیونکہ مقامی حکمران بس رعب و دبدبے کے علاوہ کچھ نہ رکھتے تھے۔ کمپنی لوگوں کو دولت دے رہی تھی اور تجارت میں اُن کی مدد کر رہی تھی۔ ابتداء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے مفادات کی خاطر عیسائیت کو بھی استعمال کیا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد عیسائیوں کے ہاتھوں سے انگریزوں نے تبلیغ کھینچ لی اور ریاست کو اور مضبوط کرنے لگے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ میونسپل کمیٹیاں اور کارپوریشنیں بنائیں جائیں۔ سڑکیں بھی بنائیں گئیں اور برقی تار کا انتظام بھی بہتر بنایا گیا۔ پولیس کا شعبہ بنایا گیا اور شہر میں گشت ہونے لگا۔ انہی وجوہات کی بنا پہ مسلمان معاشی طور پر کمزور ہو گئے اور ہندو انگریزوں کے ماتحت ہو گئے لیکن ہندوؤں نے تجارت شروع کر دی تھی اور تجارت پہ قبضہ حاصل کر لیا ہوا تھا۔ زرعی رقبہ جو مسلمانوں کی ملکیت تھا وہ بوجہ استحصال بنجر ہو گیا تھا۔ نقد روپے صرف ہندوؤں کے پاس تھے کیونکہ انہوں نے تجارت شروع کر دی تھی۔ ٹھیک اسی طرح دونوں قوموں کو بانٹا گیا اور کوٹہ بنایا گیا۔ کاشتکاری جس سے ملک کا بڑا بڑا حصہ وابستہ تھا تباہ ہوئی۔ زمین کی زرخیزی ختم ہو گئی اور بہتر نظام کاشتکاری وجود مین نہ آیا پھر بھی زمینداری اس لئے برقرار رکھی گئی کہ وفاداروں کا گردہ ہر وقت مدد کے لئے موجود رہے۔ کاشتکاری کی اس تباہی کے بعد صنعتیں بھی زوال پذیر ہوئیں اور اس کی جگہ بہت دنوں تک مشینی صنعت نے لے لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی ترقی برطانوی سرمایا داری کی ترقی کے لئے روک دی گئی۔ اس مین کچھ شک نہیں کہ اس طرح کچھ بنئے سرمایادار بن گئے اور معمولی سرمایا داری یہاں بھی شروع ہو گئی۔ یہ سرمایا داری اپنی ابتدائی منزل میں برطانوی سرمایا داری سے ٹکر لینے یا مقابلہ کرنے کی بجائے اس کی نوازشات میں پلتی رہی۔

اسی استحصال کی وجہ سے بنگال اور بہادر میں کسان بغاوتوں نے جنم لیا۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جو فصلیں انگریز کو پسند تھی وہ بس اُنہی کو کاشت کرنے کا حکم دیتا تھا اور اُنہی سے منافہ بھی بے بہا ملتا تھا انگریزوں کو۔ افیون اور پٹ سن کی

کاشت نے انگریزوں کے دور میں بنگال میں قحط کی صورتحال پیدا کر دی تھی۔ کیونکہ جن فصلوں سے خوراک حاصل ہوتی تھی اُنہیں کاشت کرنے کی طرف دھیان ہی نہیں دیا گیا۔ اور اس قحط میں تقریباً ایک کروڑ بنگالی ہندوستان لقمہ اجل بن گئے۔ اسی طرح ہندوستان کا کمزور ترین طبقہ بھی انگریزوں کے خلاف ہو گیا۔

اب لسانی معاملات نے جنم لیا۔ فارسی اب ریاستی اور دفتری زبان سے ہٹا دی گئی تھی۔ جب فارسی کی حاکمیت دور ہوئی تو نئے حکموں کی زبان کی دوامی نے مسلمانوں کو زبان سے بھی محروم کر دیا۔ اب جو حاکم تھے وہ سپاہی بن رہے تھے۔ حاکم بھی ایک ایسی قوم بن رہی تھی جنہوں نے اِسی ملک کو بے روزگار بنا دیا تھا اور لوٹتے آ رہے تھے۔ انصاف کا عمل ختم ہو گیا کیونکہ مسلمان قاضیوں کو عدالتوں سے غائب کر دیا گیا تھا۔ قوانین ایسے بنائے گئے جن میں حاکم کے لئے اور قانون اور محکوم کے لئے اور قانون جس کی وجہ سے ایک نیا استحصال شروع ہو گیا۔ جج کی حیثیت بس ایک گورا ہی رہ سکتا تھا۔ مقامی جج کسی انگریز کا مقدمہ نہیں سُن سکتے تھے جبکہ مقامی مسائل کے حل کے لئے انگریز اور مقامی ججز دونوں ہی سنتے تھے۔ گورے جج کی عدالت بھی الگ لگائی جاتی تھی اور عام آدمی کی اُس تک رسائی نہ تھی۔ نوآبادیات نے انگریزی زبان اور آمرانہ قوانین کو لاگو کر کے خود کو ہندوستان میں محکم بنا لیا۔

جیسے جیسے نوآبادیاتی فکر نے اپنے اداروں کی تشکیل کی تو ولیم جونز نے بنگال میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ جسکا مقصد یہ تھا کہ وہ خفیہ اطلاعات و معلومات اکٹھی کرتی تھی، مشرق کے فنون، سائنسی علوم، ادبیات، تاریخ اور آثار قدیمہ کے بارے میں تحقیق کرنا شامل تھا۔

اب انگریزوں نے ایک ایسے کالج کا آغاز کیا جس میں صرف اور صرف انگریزوں کو ہی تعلیم دی جاتی تھی اور تعلیم بھی مقامی زبانیں سکھانے کی تھی بجائے کی ہندوستانی زبانیں سکھائی جائیں۔ انہوں نے اردو اور ہندی صرف اس لئے سیکھی کہ اِن زبانوں سے روشناس ہو کر ہندوستانی کلچر کو بھی جان جائیں گے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیرؔ اپنی کتاب مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں لکھتے ہیں:

> ''یورپیوں نے ہندوستانی زبانوں کا مطالعہ اپنی زبان کے نظامِ معنی کے تحت کیا۔ نوآبادیاتی سیاق میں زباں کا سوال اول اول ایک ثقافتی رکاوٹ کے طور پر سامنے آتا اور بعد ازاں ایک ثقافتی منصوبے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ثقافتی رکاوٹ دور کرنے کی غرض سے محکوم ملکوں کی کلاسیکی اور ورنیکلر زبانیں سیکھی جاتیں، ان کے قواعد، لغات مرتب کیے جاتے؛ ان پر تحقیق کی جاتی اور ان کی تحصیل و تعلیم کے لیے ادارے وجود میں لائے جاتے ہیں کیونکہ جب تک یہ ثقافتی رکاوٹ موجود ہے محکوموں کے لیے نہ احکامات جاری کیے جا سکتے ہیں، نہ ان سے ٹیکس اکٹھا کیا جا سکتا ہے، نہ اپنے وضع کیے گئے قانون کی

حکمرانی قائم کی جاسکتی ہے۔''(۱۱۶)

جب فورٹ ولیم کالج میں اردو کی کلاسز جاری کی گئیں ساتھ ہی ہندوستانیوں کے لئے ہندی تدریس کا بھی کام جاری کی اگیا تا کہ انگریز افسران اِس زبان کو سیکھیں اور اُنہیں کسی قسم کی مشکل درپیش نہ آئے۔ یہاں انگریزوں نے ایک اور چالا کی کی کہ ایک ہی زبان کو دو حصوں میں بانٹ دیا، اردو اور ہندی جسکی وجہ سے اردو ہندی تنازعات نے جنم لیا۔ بقول ناصر عباس نیر:

''ہر نوآبادیاتی صورتحال دولسنیات کو جنم دیتی ہے۔ مگر دونوں زبانیں برابر رتبے کی نہیں ہوتیں نو آباددار کی زبان اسی کی مانند مہذب اور افضل ہوتی ہے، جبکہ نوآبادیاتی اقوام کی زبانیں، گنوار لوگوں کی زبانیں ناشائستہ ہوئیں ہیں، زبان کا اقداری درجہ اس کے بولنے والوں کی نسبت سے متعین ہونے لگتا ہے۔''(۱۱۷)

انگریزوں نے ہندستانیوں کو اُن کی زبنی زبان وثقافت سے بیزاری پیدا کر دی۔ عام آدمی کو یہ احساس دلانا بہت ضروری تھا اور یہی وجہ اِن کے زوال کا سبب بنی۔ اسی نوآبادیاتی کلچر کی وجہ سے ہی ہندوستان کے مقامی لوگوں میں بھی کلچر، تعلیم اور نفصیات کی بنا پہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ اِن میں کچھ قدامت پسند لوگ شامل تھے اپنے علم و کلچر اور اخلاقیات واقدار میں آنے والی نئی تبدیلی کو قبول کرنے پہ تیار نہ تھے اور دوسرے وہ لوگ تھے جنھوں نے اِن چیزوں کو فرسودہ قرار دیا اور جدید خیالات وعلوم میں ڈھلنے لگے۔ انہی دو حصوں کی وجہ سے یہ گروہ آپس میں دشمن ہوئے اردوسرے کو بُرا بھلا کہنے اور ثابت کرنے پہ تُل گئے۔ انہیں طبقات نے مغلوں کو زوال کا شکار بنایا بلکہ ہندوستان کو بھی زوال دیا اور اس طرح پیش کیا کہ بس انگریز ہی اُنہیں اس سے بچا سکتے ہیں اُن میں سب سے پہلے مسلمانوں کے جدت پسند سرسید احمد خان تھے جنھوں نے انگریزی زبان کو انگریزوں کی ملازمت کے لئے ضروری اور مفید قرار دیا۔ پروفیسر امجد علی شاکر کہتے ہیں کہ:

''سرسید احمد خان کالونیلزم کے نظریہ ساز تھے۔ اُن کے ہاں قومی آزادی کی بجائے دائمی غلامی کا تصور ملتا ہے۔ وہ قوم کو جس کے ساتھ آزادی کی تصور وابستہ ہے۔ یہ اصلاح سرسید احمد خان کے ہاں تلاش کرنا عبث ہے۔''(۱۱۸)

اب انگریزوں نے اپنی جڑیں مضبوط کیں اور ترقی کے کاموں کی طرف توجہ دینا شروع کر دیا۔ سڑکوں کی تعمیر کرائی گئی اور ریل کی لائن بھی بچھائی گئی جسکے ذریعے خام مال برطانیہ پہنچایا گیا۔ اس کی وجہ سے کام میں جلدی بھی ہوئی کیونکہ مہینوں کا سفر اب کچھ دنوں میں کٹ جاتا تھا۔ اور کئی دفعہ انگلستان میں خام مال کی کمی کی وجہ سے کارخانے بند ہو جاتے تھے۔ انگریزوں نے اپنے کارخانے چلانے کے لیے پوری دنیا سے خام مال اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ہندستان سے انگریز گرم مصالحہ، سوتی کپڑا، پٹ سن، ہیرے جواہرات اور تانبے کے برتن بھی برآمد کرتا تھا۔

''یہ سچ ہے کہ ہندستان میں انگریزوں نے سڑکیں بنائیں، ریل کی پٹڑیاں بچھائیں، تار برقی کا سلسلہ جاری کیا وغیرہ مگر ان سب 'برکات' کے اصل مقاصد کچھ اور تھے۔ ضمناً لوگوں کو کچھ اور سہولتیں بھی میسر آگئیں۔''(۱۱۹)

عام طور پہ انگریزوں نے ہندوستان کو خام مال تیار کرنے والا ملک بنا دیا تھا اور اپنے ملک یہاں سے خام مال بھیجنے کے لئے جلد سے جلد کا کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستان سے جانے والے خام مال کو تیار کا کی جاتو اور پھر اسے مختلف مما لک میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اس سے ہندوستان کی مقامی صنعت کو بہت نقصان ہوا اور برطانوی صنعت کو ترقی حاصل ہوئی۔ ریاست میں تعلیمی نظام نافذ کیا گیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اس قابل ہو جائیں کہ وہ مغربی مفادات کی نگرانی کر سکیں۔ نوآبادیاتی عہد نے ایسے ہندوستانی ذہن پیدا کئے جو انگریزوں کے خلاف بالکل آواز نہ اُٹھاتے تھے اور سلطنت برطانیہ کو بہت اچھا سمجھتے تھے۔ انگریزوں نے ایسے رویے اختیار کئے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہندوستانی لوگوں کو جاہلیت اور پسماندگی سے نکال کر مہذب اور خوشحال بنانا چاہتے ہیں۔

لارڈ میکالے کا کہنا تھا کہ وہ ہندوستان میں ایسا تعلیم کا نظام رائج کرنا چاہتے ہیں کہ جس سے ایسا طبقہ پیدا ہو جو رنگت کے اعتبار سے کالا اور فکری اعتبار سے گوروں کے مفادات کا نگہبان ہو۔ جب جدید علم، اقدار، تصورات، نظریات پر مشتمل نوآبادیاتی علاقے کی تشکیل ہوئی تو ساتھ ہی ابلاغ کے بھی جدید طریقے متعارف کروائے گئے۔ انگریزوں نے ہی ہندوستان میں اخبارات و رسائل متعارف کروائے۔ اِن اخبارات کے ذریعے مغربی و مشرقی نظریات کو پھیلایا گیا۔ سرسید احمد خان نے بھی اس تحریک میں خوب حصہ لیا۔ اِن کا نظریہ بھی یہی تھا؛ کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ جدید علم اور تصورات کے بارے آگاہی دی جائے اور اُنہیں اس طرف راغب کیا جائے۔

انگریزوں نے نوآبادتی تمدن کے ذریعے ہندوستانیوں کو یہ احساس دلانا شروع کیا کہ وہ گھٹیا اور غیر مہذب ہیں جبکہ اِن کے مقابلے میں انگریز بہت اعلیٰ قوم ہے۔ وہ ہندوؤں کو اس طرح تہذیب سکھانے لگے جیسے کہ وہ اس سے واقف ہی نہ ہوں۔ لیکن اُن کی اس حرکت نے ہندوستان کے مقامی لوگوں میں عجیب قسم کی حیرت کو جلم دیا کہ انگریز منافق ہیں۔ انگریز کی نظر میں جو ہندوستان بہت خوبصورت اور دلکش تھا وہ اچانک اُنہیں بدصورت اور گھٹیا نظر آنے لگا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب انگریز حکومت سنبھال رہے تھے اور مقامی لوگ اُنہیں حکومت دے رہے تھے۔ کارل مارکس کہتے ہیں کہ:

''انگلستان نے ہندوستان سماج کے پورے ڈھانچے کو توڑ ڈالا ہے اور اب تک تعمیر نو کے کوئی اثار نظر نہیں آرہے ہیں۔''(۱۲۰)

ہندوستان میں جب انگریز تجارت کی غرض سے آئے تھے تب ہندوستان بہت خوشحال تھا۔ زراعت اور گھریلو

صنعت ترقی کر رہی تھی۔ انگریزوں نے اپنے مفادات کی خاطر ہندوستان کے چین وسکون اور ترقی کو تباہ کر دیا۔ بنگال جیسے زرخیز اور زراعت سے مالا مال علاقے میں قحط کی صورتحال پیدا ہو گئی اور لاکھوں لوگ موت کا شکار ہو گئے ہماضی میں عام آدمی برسر اقتدار طبقے سے متاثر ہوا کرتا تھا۔ اُن کے دلوں میں بسنے والے اِن کے قومی بادشاہ، شہزادے، رانیاں، بیگمات، مقامی ہیرو اور مقدس لوگ ہوا کرتے تھے۔ جبکہ انگریزوں نے انہیں ذلیل وخوار کر کے رکھ دیا۔ ہندوستان کے لوگوں کو دلی طور پر اس بات کا دکھ تھا کہ انگیزوں نے اُن کے معاشرے میں گڑبڑ کی اور انتشار پھیلایا۔ غدر کا واقعہ انہیں بنا پہ پیش آیا۔

آزادی کی جنگ میں حصہ لینے والے زیادہ تر وہی امراء اور شہزادے تھے جو کہ شہریفانہ طور پہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ بغاوت اتنی زبردست تھی کہ برطانوی فوج کا ہر وہ سپاہی بھی اُن کے خلاف ہوا جو کہ کالا تھا جیسے اس بات کا غم تھا کہ انگریز کی فوج میں انگریز افسروں اور سپاہیوں کو ہندوستانی افسروں اور سپاہیوں سے زیادہ مرعات حاصل ہیں۔ ایسے حالات میں شنریوں کے آنے سے ہندو مسلم تضاد اور بڑھے، عیسائیوں نے مقامی لوگوں کے مذہب میں منفی باتیں نکالنی شروع کر دیں اب ہندو و مسلم طبقات میں اس بات کا ڈر ظاہر ہوا کہ کہیں ان کا مذہب بھی نہ ان سے چھن جائے۔ مزید کارتوس والے واقعے میں گائے اور سور کی دحربی کے استعمال سے جنگ آزادی کی آگ مزید بھڑکی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی لڑی گئی لیکن اُس وقت ہندوؤں کے پاس انگریزوں کے مقابلے میں جدید ہتھیار نہ ہونے کے برابر تھے۔

دوسری طرف انگریزوں کے تربیت یافتہ ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کی۔ ویسے بھی مغلیہ سلطنت کھوکھلی ہو چکی تھی۔ اب ہندوستانی سلطنت برطانیہ کے قبضے میں آ گئی تھی۔ لیکن برطانوی حکومت نے اس کا انتظامی ڈھانچہ مغلیہ سلطنت کے ہی طرز پہ رکھا۔ مقامی مذاہب کو عزت اور احترام بخشا گیا۔ اب انصاف بھی ہر شخص کو اُس کے مذہب کے مطابق ہی دیا جائے لگا۔ ذرائع ابلاغ نے بہت اچھا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ راجوں، نوابوں، موروثی بادشاہوں اور امراء کی زیادتیوں کو سر عام لایا جانا شروع کر دیا گیا۔ ایسے اقدامات کے بعد انگریز وہاں کے باسیوں کو یہ احساس دلاتے تھے کہ ہمارے آنے سے پہلے آپ کیسی زندگی بسر کر رہے تھے۔ عوام کو یہ احساس دلایا جاتا کہ آپ کے جتنے حقوق انگریز ریاست میں پورے کر رہے ہیں اُتنے کوئی حکمران نہیں پورا کر سکتا۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ انگریزوں نے خود کو ریاست کے حکمرانوں کو ظالم ثابت کرتے تھے۔ ملکہ برطانیہ کے آنے پر کچھ حالات بہتر ہوئے۔ ریاستی حکمران اپنی فوج نہ رکھ سکتے تھے لیکن ملکہ نے انہیں فوج رکھنے کی اجازت دے دی انقلابی سوچ کے حامل لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ انگریز حکومت نے تمہیں اپنی رائے دینے کی آزادی دے رکھی ہے جو کہ پہلے نہ تھی۔

انیسویں صدی میں یورپ میں آزادی کے تصورات کو اجاگر کیا گیا۔ اور فلسفہ، نفسیات اور سوشل ریفارمز کی بڑی

تحریکیں چلائیں گئیں۔ جمہوریت کو ضروری سمجھا گیا اور عورتوں کو اُن کے حقوق و آزادی دی گئی۔ ایسی اصلاحات سے ایک نئی روح پیدا ہوئی جسمیں ایک ایسے پلیٹ فارم کی کمی محسوس کی گئی جسکے ذریعے وہ انگریزوں سے اپنے مطالبات یہ بات کر سکیں۔ آل انڈیا کانگرس کی بنیاد رکھی گئی اور ایک باشعور طبقے نے اس جماعت کی قیادت سنبھالی۔ اس جماعت کے کوئی سیاسی مقاصد نہ تھے کیا کیونکہ اس پارٹی کیپہلے چارٹر میں صرف مطالبات اور مسائل کا ذکر ہوا تھا۔ اور چند اصلاحات کی خواہش کی گئی تھی۔ ایک طویل عرصے تک یہ جماعت مطالبات ہی پیش کرتی رہی۔ بعد میں جب ہندوستان کے سیاسی اور سماجی رویے میں تبدیلی نظر آئی تو اس جماعت کا نام آل انڈیا نیشنل کانگرس رکھ دیا گیا۔ بقول عبداللہ ملک:

> ''انگریز نے انہی ضرورت کے لئے انڈین نیشنل کانگرس جو ایک انگریز افسر مسٹر ہیوم کے ذریعے قائم کی تھی لیکن جیسے جیسے یہ جماعت منظّم ہوتی گئی اور ہندوستانیوں کے حقوق کے لئے اس کی آواز میں قدرے گھن گرج آنے لگی۔ تو کچھ انگریز افسروں کو یہ بات کھلنے لگی۔''(۱۲۱)

ہندوؤں کو اس بات کی تربیت دی گئی کہ کسی ایک پلیٹ فارم سے پیش کئے گئے مطالبات زیادہ پر اثر اور قانونی ہوں گے۔ برطانیہ یورپ کا ایک ایسا عیسائی ملک تھا۔ جس نے اپنا خرچ خود بن لیا تھا۔ بادشاہ چرچ آف انگلینڈ کا سربراہ ہوا کرتا تھا اور یہاں بہت سے حکومتی طریقہ کار رائج تھے۔ انگریز کے غیر ساوانہ سلوک نے اُنہی لوگوں میں رشوت ستانی میں بھی اضافہ کیا۔ اسی وجہ سے ان لوگوں نے مختلف باتیں بھی سیکھیں جو کہ بعد میں اُن کے کام آئیں۔ وہاں کے لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ وہ اکثریت میں ہیں اور قدیم ترین تہذیبوں کے مالک ہیں اور یہ کہ اُنہیں انگریزوں سے لڑنا چاہئے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی برطانوی حکومت نے مشکلات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ بنگال مین انتظامی امور ٹھیک طریقے سے نہیں رحل رہے تھے۔ جس کے باعث اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ برطانوی حکومت کی بدانتظامی اور سرکاری نظم و نسق کی کمزوری کے باعث یہ فیصلہ لیا گیا تھا لیکن ہندوؤں کے سخت ردِعمل کی وجہ سے اُنہیں اپنا یہ فیصلہ واپس لینا پڑا۔ ۱۹۰۵ء میں جب تقسیم بنگال ہوا تو مسلمانوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی کیونکہ وہ اس فیصلے سے مستقبل میں معاشی و معاشرتی حالات میں بہتری کے آثار دیکھ رہے تھے۔ لیکن ہندوؤں نے ہنگامے شروع کر دیئے اور بالآخر برطانوی حکومت کو (۱۹۱۱ء) میں تقسیم بنگال کا فیصلہ واپس لینے کا اعلان کرنا پڑا۔ اسی بنا پہ ہندو مسلم تضاد میں شدت آئی اور مسلم لیگ متحرک ہوئی۔ اب ہندوستانی معاشرے میں مذہبی اور قومی تحریکیں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے لگیں اور سیاسیات کا لوگوں کی زندگی پہ گہرا اثر ہونا شروع ہو گیا۔

اردو صحافت کے اب اپنا کردار نبھانا شروع کر دیا۔ نئے اخبارات جاری کئے گئے جن میں زمیندار، الہلال اور ہمدرد سرفہرست ہیں۔ ان اخبارات پر حکومت کی طرف سے سختیاں بھی بہت کی گئیں۔ ملکی و بیرونی حالات ایسے پیدا ہو گئے

تھے کہ ہر آنے والا دن گوروں کے لئے دشواریوں کا پیغام لا رہا تھا۔

اٹھارہویں صدی سے پہلے جرمنی کا نام ونشان بھی دنیا کے نقشے پہ نہ تھا اور یہی بڑی وجہ تھی پہلی جنگ عظیم کی۔ جرمن لوگ مختلف علاقوں میں رہ رہے تھے اُنہیں قیصر ولیم اور بسمارک نے اکٹھا کر کے ایک قومی ریاست بنایا۔ پہلی جنگ عظیم کا آغاز اُس وقت ہوا جب آسٹریا کے شہزادے کو قتل کیا گیا۔ جرمنی قوم جو کہ نئے قومی تصور کے مالک تھے وہ دنیا کی بڑی قوتوں کو چیلنج کرنے لگی کیونکہ وہ عسکری و معاشی طور پر ابھرنے والی نئی قوت تھی اور اُسے اپنی نسل پہ بھی بہت ناز تھا۔ جرمنی ہی دنیا کا وہ پہلا ملک تھا جس نے ایٹم بم کا فارمولہ تیار کر لیا ہوا تھا۔ اور پہلا جنگی جہاز بنانے کا اعزاز بھی اُنہی کے پاس ہے۔ اسی طاقت کی بناء پہ دنیا کے تمام بڑے ممالک جرمنی سے پریشان تھے۔ پہلی جنگ عظیم کی ایک یہ بھی بڑی وجہ تھی کہ بنی کے سرمایہ دارانہ تضادات اور مفادات نے جرمنی جیسے ملک کی طاقت کو روکنا ضروری سمجھا۔ دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہو چکی تھی ایک تو اتحادی سامراجی اور دوسری طرف محوری فاشتوں کا گروہ یہ خرچ کرو، ہم آپ کو وطن واپس لے کر دیں گے۔ دوسری جنگ عظم کے بعد اسرائیل بھی ریاست کی صورت اختیار کر گیا جو کہ اسی وعدے کی تکمیل پہ ہوا۔ ہٹلر انہی وجوہ کی بنا پر یہودیوں کو واجب القتل قرار دیتا تھا۔ اس کے عہد میں لاکھوں یہودیوں کا قتل ہوا۔ اس سبق آموز جنگ نے برطانیہ کو یہ سمجھایا کہ اگر دنیا کے تمام وسائل پہ قبضہ رکھنے کی کوشش کی گئی تو دنیا میں ایسے ملک بھی موجود ہیں جو آپ کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے اور رکاوٹ بنیں گے۔

دنیا کے ان بدلتے ہوئے حالات نے انقلاب روس کا واقعہ ۱۹۱۷ء میں رونما کیا۔ جسکی وجہ سے انگریز سامراج پریشانی میں مبتلا ہو گئے کیونکہ انہیں خطرہ محسوس ہوا کہ اگر دنیا میں انقلاب پسند قوموں کی اکثریت ہو گئی تو اس میں ماسکو کے اثرات پھیل جانے کا خطرہ ہے۔ جب ہندوستان میں ہجرت موومنٹ چلی تو لوگوں نے افغانستان اور روس کی مسلم ریاستوں کی طرف ہجرت کرنا شروع کر دی۔ اب مقامی طور پر بھی ہندوستان کی سیاست میں تبدیلی واقع ہونے لگی جب نظریاتی اختلاف پر قائداعظمؒ نے آل انڈیا کانگرس سے علیحدگی اختیار کی اور ۱۹۲۴ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ قائداعظم سے پہلے مسلم لیگ میں کوئی بھی شخصیت نہ تھی جو قائداعظم کا مقابلہ کر سکے۔ جب قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تب اس جماعت میں جاگیرداروں اور وڈیروں کی اکثریت تھی۔ ان کی شمولیت سے مسلم لیگ کو عوامی سطح پر بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اقبال کے نظریے نے قائداعظم کے ارادے اور بھی مضبوط کر دیئے اور اسی طرح دن بدن مسلم لیگ کی سیاسی ساکھ میں اضافہ ہونے لگا۔ اب نوآبادیات کے زیر اثر ہندوستانی سیاست کانگرس اور مسلم لیگ کے گرد گھومنے لگی۔ مختلف سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی اختلافات کے باعث کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان سیاسی کشمکش

ہیں اضافہ ہوا اور دونوں جماعتوں نے الگ الگ ہندو مسلم شناخت کی ترجمانی کی۔ ہندوستان پر سامراج کی گرفت کمزور ہونے لگی۔

برطانیہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر قبضہ کرنے والا ملک بن گیا تھا۔ اس نے اپنے فوجیوں کا غذائی مسئلہ حل کرنے کے لئے بنگال کا سارا اناج خرید لیا جس کے باعث ہوں قحط کا دور دورہ ہوا جس میں لاکھوں لوگ جان کی بازی ہار گئے۔ ہندوستان کے قریب جاپان آ پہنچا تھا۔ مالیاتی سرمایہ دار صنعتوں کا آپس میں مقابلہ رکھتے اور زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لئے نئے کارخانے لگائے جاتے لیکن اس کا فائدہ صرف سرمایہ دار کو ہی ملتا تھا سرمایہ دار آپس میں بیٹھ کر اشیاء کی قیمتیں طے کر لیا کرتے تھے اور ایک خاص حد تک رکھ کر مرحلہ وار قیمتوں میں اجافہ کیا جاتا تھا۔ صارفین کو یہ تاثر دیا جاتا کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ اور مقابلہ ایک دوسرے سے برتری لینے کی خاطر کر رہے ہیں لیکن پردے کے پیچھے سمجھوتے کئے جاتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے رونما ہونے میں بھی انہی کا ہاتھ تھا کیونکہ طاقت ور مما لک نے جونیٹ ورک تیار کیا تھا وہ صرف مالیاتی سرمایہ داری کے لئے ہی مفید تھا اب معاشی طور پہ برطانیہ کمزور ہو گیا تو امریکہ نے دنیا کی قیادت کو سنبھالا۔ جاپان پہ ایٹم بم گرایا گیا تو انسانیت کی بقا کی کمی کو محسوس کیا گیا۔ کروڑوں لوگوں کی موت نے سوچ کے دائرے کو اور وسیع کر دیا۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مستقبل میں جنگ نہیں ہوگی۔ اب آئی ایم ایف اور اقوام متحدہ جیسے ادارے بھی تشکیل ہوئے۔

نوآبادیاتی فکر اور اس کا خوف بلا مقصد نہ تھا کیونکہ کچھ عرصے بعد چین میں کسان انقلاب رونما ہوا۔ روس اور چین جیسی صورتحال ہندوستان میں بھی پیدا ہو سکتی تھی لیکن یہاں علامہ اقبال اور قائد اعظم بہت احتیاط سے تمام مسائل کا دل ڈھونڈ رہے تھے۔ لیکن پھر بھی تقسیم ہند اور اس کے نتیجے میں قیام پاکستان کے موقع پر بہت سی لڑائیاں لڑی گئیں۔ انسانیت کا خون بہایا گیا۔ یہ سب انہی تضادات کا نتیجہ تھا جس کو انگریز اپنے نوآبادیاتی مفادات کے لئے استعمال کرتا آیا تھا۔ اس موقع پہ صرف ہندو مسلم کا نہیں صرف انسانیت کا خون ہی بہتا دکھائی دیتا تھا جو کہ یہاں سامراجی قوتوں کا بہنا چاہئے تھا۔

تقسیم ہند میں سب سے زیادہ قربانیاں پنجابیوں نے دیں۔ پنجاب دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور وہاں قتل و غارت کا دور دورہ ہو گیا۔ جن لوگوں کا کوئی رشتہ دار ہجرت کے وقت لڑا تھا وہ اب بھی ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تقریباً دس لاکھ سے زائد لوگ موت کے منہ میں دھکیلے گئے، بچپن ہزار مسلمان عورتیں ہندوؤں اور سکھوں کے تسلط میں آ گئیں اور اتنی ہی ہندو اور سکھوں کی عورتیں مسلمانوں کے قبضے میں آ گئیں۔ پاکستان اور بھارت ایک دوسرے کے دشمن بن گئے لیکن ان سب فسادات کی جڑ سامراجی قوتیں یہاں سے صاف بچ کر نکل گئیں۔

حوالہ جات/حواشی

۱۔ روحی البعلبکی، الدکتور، المورد، قاموس عربی۔ انگلیزی، دارالعلم للملایین، بیروت: لبنان، طبع ہفتم، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲۰۵

۲۔ محمد مرتضیٰ الزبیدی، مؤلف۔ تاج العروس من جواھر القاموس، بیروت: لبنان، منشورات دار مکتبہ الحیاۃ، ص ۳۱۵

۳۔ جمال الدین محمد، ابی الفضل، مؤلف۔ لسان العرب، قم: ایران، نشر ادب الحوزۃ، ۱۴۰۵ھ ۱۳۶۳ق، ص ۵۴۵

۴۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، کراچی: مکتبہ دانیال، طبع اول، ۱۹۷۷ء، ص ۱۴

۵۔ خلیفہ عبدالحکیم، مقالات حکیم، جلد سوم، لاہور: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۶۹ء، ص ۲۱۹

۶۔ سلطان محمد صابر، تاریخ قدیم پشتو اور پشتون، کوئٹہ: پشتو اکیڈمی، ۱۹۷۷ء، ص ۵۲۷

۷۔ نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر، اسلامی ثقافت، لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۸۴ء، ص ۲۷

۸۔ اُردو لغت (تاریخی اُصول پر)، جلد ششم، کراچی: اُردو ڈکشنری بورڈ، ۱۹۸۳ء، ص ۸۶

۹۔ روحی البعلبکی، الدکتور، المورد، قاموس عربی۔ انگلیزی، دارالعلم للملایین، بیروت: لبنان، طبع ہفتم، ۱۹۹۵ء، ص ۴۰۰

۱۰۔ محمد التونجی، الدکتور، المعجم المفصل الادب، جلد اوّل، دارالکتب العلمیہ، بیروت: لبنان، ص ۳۰۰

۱۱۔ جمیل جالبی، قومی انگریزی اردو لغت، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء

۱۲۔ جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، کراچی: الیٹ پبلشرز لمیٹڈ، ۱۹۷۳ء، ص ۵۰

۱۳۔ فیض احمد فیض، پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش۔ مرتبہ شیما مجید، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۴

۱۴۔ فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، کراچی: ادارۂ یادگارِ غالب، فروری ۱۹۷۶ء، ص ۱۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۷

۱۶۔ عابد حسین، سیّد، قومی تہذیب کا مسئلہ، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو، ۱۹۹۸ء، ص ۱۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۴۔۱۳

۱۸۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص ۹

۱۹۔ ایضاً،ص۹

۲۰۔ ایضاً،ص۹

۲۱۔ غلام علی حداد عادل،ڈاکٹر، تمدّن برہنگی اور برہنگیٔ تمدّن،مترجم،یونس جعفری،ڈاکٹر،اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،طبع دوم،۲۰۰۸ء،ص۹

۲۲۔ Raymond Williams, Keywords: *A Vocabulary of Culture and Society*, New York: Oxford University Press, Revised Edition,1983, P.87.

۲۳۔ http://www.merriam-webster.com/dictionary/culture

۲۴۔ Raymond Williams, Keywords: *A Vocabulary of Culture and Society*, New York: Oxford University Press, Revised Edition, 1983, P.87.

۲۵۔ Online Etymology Dictionary, at:http://www.etymonline.com/index.php?term=culture&allowed_in_frame=0 Retrieved on:17 June, 2016, 12:38 p.m.

۲۶۔ Philip Bagby, *Culture and History*, Berkeley and California: University of California Press, 1959, P.73

۲۷۔ Ditto, P.73

۲۸۔ Kevin Avruch, *Culture and Conflict Resolution*, Washington-DC: United States Institute of Peace, 4th edition, 2004, P.

۲۹۔ *The Encyclopedia Americana*, Vol.8, International Edition, New York: American Corporation, 1974, P.315

۳۰۔ Alfred L. Kroeber, Clyde Kluckhohn, Culture: *A Critical Study of Concepts and Definitions*, The Museum, Cambridge, Mass., 1952, P.36.

۳۱۔ Ditto, P.36.

۳۲۔ Ditto, P.36

٢٣- Ditto, P.36.

٢٤- Philip Bagby, *Culture and History*, Berkeley and California: University of California Press, 1959, P.76.

٢٥- M. Apte, Language in Sociocultural Context, In: R. E. Asher, Editor, *The Encyclopedia of Language and Linguistics*, vol. 4, Oxford: Pergamon Press, 1994, PP.2000-2010.

٢٦- *The Encyclopedia Americana*, Vol.8, International Edition, New York: American Corporation, 1974, P.315.

٢٧- Alfred L. Kroeber, Clyde Kluckhohn, Culture: A Critical Study of Concepts and Definitions, The Peabody Museum, Cambridge: Mass., 1952, P.13.

٢٨- Joseph Drew, *Civilization Defined*, http://www.wmich.edu/i scsc/ civilization.html, Retrieved on:15 July, 2016, 10:35 a.m.

٢٩- Alfred Kroeber, *Anthropology, Harcourt*, New York: Brace and Company, second edition, 1948, P.9, (footnote 4).

٣٠- Alfred Kroeber, *Style and Civilizations*, New York: Cornell University Press, 1957, P.150.

٣١- Kevin Avruch, *Culture and Conflict Resolution*, Washington-D.C: United StatesInstitute of Peace, 4th edition, 2004, PP.6-7.

٣٢- Edward B. Tylor, *Primitive Culture*, vol.1, London: John Murray, sixth edition, june 1920, P.1

٣٣- T.S.Eliot, *Notes Towards the Defition of Culture*, London: Faber and

Faber, 1961, P.13.

۴۴۔ Ditto, P.120.

۴۵۔ Ditto, P.120.

۴۶۔ Oswald Spengler, *The Decline of the West*, one volume edition, Tr. Charles Francis Atkinson, 1980, reprint of 1932, PP.104-105.

۴۷۔ Bronislaw Malinowsky, *A Scientific Theory of Culture*, North Carolina: Chapel Hill, 1944, P.36.

۴۸۔ Felix M. Keesing, *Cultural Anthropology*, New York: Rinehart and Co. Inc., 1958, P.427.

۴۹۔ Talcott Parsons, *Essays in Sociological Theory*, Glencoe, IL., 1949, P.8.

۵۰۔ Clyde Kluckhohn, *The Science of Man in the World Crisis*, ed.,R. Linton, Concept of Culture, Columbia University Press, 1945, P.14.

۵۱۔ William A. Haviland, *Cultural Anthropology*, Orlando, Florida: Harcourt Brace Jovanovich Publishers, Sixth edition, 1990, P.30.

۵۲۔ روحی البعلبکی ،الدکتور،المورد، قاموس عربی-انکلیزی ،دارالعلمی للملایین ، بیروت ،لبنان،طبع ہفتم، ۱۹۹۵ء،ص۱۰۰۹

۵۳۔ روحی البعلبکی ،الدکتور،المورد،قاموس عربی-انکلیزی ،بیروت،لبنان: دارالعلمی للملایین،طبع ہفتم،۱۹۹۵ء،ص۳۷۰

۵۴۔ Elias Antoon Elias, al-Qamus al-`asri, Inkilizi-`Arabi(Elias' modern dictionary, English-Arabic), Cairo:Elias' Modern Press,10th ed. 1956.

۵۵۔ نُورالحسن نیر،مولوی، نُوراللغات،جلداوّل،راولپنڈی: نیلاب پرنٹرز،طبع سوم،۲۰۰۶ء،ص۱۰۸۸

۵۶۔ اُردو لغت (تاریخی اُصول پر)،جلدپنجم،کراچی: اُردوڈکشنری بورڈ،۱۹۸۳ء

۵۷۔ سیداحمدخان،سر،مقالاتِ سرسیّد،حصہ دہم،مُرتّب،مولانا محمداسماعیل پانی پتی،لاہور:مجلسِ ترقی ادب،طبع

دوم، جون ۱۹۹۲ء، ص ۳۵

۵۸۔ محمد مجیب، تاریخ تمدّنِ ہند، لاہور: پروگریسو بکس، طبع اوّل، ۱۹۸۶ء، ص ۷

۵۹۔ خلیفہ عبدالحکیم، ثقافت، (مضمون) مشمولہ: کلچر۔ منتخب تنقیدی مضامین، مُرتّب: اِشتیاق احمد، کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۴۲

۶۰۔ http://www.merriam-webster.com/dictionary/civilization

۶۱۔ Arnold Toynbee, *A Study of History*, Vol.1, London: Oxford University Press, 1934, P.455.

۶۲۔ Ditto P.455.

۶۳۔ Oswald Spengler, *The Decline of the West*, one volume edition, Tr. Charles Francis Atkinson, 1980, reprint of 1932, PP.104-105.

۶۴۔ Philip Bagby, *Culture and History*, University of California Press, 1959, P.163.

۶۵۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، تلخیص و ترجمہ: عبدالمجید طاہر، لاہور: نگارشات پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص ۳۳

۶۶۔ Matthew Melko, *The Nature of Civilizations*, Boston,MA: Porter Sargent Publisher, 1969, P.8.

۶۷۔ Stephen Blaha, *The Life Cycle of Civilizations*, Auburn,NH: Pingree-Hill Publishing, 2002

۶۸۔ Dario Fernandez-Morera in private correspondence to Joseph Drew: http://www.wmich.edu/iscsc/civilization.html

۶۹۔ Felipe Fernandez-Armesto, *Civilizations, Culture, Ambition, and the Transformationof Nature*, New York: A Touchstone Book, 2001, P.9.

۷۰۔ وحید عشرت، پاکستانی ثقافت کی تشکیل، لاہور: پاکستان فلسفہ اکیڈمی، ۱۹۷۷ء، ص ۴۶

۷۱۔ ایشوراٹوپا، ہندوستانی قومیت کا تمدنی پہلو،حیدرآباد:ادارہ مطبوعات ادبیات اردو،جامعہ عثمانیہ،۱۹۴۵ء،ص ۱۸

۷۲۔ جعفرحسن،ڈاکٹر،ہندوستانی سماجیات،علی گڑھ:انجمن ترقی اردو ہند،فروری ۱۹۵۵ء،ص ۳۹

۷۳۔ رشیداختر ندوی،ارض پاکستان کی تاریخ،جلداول،راولپنڈی:گڈول پرنٹرز،دسمبر ۱۹۸۶ء،ص ۶۷

۷۴۔ ایضاً،ص ۶۲

۷۵۔ Trar chand: *Influence of Islam on Indian Culture, Lahore*: Al-Biruni, Reprinted in Pakistan, 1978, P-II

۷۶۔ گستاؤلی بان،ڈاکٹر، تمدن ہند،مترجم علی بلگرامی،سیدمولوی(دیباچہ مترجم)،لاہور: مقبول اکیڈمی،۱۹۶۲ء،ص ۴۰

۷۷۔ جعفرحسن،ڈاکٹر،ہندوستانی سماجیات،علی گڑھ:انجمن ترقی اردو ہند،فروری ۱۹۵۵ء،ص ۱۰۱

۷۸۔ نصیراحمد ناصر،ڈاکٹر، اسلامی ثقافت،لاہور:فیروزسنزلمیٹڈ،۱۹۸۴ء،ص ۷۵

۷۹۔ قاضی جاوید،فلسفہ ثقافت اور تیسری دنیا،لاہور:میری لائبریری،دسمبر ۱۹۷۶ء،ص ۴۰

۸۰۔ محمدعثمان،پروفیسر، فکر اسلامی کی تشکیل نو،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۷ء،ص ۱۳۷

۸۱۔ وحیدقریشی،ڈاکٹر،پاکستانی قومیت کی تشکیل نو،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۵ء،ص ۹۵

۸۲۔ قاضی جاوید،ہندی مسلم ثقافت،لاہور:وین گارڈبکس لمیٹڈ،۱۹۸۳ء،ص ۱۳

۸۳۔ تاراچند،ڈاکٹر،تمدن ہند پر اسلامی اثرات،لاہور:مجلس ترقی ادب،دسمبر ۱۹۶۴ء،ص ۲۲

۸۴۔ ارشدکریم سید،پاکستان،معاشرت،سیاست وحکومت،معیشت،کراچی:منیٰ پبلی کیشنز،فروری ۱۹۸۹ء،ص ۶۹

۸۵۔ محمدتقی،سید،ہندوستان پس منظر و پیش منظر،کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۶۸ء،۲۷

۸۶۔ عابدحسین،سیّد، قومی تہذیب کا مسئلہ،نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اُردو،۱۹۹۸ء،ص ۱۶۰

۸۷۔ اردو ادبی لغت،دہلی:نورمحمد تاجران کتب لال کنواں دہلی،مطبوعہ،دہلی:سن رائز پریس عیدگاہ روڈ،س۔ن، ص ۸۸۲

۸۸۔ فیروزسنزاردوانسائیکلوپیڈیا،لاہور:فیروزسنز(پرائیویٹ)لمیٹڈ،تیسراایڈیشن،جنوری ۱۹۸۴ء،ص ۱۰۰۲

۸۹۔ Longman Dictionary of English language, 1984, P.288.

۹۰۔ Oxford English Dictionary, London. in Ania Loomba Colonialism/ Postcolonialism, London: Routledge, 1998, P.f.

۹۱۔ Key Concepts in postcolonial Literature. New Youk: Palgrave Macmillian, 2007, P.if.

۹۲۔ عبدالواحید،عالمی جنگوں کا انسائکلو پیڈیا،لاہور: نگارشات،۲۰۰۷ء،ص ۴۲

۹۳۔ Thomas Benjamin Encyclopedia of western colonialism since 1450, Ed. 2007, P.XIII

۹۴۔ Nicholas B.Dirks, "Foreword" to colonialism and its forms of knowledge. Bernard S.cogn New Jersey: Princeton university Press, 1996, P.IX

۹۵۔ محمد یحییٰ تنہا، تاریخ امریکہ،لکھنؤ:الناظر پریس،۱۹۳۰ء،ص ۷

۹۶۔ آلیورتھپچر،تاریخ یورپ،حصہ اول،مترجم مولوی عبدالماجد،حیدرآباددکن: دارالطبع عثمانیہ سرکاری،۱۹۳۲ء، تلخیص

۹۷۔ آرتھر ہیسال،توازن قوت یعنی تاریخ یورپ ،مترجم مولوی حمید احمد انصاری،حیدرآباددکن: دارالطبع عثمانیہ سرکاری،۱۹۲۶ء، تلخیص

۹۸۔ اے۔ایچ جانسن،یورپ سولھویں صدی عیسوی میں ،مترجم مولوی رحیم الدین،حیدرآباددکن: دارالطبع عثمانیہ سرکاری،۱۹۳۸ء، تلخیص

۹۹۔ جی۔پی۔گوچ،یورپ کا عصر جدید،جلد چہارم،مترجم سید ہاشمی فریدآبادی،حیدرآباددکن: دارالطبع عثمانیہ سرکاری،۱۹۳۶ء، تلخیص

۱۰۰۔ سی۔اے۔فائف،یورپ کا عصر جدید ،جلد سوم،مترجم سید ہاشمی فریدآبادی،حیدرآباددکن: دارالطبع عثمانیہ سرکاری،۱۹۳۰ء، تلخیص

۱۰۱۔ ایچ مورس اسٹیفنس،انقلابی یورپ یعنی تاریخ یورپ ،مترجم مولوی حسن عابد جعفری،حیدرآباددکن: دارالطبع عثمانیہ سرکاری،۱۹۲۶ء، تلخیص

۱۰۲۔ کیرل ریثسم،تاریخ انگلستان ،حصہ اول،مترجم،سید ہاشمی فریدآبادی،حیدرآباددکن: دارالطبع عثمانیہ سرکاری، ۱۹۳۷ء، تلخیص

۱۰۳۔ میر کرامت اللہ،انتخاب تاریخ انگلستان،لاہور: وکٹوریہ پریس،۱۸۸۵ء، تلخیص

۱۰۴۔ آلیورتھیچر،تاریخ یورپ :دورجدید،حصہ دوم،مترجم تلمذ حسین،حیدرآباددکن:دارالطبع عثمانیہ سرکاری،۱۹۲۳ء، تلخیص

۱۰۵۔ ڈبلیو۔ایلیسن فلپس،تاریخ یورپ جدید،مترجم رشیداحمد صدیقی،حیدرآباددکن:دارالطبع عثمانیہ سرکاری،۱۹۲۵ء

۱۰۶۔ اردو انسائیکلو پیڈیا،جلداول،مدیراعلا پروفیسر فضل الرحمٰن،نئی دہلی:قومی کونسل برائے ترقی اردو،ص۵۱۶

۱۰۷۔ والیٹر،اوراق ہند،مترجم:جمیراشفاق،لاہور:سانجھ،۲۰۱۱،ص۶۱

۱۰۸۔ Sugata Bose & Aysha jalal Modern south Asia: History, Culture Political, Economy. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1998, P.8.

۱۰۹۔ مبارک علی،ڈاکٹر،تاریخ اور تحقیق ،لاہور: فکشن ہاؤس،۲۰۰۵ء،ص۶۳

۱۱۰۔ William Crook,the north westerm provinces of india; Their History, Ethrology, and Administration. London: Methuen & Co, 1897, P.125.

۱۱۱۔ Alexander Dow, The History of Hindustatn. 3 Vols. Landoe 1, 1772, P.XI

۱۱۲۔ ملک عبداللہ،بنگالی مسلمانوں کی صدسالہ جہدآزادی: ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء تا ۱۹۵۷ء، لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۶۷ء،ص۲۸۲

۱۱۳۔ ایضاً،ص۲۸۲

۱۱۴۔ رمیش دت،صنعتوں کا زوال،مشمولہ:تاریخ،شمارہ نمبر۲۲،ص۲۵۱

۱۱۵۔ ایضاً،ص،۱۹۵

۱۱۶۔ ناصرعباس نیر،ڈاکٹر، مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں ،کراچی:آکسفورڈ،۲۰۱۳ء،ص۴۵

۱۱۷۔ ناصرعباس نیر،ڈاکٹر، لسانیات اور تنقید،اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۰۹ء،ص۳۳

۱۱۸۔ امجدعلی شاکر،پروفیسر،دوقومی نظریہ:ایک تاریخی تجزیہ،لاہور:۲۰۰۹ء،ص۳۱

۱۱۹۔ خواجہ زکریا،ڈاکٹر،اکبر الہ آبادی:تحقیق و تنقیدی مطالعہ،لاہور:۲۰۰۳ء،ص۲

۱۲۰۔ کارل مارکس،ہندوستان کا تاریخی خاکہ،ترتیب وتعارف:احمد سلیم،لاہور:تخلیقات،۲۰۰۸،ص۲۱۹

۱۲۱۔ ملک عبداللہ،پاکستان کی بنیادی حقیقتیں اور پاکستانی فوج کی ابتداء،لاہور:۱۹۸۸ء،ص۳۶

باب دوم

سجاد ظہیر کا تہذیبی و نوآبادیاتی شعور بحوالہ ''لندن کی ایک رات''

ا۔ سجاد ظہیر: احوال و آثار

سجاد ظہیر (بنّے بھائی) ۵/نومبر ۱۹۰۵ء کو لکھنؤ (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ سجاد ظہیر کے گھرانے کا شمار اپنے وقت رؤسا میں ہوتا تھا۔ ان کے دادا کا نام سید ظہیر الحسن اور والد کا نام سید وزیر حسن (۱۸۷۴ء۔ ۱۹۴۷ء) تھا جو لکھنؤ کے مشہور وکیل تھے اور بعد میں وہ اودھ چیف کوٹ کے جج مقرر ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام سکینۃ الفاطمہ عرف سُکن بی بی تھا۔ وہ سات بہن بھائی تھے۔ جن کے نام سید علی ظہیر، نور فاطمہ (مسز سید عبدالحسن ولد پروفیسر نورالحسن)، سید حسن ظہیر م سید حسین ظہیر، نور زہرہ (مسز نظیر حسین)، سید سجاد ظہیر، سید باقر ظہیر ہیں۔ سجاد ظہیر کی شادی: ۱۰/دسمبر ۱۹۳۸ء کو خان بہادر سید رضا حسین کی بڑی بیٹی رضیہ دلشاد سے اجمیر میں ہوئی۔ ان کی اولاد میں نجمہ ظہیر باقر، نسیم بھاٹیہ، نادرہ ظہیر ببر، نور ظہیر شامل ہیں۔ میٹرک گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول لکھنؤ سے ۱۹۲۱ء میں پاس کیا۔ ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ یونی ورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۷ء میں لندن چلے گئے اور آکسفورڈ یونی ورسٹی سے پہلے ایم اور پھر بیرسٹری (۱۹۳۵ء) کی ڈگری حاصل کی۔

سیاسی و سماجی سرگرمیوں کا آغاز ۱۹۱۹ء میں تحریک آزادی میں حصہ لینے سے شروع ہوا۔ ۱۹۲۷ء میں انڈین نیشنل کانگریس (لندن برانچ) میں شرکت کی اور لندن میں زیرِ تعلیم طلبا کو جمع کیا اور مظاہرے کیے اور اس کے دو سال بعد ۱۹۲۹ء میں انگلستان میں مقیم ہندوستانی طلبا کا پہلا کیمونسٹ گروپ قائم کیا۔ ۱۹۳۰ء میں لندن میں کیمونسٹ پارٹی کی رکنیت حاصل کی۔ ۱۹۳۵ء میں لندن میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم کی اور اس کا پہلا منی فسٹو تیار کیا۔ اسی سال ہندوستانی مارکسسٹ طلبا کا ایک گروپ بنا کر برٹش کیمونسٹ پارٹی سے رابطہ کر کے فاشزم کے مقابلے میں سینہ سپر ہو گئے۔ نومبر ۱۹۳۵ء میں ہندوستان واپس آ گئے اور الہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی رکنیت اختیار کی اور الہ آباد شہر کی کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری ہو کر جواہر لال نہرو کے ساتھ کام کرنے لگے۔ بعد ازاں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ممبر منتخب ہوئے اور کانگریس کے مختلف شعبوں خاص طور پر فارن افیئرس اور مسلم ماس کنٹکٹ سے وابستہ رہے۔ ساتھ ہی کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور آل انڈیا کسان سبھا جیسی تنظیموں کو تشکیل دے کر کسانوں اور مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں وہ ماہنامہ چنگاری سہارنپور کے مدیر بھی رہے۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن

ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ برطانوی حکومت کے خلاف اشتعال انگیز تقریر کرنے کے جرم میں تین بار جیل گئے۔ سنٹرل جیل لکھنؤ میں دو سال قید کاٹی۔ قید کے دوران مختلف ناموں سے اخباروں کے لیے لکھتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں جیل سے رہائی کے بعد پارٹی کے لیے آزادی اور مستعدی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ پارٹی کے ترجمان قومی جنگ اور نیا زمانہ نامی اخباروں کے مدیر اعلیٰ بھی رہے۔ ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کو مستحکم اور منظم کرنے میں لگے رہے۔ ملک کی ساری زبانوں کے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور فن کاروں کو انجمن سے وابستہ کیا۔ ۱۹۴۸ء میں تقسیم ہند کے بعد پارٹی ہائی کمان کے فیصلہ کے مطابق پاکستان گئے اور وہاں کیمونسٹ پارٹی آف پاکستان کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ پاکستان میں طلبا، مزدوروں اور ٹریڈ یونین کے ممبروں کی تنظیم کی۔ ۱۹۵۱ء میں حکومت پاکستان نے راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کیا۔ تقریباً ساڑھے تین سال انڈر گراؤنڈ رہے اور چار سال جیل میں گزارے۔ اسی دوران ذکر حافظ اور روشنائی تحریر کی۔ ۱۹۵۵ء میں جواہر لال نہرو کی خصوصی توجہ سے ہندوستان واپس آئے اور پھر اپنی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی از سر نو تنظیم کی اور پارٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں تاشقند میں منعقد پہلی ایفرو ایشین رائٹرس ایسوسی ایشن کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں ہفتہ وار ترقی پسند رسالہ عوامی دور کے چیف ایڈیٹر ہوئے۔ بعد میں اسی اخبار کا نام بدل کر حیات رکھا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں ملک کے مختلف ریاستوں مثلاً بنگال، اتر پردیش، آندھرا پردیش، پنجاب، راجستھان، مہاراشٹر اور بیرونی ممالک مثلاً جرمنی، پولینڈ، روس، چیکوسلاواکیا، ہنگری، بلغاریہ اور رومانیہ میں ایفرو ایشین رائٹرس ایسوسی ایشن کو مستحکم کرنے میں لگے رہے۔ ۱۹۷۱ء میں یت نام کے ادیبوں کی دعوت پر وہاں کا دورہ کیا اور ویت نام لاؤس اور کمبوڈیا میں امریکی جبر و تشدد کے خلاف کام کیا۔ ۱۳ رستمبر ۱۹۷۳ء کو ان کا انتقال حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے الما تا (قزاقستان) میں ہوا جہاں وہ افریقی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے اور ان کی تدفین جامعہ ملیہ اسلامیہ اوکھلائی دہلی کے قبرستان میں ہوئی۔

۱۹۲۷ء سے ۱۹۷۳ء تک جن ممالک کا سفر کیا ان میں برطانیہ، فرانس، بلجیم، جرمنی، ڈنمارک، آسٹریا، اٹلی، سوئیٹزرلینڈ، روس، پولینڈ، چیکوسلاواکیہ، رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری، مصر، الجیریا، لبنان، شام، عراق، افغانستان، کیوبا، ویت نام، سری لنکا، اور پاکستان شامل ہیں۔

عرب ممالک میں لبنان، شام، مصر اور الجیرا وغیرہ کے دورے کیے۔ روس بھی گئے۔ پاکستان میں ایک عرصہ نظر بند رہے پھر ہندوستان واپس آ گئے۔

سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں تھے۔ ترقی پسند تحریک کے وہ معمار تھے۔ لندن میں ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں نے اپنی تحریک کا جو پہلا مینی فسٹو تیار کیا تھا اس پر ڈاکٹر ملک راج آنند، سجاد ظہیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے ایس بھٹ، ڈاکٹر ایس سہنا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے دستخط تھے۔ ادبی دنیا میں انھوں نے انگارے میں شامل افسانوں کے ساتھ قدم رکھا۔ یہ کتاب شائع ہوتے ہی بحث کا موضوع بن گئی۔ پھر ان کا ناول لندن کی ایک رات شائع ہوا۔ انگارے کے افسانوں اور لندن کی ایک رات کے بعد ان کی اہم تصنیف روشنائی ہے۔ انھوں نے نثری نظموں کا تجربہ بھی کیا، جن کا مجموعہ پگھلا نیلم ہے۔ نیا پن اختیار کرنے کے باوجود سجاد ظہیر ادب کی روایت سے رشتہ توڑنے کے قائل نہ تھے۔ ان کی دوسری قابل ذکر کتابیں یہ ہیں۔ ذکر حافظ، نقوش زنداں (خطوط کا مجموعہ)۔ شیکسپیر کے ڈرامے اوتھیلو کا ترجمہ بھی کیا۔ دو اخباروں نیا دور اور حیات کے مدیر بھی رہے۔(۱)

سجاد ظہیر پر پی ایچ ڈی کا مقالہ سجاد ظہیر: حیات اور ادبی خدمات، ڈاکٹر نصیر الدین ازہر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی ۱۹۹۶ء میں ڈاکٹر شمیم حنفی کی نگرانی میں لکھا۔ کتابی شکل میں یہ مقالہ سجاد ظہیر: حیات و جہات (تحقیق و تنقید)، نئی دہلی: مظہر پبلی کیشن، A-1، جوگا بائی ایکسٹنشن، کھجوری روڈ، ۲۰۰۴ء، میں مصنف نے خود شائع کیا۔

سجاد ظہیر کی تصانیف و تالیفات:

(انگارے: افسانوں کا مجموعہ، لکھنؤ: نظامی پریس، ۱۹۳۲ء، ۱۳۴ص)

اس مجموعے کے مرتب اور پبلشر خود سجاد ظہیر تھے۔ اس مجموعے میں نو کہانیاں اور ایک ڈرامہ شامل تھا۔ پانچ افسانے سجاد ظہیر کے تھے: (۱) نیند نہیں آتی (۲) جنت کی بشارت (۳) گرمیوں کی ایک رات (۴) دلاری (۵) پھر یہ ہنگامہ۔ دو افسانے احمد علی کے (۱) بادل نہیں آتے (۲) مہاوٹوں کی ایک رات۔ محمود الظفر کا ایک افسانہ ''جوانمردی'' اور ایک افسانہ ڈاکٹر رشید جہاں کا ''دلّی کی سیر'' اور ان ہی کا ایک مختصر ڈرامہ ''پردے کے پیچھے'' بھی شامل تھا۔

انگارے کی اشاعت کے کچھ ماہ بعد سجاد ظہیر اپنی تعلیم مکمل کرنے واپس لندن چلے گئے، مگر ہندوستان میں ان کہانیوں کے خلاف ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انگارے کی حمایت میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو، دیا نارائن نگم نے رسالہ زمانہ میں مئی ۱۹۳۳ء میں اس پر ستائشی تبصرے کئے۔ انگارے کی مخالفت میں ہفت روزہ سچ لکھنؤ سے مدیر عبدالماجد دریابادی نے ایک شرمناک کتاب، گندگی کا ایک قدرداں کے عنوان سے سات شماروں میں مضامین شائع کیے۔ اس کے علاوہ سہ روزہ سرفراز لکھنؤ سے مدیر خواجہ اسد اللہ اسدؔ نے نکالا۔ ۱۔ دنیائے مذہب میں ایک فتنہ، ۲۵/جنوری ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ ۲۔ راجپال کی روح ۲۱/فروری ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا اس میں

سید مصطفیٰ حسین رضوی پیش پیش تھے۔ان کے علاوہ ہمدم (لکھنؤ)، نوید (لکھنؤ)، روزنامہ خلافت (لکھنؤ)، مجز عالم (مرادآباد)، روزنامہ حقیقت (لکھنؤ)، اور اسٹار الہ آباد وغیرہ نے انگارے کے خلاف آواز بلند کی۔ڈاکٹر محمد اشرف کا کہنا ہے:

''اس ہنگامہ آرائی کو دیکھتے ہوئے حکومتِ ہند نے انگارے کی اشاعت کے چار ماہ بعد یعنی ۱۵ر مارچ ۱۹۳۳ء کو تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۹۹اے کے تحت اس کے تمام نسخوں کو ضبط کرنے کا حکم جاری کر دیا۔'' (۲)

(بیمار، ۱۹۳۵ء؛ ڈرامہ)

لندن میں بنائی گئی ادبی محفل پی۔ڈبلیو۔اے میں پڑھا گیا۔یہ ایک ایکٹ کا ڈرامہ ہے۔اس ڈرامے کے چار کردار ہیں۔پہلا بشیر جو اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہے۔دوسرا عزیز، تیسرا اس کی بیوی سلیمہ اور چوتھا کردار ایک نوکر کا ہے جس کا نام بدّل ہے۔بشیر عزیز کا دور کا رشتہ دار ہے اور اپنی بیماری کے سبب عزیز کے یہاں دو ماہ سے مقیم ہے۔عزیز بشیر کی تیمارداری کے لیے بیوی کو خوصی ہدایت کرتا ہے، بیوی بشیر کی تیمارداری میں اتنا محو ہو جاتی ہے کہ خاوند کو نظر انداز کرنا شروع کر دیتی ہے، عزیز جب دیکھتا ہے کہ پانی سر سے اونچا ہونے لگا ہے تو وہ بشیر کو جانے کے لیے کہتا ہے، جس سے بشیر کو کھانسی کا دورہ پڑتا ہے اور وہ مر جاتا ہے۔سلیمہ بشیر کی موت سے ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہے۔پریم چند نے بھی سجاد ظہیر کے نام اپنے خط میں اسے ناکام ڈارمہ کہا ہے۔(۳)

(لندن کی ایک رات، ۱۹۳۸ء؛ ناولٹ)

شعور کی رو میں لکھا گیا سات ابواب پر مشتمل یہ ناولٹ ۱۹۳۶ء میں مکمل ہوا اور ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔یہ ناولٹ اعظم کے انتظار اور راؤ کی ملاقات سے شروع ہوتا ہے درمیان میں جین کا تذکرہ ہے۔دوسرے باب یہ دونوں شراب خانے پہنچتے ہیں۔ہندوستاں کی سیاسی، سماجی حالت پر تبصرہ کرتے ہیں۔اسی دوران انگریز مزدور ٹام اور جم کی گفتگو سے برافروختہ ہو کر نعیم کے یہاں جاتے ہیں۔نعیم کے یہاں دوسرے لوگ پہنچتے ہیں۔پھر پارٹی کا ہنگامہ، موسیقی، رقص اور اسی کے درمیان بحث و مباحثہ میں لندن میں ہندوستانی نوجوانوں کی نفسیاتی کیفیت، سیاسی و سماجی شعور، اشتراکی خیالات، روحانیت، غلامی سے نجات پانی کی ترکیبوں جیسے موضوعات شامل ہیں۔پارٹی کے اختتام پر سب لوگ چلے جاتے ہیں تو صرف شیلا گرین اور مکان کا رہائشی نعیم رہ جاتے ہیں۔اب چونکہ آدھی رات گذر چکی ہے اس لیے باقی ناولٹ شیلا کے عشق کی کہانی پر محیط ہے جو صبح ہونے تک جاری رہتی ہے۔(۴)

(اردو ہندی ہندوستانی، ۱۹۴۷ء؛لسانی مسئلہ)

یہ مقالہ اردو ہندی تنازع پر ۱۹۴۵ء کی حیدر آباد کانفرنس میں پڑھا گیا اور ستمبر ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔

(نقوش زنداں، دہلی: مکتبہ شاہراہ، جون ۱۹۵۱ء؛خطوط کا مجموعہ)

یہ خطوط سجاد ظہیر نے سنٹرل جیل لکھنؤ اور کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ سے اسیری کے دوران اپنی شریک حیات رضیہ سجاد ظہیر کو لکھے تھے۔ رضیہ سجاد ظہیر نے ہی اسے مرتب کر کے چھپوایا۔ انتساب سجاد ظہیر کی روپوشی کے نام ہے۔ پیش لفظ جوش ملیح آبادی نے لکھا تھا۔ اس مجموعے میں کل ۸۱ خطوط ہیں۔

(ذکرِ حافظ، ۱۹۵۴ء؛تنقید)(علی گڑھ: انجمن ترقی اُردو، ہند، ستمبر ۱۹۵۶ء، ۱۵۲ص)

حافظ شیرازی کے فکر و فن پر ناقدانہ نظر۔ یہ کتاب، جون جولائی ۱۹۵۴ء میں انہوں نے مچھ جیل بلوچستان میں دورانِ قید تحریر کی۔

(روشنائی، ۱۹۵۹ء)(لاہور: مکتبۂ اُردو، نومبر ۱۹۵۶ء، ۴۱۳ص)(کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۷۱ء)(لاہور: مکتبہ اُردو، ۱۹۷۶ء)(نئی دہلی: سیما پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء، ۴۳۶ص)(مرتبین نجمہ ظہیر باقر، علی باقر، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) یہ ترقی پسند تحریک کی تاریخ اور تذکرہ ہے جس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ابتدائی ۲۵ سالہ سرگرمیوں کا جائزہ ہے۔

(پگھلا نیلم، ۱۹۶۴ء؛نثری نظموں کا مجموعہ)(دہلی: نئی روشنی پرکاشن، ۱۹۶۴ء)

نثری نظم کی اصطلاح پہلی بار میرا جی نے خود اپنی زیرِ ادارت بمبئی سے نکلنے والا رسالہ خیال میں استعمال کی تھی۔ اس رسالہ میں بسنت سہائے کے فرضی نام سے ۱۹۴۸ء میں میرا جی نے نثری نظموں کے عنوان سے اپنی چند نظمیں شائع کی تھیں۔ سجاد ظہیر کے زمانے میں بھی یہ متنازع صنفِ سخن رہی۔ پگھلا نیلم کے معترضین میں فیض احمد فیض، راہی معصوم رضا، نیاز حیدر اور سکندر علی وجد شامل ہیں۔

(نئی تصویریں، ۱۱ستمبر ۱۹۴۲ء؛ ترقی پسند مصنفین کے آٹھ ڈراموں کا انتخاب)

(اپنے لوگ؛ روسی کہانی کا ترجمہ)(ہفتہ وار ''قومی جنگ'' ۱۹۴۲ء)

(اعتماد؛ نکولا دابتسا روف کی روسی نظم کا منظوم ترجمہ)(''حیات'' ۴ رجنوری ۱۹۷۰ء)

(اوتھیلو؛ شیکسپیر سے ترجمہ)

(فیصلہ میں کروں گا؛ روسی کہانی کا ترجمہ)(ہفتہ وار ''قومی جنگ'' ۱۹۴۲ء)

(کینڈڈ؛ وولیئر سے ترجمہ)

(کاندید؛ والٹیئر سے ترجمہ)

(**گورا**؛ رابندر ناتھ ٹیگور سے ترجمہ)
(**پیغمبر**؛ خلیل جبران سے ترجمہ)
(**مضامینِ سجاد ظہیر**، لکھنؤ: اُتر پردیش اکادمی، ۲۳/مارچ ۱۹۷۹ء، ۹۷ص)

۲۔لندن کی ایک رات کا تہذیبی ونوآبادیاتی مطالعہ

ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت یوں تو ظلم واستبداد کی ایک طویل داستان ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ سیاسی ،فکری، معاشرتی اوراد بی اعتبار سے اس کا ایک روشن پہلو بھی ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔انگریز سامراج کے روّیے کے خلاف جوردِعمل معاشرتی اورسیاسی زندگی میں ہوا اُسی کی بدولت برصغیر میں مختلف سطحوں پر ایک نئی بیداری پیدا ہوگئی۔قومیت کے جدید تصور کے ساتھ ہی بین الاقوامی مسائل کا شعور بڑھنے لگا اور سیاسی وسماجی مسائل کی سطح علاقائی حدود سے نکل کر ایک وسیع تر سرحد میں داخل ہوگئی۔انقلاب روس نے عوامی تحریکات کی سوغات پیش کی۔مسولینی کے بعد جرمنی میں ہٹلر کے ہاتھوں فاشزم کے ہاتھوں طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اس نے پوری دنیا اور خاص طور پر یورپ میں ہلچل اور بے چینی پیدا کی۔اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کے مختلف دانشوروں اور مفکروں کی طرف سے فاشزم کے خلاف احتجاج شروع ہوا۔چنانچہ روس میں ظلم وجبر کے خلاف مارکسزم ایک کامیاب ترین حربہ ثابت ہوا تھا۔اس طرح مفکروں اور ادیبوں نے تہذیب،ادب اور پوری انسانی زندگی کو فاشزم کے بڑھتے ہوئے طوفان سے محفوظ رکھنے کے لیے منظّم ہو کر اشترا کی نقطۂ نظر کی حمایت کرنے پر زور دیا۔ادبی سطح پر ترقی پسندی یا ترقی پسند تحریک کا آغاز اسی رویے کا نتیجہ ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد نہ صرف عوام بلکہ سیاسی رہنما بھی تصادم کے ان اثرات سے دامن نہ بچا سکے تھے جو انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ثبت کیے تھے۔ہندوستان کی سیاست گھٹن کا شکار ہو چکی تھی اور اس گھٹن سے بیزار، باشعور اور تعلیم یافتہ نوجوانوں نے انگریزوں کے ظلم واستبداد کے خلاف اپنے عزائم کا برملا اظہار شروع کر دیا۔اسی زمانے میں برطانیہ،فرانس،روس،امریکہ،کینیڈا اور کئی دوسرے ممالک میں سیاسی ہلچل پیدا ہو چکی تھی جو کہ برصغیر پاک و ہند سے زیادہ طاقت ورتھی۔مغرب کی علمی وادبی تحریکوں نے ہندوستان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا مثلاً انقلاب روس نے پوری دنیا کی استحصال زدہ اقوام میں شعور پیدا کر کے صدائے بغاوت بلند کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔اسی طرح اشترا کی خیالات کے مالک کارل مارکس نے پوری دنیا کے دانشوروں اور ادیبوں کو نئی فکر سے آگاہ کیا۔اس تبدیلی فکر کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر حنیف فوق رقمطراز ہیں:

> ”زمانہ رفتہ رفتہ ارتقائی منازل طے کر رہا تھا کارل مارکس کے معاشی نظریئے نے ۱۹۱۶ء کے بعد سے نوجوانوں کے دل و دماغ کو خاص طور پر متاثر کرنا شروع کر دیا۔۱۹۲۹ء میں جب جواہر لال صدر کانگریس ہوئے تو یہ خیالات کچھ اور سرعت سے پھیلنے لگے۔یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء میں ایک باقاعدہ جماعت کانگریس میں،کانگریس سوشلسٹ کے نام سے قائم ہوگئی ادھر روس کے کئی ادیبوں نے ادب کو نئی دھڑکنیں عطا کی۔ٹالسٹائی اور گورکی نے ادب اور عوام کی وابستگی گہری کر دی اور چیخوف نے ادب کو

زندگی کا آئینہ دار بنا دیا اسی کے ساتھ ساتھ پرانے نظام کے خلاف نئی بغاوت کی رو دنیا کے تقریباً ہر ملک میں دوڑ گئی۔''(۵)

عالمی منظرنامے پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں اور تبدیلی کی اس لہر نے اہلِ ہندوستان کے دلوں میں بھی جذبۂ حریت کو ابھارا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلابِ روس نے پوری دنیا کے استحصال زدہ لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ آزادی کا حصول ان کا بھی حق ہے۔ آزادی کا یہ احساس آہستہ آہستہ پروان چڑھنے لگا اور جب دنیا بھر میں استحصال و جبر کے خلاف شدید ردِعمل کا اظہار ہوا تو برصغیر پاک و ہند کی سرزمین بھی اسی ردِعمل سے ہمکنار ہوئی۔ بقول فردوس انور قاضی:

''ہندوستان میں بھی ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۱ء تک کے سیاسی اور اقتصادی حالات دگرگوں رہے تھے۔ عدم تعاون کی تحریک، تحریکِ خلافت، دہشت پسند نوجوانوں کی انقلابی تحریک، انگریزوں کی فرعونیت، ہندوستان پر ان کے جارحانہ تسلط، بھوک اور جہالت نے ہندوستانیوں کی رگوں میں زہر بھر دیا تھا اور جدوجہدِ آزادی انقلابی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔''(۶)

ہندوستان کی موجود صورتحال، جہالت، مفلوک الحالی اور غلامی نے جہاں معاشرے کے لوگوں کو متاثر کیا وہیں ادیبوں کے تخلیقی ذہنوں کو ایک نئی سمت دکھائی اور ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کے ساتھ ساتھ روایت سے بغاوت بھی ادب میں شامل ہوئی۔

سجاد ظہیر نے فرسودہ روایات کے بداثرات کے علاوہ استحصال، بے رحم سماجی قوانین اور معاشرتی جکڑ بندیوں کے خلاف پیدا ہونے والی بیزارگی کو محسوس کر لیا تھا اسی لیے انھوں نے نہ صرف خود کو بلکہ اپنے ہم خیال ادیبوں کو بھی ان مسائل سے چھٹکارا پانے کے لیے کھڑا کر دیا اور اسی ضمن میں ۱۹۳۵ء میں نانکنگ ریسٹورنٹ، لندن میں ایک انجمن بنانے کا فیصلہ کیا اس منصوبے کی تکمیل کے لیے سجاد ظہیر کے علاوہ ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے۔ ایس۔ بٹ، ڈاکٹر ملک راج آنند اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر بھی پیش پیش تھے۔ اس انجمن کی تشکیل ہی ترقی پسند تحریک کا موجب بنی۔ سجاد ظہیر انقلاب لانا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے ادب کو با مقصد بنایا تا کہ وہ انقلاب لانے میں مددگار و معاون ثابت ہو۔ سجاد ظہیر رقمطراز ہیں:

''ہم اپنے وطن میں ایسی تہذیب اور ایسے ادب کی نمو اور فروغ کے خواہاں تھے جو ہمارے وسیع ملک میں رہنے والی مختلف اقوام اور تہذیبی گروہوں کے آزادی، خواہ روشن، سائنسی اور عقلی رجحانات کو نمایاں کرے جو بیرونی اقتدار کے پیدا کیے ہوئے غلامانہ اور روح فرسا انتشار کی بیخ کنی کرے۔ ہم قدیم جاگیرداری دور کی توہم پرستی اور مذہبی منافرت کے زہریلے اثرات کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ یہ سامراجی اور جاگیری اقتدار کی نظریاتی بنیادیں ہیں۔ ہم اپنے ماضی کی عظیم تہذیب سے اس کی انسان دوستی، حق پرستی، صلح جوئی، اس کا حسن اور سبھاؤ تا اخذ کر لینے کے حامی تھے لیکن ہم اس کو

جمود، فراریت، عقل دشمنی اور افیون صفت جھوٹی روحانیت کو سختی سے مسترد کرتے تھے۔''(۷)

برصغیر پاک و ہند میں پروان چڑھنے والی بہت سی تحریکوں کو باقاعدہ منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے دوام حاصل نہ ہوسکا لیکن ترقی پسند تحریک ایسی تحریک تھی جو باضابطہ اور منظم طریقے سے ارتقاء پذیر ہوئی اور اس کے فروغ کا سبب وہ ادیب بنے جو تغیر و تبدل کے حامی تھے۔ ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں ہونے والے ترقی پسند تحریک کے جلسے کی صدارت منشی پریم چند نے کی۔ اس تحریک کا باقاعدہ منشور تھا اور اس منشور میں کہا گیا تھا:

''ہم ہندوستان کی تہذیبی روایات کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے ملک کے انحطاطی پہلوؤں پر بڑی بے رحمی سے تبصرہ کریں گے اور تخلیقی و تنقیدی انداز ان سبھی باتوں کی مصوری کریں گے جن سے ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہیے اور وہ ہے ہماری روٹی کا، بدحالی کا، ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی غلامی کا۔ ہم اسی وقت ان مسائل کو سمجھ سکیں گے ہم میں انقلابی روح بیدار ہوگئی ہے۔ وہ سب کچھ جو ہمیں انتشار، نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جاتا ہے۔ قدامت پسندی ہے اور وہ سب کچھ جو ہم میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرتا ہے، جو ہمیں عزیز روایات کو عقل و ادراک کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے اکساتا ہے، جو ہمیں صحت مند بناتا ہے اور ہم میں اتحاد اور یک جہتی کی قوت پیدا کرتا ہے اس کو ہم ترقی پسندی کہتے ہیں۔''(۸)

ترقی پسند تحریک نے نہ صرف ہمیں زندگی کے نئے تقاضوں سے آگاہ کیا بلکہ معاشرت کے نئے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی اور ان کی سچی اور حقیقی عکاسی بھی کی۔ ترقی پسند ادیب مذہب سے نہیں بلکہ عقیدت مندوں کی توہم پرستی سے اعلان جنگ کرتا ہے اور مذہب سے متعلق قناعت پسندی کے غلط تصور سے بیزار نظر آتا ہے اور اپنے حق کے اصول کے لیے لوگوں میں صدائے احتجاج کو بلند کرنا چاہتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ترقی پسند تحریک، علی گڑھ تحریک کی ہی کڑی ہے اور یہ دونوں تحریکیں بہت سی باتوں میں مماثلت رکھتی ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''......علی گڑھ تحریک کا موازنہ ترقی پسند تحریک سے کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔ علی گڑھ تحریک ایک خالص ادبی تحریک نہ تھی۔ ترقی پسند تحریک بھی صرف ادبی نہیں لیکن علی گڑھ تحریک کے بانیوں میں بعض دیو پیکر اشخاص تھے جو اس تحریک کو نصیب نہ ہوئے۔ علی گڑھ تحریک ایک اصلاحی تحریک ہے، ترقی پسند تحریک ایک باغیانہ تحریک ہے۔ علی گڑھ تحریک ایک متوسط طبقے کی جینے کی خواہش پر مبنی تھی، ترقی پسند تحریک متوسط طبقے کے لیے ذہنی غذا فراہم کرنے کے بجائے ایک نئے اجتماعی نظام کی آواز ہے۔ دونوں تحریکیں ادب برائے ادب یا ادب برائے جمال کی قائل نہیں۔''(۹)

ترقی پسند تحریک کے قیام کے بعد اردو ادب میں حقیقت نگاری کو فروغ ملا اور یوں ترقی پسند ادیبوں نے ادب کو سماج اور حقیقت سے قریب تر کر دیا اور ادب سے جمودی کیفیت کو ختم کر کے متحرک کر دیا۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی بے حسی سے نجات پانے کے لیے خوابِ غفلت میں ڈوبے ہوئے ذہنوں کو جھنجھوڑا اور بے زبان لوگوں کو ادب کے ذریعے زبان دی۔ ڈاکٹر قمر رئیس ترقی پسند ادیبوں کی علمی خدمات پر نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان ادیبوں کا کوئی ناول ''گئودان'' کی طرح وسیع تر زندگی میں ہمہ جہتی کشمکش کا رزمیہ تو نہیں ہے لیکن ان میں زندگی کے جن گوشوں اور حقیقتوں کے اوراق کھولے گئے ہیں وہ دلچسپی اور معنویت سے خالی نہیں......ان ترقی پسند ادیبوں کے ناولوں میں جو کردار ہیں وہ تصور پرستی کی گیلی اور چکنی مٹی کے بجائے حقیقت پسندی کی کھردری اور سخت پتھریلی مٹی کے ڈھالے ہوئے ہیں۔ وہ پرانے عقائد اور فرسودہ سماجی رشتوں کی شکست وریخت ہی نہیں آزادی، انصاف اور انسان دوستی کے نئے تصورات اور نئے خوابوں کی علامت بھی ہیں۔ اعظم، راؤ، نعیم، شمشاد، حیدر سب کا وجود ایک باغی روح کی آگ سے دہک رہا ہے۔''(۱۰)

ترقی پسند تحریک نے اپنے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والے ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس دور میں ناول نے نہ صرف حقیقت پر مبنی سیاسی رجحان کی عکاسی کی بلکہ انسانوں کے تمام طبقوں کی ترجمانی بھی کی ہے مثلاً کسانوں کے حقوق کی پامالی کا مسئلہ بھی زیرِ بحث رہا، مہاجنوں اور سود خوروں کی بے حسی کو بے نقاب کیا گیا اور اسی طرح ذات پات کی تفریق کو قابلِ نفرین سمجھا گیا۔ ڈاکٹر افضال بٹ رقمطراز ہیں:

> ''ناول نگاروں نے سماج اور اس کے نشیب و فراز کو مختلف موضوعات کا روپ دے کر ناول میں پیش کیا۔ طبقاتی کشمکش اور جاگیردارانہ سرمایہ دارانہ استحصال کے مخالف نفرت و بغاوت کو خاص اہمیت دی گئی۔ سیاسی، سماجی اور اخلاقی تبدیلیوں کے لیے ہندوستانی عوام کے ذہنوں کو تیار کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔''(۱۱)

مختصر یہ کہ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا کیونکہ یہ تحریک چند ذہنوں کی پیداوار نہیں تھی بلکہ اپنے دور کی معاشی، سیاسی اور اقتصادی ابتری کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ اس تحریک سے وابستہ ادیبوں نے اپنی بے پناہ کاوشوں سے اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو ادب کی اقدار کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور عالمی ادب کے رجحانات کا عکاس بنا کر اردو ادب کے فروغ کی کوشش کی۔

اُردو ناول اِرتقا کی اِبتدائی منزلیں طے کرتا ہوا ڈپٹی نذیر احمد سے پریم چند تک پہنچا تو اُسلوب، تیکنیک اور رُجحانات کے حوالے سے واضح خانوں میں بٹ چکا تھا۔ اوّلین تین چار دہائیوں میں جو رُجحانات مُتعیّن ہوئے وہی تھوڑی

بہت تبدیلیوں کے ساتھ ناول میں رائج رہے اور کم و بیش پون صدی تک ناول کی تیکنیک، موضوعات یا اُسلوب میں کوئی اِنقلابی تبدیلی یا اِضافہ نظر نہیں آتا۔ ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، محمد علی طیب، سجاد حُسین کسمنڈوی، مرزا ہادی رُسوا، پریم چند، مُنشی سجاد حُسین، راشد الخیری، مرزا محمد سعید دہلوی، قاضی عبدالغفار، نیاز فتح پوری اور دِیگر بہت سے ناول نگاروں نے ناول کی صنف کو اُفقی سمت میں پھیلاؤ اور وُسعت سے ہمکنار کرنے میں اہم کردار ادا کیا تاہم عمودی سمت میں اِسے ایک خاص سطح سے اوپر اُٹھنے کا موقع مُیسّر نہ آیا۔ ناول کو موضوع، مواد اور تیکنیک کے اعتبار سے پہلی بار ایک مختصر کینوس کے ناول نے جدّت کے ذائقوں سے آشنا کیا، ۱۹۳۸ء میں اِشاعت پذیر ہونے والا یہ ناول لندن کی ایک رات تھا جسے سجاد ظہیر نے تحریر کیا۔ اُردو ناول اپنے آغاز سے اِس جدید رُجحانات کے نمائندہ ناول تک سات دہائیوں کا سفر طے کرنے کے بعد پہنچا اور اِس دوران میں صُورتِ حال کچھ یوں رہی:

> ''ناول نگاری موضوع اور مواد کے تنوع اور مختلف اُسلوبیاتی رویوں کے باوصف تیکنیکی اور تشکیلی اعتبار سے بعض مشترک عناصر کی حامل رہی۔۔۔ یعنی مرکزی خیال، موضوع پلاٹ، کہانی کا منطقی پھیلاؤ، واقعاتی ماجرائیت، قصہ در قصہ کی بُنت سازی کرداروں کی تعمیر و تشکیل، کرداروں کا اختلاطِ باہمی ٹکراؤ، کش مکش، جدو جہد، کرداروں کے علامتی بہروپ، مکالمے، منظر نگاری، ڈرامائیت، تجسّس کے حامل عناصر، دلچسپ اندازِ بیاں، ماحول سازی میں حقیقت کی عکاسی، قاری کی جذباتیت کا لحاظ، رومانیت اور قصہ گو کی پروازِ تخیل وغیرہ وہ مشترکہ عناصر ہیں جو ''لندن کی ایک رات'' کی اشاعت سے قبل کم و بیش ہر ناول کی بُنت میں کسی نہ کسی انداز میں برتے جاتے رہے۔''(۱۲)

ناول اپنے اِبتدائی برسوں میں اُسلوب، تیکنیک، موضوعات اور مواد کے اعتبار سے جس سطح پر تھا اُس میں بتدریج تبدیلی اور کسی حد تک بہتری آئی لیکن کسی اِنقلابی تبدیلی سے یہ صنفِ ادب محروم ہی رہی۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کے میدان میں جو ہمہ گیر تبدیلیاں برپا کیں ناول بھی اُن تبدیلیوں سے گُزرا۔ سجاد ظہیر نے اپنے ناول کے ذریعے سے اِظہار کے نئے پیرائے مُتعارف کرائے اور اُردو میں پہلی بار مغرب سے درآمدہ یہ صنف اِظہار کے مغربی وسیلوں سے مُزیّن نظر آنے لگی۔

> ''سجاد ظہیر کا مذکورہ ناول نہ صرف موضوع اور مواد کے اعتبار سے بلکہ اسلوب اور تیکنیک کے لحاظ سے بھی اردو ناول نگاری کے فن میں ایک غیر معمولی جست کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ ''شعور کی رَو'' اور ''تلازمہَ خیال'' کی تیکنیک استعمال کی گئی ہے۔۔۔ ناول نگاری کو ایک نئے اسلوبِ نگارش بخشنے کی اجتہادی فوقیت سجاد ظہیر ہی کو حاصل ہے۔''(۱۳)

یورپی ادب میں ماڈرن ازم کے اثرات سے سجاد ظہیر کی خوشہ چینی اور اُردو میں جدید اسالیب و تیکنیک کا تجربہ کوئی

حیرت انگیز بات نہ تھی۔ بیسویں صدی کے انگریزی کے نامور ماڈرنسٹ ادیبوں کی تصانیف نے لکھنے اور پڑھنے والوں کے ایک وسیع حلقے کو مُتاثر کیا اور یورپ میں تعلیم حاصل کرنے والے سجاد ظہیر کا اِن اثرات کے تحت لندن کی ایک رات لکھنا اِسی وسیع دائرۂ اثر کی نُمائندگی کرتا ہے۔ جیمز جوائس کے یولیسیز (۱۹۲۲ء)، ورجینیا وولف کے مسز ڈیلووے (۱۹۲۵ء)، ٹو دا لائٹ ہاؤس (۱۹۲۷ء)، اورلینڈو (۱۹۲۸ء) اور ولیم فاکنر کے دا ساؤنڈ اینڈ دا فیوری (۱۹۲۹ء) اور ڈوروتھی رچرڈسن کے سلسلۂ ناول پلگرمج (۱۹۳۸ء۔۱۹۱۵ء) میں بیانیے کی نئی تیکنیکوں مثلاً شعور کی رَو، داخلی خودکلامی اور آزاد تلازمۂ خیال کا اِستعمال نئے رُجحانات کو جنم دے رہا تھا۔ ماڈرنسٹ ناول نگاروں میں مذکورہ تیکنیک کے اِستعمال میں ڈوروتھی رچرڈسن کو اوّلیت حاصل ہے اور وہی اِس کی وضع کنندہ بھی تھیں۔ جبکہ جیمز جوائس کا ناول یولیسیز اپنی اثر انگیزی میں بے مثال مانا جاتا ہے جس نے لکھنے والوں کے ایک وسیع حلقے کو مُتاثر کیا۔ ورجینیا وولف کے ناولوں کا حلقۂ اثر بھی بے حد وسیع ہے۔ ورجینیا وولف کا شُمار انگریزی ادب میں ماڈرن ازم کے اہم اور نُمائندہ ادیبوں میں ہوتا ہے۔ مغرب سے جنم لینے والی ادبی تحریکوں نے اُردو ادب کو بھی مُتاثر کیا ہے اور ناول نگاری میں ماڈرن ازم کے اثرات کا آغاز سجاد ظہیر کے ناول لندن کی ایک رات سے ہوتا ہے۔ اِس بارے میں کمال احمد صدیقی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے:

> ''جیمس جوائس اور ورجینیا وولف کے بیانیہ میں تجربوں کے متوازی تجربے ''انگارے'' کی کہانیوں میں اور 'لندن کی ایک رات' میں شعوری طور پر کیے گئے ہیں اور اردو ادب میں یہ رجحان ساز اور رجحان نما ثابت ہوئے۔'' (۱۴)

لندن کی ایک رات کا کینوس مختصر اور پلاٹ غیر واضح ہے۔ اِس ناول میں لندن میں مُقیم ہندوستانی طلبہ کے ایک گروہ کی سرگرمیوں کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ مذکورہ طلبہ اعلیٰ تعلیم کے حُصول کے لیے دیارِ غیر میں قیام پذیر ہیں لیکن وطن سے دُوری کے باوجود برطانوی سامراج کے تسلّط اور اِس کے نتیجے میں ہندوستان میں پھیلی سیاسی، سماجی، معاشی اور مُعاشرتی ابتری پر فکرمند ہیں اور اِس پر سوچ بچار میں مشغول نظر آتے ہیں۔ بظاہر یہ طالبِ علم اپنے اپنے گھروں سے منگوائی جانے والی رقوم سے تفریح کرتے اور بے فکری و عیاشی میں شب و روز گزارتے دِکھائی دیتے ہیں لیکن درحقیقت قومی مسائل سے بے خبر نہیں اور اِن مسائل پر سوچنے اور اِن کے حل تلاش کرنے میں مگن ہیں۔ اِن میں سے اکثر طلبہ اِشتراکیت اور مارکسزم سے مُتاثر ہیں، سرمایہ داری سے نفرت کرتے ہیں اور اشتراکیت کو سرمایہ داری کا توڑ سمجھتے ہوئے اِس نظام کی آمد کے تہہِ دِل سے مُتمنّی و مُنتظر ہیں۔ تاہم سارے طلبہ جو ناول میں دِکھائے گئے ہیں ایک جیسے نظریات نہیں رکھتے۔

ناول کے ہندوستانی طلبہ میں نعیم، عارف، راؤ، اعظم، احسان اور کریمہ شامل ہیں اور یہ نعیم کے ہاں مُنعقدہ پارٹی میں مدعو ہیں۔ یہ نوجوان ایک دُوسرے سے مختلف بلکہ مُتضاد نقطہ ہائے نظر کے مالک ہیں۔ عارف نامی نوجوان آئی۔سی۔

ایس میں کامیاب ہو کر سول سروس یا بالفاظِ دیگر حُکمران طبقے کا حصہ بننے کا خواہاں ہے۔ راؤ اور احسان اِشترا کی فکر کے نُمائندے ہیں، خُصوصاً احسان ایک دُوسرے کردار خان صاحب کے بقول 'بالشویک' ہے۔ اعظم ہے جسے جین سے مُلاقات کی فکر سرگرداں کیے ہوئے ہے جو مُقررہ وقت اور طے شُدہ مقام پر مُلاقات کے لیے نہیں پہنچی اور اُسے شدّت کی سردی میں لندن کے کہر زدہ موسم میں گھنٹوں باہر کھڑے ہو کر اُس کا لا حاصل اِنتظار کرنا پڑا۔ کریمہ ہے جو ہندوستان جیسے قدامت پسند مُعاشرے سے اکیلی ہزار ہا میل کا سفر طے کر کے لندن میں تعلیم کی غرض سے آئی ہے لیکن یہاں یکسوئی سے محروم، فکر و عمل کی دُوئیت کا شکار ہے اور تہذیبِ مغرب کے محاسن و قبائح کے اِنتخاب و اِسترداد میں اُلجھی ہوئی ہے۔ اُسے مغرب کی تقلید گوارا ہے لیکن 'اندھی تقلید' نا قابلِ برداشت۔ وہ نعیم کی پارٹی میں موجود ہے اور اِس بات پر کُڑھنے میں مصروف ہے کہ یہ ہندوستانی لڑکے آخر اپنی تہذیب کو فراموش کیوں کیے بیٹھے ہیں اور کیوں ایک مُسلمان لڑکی یعنی کریمہ کو رقص کی دعوت دینا اُنہیں معیوب نہیں لگتا۔ وہ اپنے خیالات کے برملا اِظہار سے بھی نہیں چُوکتی اور جواباً لڑکے اُس کے دوغلے پن اور دہرے معیار کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں جو اکیلے پارٹی میں تو آ گئی ہے لیکن رقص پر معترض ہے۔ وہ اُس کی ہندوستان سے تنہا لندن آمد، بے پردگی اور مردوں کی مجلس میں موجودگی پر بھی طنز کرتے ہیں۔ اِس مقام پر کریمہ قدیم و جدید کی کش مکش میں گرفتار ہندوستانیوں کی نُمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ نعیم کے ہاں موجود یہ سارے نوجوان طلبہ کسی نہ کسی اُلجھن کا شکار نظر آتے ہیں اور اُن کی اُلجھنوں کے سرے ہندوستان کی سیاسی و معاشی صُورتِ حال سے جا ملتے ہیں۔ سید وقار عظیم اس ناول میں موجود الجھنوں کا کچھ یوں تذکرہ کرتے ہیں:

> ''اس مختصر سے ناول میں کرداروں کے عمل اور انکے جذباتی ہیجان کے پیچھے کوئی نہ کوئی نفسیاتی گرہ ہے۔ زندگی کے پس منظر میں ہر وقت اس کے انتشار کا احساس ہے۔ سیاست اور زندگی میں یکا یک جو گہرا ربط پیدا ہو گیا ہے اس کا پرتو ہے۔ جنس اور اس کے مسائل کو ایک علمی نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ فلسفۂ اخلاق پرانے رسوم و قیود کا نہیں بلکہ فطرت کا پابند ہے۔ اس ناول کا انداز سرتا سر فکری ہے اور اسی فکری انداز نے ہندوستانی اور اس سے باہر یورپ کے ذہن کی الجھنوں کی مصوری کی ہے۔ کہیں کہیں اس میں اس سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر کی جھلک بھی ہے جو زندگی سے بھی زیادہ ادب پر چھا جانے کی کوشش میں مصروف ہے۔''(۱۵)

سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے علمبردار تھے۔ انھوں نے اپنے ناول لندن کی ایک رات میں جو کردار پیش کیے ہیں وہ اشتراکیت کی تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ سجاد ظہیر کے ان کرداروں میں لندن کی معاشرت اور تہذیب کے اثرات بہت عمدگی سے دکھائے ہیں۔ ان کے کردار درحقیقت بیسویں صدی کی نوجوان نسل کے نمائندہ کردار ہیں۔ ان کے

ہاں کرداروں کا ایک بڑا دلچسپ حوالہ ملتا ہے کہ انگریز میموں سے کس طرح ہندوستانی نوجوان جنسی طور پر متاثر ہوئے اور ان کی گوری چمڑی سے متاثر ہوکر ادنیٰ درجے کی انگریز لڑکی سے شادی کرنا بھی قبول کر لیتے تھے۔

سجاد ظہیر انگارے کے روح و رواں تھے۔ انھوں نے فرسودہ روایات کے بداثرات کے علاوہ استحصال، بے رحم سماجی قوانین اور معاشرتی جکڑ بندیوں کے خلاف پیدا ہونے والی بیزارگی کو محسوس کر لیا تھا اسی لیے انھوں نے نہ صرف خود کو بلکہ اپنے ہم خیال ادیبوں کو بھی ان مسائل سے چھٹکارا پانے کے لیے کھڑا کر دیا اور اسی ضمن میں ۱۹۳۵ء میں نانکنگ ریسٹورنٹ، لندن میں ایک انجمن بنانے کا فیصلہ کیا اس منصوبے کی تکمیل کے لیے سجاد ظہیر کے علاوہ ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے۔ ایس۔ بٹ، ڈاکٹر ملک راج آنند اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر بھی پیش پیش تھے۔ اس انجمن کی تشکیل ہی ترقی پسند تحریک کا مؤجب بنی۔ سجاد ظہیر انقلاب لانا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے ادب کو بامقصد بنایا تاکہ وہ انقلاب لانے میں مددگار و معاون ثابت ہو۔ سجاد ظہیر رقمطراز ہیں:

> ''ہم اپنے وطن میں ایسی تہذیب اور ایسے ادب کی نمو اور فروغ کے خواہاں تھے جو ہمارے وسیع ملک میں رہنے والی مختلف اقوام اور تہذیبی گروہوں کے آزادی، خواہ روشن، سائنسی اور عقلی رجحانات کو نمایاں کرے جو بیرونی اقتدار کے پیدا کیے ہوئے غلامانہ اور روح فرسا انتشار کی بیخ کنی کرے۔ ہم قدیم جاگیرداری دور کی توہم پرستی اور مذہبی منافرت کے زہریلے اثرات کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ یہ سامراجی اور جاگیری اقتدار کی نظریاتی بنیادیں ہیں۔ ہم اپنے ماضی کی عظیم تہذیب سے اس کی انسان دوستی، حق پرستی، صلح جوئی، اس کا حسن اور سبھاؤ تا اخذ کر لینے کے حامی تھے لیکن ہم اس کو جمود، فراریت، عقل دشمنی اور افیون صفت جھوٹی روحانیت کو سختی سے مسترد کرتے تھے۔'' (۱۶)

لندن کی ایک رات ترقی پسندی سے متعلق اردو ناولوں کے سلسلے کا پہلا نقش ہے۔ اس میں لندن میں مقیم چند ہندوستانی طلباء کی ذہنی اور نفسیاتی تصویر کشی ملتی ہے، جس سے ہندوستانی نوجوانوں کی مجموعی ذہنی حالت کے ساتھ اس دور کے سیاسی و سماجی حالات اور تحریک آزادی کی مجموعی صورت حال پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کے نوجوانوں میں انقلابی رجحان پنپ رہا تھا، اشتراکی خیالات جڑ پکڑ رہے تھے۔ ملک و قوم، آزادی، سیاست، اقدار وغیرہ مسائل پر سنجیدگی سے سوچنا شروع ہوا تھا۔ لندن کی ایک رات کے دو کردار اعظم اور راؤ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ اعظم کہتا ہے:

> ''وطن کی بھلائی کے لیے کوشاں ہیں ذرا مجھے بتایئے تو سہی کسی کو یہ تک معلوم نہیں وطن کی بھلائی ہے کس چڑیا کا نام، اس کے لیے کوشاں ہونا تو درکنار، زنانہ بن کر چرخہ کاتنے میں وطن کی بھلائی ہے یا

مہاتما گاندھی کی طرح سچ کی کھوج کرنے میں وطن کی بھلائی ہے یا کونسل کی ممبری یا منسٹری میں وطن کی بھلائی ہے یا سوشل ریفارم اور اچھوت کانفرنس میں حصہ لینے میں وطن کی بھلائی ہے۔'' (۱۷)

اس ناول میں جگہ جگہ ہندوستانی سیاست، انگریزوں کا ظلم وستم تحریک آزادی سے وابستہ رہنماؤں کے طرزِ عمل، ہندوستانی زبان وادب کے رجحانات وموضوعات پر طنز ملتا ہے۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی عدم تشدد کے راستے سے منزلِ مقصود پر پہنچنا چاہتی تھی لیکن اُس دور کے ہندوستانی نوجوانوں کا ایقان تھا کہ کوئی بھی قوم آج تک عدم تشدد کے راستے سے کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچی۔ اس لیے ہندوستان کی آزادی کے لیے بھی یہ رویہ اختیار کرنا فضول ہی نہیں بلکہ مضرت رساں بھی ہے۔

ہندوستان میں سیاسی تبدیلی کی خواہش لندن کی ایک رات کے بیشتر کرداروں میں ملتی ہے۔ ہر جگہ سیاست موضوع بنی رہتی ہے۔ غلام ملک کے نوجوان جب آزاد ملک کی فضاؤں میں پہنچتے ہیں تو انھیں غلامی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ اپنے ملک کے سیاسی وسماجی حالات کے تئیں کچھ اسی قسم کی بیزاری لندن میں مقیم ہندوستانی نوجوانوں کے یہاں ملتی ہے۔ لندن کی ایک رات میں مختلف اور متضاد رجحانات رکھنے والے کردار پیش ہوئے ہیں۔ راؤ اشتراکی خیالات کا حامل ہے لیکن زندگی سے بیزار ہے اور زندگی سے متعلق اس کا نظریہ بھی مریضانہ ہے۔ اُسے ہندوستان کی موجودہ صورت حال سے زبردست ناامیدی ہے۔ حالات کے نہ بدلنے کے خیال نے اُس میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے:

''زندگی اور اس پر بحث۔ اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوسکتی ہے انسان اپنے کو کس قدر عظیم الشان ہستی خیال کرتا ہے لیکن نظامِ کائنات میں ہمارا درجہ کیا ہے۔ زمین پر رینگنے والے کیڑوں میں سے ذلیل ترین کیڑے، اور ہم اپنی زندگی کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے مرکز ہیں یہ کتنی مضحک بات ہے۔'' (۱۸)

راؤ کے برعکس احسان پکا اشتراکی ہے۔ اس کا اپروچ مثبت ہے اور وہ اشتراکی انقلاب میں ایمان رکھتا ہے۔ وہ انگریز سامراج سے ہی نفرت نہیں کرتا ہے بلکہ اُسے سرمایہ داروں کی نیا بھی ڈوبتی نظر آتی ہے وہ سوچتا ہے۔

احسان کے برعکس عارف کو سیاست، غلامی، آزادی سے دل چسپی نہیں۔ وہ لندن میں آئی اے ایس کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے اور آئی اے ایس آفیسر بننا اُس کی زندگی کا مقصدِ واحد وہ ہمیشہ انگریزوں کی نقل کرتا رہتا ہے اور 'صاحب' بننے کے خواب بنتا رہتا ہے۔ اس ناول میں ایسے بھی کردار ہیں جن کو روزگار کی فکر ہے اور تاریک مستقبل کا احساس اُن کے وجود کو گھُن لگائے ہوئے ہے۔ اپنے بارے میں سوچتے رہتے ہیں:

''آج کل بے روزگاری کتنی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا۔ میں اپنے امتحان میں پاس ہوں

گا یا نہیں اور اگر ہو بھی گیا تو پھر اُس کے بعد نوکری ملے گی بھی یا نہیں۔'' (۱۹)

ان نوجوانوں میں کوئی سیاست سے دل چسپی رکھتا ہے اور اشتراکی نظام میں عافیت سمجھتا ہے۔کسی کو مستقبل تاریک اور خوفناک دکھائی دیتا ہے۔کوئی آزادی اور غلامی کو موضوع بحث بناتا ہے کسی کو 'صاحب' بننے کی فکر ہے۔ یہ مختلف خیالات اُس دور کے ہندوستانی نوجوانوں کی اذہان کی تصویر کشی کرتے ہیں ان کا ذہن بیک وقت روشن بھی ہے اور تاریک بھی۔ان سے اقدار چھن چکی ہیں یا اُن کے لیے بے معنی ہو چکی ہیں اور اب یہ نئی قدروں کی تلاش کے لیے سرگرداں نظر آتے ہیں۔ناول کے یہ تمام کردار انفرادی خیالات (جو اُن کی انفرادی شناخت بھی بنتے ہیں) کے ساتھ ابھرتے ہیں۔اس ناول کے بارے میں خلیل الرحمان اعظمی لکھتے ہیں:

''سجاد ظہیر نے مختلف کرداروں کے ذریعے ہندوستان کے متوسط تعلیم یافتہ طبقے کے نوجوانوں کی عکاسی کی ہے اور اس طور پر اس دور کے بہت سے سیاسی و تہذیبی مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے اس ناول میں جو تصویریں ہیں وہ دھندلی دھندلی سی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذہن اور جذباتی کش مکش ابھی اپنی ابتدائی منزلوں میں ہے۔'' (۲۰)

لندن کی ایک رات کی تخلیق کا زمانہ ہندوستان کی حکومت اور تحریکِ آزادی کا زمانہ ہے جب تعلیم یافتہ طبقہ نے اپنے ملک کی غربت، افلاس اور بے چارگی کے بارے میں سوچنا شروع کیا تھا اور سامراجی ظلم و ستم کی بیخ کنی کے لیے پرتول لیے تھے۔یہی سب باتیں لندن کی ایک رات میں ملتی ہیں۔

ہندوستان میں انگریزوں کے ظلم و ستم جاری تھے اور اُدھر انگلستان میں اخباروں میں انگریزوں کی فراغ دلی، اصول پرستی اور انصاف پسندی کے چرچے ہو رہے تھے ادھر آزادی کے متوالوں کے سینوں کو آزادی چاہیے پر گولیوں کا نشانہ بنایا جاتا تھا اُدھر انگلستان میں انھیں فسادی کہا جاتا تھا 'بیکار مزدوروں کا ہائیڈ پارک میں جلسہ۔دس انگریز سپاہیوں نے دس ہزار ہندوستانی نیٹوز کو فساد کرنے سے روکا۔ایک گورا زخمی ہوا اور پندرہ نیٹوز کی جان گئی۔' انگلستان کے انگریزی اخباروں میں اِسی طرح کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ یہ شہ سرخیاں پڑھ کر اعظم سوچتا ہے:

''یہ کم بخت انگریزی اخبار کتنی حقارت کے ساتھ ہم ہندوستانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔'نیٹوز' ہم نیٹوز ہیں اور یہ لال منہے بندر جو اس ملک میں رہتے ہیں یہ کون ہیں۔'' (۲۱)

بعد میں اعظم یہ شہ سرخیاں اپنے دوست راؤ کو سناتا ہے اور بحث کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

''ہم کالے آدمیوں کی جان کیڑے مکوڑوں کے برابر ہے اور قصور ضرور ہمارا ہی ہوگا! ہم ہندوستانی اسی لائق ہیں، کمینے، ذلیل، بزدل، جوتا کھاتے ہیں مگر انگریزوں کی خوشامد سے باز نہیں آتے

۔ہندو مسلمان کی جان کے در پے، مسلمان ہندو کا گلا گھونٹنے کے لیے تیار۔ گولی نہیں! میرا تو بس چلے تو ساری قوم کو توپ کے منہ پر رکھ کر اُڑا دوں۔ اس قوم کو زندہ ہی رہنے کا کوئی حق نہیں۔ خیال تو کرو ۳۵ کروڑ انسان اور ایک لاکھ سے بھی کم انگریز ان پر مزے سے حکومت کرتے ہیں اور حکومت بھی کیسی حکومت! ہندوستان میں ذلیل سے ذلیل انگریز کا رتبہ بڑے سے بڑے ہندوستانی سے بڑھ کر ہے۔'' (۲۲)

غلام ہندوستان کے یہ نوجوان انگلستان کی آزاد فضاؤں میں اپنے ملک کی غلامی کے جس احساس سے دوچار ہیں وہ اُن کے باطنی کرب اور ذہنی کش مکش کا مظاہرہ کرتا ہے۔

''یہاں انگلستان میں چاہے انگریز مرد ہمارے جوتے صاف کرے اور انگریز لڑکیاں ہم سے محبت کریں مگر سوئز کے اس پار تو ہم سب 'کالا لوگ'، 'نیٹوز' غلاموں سے بدتر سمجھے جاتے ہیں۔ میں بیرسٹر ہو جاؤں اور تم انجینئر، مگر ہندوستان میں وہی 'نیٹوز' کے 'نیٹوز' ہو گے اور انگریزوں کی ٹھوکریں کھاؤ گے۔ اور باوجود اس کے پھر اُلٹ کر انھیں کو 'سرکار سلام'، 'خداوند' اور 'باپ' کہو گے۔ اتنی ذلت برداشت کرنے پر بھی جس قوم کے کان پر جوں نہ رینگے اس کا تو صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جانا ہی بہتر ہے۔'' (۲۳)

لندن کی ایک رات میں نوجوان نسل کو اُس دور کی تحریک آزادی کے لیڈروں کی کاوشوں سے دل برداشتہ دکھایا گیا ہے۔ اُن کی نظر میں عوامی رہنما خود غرضی سے عاری ہیں اور آپسی بکھیڑوں میں الجھ گئے ہیں۔

''ہندو مہا سبھا یا مسلم لیگ میں وطن کی بھلائی ہے؟ ہر شخص کے پاس وطن کی بھلائی کا ایک نسخہ ہے۔ ہر شخص معلوم ہوتا ہے وطن کی بھلائی کے لیے کوشاں ہے۔ ہر شخص پکار پکار کے کہتا ہے کہ وہ وطن کی بھلائی کے لیے کام کر رہا ہے۔ حد ہو گئی۔ اُن کی دیکھا دیکھی سے انگریزی گورنمنٹ تک کہنے لگی کہ وہ بھی ہندوستان کی بھلائی ہے اور ملک کا یہ حال ہے کہ۔ ایک طرف تو غربت اور بھوک کا سایہ ملک پر پھیلتا جا رہا ہے۔ دوسری طرف ظلم و جبر کا جال چاروں طرف سے ہم کو جکڑ رہا ہے۔'' (۲۴)

''لندن کی ایک رات'' کے بیش تر کردار اپنے اس اذیت ناک احساس کا مداوا ڈھونڈتے ڈھونڈتے جبلی، ذہنی اور روحانی کش مکش کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ عشق، مے نوشی، اور یار باشی سے بھی اُن کے زخموں اور دکھوں کا مداوا نہیں ہوتا وہ سب کے سب اپنے ملک کی غلامی، افلاس، غربت، ذلت، کروڑوں ہم وطنوں کی مظلومی کے بارے میں سوچتے ہیں۔'' (۲۵)

اُس دور کے ہندوستان میں ہر سو غربت، جہالت، معاشی ابتری اور افلاس کا راج تھا۔ جس کا ذکر اس ناول میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ ٹام جس نے ہندوستان میں انگریزی فوج میں کام کیا ہے اپنے دوست جم سے ہندوستان کے بارے میں کہتا ہے:

''میں لڑائی سے پہلے ہندوستان میں تھا اور میں نے وہاں کی حالت دیکھی ہے۔ اس وقت میں جوان

تھا، میں احمق تھا، سنتے ہو مجھے، میں احمق تھا۔ برٹش امپائر کا خیال کر کے میری رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگتا تھا۔ میں نے ہندوستانیوں کا 'کالا لوگ'۔ 'نگر'۔ 'نیٹوز' کہہ کر خطاب کرتا تھا، میں ہندوستانیوں کو جانوروں سے بدتر سمجھتا تھا۔ ہم لوگوں کو فوج میں سکھایا یہی جاتا تھا۔ میں نے خود دیکھا کہ ہم ہندوستانیوں میں کس طرح صلح قائم رکھتے ہیں! میں تم سے کہتا ہوں جم، ہندوستان میں ہماری حکومت کی بنیاد خوف پر ہے۔ تم جو کہتے ہو کہ ہندوستان میں ہماری وجہ سے امن قائم ہے۔ ممکن ہے، مگر امن کی قیمت کیا ہے؟ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ۔ غریب ننگے، بھوکے جو کیڑوں مکوڑوں کی طرح رہتے ہیں، لاکھوں، کروڑوں انسان۔ مشکل سے تم یہ کہہ سکو گے کہ وہ انسان ہیں۔'' (۲۶)

اسی طرح ہیرن پال اپنی محبوبہ سے ہندوستان کی معاشی بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

''جو قوم غلام ہو، جس میں اسی فیصدی انسانوں کو پیٹ بھر کھانا نہ ملتا ہو، جس میں مرض، وبا، بیماری اس قدر پھیلی ہو کہ سارے ملک میں مشکل سے کوئی تندرست انسان نظر آتے ہوں، جہاں علم گنتی کے لوگوں تک محدود ہو، جہاں بچے کملائے ہوئے پھولوں کی طرح ہوں، جہاں اکثر لوگوں کے چہروں پر بھوک، فاقہ، غربت اور مصیبت لکھی ہوئی ہو اور باقیوں کے چہرے سے سستی، جہالت اور ایک مکروہ قسم کی خوش حالی نظر آتی ہو۔'' (۲۷)

لندن کی ایک رات میں قوم کی بے بسی اور بے حسی پر طنز کے گہرے اور تیز نشتر بھی ملتے ہیں۔

''خوشی سے زندگی بسر کرنے کا راز ناامیدی میں ہے، ناامیدی کا بلند ترین درجہ کامل بے حسی کی کیفیت ہے۔ یہ وہ درجہ ہے کہ انسان کو خوشی اور غم آرام اور تکلیف میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ہم ہندو اسی کو نروان کہتے ہیں۔'' (۲۸)

لندن کی ایک رات کا زمانہ چونکہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا ابتدائی زمانہ تھا۔ انجمن کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی تھا کہ ادب کو زندگی کے قریب لایا جائے اور زندگی کا ترجمان بنایا جائے۔ سجاد ظہیر کو معلوم تھا کہ ہندوستان کا ادب زیادہ تر گل و بلبل کے عشقیہ قصوں سے متعلق ہے اور زندگی سے دور پڑا ہے چنانچہ ناول میں اعظم اپنی محبوبہ کا طویل انتظار کرتے ہوئے ذلت محسوس کرتا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اردو شاعری کے حوالے سے اس کا جواز تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو دراصل شعر و ادب کی اس وقت کی صورتِ حال پر گہری چوٹ کی حیثیت رکھتا ہے:

''عشق میں ذلت اٹھانا دراصل ذلت نہیں۔ اُردو کے اُن تمام شاعروں کے شکوے اور گلے مجھے یاد آنے لگے جو کوچۂ جاناں کے کتے بن کر اغیار کی ٹھوکریں کھاتے ہیں اور ماں کی گالیاں سنتے ہیں اور معشوق کے ہرجائی پن اور ناز نخرے کو لذتِ روح سمجھ کر نہ صرف برداشت کرتے ہیں بلکہ خود اُس کی

خواہش کرتے ہیں کہ اُن پر ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹیں۔''(۲۹)

لندن کی ایک رات کی اہمیت جہاں اس لحاظ سے ہے کہ یہ پہلا ترقی پسند ناول ہے وہاں اس لحاظ سے بھی اس کی حیثیت نمایاں اور اولیں ہے کہ اس میں 'شعور کی رو' تکنیک کا استعمال ہوا ہے۔شعور کی رو کی تکنیک میں لکھا ہوا سب سے عمدہ ناول انگریزی ادب میں جیمز جوائس کا یولیسس (Ulysses) ہے۔سجاد ظہیر نے اس ناول کو ضرور سامنے رکھا ہوگا۔یولیسس ایک زبردست اور عظیم تجربہ ہے جو ۱۶ر جون ۱۹۰۴ء کی صبح ۸ بجے سے شروع ہوتا ہے اور دوسری صبح دو بجے ختم ہوتا ہے اور 'لندن کی ایک رات' شام چھ بجے سے شروع ہوتا ہے اور صبح کی پھیکی پھیکی روشنی پر ختم ہوتا ہے۔اِسی لیے علی عباس حسینی نے یہ بات کہی تھی کہ:

''وہاں ڈبلن کا ایک دن تھا یہاں لندن کی ایک رات، وہ تحت الشعور کی انسائیکلو پیڈیا ہے، یہ جیمس ڈکشنری۔''(۳۰)

سجاد ظہیر کے یہاں شعور کی رو کی تکنیک کا بھر پور ادراک نہیں ملتا۔تاہم انھوں نے اس تکنیک کو اردو میں متعارف کیا اور اس کے ذریعہ سے مختصر کینوس میں اُس دور کے نوجوانوں کے تمام جذباتی اور ذہنی تضادات وتصادمات کو پیش کیا۔شعور کی رو کی تکنیک میں لکھے گئے اس ناول میں کہانی کی کوئی خاص ترتیب نہیں کرداروں کے خیالات بھی بے ترتیب ہیں لیکن اس سے ہم ان کے نظریات سے خوف وہراس سے اور اُن کے حال اور ماضی سے آشنائی حاصل کرتے ہیں۔

لندن کی ایک رات ایسے نوجوان طلبہ وطالبات کی کہانی ہے جو لندن میں مختلف شعبۂ ہائے تعلیم سے منسلک ہیں۔ان میں زیادہ تر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔مثلاً نعیم الدین تاریخ کا طالب علم ہے اور تھیسز کا پانچواں باب لکھ رہا ہے۔عارف بی۔اے ہے اور ہندوستان میں آئی سی ایس کی ناکامی کے بعد انگلستان میں آئی سی ایس کرنے آیا ہے۔ایک انگریز لڑکی شیلا ہے جو دن کے وقت کسی دفتر میں کام کرتی ہے اور رات کے کالج میں ہفتے میں چار بار لیکچر سننے جاتی ہے۔اسے ہیرن پال سے محبت ہو جاتی ہے جو بنگال کا رہنے والا ہے اور انگلستان میں ڈاکٹری کے آخری سال کا طالب علم ہے۔اسی طرح راؤ، احسان، کریمہ اور جین سب ہی طالب علم ہیں۔

کہانی کا آغاز لندن کے شدید ٹھنڈے موسم کے باوجود وہاں کی چہل پہل سے ہوتا ہے۔اعظم رسل اسکوائر کے انڈر گراؤنڈ اسٹیشن پر کھڑا انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا لیکن جین عہد وفا نہیں کرتی۔جین سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنی بیمار ماں کا بھی خیال رکھتی ہے۔وہ رات کے دس بجے اعظم کو فون کرتی ہے اور نہ آنے کی وجوہات بتا کر معافی مانگتی ہے اور اگلے دن بارہ بجے فون کرنے کا کہتی ہے لیکن اس دن بھی شام چھ سات بجے تک فون نہیں کرتی۔راؤ اعظم کو بتاتا ہے کہ آج تمام دوستوں کی دعوت نعیم کے گھر ہے۔راؤ ایک ذہین طالب علم ہے اس نے اپنے مقصدِ حیات کو بھلایا نہیں اس لیے وہ کسی

لڑکی کے ساتھ عشق کے جنجال میں نہیں پڑتا۔

راؤ اور احسان دو طالب علم انقلابی ذہنیت رکھتے ہیں اور اپنے ملک کو بدلنا چاہتے ہیں۔ اخبار پڑھنا راؤ کا معمول ہے۔ ایک دن اعظم ہندوستان میں چلنے والی گولی کے بارے میں پوچھتا ہے تو راؤ جواب دیتا ہے:

> ''نہیں میں نے اخبار تو نہیں دیکھا مگر اشتہار دیکھے ہیں۔ اب تو یہ روز کا دستور ہوتا جاتا ہے ہم کالے آدمیوں کی جان کیڑوں مکوڑوں کے برابر ہے اور قصور ضرور ہمارا ہی ہوگا! ہم ہندوستانی اسی لائق ہیں، کمینے، ذلیل، بزدل، جوتا کھاتے ہیں مگر انگریزوں کی خوشامد سے باز نہیں آتے۔ ہندو مسلمان کی جان کے درپے مسلمان ہندو کا گلا گھونٹنے کے لیے تیار۔ گولی نہیں میرا بس چلے تو ساری قوم کو توپ کے سامنے رکھ کر اڑا دوں۔ اس قوم کو زندہ ہی رہنے کا کوئی حق نہیں۔'' (۳۱)

راؤ ملکی حالت پر ذہنی کوفت میں مبتلا رہتا ہے۔ اسے ہندوستانیوں پر غصہ آتا ہے کہ ۳۵ کروڑ انسانوں پر ایک لاکھ سے بھی کم انگریز حکومت کر رہے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ چاہے کوئی انجینئر ہو یا میری طرح بیرسٹر بن جائے ہندوستان میں جا کر انگریزوں کی یہ غلامی کرنی ہے کیونکہ ہندوستان ایسا مقام ہے جہاں انگریز کا مقام بڑے سے بڑے ہندوستانی سے بالا ہے۔ راؤ غلامی کی اصل وجہ ہندو مسلم فسادات کو ٹھہراتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر یہ دو قومیں فتنہ و فساد سے بچتیں تو شاید انھیں انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا مل جاتا۔ اعظم سے گفتگو کے دوران راؤ کی آنکھوں میں ہندوستان کا دردناک نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ غریب عوام کے بارے میں پریشان ہوجاتا ہے جن کے چہروں پر دھوپ اور بھوک کے اثر سے جھریاں اور گڑھے پڑ گئے تھے۔ وہ ان کے میلے کچیلے کپڑوں پر بھی کافی پریشان تھا۔

راؤ کے علاوہ ناول کا دوسرا کردار احسان بھی انقلابی فکر کا حامل ہے۔ وہ انگریزوں کی غلامی کے خلاف ہے۔ ہندوستان کی پستی اور زوال پر اس کی گہری نظر ہے۔ وہ ہندوستانیوں کی عیش پسند زندگی سے اکتایا ہوا ہے وہ چاہتا ہے کہ ہندوستانی طالب علم جو پڑھنے لکھنے کی غرض سے یورپ آئے ہیں یہاں ناچ گانے میں اپنا وقت ضائع نہ کریں بلکہ اچھی تعلیم حاصل کر کے مفید اور کارآمد شہری بنیں اور ملک کی ترقی میں معاون ثابت ہوں۔ احسان میں انگریز سامراج سے نفرت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ سرمایہ داری نظام کو چند دن کا مہمان سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں وہ وقت ضرور آئے گا جب ہندوستان آزاد ہوگا اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ دے گا۔ احسان نے رئیس، بنیوں، وکلا، ڈاکٹرز، پروفیسر وغیرہ کو جونک سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> ''تم سب کے سب رئیس بنئے، مہاجن، بیرسٹر، وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر، سرکاری نوکر، جونک کی طرح ہو اور ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں کا خون پی کر زندہ رہتے ہو۔ ایسی حالت قیامت تک

قائم نہیں رہے گی۔ کسی نہ کسی دن تو ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں مصیبت زدہ انسان خواب سے
چونکیں گے بس اسی دن تم سب کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔'' (۳۲)

راؤ احسان کے ساتھ ساتھ ہیرن پال بھی تبدیلی کا خواہاں ہے۔ وہ سوئٹرز لینڈ ایک ماہ کے لیے جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات شیلا گرین سے ہوتی ہے۔ ذہنی ہم آہنگی انھیں قریب لاتی ہے۔ شیلا ہیرن سے محبت کرنے لگتی ہے۔ وہ بھی راؤ اور احسان کی طرح اپنے ملک کی آزادی کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ شیلا سے ملک کے تمام مسائل پر اظہار خیال کرتا ہے۔ وہ چاہے برطانیہ میں ہو یا سوئٹرز لینڈ میں اس کی روح ہندوستان میں ہی محوِ پرواز ہے۔ وہ مصمم ارادہ رکھتا ہے کہ وہ اپنے ملک میں موجود تمام مسائل کا خاتمہ کرے۔ راؤ اور احسان کے کردار کے بارے میں عتیق احمد رقمطراز ہیں:

''راؤ اور احسان ...... دونوں مسلسل ہندوستان کی غلامی اور اقتصادی بدحالی، شدید غربت، تعلیم کی کمی اور اوپر سے ان سے کام لینے والے سیٹھ ساہوکاروں اور جاگیرداروں کے ظلم اور زیادتی یہ سب باتیں انھیں مستقل طور پر بے چین رکھتی ہیں چنانچہ ان دونوں کے رویے میں ایک تلخی اور جھلاہٹ مسلسل حاوی رہتی ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنے ملک کی حالت پر بے چین ہیں اور دوسری طرف وہ ان طالب علموں کو دیکھتے ہیں جو اگر سنجیدگی سے اپنی تعلیم مکمل کر لیں اور اپنے اندر بھی ملک کی فلاح اور بہبود کا جذبہ پیدا کر کے واپس چلے جائیں تو بدقسمت لوگوں کے حالات اور تقدیر بدلنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔۔۔ وہ لندن کے ایسے لوگوں سے بھی ملتے جلتے رہتے ہیں جن کی سوچ انقلابی بھی ہو اور ہندوستان پر برطانوی حکمرانی کو خود انگریز ہوتے ہوئے بھی ہندوستان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ سمجھتے ہیں۔ اور اس عزم کے ساتھ زندہ ہیں کہ بہرحال ہندوستان کی پیشانی سے کالک دھلنی چاہیے۔ جس میں ان کا بھی اپنا کردار اور حصہ ہوگا۔'' (۳۳)

سجاد ظہیر نے اپنے اس ناول کے ذریعے نوجوانوں کی اپنے وطن سے محبت، ان کے اختلاف رائے، متضاد خیالات اور رجحانات کو ہم تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ان کے ہاں شخصی آزادی کا تصور بھی کارفرما ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد عارف:

''سجاد ظہیر نے ''لندن کی ایک رات'' میں مختلف کرداروں کے حوالے سے آزادی کے متنوع تصورات کو اجاگر کیا ہے۔ تاہم رجحانِ غالب ان کے نزدیک معاشی انصاف، آزادی و مساوات ہی ہے۔'' (۳۴)

لندن کی ایک رات سجاد ظہیر کا ایسا ناول ہے جس میں کئی کرداروں کے ذریعے ہندوستان نوجوانوں کے ذہنوں میں پروان چڑھنے والی بغاوت کے عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ باغیانہ عناصر آگے چل کر اردو ادب میں عام طور

پر اور ترقی پسند تحریک کے ادب میں خاص طور پر نمایاں ہوئے۔ ان کرداروں میں سے کسی ایک کردار کو سجاد ظہیر نے مرکزی کردار کی حیثیت سے نہیں ابھارا، اس لیے کوئی ایک خاص کردار ایسا نہیں جو باقی سب کی نمائندگی بھی کرتا ہو یا جس کی حیثیت باقی کے مقابلے میں لیڈر کی سی ہو۔ تاہم راؤ اور احسان دیگر کرداروں کے مقابلے میں کسی قدر نمایاں ضرور ہیں۔ اس ناول کے کردار مل کر ایک ایسے کردار کا نقشہ ضرور ابھارتے ہیں جس میں اس وقت کے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی صورت حال کے خلاف باغیانہ اور انقلابی رجحانات موجود ہیں۔

مشرقی تہذیب:

لندن کی ایک رات کا پہلا کردار اعظم ہے۔ یہ بھی احسان اور راؤ کے ساتھ انگلستان میں زیرِ تعلیم ہے لیکن اسے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ مشرقی روایتی عاشق کی طرح اپنی محبوبہ جین کا انتظار کرتا ہے۔ محبوبہ کی یاد میں تڑپنے ، آنسو بہانے کے بجائے جھنجھلاتا ہے، شک اور رشک کی ملی جلی کیفیت اس پر طاری رہتی ہے۔ گو اس کا مقصد زندگی عشق اور صرف عشق ہے لیکن اس عشق میں مشرقیت اور مغربیت گھل مل گئی ہے، جین ایک مغربی لڑکی ہے، لیکن اعظم اسے مشرقی انداز سے دیکھتا ہے حالانکہ وہ مغربی تہذیب سے بخوبی واقف ہے۔ اور شاید یہی واقفیت اس کے دل میں بدگمانی بھی پیدا کرتی ہے۔ جین کا بار بار کہنا تم جانتے ہو اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اعظم مغربی تہذیب اور تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتا ہے:

> ''چھ بج کے دس منٹ ہو گئے۔ رسل اسکوائر کے 'انڈر گراؤنڈ اسٹیشن' کی گھڑی پر بار بار اعظم کی نظر جاتی ہے۔ 'کم بخت آج پھر وعدہ کر کے معلوم ہوتا ہے نہیں آئے گی۔ یہ پہلی بار نہیں ہے۔ مجھے اپنی حالت پر خود شرم آتی ہے۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ ذرہ برابر بھی میرا خیال نہیں کرتی، مگر میں ہوں کہ اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ آخر لندن میں اور بہت سی لڑکیاں ہیں اور میں کچھ ایسا بدصورت بھی نہیں، مگر میں اس قدر کمزور ہوں۔ مجھے اپنے اوپر ذرا بھی قابو نہیں۔ کتنی دفعہ ارادہ کر چکا ہوں کہ اس سے ملنا چھوڑ دوں، اس سے بات تک نہ کروں، سڑک پر ملے تو دوسری طرف منہ پھیر لوں اور اگر وہ خود میرے پاس اپنی مرضی سے آئے تو صاف کہہ دوں 'چلی جا میرے پاس سے اگر مجھ سے تجھے محبت نہیں تو کیوں میرے پاس آتی ہے۔ کوئی اور عاشق ڈھونڈھ۔ تیرے اور بہت سے طلب گار ہیں۔ میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں۔' اور اس طرح کے اور بہت سے تیز و تند کلمے، جس سے دراصل اس کے دل پر چوٹ لگے، اسے تکلیف پہنچے، اسے اذیت ہو۔ اس طرح سے میں اس سے بدلہ لوں۔ مجھے جو پریشانی، کوفت، الجھن، بے اطمینانی، حسد، رشک، غصہ، رنج، اس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس کا بدلہ لوں۔ لیکن کبھی مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ یہ بہانہ نہیں۔ تم جانتے ہو، میں تم کو کس قدر چاہتی ہوں۔ اچھا کل بارہ بجے کے قریب تم کو ٹیلی فون کروں گی۔ اب مجھے اس وقت معاف کرو۔ مجھ سے ٹیلی فون پر بات کرنے تک

کی اسے فرصت نہیں اور کل صبح سویرے اٹھنا ہے اپنی والدہ کی مدد کے لیے۔ جھوٹ، جھوٹ، وہ ضرور کسی اور کے ساتھ سیر و تفریح کو جا رہی ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ بس اس سے اچھا موقع اب نہیں مجھے ملے گا۔ اس سے صاف صاف کہہ دوں، جو کچھ بھی میرا شبہ ہے۔ مگر میں نے جواب دیا۔ 'اچھی بات ہے، جین، کل بارہ بجے تمھارے ٹیلی فون کا میں انتظار کروں گا۔ گڈ نائٹ۔'' (۳۵)

اعظم بہت کچھ سوچتا ہے، اپنے آپ کو گالیاں دیتا ہے مگر جب اس کا فون آتا ہے تو اسے کچھ کہہ نہیں پاتا۔ مشرقی تہذیب کئی کرداروں میں رچی دکھائی دیتی ہے، جو مغربی تہذیب کو ایک حد تک قبول کرنے پر تو آمادہ ہیں، لیکن یکسر اپنی تہذیب سے کنارہ کش ہونا ان کے بس کی بات نہیں، ایسا ہی ایک کردار کریمہ ہے جو ہندوستان جیسے قدامت پسند مُعاشرے سے اکیلی ہزار ہا میل کا سفر طے کر کے لندن میں تعلیم کی غرض سے آئی ہے لیکن یہاں یکسوئی سے محروم، فکر و عمل کی دُوئیت کا شکار ہے اور تہذیبِ مغرب کے محاسن و قبائح کے اِنتخاب و اِسترداد میں اُلجھی ہوئی ہے۔ اُسے مغرب کی تقلید گوارا ہے لیکن 'اندھی تقلید' ناقابلِ برداشت۔ وہ نعیم کی پارٹی میں موجود ہے اور اِس بات پر کُڑھنے میں مصروف ہے کہ یہ ہندوستانی لڑکے آخر اپنی تہذیب کو فراموش کیوں کیے بیٹھے ہیں اور کیوں ایک مُسلمان لڑکی یعنی کریمہ کو رقص کی دعوت دینا اُنہیں معیوب نہیں لگتا۔ وہ اپنے خیالات کے برملا اظہار سے بھی نہیں چُوکتی اور جواباً لڑکے اُس کے دوغلے پن اور دہرے معیار کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں جو اکیلے پارٹی میں تو آ گئی ہے لیکن رقص پر معترض ہے۔ وہ اُس کی ہندوستان سے تنہا لندن آمد، بے پردگی اور مردوں کی مجلس میں موجودگی پر بھی طنز کرتے ہیں۔ اِس مقام پر کریمہ قدیم و جدید کی کش مکش میں گرفتار ہندوستانیوں کی نُمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ مغربی معاشرے میں رہ کر بھی اس نے مشرقی اقدار سے منہ نہیں موڑا۔ ایک منظر ملاحظہ ہو:

''انگریز لڑکی اب کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر آتش دان کی طرف آ گئی۔ عارف اور کریمہ بھی قریب آ کر بیٹھ گئے اور ان تینوں نے ایک دوسرے پر نظر ڈالی۔ نعیم نے عارف اور کریمہ کے کوٹ لے جا کر کونے میں کھونٹی پر ٹانک دیے۔ پھر اس نے واپس آ کر سب کو سگرٹ پیش کیے۔ 'جی نہیں شکریہ، میں سگرٹ نہیں پیتی'۔ کچھ تتلیوں کی سی مہین آواز میں کریمہ نے کہا'' (۳۶)

کریمہ بیگم لندن میں انھیں طلبہ کے ساتھ زیرِ تعلیم ہے۔ وہ ہندوستانی عورت ہے جو اپنے مرد کے ساتھ کسی دوسری عورت کو دیکھ کر چراغ پا ہو جاتی ہے، جہاں اسے کوئی خوبصورت عورت نظر آئی اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ شک اور حسد سے جلنے بھننے لگتی ہے۔ سجاد ظہیر نے کریمہ کے روپ میں ایسی عورتوں کی صحیح عکاسی کی ہے۔ ہندوستانی طالب نعیم کے کمرے میں پارٹی ہے۔ انگریز لڑکی شیلا گرین ہندوستانی لڑکوں سے محوِ گفتگو ہے۔ کریمہ بیگم بھی اس پارٹی میں موجود ہیں۔ اس موقعے پر کریمہ بیگم پر جو کچھ گزر رہی ہے سجاد ظہیر نے اسے کاغذ پر اس طرح منتقل کیا ہے جیسے وہ خود سجاد ظہیر کے بجائے

کریمہ بیگم ہوں:

''ان ہندوستانی لڑکوں کو آخر کیا ہو گیا؟ گوراچٹرا دیکھ کر انھیں اپنے اوپر بالکل قابو نہیں رہتا۔ سوا سفید چمڑے کے اور اس فرنگن میں کیا ہے؟ کیا بن بن کر باتیں کرتی ہے۔ دیدہ دلیری سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ چست کپڑے صرف اس لیے پہنتے ہیں کہ مرد اس کے جسم کی بہار دیکھیں۔ بے شرم، بے غیرت، بے حیا۔ ایسی عورتوں میں اور زبان بازاری میں کیا فرق؟ چڑیل کی طرح بال بکھرے ہوئے، منہ پر پوڈر لگا ہوا، لہنگے میں سے گز گز بھر ٹانگیں باہر نکلیں، جرابیں ریشمی، اتنی باریک کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر۔ کھڑی ہوں تو اکڑ کر، چلیں تو سینہ تان کر، سگرٹ یہ پئیں، شراب یہ پئیں، ناچیں یہ، کون سے ہنر ہیں جوان فرنگنوں میں نہیں۔ رہ گئی عصمت، آبرو، اسے تو یہ ہتھیلی پر لیے پھرتی ہیں۔ آج اس مرد پر ڈورا ڈالا تو کل دوسرے کو پھانسنے کی فکر۔ سوائے مزے اُڑانے کے ان کی زندگی کا کوئی اور مقصد نہیں اور ہمارے ہندوستانی لڑکے ولایت آ کر ان کے جال میں ایسے پھنستے ہیں کہ ان کو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔ آخر ان کی سمجھ پر کیوں پتھر پڑ گئے؟ کوئی مجھے بتائے کہ اس شیلا گرین میں کہاں کا حسن کوٹ کوٹ کر بھرا ہے جو یہ دونوں اس پر مرے جاتے ہیں۔ بڑی آئی ہے، ہندوستان کی دوست بننے والی! صرف ان لڑکوں کی خوشامد کے لیے کہتی ہے کہ ہمیشہ سے ہندوستان سے دلچسپی ہے۔ شرابی، سود خور، کرسٹان، ہمیں اس دوستی کی حقیقت خوب معلوم ہے۔ کہتی ہے کہ ہندوستانی بڑے خوبصورت ہوتے ہیں جس سے ان لڑکوں کے سر پھر جائیں۔ اور چالا کی تو دیکھو کیسا میرے سوال کو پی گئی۔ جواب دیتی تو قلعی نہ کھل جاتی۔ معلوم نہیں کتنے ہندوستانیوں کو خراب کر چکی ہوگی۔ چلتر باز! لیکن آخر ان لڑکوں کی عقل پر پردے کیوں پڑ گئے ہیں؟ بہت پڑھی لکھی بھی تو نہیں معلوم ہوتی۔ سینہ سپاٹ، پھیکا رنگ، صورت پر پھٹکار برستی ہے جسم مردوں کے ایسا، یہ عورت ہے یا پہلوان؟ ایک بھی بات تو اس میں شریف زادیوں کی سی نہیں۔ نیچ خاندان کی ہوگی۔ کسی مزدور اٹھائی گیرے کی لڑکی۔ انگریز اِسے پوچھتے نہ ہوں گے۔ ایسی ایسی کتنی لڑکیوں کو یہاں شوہر نہیں دستیاب ہوتے۔ سب جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہیں۔ چلتی ہوئی عورت ہے۔ کسی بھولے بھالے امیر ہندوستانی شریف زادے کو پھانس کر اس سے شادی کرنے کی فکر میں ہوگی۔ دل میں ضرور ہم لوگوں سے نفرت کرتی ہوگی، لیکن اپنے کو دولت کے لیے بیچ دے گی۔'' (۳۷)

مشرقی تہذیب چونکہ مجلسی تہذیب ہے، اس میں انفرادی معاملات میں دخل دینا معیوب نہیں سمجھا جاتا، جب کہ مغربی تہذیب میں کسی اجنبی سے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں سوال کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے، اس لیے سجاد ظہیر مغربی تہذیب کا تقابل کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہاں کیسے اس ضمن میں موسم جیسے موضوعات کا سہارا لیا جاتا ہے:

''موسم کی باتیں کر کے ہر شخص اپنے ذاتی معاملات پر اوروں کو گفتگو کرنے سے روک دیتا ہے۔ یہ ایسا

مضمون ہے جس پر ہر شخص آزادی کے ساتھ اظہار رائے کر سکتا ہے۔ بغیر یہ بتائے کہ اس کا ''اسم شریف'' کیا ہے۔ اس کا ''دولت خانہ'' کہاں ہے۔ اس کا پیشہ کیا ہے۔ اس کی تنخواہ کیا ہے۔ اس کا مذہب کیا ہے۔ اس کی ذات کون سی ہے۔ جو ہمارے وطن کا دستور ہے۔''(۳۸)

مشرقی تہذیب کا ایک اہم جزو شاعری ہے، پورا معاشرہ اسے نہ صرف پسند کرتا ہے، بلکہ اسے روزمرہ زندگی کا حصہ بنا دیا گیا تھا لیکن مغربی عقل کی دلدادہ ہے، مغربی تہذیب میں اسے صرف حظ کی چیز سمجھا جاتا ہے وہ وہاں کہ تہذیبی زندگی کا حصہ نہیں ہے، اسے خیالی دنیا سمجھا جاتا ہے اور اسے حقیقت سے فرار سمجھا جاتا ہے، نعیم جب راؤ کی دوست سے گفتگو کرتا ہے تو ان خیالات کا اظہار ایسے کرتا ہے:

''ممکن ہے ہم ہندوستانیوں کے سست ہونے کی یہی وجہ ہو کہ ہم ہر وقت شاعری میں ڈوبے رہتے ہیں۔ آپ کہتی ہیں کہ شاعری کا اثر ہمارے دل و دماغ کو تھوڑی دیر کے معطل کر دیتا ہے یا کم از کم انھیں اصلیت سے ہٹا کر ایک خیالی دنیا میں پہنچا دیتا ہے اور خیالی دنیا میں رہتے رہتے ہم اس قدر محو ہو جاتے ہیں، کہ مکان و زمان چونکہ لامتناہی ہیں، اس لیے ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بھی لامتناہی ہیں۔ ہر انسان کے دل میں اپنے کو زندہ جاوید سمجھنے کی چھپی ہوئی خواہش ہوتی ہے۔ شاعری کے ذریعہ سے ہم اپنی یہ پیاس بجھاتے ہیں۔ عقل ہم سے کہتی ہے کہ یہ سراسر حماقت ہے لیکن شاعری کے ذریعہ سے ہم عقل کو بھی زیر کر سکتے ہیں۔ ہماری شاعری عقل کی برائیوں سے بھری پڑی ہے۔ عقل ہمیں مشکلوں اور تکلیفوں کی طرف کھینچتی ہے۔ عقل ہمیں دھوکا دے سکتی ہے۔ لیکن شاعری کی شراب! آپ نے خود کہا کہ اس کا اثر ہمیں مست کر دیتا ہے۔ اور اگر ہمیں یہ مستی، یہ بے خودی کی حالت، یہ بے عقلی، کبھی خوشی اور کبھی غم کے دریا میں اس طرح غرق کر دیتی ہے کہ ہم اپنی انسانیت تک کو بھول جاتے ہیں اور محض ایک نغمہ مسرت یا ایک نالۂ جانگداز ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کیا ہمیں اس چیز سے پرہیز نہیں کرنا چاہیے۔''(۳۹)

مشرقی اور مغربی تہذیب کا ایک فرق مادی ترقی ہے۔ لندن کی آسودہ زندگی میں اکثر ہندوستانی طالب علموں کو ہندوستان کی یاد ستاتی ہے تو ان کی یاد میں ہندوستان کے گلی کوچے اور اس کے مکینوں کے چہرے روشن ہو جاتے ہیں، ایسے میں دراصل مغربی اور مشرقی تہذیب کا تقابل سامنے آتا ہے۔ مغربی تہذیب کی معاشی برتری، مشرق کی پس ماندگی کا منہ چڑا رہی ہوتی ہے، جب اعظم پارٹی سے واپس اپنے کمرے میں پہنچتا ہے تو ایسا ہی ایک منظر ہمارے سامنے آتا ہے: ''اعظم نے اپنے کمرے میں پہنچ کر گیس جلائی، ٹوپی اتار کر پلنگ پر پھینکی اور بغیر اوورکوٹ اتارے آتش دان کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اندھیرے کی وجہ سے کوئی چیز اچھی طرح وہاں دکھائی نہیں دیتی تھی ـــــ۔ اس تاریکی میں اعظم کو ان گلیوں کا خیال آیا، ہندوستان کے شہروں کی گلیاں۔ دلّی، لکھنؤ، بنارس جن میں رات کو بالکل تاریکی رہتی ہے یا جہاں روشنی بہت کم ہوتی

ہے۔ایک مرتبہ بڑی رات گئے وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ چوک جا رہا تھا۔بالکل اندھیرا تھا۔نالیوں میں سے بوآ رہی تھی۔چلتے چلتے ایک طرف روشنی دکھائی دی جو ایک کوٹھری کے دروازہ میں سے آ رہی تھی۔ادھر جو نظر پڑی تو دیکھا کہ دو بڑھے ایک تخت پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں،ان کے جسم پر سوائے چھوٹی چھوٹی تہمدوں کے اور کچھ بھی نہیں،سفید داڑھیاں،گردنیں جھکی ہوئی اور اُن کے سامنے شطرنج بچھی ہوئی ہے۔معلوم ہوتا تھا کہ اتنے بڑے شہر میں یہ صرف دو بڑھے اس وقت جاگ رہے تھے اور ان کی لالٹین کے سوا شہر کی باقی روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔اعظم اور اس کا دوست ذرا دیر کے لیے وہاں رُک گئے،لیکن اُن دو بڈھوں نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔اس وقت اعظم کو ان دونوں کا خیال کر کے کچھ خوشی ہوئی۔''(۴۰)

مغربی تہذیب:

سجاد ظہیر کے کردار خواہ نخواہ مغربی تہذیب کے سحر میں جکڑے ہوئے ہیں۔سرمایہ داری اور سامراج سے نفرت کرنے والے نوجوان مغرب کی آزادہ روی کے سحر میں ڈُوبے ہوئے ہیں اور روشن مُستقبل کی علامت سمجھی جانے والی انگریزی زبان وتہذیب اُن کی مجبوری بن چکی ہے۔اُنہیں اپنے وطن کو درپیش مسائل کی جڑیں سرمایہ دارانہ نظام اور سامراجی تسلّط سے پُھوٹتی نظر آتی ہیں لیکن اِن مسائل کے حل کے لیے وہ مغرب ہی سے جنم لینے والی مارکسی اور اِشتراکی فکر پر اِنحصار کرنے پر مجبور ہیں۔اُن کے برعکس عارف جیسے نوجوان جو نوآبادیاتی ہندوستان میں اپنا مُستقبل آئی۔سی۔ایس میں محفوظ تصوّر کرتے ہیں دِن رات فرنگی آقاؤں کی تہذیب میں پُوری طرح سے ڈھل جانے کی تگ ودَو میں مصروف ہیں اور چاہتے ہیں کہ مغربی سانچوں میں ڈھلنے کے عمل میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔سجاد ظہیر نے اپنے ناول میں اِن فکری اِنتہاؤں پر موجود ہندوستانیوں کے ساتھ ساتھ چند یورپی کردار بھی پیش کیے ہیں۔پب میں چند نچلے طبقے کے افراد ہیں جن میں سے بعض ہندوستانیوں کی حالتِ زار پر اُن سے ہمدردی رکھتے ہیں اور بعض عالمِ مدہوشی میں بھی نسلی اِمتیاز اور نفرت وتعصّب پر مبنی اپنے خیالات کا بآوازِ بلند اِظہار کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔نعیم کی پارٹی میں شامل ایک یورپی لڑکی ہے جو سنیما ایکٹریس بننے کی کوششوں میں ہے اور جسے برٹش میوزیم کے باہر رکھے شیر ''بڈھے معلوم ہوتے ہیں۔''(۴۱)

اور اُس کے اِشتراکی فکر کے حامی دوست کے بقول مذکورہ شیر برطانوی اِمپیریلزم کے زوال کی علامت ہیں۔اور شیلا گرین جو اپنے والدین کی'' کالے لوگوں'' سے دُور رہنے کی ہدایات کے باجود ہندوستان میں اپنی دِلچسپی کی وجہ سے اِن طلبہ کے درمیان موجود ہے اور سب کی توجّہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔نعیم بیشتر وقت شیلا کے ہمراہ رہتا ہے اور اُن کی آپس کی گُفتگو سے شیلا کی دِل شکستگی اور تنہائی کی وجوہات معلوم ہوتی ہیں۔اِسی پارٹی میں شیلا گرین اور نعیم کے مابین محبت کا جذبہ جنم لیتا ہے

جو دراصل دو تنہا اِنسانوں کی تنہائی سے پیدا شدہ صُورتِ حال کا نتیجہ ہے۔ سجاد ظہیر نے اِس جذبے کی محض اِنسانی جہت کو نُمایاں کیا ہے اور اسے حاکم و محکوم کے مابین رشتے کی جہت تک نہیں پہنچایا۔

''وہ دونوں ایک محکوم قوم اور دوسری نو آبادیاتی طاقت کے افراد ہونے کے باوجود جنس و عشق کے ذریعے سیاسی طاقت کے کھیل میں مُبتلا نہیں کیے جاتے اور نہ ہی ان کے درمیان ایسا تناؤ اُبھرتا ہے جسے آج کل کی چلتی ہوئی زبان (Jargon) میں ''تہذیبوں کا تصادم'' قرار دیا جا سکے۔ سجاد ظہیر اپنے کرداروں پر مشرق اور مغرب کی نمائندگی کا غیر ضروری بوجھ نہیں لادتے۔ یہ کردار جہاں کے ہیں اور جہاں سے Belong کرتے ہیں، وہیں کے نظر آتے ہیں۔'' (۴۲)

سجاد ظہیر نے ماحول کی مُناسبت سے فنکارانہ مہارت سے مغربی تہذیب کے کئی پہلو نُمایاں کیے ہیں۔ اس حوالے سے ناول کا آغاز ہمیں مغربی ماحول سے آشنا کرتا ہے، خصوصاً لندن کی تصویر کشی، مغربی ممالک کا سرد موسم بھی ان کی عادات واطوار اور رسوم و رواج پر اثر انداز ہوتا ہے۔ نیز اس دور کی صنعتی ترقی سے بھی ہمیں آشنا کرتی ہے۔ ناول کا آغاز یوں ہوتا ہے: ''لندن نہایت گھنے، زردی مائل، گاڑھے، تاریک کہرے سے ڈھکا ہوا ہے۔ ایک ایسا لحاف جو نم ہو اور ٹھنڈا، جس سے ہمارا سارا جسم اور خصوصاً ناک منہ ڈھانپ دیا جائے۔ سانس مشکل سے لی جائے۔ سانس لیتے وقت یہ معلوم ہو کہ تر دھواں پی رہے ہیں، ہر چیز نم، ہر چیز پر مہین مہین پانی کے قطرے جمے ہوئے ہیں۔ سردی زیادہ نہیں، لیکن جتنی بھی ہے تکلیف دہ ہے۔ تیسرا پہر ہے لیکن معلوم ہوتا ہے رات ہو گئی۔ سڑک کی روشنی میں چمک نہیں، اندھیرے اور روشنی میں معلوم ہوتا ہے لڑائی ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی کہرے کے ہلکے ہو جانے سے گیس کی روشنی چمک اُٹھتی ہے۔ اس کیفیت کے باوجود لندن کی چہل پہل میں کوئی کمی نہیں۔ دوکانیں روشن اور سڑکیں موٹروں، لاریوں اور بسوں سے بھری ہوئی ہیں۔ کنارے کی پٹڑی پر جہاں لوگ پیدل چلتے ہیں، دفتروں سے نکلے ہوئے لوگ منشی، محرر، کاروباری، ٹائپ کرنے والی لڑکیاں، طالب علم اور چھوٹے کارخانوں میں کام کرنے والے مرد اور عورتیں تیز تیز قدم بڑھائے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ چھ بج چکے ہیں۔ اور ''بلومسبری'' میں جہاں لندن کے طالب علم، ''اہل دماغ''، ''اصلی اور نقلی'' ہر قوم کے لوگ جو انگلستان کی سیر کو آتے ہیں، آ کر ٹھہرتے ہیں۔ جہاں انگلستان کے ذہنی

انقلابی، آرٹسٹ، غریب، مصنف، وہ سب لوگ جو ایک روحانی خلا میں معلق ہیں، مل جل کر عجیب وغریب کیفیت پیدا کرتے ہیں۔''(۴۳)

سجاد ظہیر نے مغربی طرزِ معاشرت، آداب واخلاق، تعصبات، رویوں، افکار ورسوم کی عکاسی میں چھوٹے چھوٹے واقعات اور مکالموں اور اکثر اوقات کرداروں کی سوچ اور سلسلۂ خیالات کے ذرائع استعمال کیے ہیں۔ کرداروں کے باہمی تفاعل سے مغربی تمدّن کے کئی پہلو اپنی تہہ میں پوشیدہ وجوہات سمیت منکشف ہوتے ہیں۔ جنسی آزادی معیوب نہیں ہے، اعظم راؤ کے بارے میں سوچتا ہے:

''راؤ خوش قسمت آدمی ہے۔ اسے کبھی عشق وعاشقی کے جنجال میں پڑتے کسی نے نہ دیکھا۔ باوجود اس کے ہمیشہ کوئی نہ کوئی بانکی لڑکی اس کے قبضے میں رہتی ہے۔''(۴۴)

ناول کے کئی کرداروں پر مغربی رنگ غالب آچکا ہے اور وہ شراب نوشی سے بھی اجتناب نہیں کرتے، راؤ اور اعظم جب اسٹیشن سے نکل کر نعیم کے گھر جانے لگتے ہیں تو راؤ کہتا ہے:

''چلو 'پب' میں چلتے ہیں، ایک ایک گلاس 'بیئر' پئیں۔ پھر نعیم کے ہاں چلتے ہیں۔''(۴۵)

اعظم اور راؤ جس 'پب' میں گئے گو وہ ایک معمولی شراب خانہ تھا، لیکن سجاد ظہیر شراب خانوں کے عمومی ماحول کی منظر کشی یوں کرتے ہیں:

''انگلستان میں شراب خانے عام طور پر دو یا تین حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ سامنے کا حصہ جس میں مزدور طبقہ کے لوگ جاتے ہیں اور اندر کا حصہ جس میں پیسے والے لوگ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک چھوٹا سا تیسرا حصہ بھی ہوتا ہے۔ جہاں وہ لوگ جنھیں جلدی سے واپس چلا جانا ہوتا ہے، شراب پی لیتے ہیں۔ اس حصہ میں بیٹھنے کے لیے کرسیاں وغیرہ نہیں ہوتیں۔ شراب بیچنے والا درمیان میں ہوتا ہے۔ اس کے چاروں طرف کوئی ڈیڑھ گز اونچی اور تقریباً ایک فٹ چوڑی لکڑی کی میز ہوتی ہے۔ اس میز میں اندر کی طرف نل لگے ہوتے ہیں جن میں سے گلاس بھر بھر کر بیئر ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو بوتل میں بھری ہوئی شرابیں نہیں پینا چاہتے۔''(۴۶)

اسی طرح باہمی گفتگو کے لیے 'موسم' سب سے اہم موضوع ہونا یا یورپی عورت کی آزادی کا صنعتی عہد کی پیداوار ہونا اور صنعتی انقلاب کے نتیجے میں یورپی اقدار کی تبدیلیاں وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن سے ہمیں سجاد ظہیر مغربی تہذیب کے بارے میں آشنا کرواتا ہے۔ موسم کے بارے میں یوں لکھتے ہیں: ''انگلستان میں موسم پر اظہار کرنا ہر شخص اپنا فرض سمجھتا ہے۔ بجائے مزاج پرسی کے موسم کی اچھائی یا برائی کا ذکر کرنا، ایک دستور سا ہو گیا ہے، جس کے جواب میں دوسرا شخص اتفاق

رائے کا اظہار کرتا ہے اور اگر اسے کچھ اور ضروری بات نہیں کرنی ہوتی، اور اس کا دل چُپ رہنے کو بھی نہیں چاہتا تو پھر موسم پر گفتگو چھڑ جاتی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے تجربات بیان کرتا ہے، سال گذشتہ موسم اتنا برا نہیں تھا، پانچ سال ہوئے جب گرمیوں کے مہینے میں سورج بالکل دکھائی نہیں دیا اور مسلسل بارش ہوتی رہی اور جاڑوں بھر دھوپ ہی دھوپ رہی، تین برس پہلے اتنی سردی پڑی کہ نل میں پانی جم گیا۔ دریائے ٹیمس پر اسکیٹنگ ہوتی رہی وغیرہ وغیرہ۔ غرض اس گفتگو کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ انگریز قوم نے غالبًا انفرادی آزادی کو قائم رکھنے کے لیے اس رسم کو رائج کیا ہے۔ موسم کی باتیں کر کے ہر شخص اپنے ذاتی معاملات پر اوروں کو گفتگو کرنے سے روک دیتا ہے۔ یہ ایسا مضمون ہے جس پر ہر شخص آزادی کے ساتھ اظہار رائے کر سکتا ہے۔ بغیر یہ بتائے کہ اس کا ''اسم شریف'' کیا ہے۔ اس کا ''دولت خانہ'' کہاں ہے۔ اس کا پیشہ کیا ہے۔ اس کی تنخواہ کیا ہے۔ اس کا مذہب کیا ہے۔ اس کی ذات کون سی ہے۔ جو ہمارے وطن کا دستور ہے۔'' (۴۷)

مشرق کا موسم گرم اور مغرب کا موسم سرد ہے۔ مغربی معاشرہ چونکہ سرد موسم کا عادی ہو گیا ہے، اس لیے اس پر برے موسم کا اتنا اثر نہیں ہوتا، جتنا مشرقی لوگ اسے محسوس کرتے ہیں، عارف کے جواب میں شیلا گرین، انھی خیالات کا اظہار اس طرح کرتی ہے:

''میں تو اسی موسم میں پیدا ہوئی۔ اسی میں اتنی بڑی ہوئی۔ اس وجہ سے میرے اوپر آج کے ایسے برے موسم کا زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ لیکن آپ لوگ جو مشرقی دھوپ کے عادی ہیں ضرور ہمارے تاریک انگریزی موسم کا گالیاں دیتے ہوں گے۔'' (۴۸)

لندن کے سرد موسم میں فطرت کے نقوش بھی دھندلا گئے تھے۔ شیلا گرین اور نعیم جب پارٹی کے بعد، نعیم کے گھر میں اکیلے رہ جاتے ہیں تو شیلا کہتی ہے کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے، اسے تازہ ہوا کی ضرورت ہے، ایسے میں نعیم پردوں کو کھسکا کر کھڑکیاں کھول دیتا ہے، تو جو منظر ہمارے سامنے آتا ہے وہ کچھ ایسا ہے:

''وہاں بالکل سناٹا تھا۔ وہ کھڑکی سے سر نکالے ذرا دیر کے لیے وہیں کھڑا رہ گیا۔ شیلا بھی اس کے قریب آ کر باہر جھانکنے لگی۔ آسمان صاف ہو چکا تھا اور سامنے کے مکانوں کی چھت کے اوپر سے آدھا چاند دکھائی دے رہا تھا۔ زرد سا چاند جس کی روشنی زمین تک آتے آتے غائب ہو جاتی تھی۔ شیلا نے کہا۔ 'لندن میں چاند کتنا برا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں چاند تو دکھائی دیتا ہے، مگر چاندنی کبھی نہیں ہوتی۔'' (۴۹)

انگلستان میں جہاں ایسے لوگ بستے تھے جو ہندوستان کی صورت حال کو اچھی طرح سمجھتے تھے وہاں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو ہندوستانیوں سے اسی حقارت کا مظاہرہ کرتے تھے، جیسے نو آبادیاتی حاکموں کا رویہ تھا۔ پب میں ایسے ہی ایک بدمست شرابی نے جب راؤ اور اعظم کو 'ہیلو بلیکی' کہہ کر پکارا تو اس نے سارے پب کے ماحول کو خراب کر دیا اور

بالآخر شراب خانے والے نے اس کی جانب سے ان دونوں سے معافی مانگی۔ جو مغربی اخلاقیات کو ظاہر کرتی ہے کہ وہاں کسی کی دل آزادی کو خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے۔

مغربی تہذیب میں مرد عورت کا میل جول ایک عام سی بات ہے، اسی لیے جب ایک اجنبی لڑکی جو راؤ کی دوست تھی، نعیم کے یہاں پارٹی میں شرکت کے لیے آتی ہے تو دورانِ گفتگو نعیم کہتا ہے:

''نہیں نہیں آپ بالکل یہ خیال نہ کیجیے۔ میں آپ کی باتیں بڑی دلچسپی سے سن رہا ہوں۔ مجھے اس کا موقع بہت کم ملتا ہے کہ یہاں کی سمجھ دار عورتوں سے باتیں کروں، اور ہمارے یہاں ہندوستان میں تو آپ جانتی ہیں کہ مرد اور عورتیں خصوصاً نوجوان اس طرح بیٹھ کر باتیں نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ نعیم نے معذرت کے لہجے میں کہا۔'' **(۵۰)**

مغربی معاشرے میں شراب خانے اور قہوہ خانے لازم و ملزوم ہیں۔ یہ دونوں ان کی تہذیب کا حصہ ہیں۔ ایسے ہی سوئزرلینڈ کے ایک قہوہ خانے کا منظر شیلا گرین بیان کرتی ہے، جہاں اس کی ملاقات ہیرن پال سے دوبارہ ہوتی ہے:

''رات کو میں ایک قہوہ خانے میں گئی، اس گاؤں کا قہوہ خانہ، رستوران، ناچ گھر سب کچھ وہی تھا۔ ایل لمبا سا نیچی چھت کا کمرہ، جس کی لکڑی کی چھت اور لکڑی کا فرش سے خوش گوار خوشبو سی آ رہی تھی، چاروں طرف میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ ان کے گرد تین تین، چار چار کرسیاں اور ایک طرف ذرا سے اونچے حصہ پر ایک پیانو، اور ایک ڈھول اور ایک وایولن بجانے والا باجہ بجا رہا تھا، اِدھر اُدھر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ تمام یورپ کی زبانیں وہاں سننے میں آ رہی تھی۔ مجمع بہت تھا۔ قریب قریب تمام جگہیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں جگہ خالی تھی، وہاں جا کر میں بیٹھ گئی اور قہوہ پینے لگی۔'' **(۵۱)**

مغرب کا موسم اور لینڈ اسکیپ مشرق سے مختلف ہے۔ سوئزرلینڈ کے لینڈ کا منظر یوں بیان کیا ہے: ''سرسبز پہاڑوں میں گھری ایک وادی سیکڑوں گز نیچے نظر آتی تھی، جس کے بیچوں بیچ وہی جھیل تھی جہاں سے ہم چلے تھے۔ سورج کی کرنیں اب صرف جھیل کے ایک حصہ پر پڑ رہی تھیں جو پارہ کی طرح نیلا ہٹ لیے ہوئے چمک رہا تھا۔ دوسرا حصہ جس پر سایہ تھا گہرے، سیاہی مائل رنگ کا تھا، جھیل کے ایک کونے پر جدھر دھوپ تھی نہانے والوں کا ہجوم نظر آتا تھا، جو اتنی دور سے چونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اس جگہ بڑی بڑی رنگ برنگ کی چھتریاں زمین میں گڑی ہوئی، لگی تھیں، ان کے نیچے لوگ لیٹے ہوئے دھوپ کھا رہے تھے۔ چند ہوٹل بھی یہاں سے نظر آتے تھے۔ ان کے کمرے، یہاں سے کبوتروں کی کابک معلوم ہوتے تھے۔ وادی کے دوسری طرف کا پہاڑ عجیب و غریب تھا۔ اس کے نیچے کا آدھا حصہ درختوں سے بھرا ہوا تھا لیکن اوپر پہنچ کر یہ درخت کم ہوتے جاتے تھے۔ ان کی جگہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر

اُ گی ہوئی تھیں۔اور بالکل چوٹی کے قریب پہنچ کر صرف بھوری چٹانیں رہ جاتی تھیں جن کی اونچی نیچی کنگھی سی لکیر سے سوئی کی طرح نوکیلی چوٹیاں نکلی ہوئی تھیں۔اس پہاڑ کے پیچھے، جہاں تک نظر کام کرتی تھی، کوہستانی علاقہ تھا۔قطار اندر قطار، دور تک سر بفلک چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔افق کی حد پر پہنچ کر ہلکے سے نیلے غبار میں چھپا ہوا برفستان کا سلسلہ نظر آتا تھا، جہاں دھوپ کی چمک اور سایہ برف کی سفیدی اور آسمان کی نیلاہٹ سب ایک دوسرے میں مل کر آنکھوں کے سامنے رنگ، روشنی اور تاریکی، عظمت و بلندی کی ایک ایسی مکمل تصویر کھینچ رہے تھے، جس کا بیان کرنا ممکن نہیں۔''(۵۲)

مغربی معاشرے میں دوسری تہذیبوں کے بارے میں جاننا، عوامی دلچسپی کا ایک اہم موضوع ہے، تہذیبوں کا تقابلی معالعہ، ان کے مطالعے کا حصہ ہے، اور اس دور کا ہندوستان تو ویسے بھی انگریزوں کا کالونی تھا، ایسے میں اس کی تہذیب کا عوامی موضوع ہونا کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے، ایسا ہی ایک منظر جب شیلا گرین اپنے بارے میں بتاتی ہے، لیکن اس میں اہم بات یہ ہے کہ مغربی لوگ اس تہذیب کا کیسا امیج بناتے ہیں:

''مجھے ہندوستان اور ہندوستان کی ہر چیز سے بہت دلچسپی ہے۔میرے ایک چچا ہندوستان میں نوکر تھے۔مجھے یاد ہے جب وہ چھٹیوں میں گھر واپس آتے تو میرے لیے ہندوستانی کھلونے لایا کرتے تھے۔عجیب وغریب کپڑے کی بنی ہوئی گڑیاں، رنگ برنگ کے چمک دار کپڑے پہنے ہوئے، ان کے تاگے سے بنے ہوئے کالے بال، ان کی لمبی لمبی چوٹیاں، ان کے چھوٹے چھوٹے منہ اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور بھویں، اُنھیں دیکھ کر میں بچپن میں ہندوستان کو ایک پرستان سمجھتی تھی جہاں خوبصورت شہزادے اور حسین سانولی عورتیں زر و جواہر میں لدے ہوئے، سنگ مرمر کے بڑے بڑے محلوں میں عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔جب میں بڑی ہوئی اور میں نے اسکول جانا شروع کیا اور وہاں میں نے تاریخ پڑھی تو میرے بچپن کے تصورات رفتہ رفتہ بدلنے لگے۔سراج الدولہ اور 'بلیک ہول' کے ہولناک قصے پڑھ پڑھ کر اور ہندوستانیوں اور 'کالے آدمیوں' کی برائیاں سن سن کر میرے دل میں ہر سیاہ فام انسان کی طرف سے کچھ خوف سا بیٹھ گیا۔باوجود اس کے وہ دلچسپی جو مجھے اس دور دراز، نامعلوم ملک سے بچپن ہی سے تھی غائب نہیں ہوئی۔جب میں کالج میں داخل ہوئی تو میں نے ہندوستانی طالب علموں سے ملنے کی خاص طور پر کوشش کی، گو کہ میرے والدین ہمیشہ مجھ سے تاکید کیا کرتے تھے کہ 'کالے لوگوں' سے بچتی رہوں۔بدقسمتی سے میری اس خاص کوشش کا بہت مایوس کن نتیجہ نکلا۔لوگوں کو میری جانب سے طرح طرح کی غلط فہمیاں ہونے لگیں۔اب مجھے ان باتوں کا خیال کر کے ہنسی آتی ہے۔میں اس زمانہ میں کتنی ناتجربہ کاری اور حماقت کی حرکتیں کیا کرتی تھی!''(۵۳)

اس کے مقابلے میں دیکھیں کہ ہندوستان میں کیسی تاریخ پڑھائی جاتی تھی اور ہمارے نظام تعلیم میں کیا کوتاہیاں

تھیں، اورنگ زیب نے اپنے استاد کے سامنے اس زمانے کے طرزِ تعلیم پر جو تنقید کی اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس زمانے کے طریقہ تعلیم کی کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھا۔ برنیر اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد جب اس کا ایک استاد کسی منصب کی ہوس میں اس کے دربار میں آیا اور درباری امرا سے جوڑ توڑ کر کے ایک بلند پایہ منصب لینے کے درپے ہوا تو اورنگ زیب نے ایک دن اسے تخلیے میں بلا کر ایک طویل تقریر کی اور کہا ''مولنا! آپ کی کیا خواہش ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو دربار کے اول درجہ کے امرا میں داخل کرلوں؟ میں جانتا ہوں کہ آپ کا مجھ پر حق ہوتا۔ اگر آپ مجھے کوئی کام کی تعلیم دیتے۔ لیکن آپ نے مجھے کیا پڑھایا؟ آپ نے مجھے بتایا کہ فرنگستان ایک معمولی سا جزیرہ ہے، جہاں سب سے بڑا بادشاہ پہلے پرتگال کا حاکم تھا۔ پھر ہالینڈ کا بادشاہ ہوا۔ اور اب شاہ انگلستان ہے۔ فرانس اور اندلس کے حکمرانوں کے متعلق آپ نے مجھے بتایا کہ وہ ہمارے معمولی راجاؤں کی طرح ہیں اور شاہنشاہانِ ہندوستان ان سب حکمرانوں سے بڑے ہیں۔ انہی میں ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں ہوتے ہیں۔ جو شاہانِ عظیم، فاتحانِ جہان اور بادشاہانِ عالم ہیں۔ آپ نے مجھے بتایا کہ ایران، کاشغر، تاتار، پیکو، سیام اور چین کے حاکم شاہ ہند کا نام سن کر کانپتے ہیں۔ سبحان اللہ! آپ کے علمِ جغرافیہ اور تاریخ دانی کا کیا کہنا! کیا آپ کا فرض نہ تھا کہ آپ مجھے دنیا کی تمام قوموں کی خصوصیات سے آگاہ کر کے یہ بتاتے کہ ان ملکوں کی پیداوار اور ان کی جنگی طاقت کا کیا حال ہے۔ یہ لوگ لڑتے کس ڈھب سے ہیں۔ ان کے رسم و رواج اور مذہب و حکومت کے طریقے کیسے ہیں؟ ان کی پولیٹیکل پالیسیاں کیا ہیں؟ آپ کا فرض تھا کہ مجھے تاریخ کی باقاعدہ تعلیم دے کر حکومتوں کے آغاز اور ان کی ترقی و تنزل کے اسباب بتاتے۔ ان واقعات، حادثات اور غلطیوں سے آگاہ کرتے۔ جن کی وجہ سے بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آتے ہیں۔ خیر دنیا کی تاریخ سے پوری اور گہری واقفیت دلانا تو درکنار آپ نے مجھے میرے آباواجداد کے نام بھی پوری طرح نہیں بتائے۔

آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ ایک شہزادے کی تعلیم کے لئے کون سے مضامین درکار ہیں۔ یہی سمجھا کہ مجھے بس صرف ونحو کی بڑی مہارت چاہیے اور مجھے وہ علم حاصل کرنا چاہیے جس کی ضرورت ایک قاضی یا فقیہ کو ہوتی ہے۔ اس طرح آپ نے میری جوانی کا قیمتی زمانہ لفظوں کو سیکھنے کی خشک اور بے فائدہ اور لامتناہی کوشش میں صرف کر دیا۔

آپ نے میرے والد ماجد سے کہا کہ ہم نے اسے فلسفہ پڑھایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ نے کئی برس تک میرے دماغ کو ان فضول اور احمقانہ مسائل سے پریشان کیا۔ جن کا زندگی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔ بیشک آپ نے میری زندگی کے بہترین سال اپنے دلپسند لیکن خیالی مسائل کی بحث میں صرف کر دیئے۔ جب میری تعلیم ختم ہوئی تو مجھے علم وفن سوائے اس کے کوئی واقفیت نہ تھی کہ میں چند ایسی دقیق اور مشکل اصطلاحیں استعمال کر سکتا تھا۔ جن سے روشن

دماغ والے انسان گھبرا جاتے ہیں اور جن سے فلسفہ کے دعویدار اپنی جہالت اور ناواقفیت پر پردے ڈالتے ہیں!

اگر آپ مجھے وہ علم سکھاتے جو عقل اور سمجھ کے اصولوں پر دماغ کی تربیت کرتا ہے اور اسے صحیح اور وزنی دلائل کا طلبگار رہنا تا ہے یا مجھے وہ باتیں بتاتے جن سے حوادثِ زمانہ کے مقابلے میں انسان اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ نہ مصائب اسے پریشان کرتی (کرتے) ہیں اور نہ خوشی اور کامیابی سے اس کا دماغ بگڑتا ہے۔ یا اگر آپ مجھے انسانی فطرت کے رموز سے واقف کر دیتے یا مجھے دنیا کا، اس کے مختلف حصوں کا اور اس کے نظام کا پورا پورا حال بتا دیتے تو مجھ پر آپ کے احسانات سکندر اعظم پر ارسطو کے احسانات سے بڑھ کر ہوتے اور میں پوری طرح آپ کی قدر افزائی کرتا۔"

شیخ اکرام 'رود کوثر' میں لکھتے ہیں:

> "اب بعض اہل تحقیق کہتے ہیں کہ یہ تقریر برنیر کے نہانخانہ دماغ کی تخلیق ہے۔ عالمگیر کے خیالات کا اظہار نہیں۔ ممکن ہے یہ شبہ جائز ہو، لیکن اس سے اصل بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو اعتراضات اس میں درج ہیں، وہ فی نفسہ اس قدر وزنی ہیں کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور کیا یہ امر قابل افسوس نہیں کہ جو کوتاہیاں ایک ژرف بیں اجنبی کو تھوڑے ہی قیام کے بعد نظر آ گئیں، ان سے ہمارے اربابِ حل وعقد اتنی صدیاں غافل رہے؟" (۵۴)

نعیم کے کمرے میں پارٹی کا آغاز اس مغربی ماحول کی بھرپور عکاسی کرتا ہے، جس میں مغربی کرداروں کے ساتھ کئی مشرقی کردار پورے طور پر اور کئی جزوی طور پر رچ بس گئے ہیں، پارٹی کے آغاز کا منظر نامہ یوں ہے:

> "تھوڑی دیر بعد نعیم کے کمرے میں دس پندرہ آدمی جمع ہو گئے، پانچ چھ لڑکیاں اور آٹھ دس لڑکے۔ گراموفون بجنے لگا۔ میز اور کرسیاں لوگوں نے کھسکا کر کنارے رکھ دیں اور ناچ شروع ہو گیا۔ کچھ لوگ اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے، کسی کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا، کوئی صرف لمنیڈ یا شربت پی رہا تھا، کسی نے صرف سگرٹ پر قناعت کی تھی۔ ہر تین چار منٹ کے بعد ایک ریکارڈ ختم ہو جانے پر باجہ بجنا رک جاتا، تو شور وغل میں ذرا کمی ہو جاتی۔ ناچنے والے جوڑے ایک دوسرے سے جدا ہو کر منتشر ہو جاتے۔ کوئی بیٹھے ہوئے لوگوں کے پاس جا کر ان کی گفتگو میں شامل ہوتا، کوئی کھڑا رہ جاتا اور بات چیت کا سلسلہ جاری رکھتا۔ کوئی کسی لڑکی کو الگ گوشہ میں لے جا کر اس سے راز و نیاز کی باتیں کرتا۔ ایک دو آدمی زیادہ شراب پی گئے تھے چلا چلا کر باتیں کر رہے تھے۔"(۵۵)

مغربی تہذیب میں چونکہ مذہب کی ثانوی حیثیت ہے اس لیے اس کی اخلاقیات مشرق سے مختلف ہیں۔ یورپی معاشرے میں وہ باتیں جو مشرقی معاشرے میں بیڈروم کے اندر ہوتی ہیں، وہ محفل میں سرِ عام ہوتی ہیں۔ جین کافی دیر کے بعد جب پارٹی میں آتی ہے تو اعظم کو اس طرح مناتی ہے:

''جین نے اُس کے گلے میں دونوں ہاتھ ڈال دیئے اوراس کی گود میں بیٹھ۔ پھراس نے آہستہ سے کہا' مجھے معاف کردو' اور یہ کہہ کرقبل اس کے کہ اعظم کچھ جواب دے اس کے لبوں کا بوسہ لے لیا۔'' (۵۶)

مغربی تہذیب کی کسی بھی مشرقی تہذیب سے مختلف ہے، اعظم کو جب پیرس کی یاد آتی ہے، تو وہاں کے ریڈ لائٹ ایریا کا منظر کچھ یوں ہے:

''پیرس، اگراس وقت میں وہاں ہوتا تو اچھا ہوتا۔ وہی عورتیں جو اُس مرتبہ دیکھی تھیں، ہوتیں۔ میں بھی اس زمانہ میں کیا احمق تھا۔ سوفرانک بالکل مفت میں خرچ کرڈالے۔ بالکل برہنہ عورتیں۔ ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ تھام کر اپنے سینہ پر رکھ لیا تھا۔ پھر میں وہاں سے بھاگ آیا۔ تاریک گلی تھی اور دروازے پر سرخ لیمپ لگا ہوا تھا۔'' (۵۷)

مغربی تہذیب کی برتری دراصل معاشی ترقی کی وجہ سے اہم تھی، جس کے مظاہرے' لندن کی ایک رات میں جابجا نظر آتے ہیں:

''وہ چلتے چلتے برٹش میوزیم کے پیچھے آ گئے۔ ایک طرف لندن یونی ورسٹی کی نئی عمارتیں بن رہی تھیں۔ آدھی بنی ہوئی دیواریں، سیڑھیاں، مچانیں اور پتھر اٹھانے والے' کرین' لکڑی کی چاردیواری کے اندر سے اوراٹھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے، اور چوڑی سی سڑک کے دوسری طرف میوزیم کے اونچے اونچے کھمبے اور نیچے چبوترے پر بیچوں بیچ میں دو پتھر کے بڑے بڑے شیر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔'' (۵۸)

صرف ایک رات کے ماجرے کو تنگ دامنی کے اِمکانات سے بچانے کے لیے سجاد ظہیر نے جدید تکنیک کا اِستعمال کیا ہے اور اِس سلسلے میں شعور کی رَو، داخلی خود کلامی اور آزاد تلازمۂ خیال سے بھرپور مدد لیتے ہوئے اُنہوں نے لندن میں نعیم کے کمرے سے ہندوستان اور سوئزرلینڈ تک مکانی دائرے اور ناول کے کینوس کو وُسعت دے دِی ہے۔ فنّی خوبیوں سے آراستہ یہ ناول تہذیبِ مغرب کے فکری وعملی پہلوؤں کی عکاسی سے بھرپور ہے۔ مغربی تہذیب کے مادّی وغیر مادّی ہر دوطرح کے مظاہر وافر نظر آتے ہیں جس میں ایک طرف تو ناول کی سیٹنگ کا عمل دخل بھی ہے اور دُوسری جانب ہندوستانیوں کا مذکورہ تہذیب سے اثر پذیر ہونا بھی ایک بہت اہم وجہ ہے۔ ہندوستان بالخصوص ہندوستانیوں پر مغربی تہذیب کے گہرے اثرات اِس مختصر ناول سے نُمایاں ہیں۔

نوآبادیاتی اثرات:

نوآبادیاتی عہد کا ہندوستانی نوجوان فکری محاذ پر کش مکش کا شکار تھا۔ ایک طرف سامراجی حکمرانوں کی تہذیبی یلغار کے مُقابلے میں اپنی تہذیبی میراث سے تہی دست ہونے پر مجبور تھا اور دُوسری طرف عالمی سطح پر اِشتراکیت اور مارکسزم کے

بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ نے ایک سیلاب کی طرح یورپی نوجوانوں کے اذہان کو گرفت میں لینا شروع کر دِیا تھا۔ یورپ سے یہ اثرات بتدریج دُوسرے علاقوں بشمول ہندوستان تک رسائی حاصل کر رہے تھے اور یہاں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں تک مُنتقل ہونے لگے تھے۔ اِس عہد کا نوجوان طبقہ دو حصوں میں منقسم نظر آتا ہے: ایک سامراج دُشمن اور دُوسرا اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے ذریعے سے نوآبادیاتی طاقت کے ہاتھ مضبوط کرتا ہوا۔ یہ دوسرا طبقہ ہندوستانی سول سروس میں ملازمت کے حُصول کے لیے سرگرداں تھا اور اِسی لیے انگریزی زبان اور تعلیم کے تعاقب میں دن رات ایک کیے ہوئے تھا۔ یورپ جا کر تعلیم کے سلسلے کو آگے بڑھانے میں بھی یہی مقاصد پوشیدہ تھے، لیکن سامراج دُشمنی کا اِظہار کرنے والے بھی ترقی کے راستے انگریزی زبان اور تعلیم میں ہی ڈھونڈ ھتے تھے اور اُن کی لندن میں موجودگی کا سبب بھی یہی تھا۔

لندن کی ایک رات میں منظر پر اُبھرنے والے نوجوان ہندوستانی اشرافیہ اور مُتموّل گھرانوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ ہیں جو بغرضِ تعلیم لندن میں قیام پذیر ہیں۔ وطن سے دُوری کے باوجود وطن کے مسائل خُصوصاً سیاسی، سماجی اور معاشی حالات سے الگ تھلگ نہیں رہ پاتے۔ اُن کی مجلسی گفتگو کا محور ومرکز ہندوستان کے مسائل اور وہاں کی دِگرگوں سیاسی صُورتِ حال ہے۔ ایسی ہی ایک گفتگو راؤ اور اعظم کے درمیان ہوتی ہے:

> ''تم نے آج شام کا اخبار دیکھا؟ ہندوستان میں پھر کہیں گولی چلی۔' اعظم نے کہا۔ 'نہیں میں نے اخبار تو نہیں دیکھا مگر اشتہار دیکھے ہیں۔ اب تو یہ روز کا دستور ہوتا جاتا ہے ہم کالے آدمیوں کی جان کیڑے مکوڑوں کے برابر ہے اور قصور ضرور ہمارا ہی ہوگا! ہم ہندوستانی اسی لائق ہیں، کمینے، ذلیل، بزدل، جوتا کھاتے ہیں مگر انگریزوں کی خوشامد سے باز نہیں آتے۔ ہندو مسلمان کی جان کے درپے، مسلمان ہندو کا گلا گھونٹنے کے لیے تیار۔ گولی نہیں! میرا تو بس چلے تو ساری قوم کو توپ کے منہ پر رکھ کر اُڑا دوں۔ اس قوم کو زندہ ہی رہنے کا کوئی حق نہیں۔ خیال تو کرو ۳۵ کروڑ انسان اور ایک لاکھ سے بھی کم انگریز ان پر مزے سے حکومت کرتے ہیں اور حکومت بھی کیسی حکومت! ہندوستان میں ذلیل سے ذلیل انگریز کا رتبہ بڑے سے بڑے ہندوستانی سے بڑھ کر ہے۔ یہاں انگلستان میں چاہے انگریز مرد ہمارے جوتے صاف کرے اور انگریز لڑکیاں ہم سے محبت کریں مگر سوئز کے اس پار تو ہم سب 'کالا لوگ'، 'نیٹوز' غلاموں سے بدتر سمجھے جاتے ہیں۔ میں بیرسٹر ہو جاؤں اور تم انجینئر، مگر ہندوستان میں وہی 'نیٹوز' کے 'نیٹوز' ہوگے اور انگریزوں کی ٹھوکریں کھاؤ گے۔ اور باوجود اس کے پھر اُلٹ کر انھیں کو 'سرکار سلام'، 'خداوند' اور 'باپ' کہو گے۔ اتنی ذلت برداشت کرنے پر بھی جس قوم کے کان پر جوں نہ رینگے اس کا تو صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جانا ہی بہتر ہے۔ مجھے تو خوشی ہوتی ہے جب ہندوستان سے گولی چلنے کی خبر آتی ہے۔' راؤ نے تلخی کے ساتھ کہا۔'' **(۵۹)**

اِن طلبہ کے ذاتی مسائل میں سرِفہرست اپنی تعلیم کی تکمیل اور اعلیٰ سرکاری مُلازمت کا حُصول ہے اور دونوں مراحل آسان نہیں ہفت خوان طے کیے بغیر نہ تو اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کا اِمکان تھا اور نہ ہی سول سروس میں مُلازمت کا ملنا مُمکن تھا۔ وسائل کی فراوانی کے باوجود بعض ہندوستانی طلبہ ڈگری کے حُصول میں اپنی تن آسانی اور توجہ کے ارتکاز کی کمی کے باعث کئی کئی برس لگا دیتے۔ یورپ میں طرح طرح کی غیر تعلیمی، سیاسی اور سماجی مصروفیات نے مذکورہ نوجوانوں کے لیے منزل تک رسائی کو مُشکل تر بنا دیا تھا۔ اِن مُشکلات کی عکاسی میں سجاد ظہیر کا ذاتی تجربہ بھی جھلکتا نظر آتا ہے جو اپنے قیامِ لندن کے دوران میں ایسے ہی حالات سے گُزرے تھے۔(۶۰)

لندن کی ایک رات 'میں کالونیل عہد کے ہندوستان کے سیاسی وسماجی حالات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی نوجوانوں کی خارجی و باطنی کش مکش کو بھی نُمایاں کیا گیا ہے۔ان نوجوانوں کے لیے انگریزی زبان سیکھنا اور انگریزی رہن سہن اِختیار کرنا کس قدر اہمیت رکھتا تھا اِسے جاننے کے لیے عارف کے معمولات پر ایک نظر ڈالنا کافی ہوگا جس کے شب وروز ایک نوع کی مُشقت میں بسر ہو رہے تھے محض اِس اُمید پہ کہ وہ آئی۔سی۔ایس میں کامیاب ہو جائے:

> ''عارف ہر روز ''ٹائمز'' اخبار وظیفہ کی طرح پڑھتا تھا اور کبھی کبھی اس میں سے اچھے اچھے جملے ایک علیحدہ کاپی پر نقل بھی کر لیتا تھا۔اس کے بعد وہ ان جملوں کو زبانی یاد کرنے کی کوشش کرتا۔۔۔اسے امید تھی کہ اس طرح سے رفتہ رفتہ نہ صرف اس کی انگریزی زبان کی مہارت بہتر ہو جائے گی۔ بلکہ ''ٹائمز'' اخبار کے خیالات اس کے دماغ میں اچھی طرح سے جم جائیں گے۔اس اخبار کا نقطۂ نظر انگلستان کے بڑے صاحبوں کا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔جو بات ٹائمز میں چھپ جائے اسے ''نیم سرکاری'' سمجھنا چاہیے۔عارف چاہتا کہ وہ سرکاری خیالات میں بالکل ڈوب جائے اور جب امتحان کا وقت آئے تو اس کے قلم سے اور اس کی زبان سے ایک حرف بھی ایسا نہ نکلے جس سے امپیریلسٹ ممتحنوں کو کسی قسم کا اختلاف ہو سکے۔''(۶۱)

عارف اور اُس کی طرح کے دِیگر بے شمار باصلاحیت نوجوان کالونیل عہد کے ہندوستان میں باوقار سماجی مقام، اعلیٰ مرتبے اور عزت و دولت میں اضافے کا ذریعہ آئی۔سی۔ایس کو سمجھتے تھے۔سجاد ظہیر نے ''ٹائمز اخبار'' کے حوالے سے عارف کے خیالات کا اِظہار کرتے ہوئے دراصل برطانوی حُکمرانوں کی اُس حکمتِ عملی کو بے نقاب کیا ہے جو سرکاری عُہدوں کے عوض ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقے کو اپنا وفادار بنانے اور ایک مخصوص ذہنیت کو پروان چڑھانے پر مبنی تھی۔سرکاری مُلازمتوں بالخصوص آئی۔سی۔ایس میں کامیابی سامراجی ذہنیت کو اپنانے اور اپنی رائے کو انگریز سرکار کی رائے کے تابع بنانے سے مشروط تھی۔نوآبادیاتی طاقت کے زیرِ تسلط ہندوستان میں نوجوان طبقہ ''لیلائے سول سروس کا مجنوں'' بنا ہوا تھا

کیونکہ یہی وہ واحد راستہ تھا جس پر چل کر ہندوستان کے حاکموں کی فہرست میں جگہ بنائی جاسکتی تھی۔ عارف اوراُس جیسے لاتعداد نو جوان اپنی آنکھوں میں یہی سپنے سجائے آئی۔سی۔ایس کے اِمتحان کی تیاری میں دن رات ایک کیے ہوئے تھے۔ بنظرِ غائر دیکھا جائے تو آئی۔سی۔ایس محض ایک امتحان کے ذریعے سے اعلیٰ ملازمتوں تک رسائی کا نام نہ تھا، ایک مخصوص طرزِ زندگی اور ذہنیت کو اپنانا بھی اس کے لوازمات میں شامل تھا جو سراسر مغربی تہذیب کی اندھی تقلید پر مبنی تھی۔ ہندوستانیوں میں مغرب کی نقالی کے نتیجے میں ایک کھیپ کی کھیپ ایسے افراد کی جنم لے رہی تھی جنہیں ''براؤن صاحب'' کہہ کے پکارا جاتا تھا۔ یہ ''براؤن صاحب'' یا بقولِ سجاد ظہیر ''پکا صاحب'' انگریزوں سے بڑھ کر انگریز بننے کی کوشش میں اپنی مادری زبان اور رِوایات تک فراموش کر دیتے تھے۔ اِسی صاحبی کے اِختیار کرنے کے لیے عارف اوراُس کی مانند مُتعدّد نو جوان جس نہج پر زندگی گزار رہے تھے اور جس نوع کی جِد وجَہد میں مصروف تھے اُس کا نقشہ سجاد ظہیر نے اِن الفاظ میں کھینچا ہے:

> ''خچر کی طرح سے وہ ایک سیدھے راستے پر لگا ہوا کام کرتا چلا جاتا اسی کے ساتھ اس کے ذہن میں یہ بات بھی سما گئی تھی کہ انگریزی کپڑے اچھی طرح پہننا، انگریزی زبان میں بالکل انگریزی لہجہ میں بولنا، سنیما کی تصویروں کے بارے میں اور ہولی وڈ کے ایکٹروں اور ایکٹریسوں کے ذاتی معاملات، ان کی شادیوں اور طلاقوں کی تازہ ترین خبروں سے واقف رہنا اور ان پر بات چیت کرنا، کلکٹری کے امیدواروں کا فرض ہے۔''(۶۲)

سول سروس کے اُمیدواروں کے اِس طرزِ فکر اور اندازِ نظر سے واضح ہے کہ نو آبادیاتی حُکمرانوں کی تہذیب اور سوچ اپنائے بغیر اُنہیں اپنے مقاصد میں کامیابی کا ملنا دُشوار نظر آتا تھا۔ وہ ایک مخصوص طرزِ زندگی اپنانے پر مجبور تھے جو اپنی اصل میں سطحی اور پست مقاصد پر مبنی تھا۔

صرف سول سروس کے امیدوار ہی نہیں، بلکہ سول سروس میں کامیاب ہونے والے لوگوں پر مغربی تہذیب کی چھاپ کس قدر گہری ہوتی تھی، اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے، جو عارف کے ضمن میں سجاد ظہیر نے بیان کیا ہے:

> ''وہ ان لوگوں کا جانشین ہونے والا تھا جن کو اس بات پر فخر تھا کہ انھیں اپنی مادری زبان اچھی طرح بولنی نہیں آتی، اور جو اپنے کو انگریزوں سے بھی بڑھ کر 'پکا صاحب' سمجھتے تھے۔ انھیں پکے صاحب لوگوں میں ایک 'مسلمان' کلکٹر صاحب تھے۔ جن کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انھوں نے بقر عید کے دن اپنے مسلمان منشی سے پوچھا۔ 'ول منشی! کیا آج تُم لوگوں کا بڑا دن ہے؟''(۶۳)

سجاد ظہیر اِشتراکی فکر کے علَم بردار تھے اور سرمایہ داری اور سرمایہ دارانہ ذہنیت بالخصوص سامراجی تسلّط کے بہت بڑے ناقد اور مخالف تھے۔ ناول میں موجود اکثر کردار سامراج مخالف اور اِشتراکی نظریات کے مُؤیّد نظر آتے ہیں۔ یو پی

نوجوانوں کی بڑی تعداد اِشتراکیت کی مُقلّد تھی اور اِس تحریک کا دائرہ یورپ بھر میں تیزی سے وسیع ہو رہا تھا۔ ہندوستانی نوجوانوں نے بھی اِشتراکیت اور مارکسزم سے گہرے اثرات قبول کیے اور ہندوستان میں برطانوی سامراج سے چُھٹکارے اور سوشلسٹ نظام کے رائج ہونے کے خواب دیکھنا شروع کر دیے اور اِن خوابوں کو حقیقت کا رُوپ دینے کے لیے عملی کوششوں کا بھی آغاز کیا گیا۔ اِنھی فکری رُجحانات کے تحت لندن کی ایک رات میں اِشتراکی ذہن رکھنے والے طلبہ عارف کے طرزِ حیات پر مُخالفانہ زاویے سے تنقید کرتے ہیں اور اُسے سامراجی مقاصد کی تکمیل میں مددگار تصوّر کرتے ہیں۔ اس دور کے انگریزی اخبارات بھی نوآبادیاتی حکمرانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اعظم جب جین کا 'انڈر گراؤنڈ' پر انتظار کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت کا منظر ملاحظہ ہو:

> ''اخبار کی دوکان کے سامنے بڑے بڑے اشتہار لگے ہوئے تھے۔ ٹائمز، ڈیلی میل، مارننگ پوسٹ، ڈیلی ٹیلیگراف وغیرہ۔ اس کی نظر شام کے اخباروں پر پڑی جنھیں لوگ اسٹیشن کے باہر بیچ رہے تھے۔ 'فٹ بال کے میچ کے نتیجے'، 'میچ کے آخری نتیجے' اخبار بیچنے والے پکار رہے تھے۔ اتنے میں اس کی نظر چند اور اشتہاروں پر پڑی جو تختوں پر چپکے ہوئے تھے۔ 'بیکار مزدوروں کا ہائیڈ پارک میں جلسہ'، 'دس انگریزی سپاہیوں نے دس ہزار ہندوستانی نیٹوز کو فساد کرنے سے روکا'، 'ایک گورا زخمی ہوا۔ اور ۱۵ نیٹوز کی جان گئی'، بڑے بڑے، کوئی ڈھائی فٹ لمبے اور ایک فٹ چوڑے کاغذوں پر یہ اشتہار سرخ حرفوں میں لکھے ہوئے تھے۔ اعظم کا خیال ایک لمحہ کے لیے اپنے دوست کے انتظار سے ہٹ کر ہندوستان، وطن کی طرف گیا۔ 'یہ کمبخت انگریزی اخبار کتنی حقارت کے ساتھ ہم ہندوستانیوں کا زکر کرتے ہیں۔ 'نیٹوز'، ہم 'نیٹوز' ہیں اور یہ لال منہے بندر، جو اس ملک میں رہتے ہیں یہ کون ہیں؟'' (۶۴)

نوآبادیاتی اثرات سے لندن کی رات کے کردار بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کو مغربی استعمار کا پوری طرح احساس ہے، اس لیے اس مغربی ماحول میں ہندوستان سے متعلق ایک ایک خبر ان طالب علموں کے دماغ پر یوں اثر انداز ہوتی ہے کہ وہ ان کے لاشعور کا حصہ بن جاتی ہے، راؤ جب 'پب' میں شراب پی رہا ہوتا ہے تو اعظم کے جین سے نہ ملنے کے کرب میں ڈوبتا ہے تو نشہ کی حالت میں ان ہندوستانیوں کی یاد اس کے ذہن میں ایک فلم کا سین بن کر نمودار ہوتی ہے جس میں انگریز فوجی ان پر گولی چلا رہے ہوتے ہیں:

> ''راؤ کی انکھوں کے سامنے یک بارگی ہندوستانیوں کی ایک بھیڑ نظر آئی، جس میں زیادہ تر غریب، میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے، لوگ تھے، جن کے چہروں پر دھوپ اور ہوا اور بھوک کے اثر سے جھریاں اور گڈھے پڑے ہوئے تھے۔ جن کے ہاتھ مزدوری کرنے سے سخت اور مضبوط معلوم ہوتے تھے، جن کی آنکھوں میں محنت کی روشنی تھی۔ جن کے کندھے جھکے ہوئے تھے، جن کی ٹانگیں ان کی میلی

دھوتیوں سے لکڑی کی طرح نکلی ہوئی تھیں۔ان لوگوں کی بھیڑ سڑک کے چوراہے پر،اس بھیڑ میں ملے جلے ہندوستانی طالب علم، وہ غریب ،جن کو پچیس روپیہ مہینہ تک کی نوکری اب نہیں ملتی ، دبلے پتلے ،سینہ کمزور، چار دن سے داڑھی نہیں بنائی۔چھوٹا انگریزی کوٹ اور دھوتی میلی سی ،عینک، ننگے سر، یہ بھی سیکڑوں کی تعداد میں،اور اسی طبقہ کے اور بہت سے لوگ۔سارا مجمع ہل رہا ہے،سمندر کی لہریں۔آگے بڑھنے کی کوشش،مگر راستہ رکا ہوا ہے۔گورے بندوقیں لیے ہوئے سامنے کھڑے ہیں۔مشین گنیں بھی ہیں۔سنگینیں دھوپ میں چمک رہی ہیں۔سپاہیوں کے پیچھے گھوڑوں پر سوار انگریزی افسر،تیز دھوپ ،گرمی، چہروں پر پسینے کے قطرے نمایاں ہیں۔ہوا بند۔راؤ اس مجمع کے بیچ میں کھڑا ہوا ہے۔آخر ہم آگے کیوں نہیں بڑھتے؟ یہاں تک پہنچ کے رک جانے سے کیا فائدہ؟اتنی دور تک آئے اور اب رکے ہوئے ہیں۔'آگے بڑھو۔۔۔آگے بڑھو' کی آواز یک بارگی اس کے کانوں میں آئی اور اس کے سارے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔تکلیف جس سے کچھ فائدہ پہنچے،تکلیف جو آرام کی ہراول ہو، یہاں تک کتنی مشکل سے ہم پہنچے اور اب آگے بڑھنے والے ہیں۔لیکن نہیں۔نہیں۔نہیں۔زندگی اتنی سہل نہیں جتنی ہم سمجھے ہوئے ہیں۔۔۔۔وہ اکیلا میدان میں کھڑا ہوا ہے ،سارا مجمع غائب ہو گیا۔سامنے گورے کھڑے ہیں اور چاروں طرف اِدھر اُدھر خون کے دھبے،گرم تازہ خون اور زخمی انسان اور مردے،کوئی منہ کے بل پڑا ہے اور اس کے ہاتھ پیٹ کے نیچے دبے ہوئے ہیں،کوئی چت پڑا ہے اور اس کے سر پر گولی لگی ہے۔آنکھیں دہشت زدہ، دیدوں سے پھٹی پڑتی ہیں،منہ کھلا ہوا ہے ۔اس کے چہرے پر،گردن پر، میلے کرتے پر، لال لال خون کے دھبے۔ایک زخمی جس کے پاؤں پر گولی لگی ہے اور جو درد کی شدت سے زور زور سے چلا رہا ہے۔یہ ہے تکلیف،اس کا نام ہے درد۔اس شراب کے گلاس کو تو ذرا دیکھو۔اس کی تیزی غائب ،اس کی ٹھنڈک ندارد،اس کا رنگ بدل گیا،سیاہ سی گاڑھی چیز، گہرا سرخ رنگ،خون گرم،تازہ خون۔یا خدا۔'دس انگریزی سپاہیوں نے دس ہزار نیٹوز کو فساد کرنے روکا،ایک گورا زخمی ہوا اور پندرہ نیٹوز کی جان گئی'۔''(۶۵)

لندن کا عام آدمی بھی اس دور میں نو آبادیاتی اثرات سے لاتعلق نہیں تھا۔تو ایسے میں ٹام اور جم نامی دو مزدوروں کی گفتگو اس منظر نامے کو زیادہ واضح کرتی ہے۔راؤ سے جب 'پب' میں ایک مزدور ٹام دیا سلائی مانگتا ہے، پائپ سلگا کر جب وہ دیا سلائی واپس کرتا ہے ہے،تو راؤ سے یوں گویا ہوتا ہے:''ہندوستان بھر میں گڑبڑ ہو رہی ہے۔'اعظم نے یہ سن کر اپنے دل میں کہا۔'پھر تم سے کیا مطلب! ہمیں ان باتوں سے دلچسپی نہیں۔خواہ مخواہ ہم سے بات چیت کرنے کی خواہش مت کرو ۔خدا کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔اس وقت مجھے ہندوستان میں گڑبڑ ہونے کی وجہ معلوم کرنے کی فرصت نہیں'۔جین۔جین ۔اس کے سر میں ابھی تک کلہاڑے چل رہے تھے۔وہ خاموش رہا۔اور راؤ نے خیال کیا وہ شخص کیوں ہم سے باتیں کرنا چاہتا

ہے؟ ہندوستان سے اسے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟ ہمیں غلام سمجھ کر دل میں ضرور ہم سے نفرت کرتا ہوگا۔اس کی اپنی حالت خراب سہی لیکن اکثر انگریزوں کی طرح ہندوستان کو، ہمارے ملک کو اپنی ذاتی مِلک سمجھتا ہوگا۔ ہندوستان میں گولی چلی۔اس کے بھائی بندوں نے، ہمارے بھائی بندوں پر گولی چلائی۔ یہ دنیا بھر میں گولیاں چلا کر اور آسمان سے بم برسا کر تہذیب پھیلانا اور صلح اور امن قائم رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔اور یہ شخص مجھ سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتا ہے ؟اس نے انگریز کو جواب دیا۔'ہاں ہندوستان سے بری خبر آئی ہے لیکن مجھے کوئی پرواہ نہیں۔جتنی زیادہ ہندوستان میں گڑبڑ ہو مجھے تو اتنی ہی زیادہ خوشی ہوتی ہے۔'غصہ اور طنز سے بھرا ہوا کلمہ۔لیکن اس ٹھوس انگریز مزدور پر راؤ کے غصہ اور طنز کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔اس نے اپنے پائپ سے ایک کش لیا اور پھر بغیر کسی جوش وخروش کے جواب دیا۔'میں یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے فساد، گڑبڑ، خون خرابے کی خبر سن کر خوشی نہیں ہوتی اور جب ہم انگریز ہندوستان میں جا کر بغیر فوج کی مدد کے حکومت نہیں کر سکتے تو میں یہ کہتا ہوں۔' تھوڑی سی آواز اٹھا کر اس نے دوبارہ کہا۔'میں یہ کہتا ہوں کہ اب اس بات کا وقت آ گیا کہ ہم ہندوستان سے اپنا بوریا بستر سنبھال کر گھر واپس چلے آئیں اور ہندوستانیوں کو اُن کا ملک حوالے کر دیں، وہ جو چاہیں اپنے ملک کو لے کر کریں اور بہرصورت میں تو یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ ہمارے انگلستان پر جرمن یا فرانسیسی یا کوئی اور قوم آ کر حکومت کرے۔تو پھر ہندوستان میں رہنے کا ہم کو کیا حق ہے؟' وہ دوسری طرف مڑا اور اپنے پاس والے مزدور کو خطاب کر کے کہا۔'جم۔میں ٹھیک کہتا ہوں؟'۔جم جو لمبا اور دبلا تھا اور جس کے چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، اپنے ساتھی ٹام کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور سر جھکائے ہوئے اپنے بیئر کے گلاس پر نظر جمائے کھڑا تھا۔ٹام کی باتیں سن کر جم نے پہلے کچھ جواب نہ دیا۔راؤ کے دل میں جو ایک نفرت سی ٹام کی طرف سے تھی وہ اب دلچسپی سے بدل گئی۔'یہ انگریز مزدور غالباً اتنے احمق نہیں جتنا انگلستان کے اخبار، ڈیلی میل وغیرہ۔ان کے دلوں میں سچائی کے لیے ابھی تک تھوڑی سی جگہ باقی ہے۔'لیکن راؤ کو پھر غصہ آیا۔'یہ کچھ کرتے کیوں نہیں!' راؤ نے جم کی طرف دیکھا۔اسے اس کے جواب کا انتظار تھا۔ٹام نے پھر جم سے کہا۔'ول جم، تمھارا کیا خیال ہے؟'۔'ٹام!' جم نے آہستہ سے کہا۔'لیکن اگر ہم ہندوستان کو چھوڑ دیں تو پھر اس ملک کی حالت کیا ہوگی، ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ وہاں ہندو اور مسلمان دو مذہب کے لوگ ہیں اور ان میں ہمیشہ آپس میں لڑائی ہوا کرتی ہے۔یہ دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔اگر ہم ہندوستان میں امن نہ قائم رکھیں اور اس ملک کو چھوڑ کر چلے آئیں تو ہندوستان میں بہت خون خرابے کا ڈر ہے۔' ٹام نے اپنا گلاس اٹھا کر دو گھونٹ میں ساری بیئر ختم کر دی اور بہ آواز بولا۔'جم، میں تم سے کہتا ہوں میری بات سنو، میں لڑائی سے پہلے ہندوستان میں تھا اور میں نے وہاں کی حالت دیکھی ہے۔اس وقت میں جوان تھا، میں احمق تھا، سنتے ہو مجھے، میں احمق تھا۔ برٹش امپائر کا خیال کر کے میری رگوں میں خون

تیزی سے دوڑنے لگتا تھا۔ میں نے ہندوستانیوں کا 'کالا لوگ'، 'نگر'، 'نیٹوز' کہہ کر خطاب کرتا تھا، میں ہندوستانیوں کو جانوروں سے بدتر سمجھتا تھا۔ ہم لوگوں کو فوج میں سکھایا یہی جاتا تھا۔ میں نے خود دیکھا کہ ہم ہندوستانیوں میں کس طرح صلح قائم رکھتے ہیں! میں تم سے کہتا ہوں جم، ہندوستان میں ہماری حکومت کی بنیاد خوف پر ہے۔ تم جو کہتے ہو کہ ہندوستان میں ہماری وجہ سے امن قائم ہے۔ ممکن ہے، مگر امن کی قیمت کیا ہے؟ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ۔ غریب ننگے، بھوکے جو کیڑوں مکوڑوں کی طرح رہتے ہیں، لاکھوں، کروڑوں انسان۔ مشکل سے تم یہ کہہ سکو گے کہ وہ انسان ہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں ہمارے یہاں بے کار مزدوروں کی حالت اس سے ہزار درجہ بہتر ہے اور اس پر بھی یہاں یہ شور و غل مچا ہے، آئے دن جلسے ہوتے ہیں، جلوس نکلتے ہیں اور گورنمنٹ کو یہ جتلاتے ہیں کہ جب تک وہ بے کار مزدوروں کے اچھی طرح رہنے سہنے کا انتظام نہ کرے وہ مہذب گورنمنٹ کہلانے کے لائق نہیں۔ جم میری بات کا یقین مانو، میں نے اپنی آنکھوں سے ہندوستان میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ہر جگہ غربت ہی غربت دیکھی۔ ہم وہاں ڈیڑھ سو برس سے زیادہ سے ہیں اور صلح اور امن قائم کئے ہوئے ہیں! تم جب امن قائم رکھنے کی باتیں مجھ سے کرتے ہو تو مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔" (٦٦)

سجاد ظہیر نے **لندن کی ایک رات** میں مغرب کے رنگ و نسل کی بُنیاد پر دیگر اقوام سے روا رکھے جانے والے اِمتیاز اور تعصّب کی جھلکیاں بھی جا بجا دِکھائی ہیں۔ نسلی اِمتیاز مغربی تہذیب کے بظاہر اُجلے دامن پر ایک ایسے داغ کی مانند نظر آتا ہے جو مِٹائے نہیں مِٹتا اور چُھپائے نہیں چُھپتا۔ اعظم اور راوَ پب میں بیٹھے پینے میں مصروف ہوتے ہیں تو اُنہیں ٹام نامی مزدور ملتا ہے جو نہ صرف اپنی حالتِ زار پر مایوس ہے بلکہ ہندوستانیوں کی غُلامی اور برطانوی تسلّط کے بھی خلاف ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کے تئیں ٹام کی سوچ شروع ہی سے ہمدردانہ نہیں تھی بلکہ برطانوی فوج میں شمولیت اور ہندوستان میں تعیناتی کے بعد اُن کی غُربت اور تباہ حالی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اُس میں ہمدردی کے جذبات جنم لیتے ہیں۔ ورنہ پہلے تو ٹام بقولِ خود:

> "میں ہندوستانیوں کو 'کالا لوگ'، 'نگر'، 'نیٹو' کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ میں ہندوستانیوں کو جانوروں سے بد تر سمجھتا تھا۔ ہم لوگوں کو فوج میں یہی سکھایا جاتا تھا۔" (٦٧)

نسل پرستی کا یہ زہریلا بیج ہر درجے اور طبقے کے لوگوں کے دِلوں میں بوئے جانے کا مقصد غُلام قوم کو دبانا اور برطانوی نوآبادیاتی طاقت کا دبدبہ قائم رکھنا تھا۔ رنگ و نسل کی بُنیاد پہ اِنسانوں کی تقسیم دراصل نوآبادیاتی غُلاموں کو اپنے آقاؤں سے دُور رکھنے اور اپنے احساسِ برتری کا اعلان تھی۔ راوَ کو یہ خیال ہی نفرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ انگریز "دنیا بھر میں گولیاں چلا کر اور آسمان سے بم برسا کر تہذیب پھیلانا اور صلح اور امن قائم رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔" (٦٨)

اِس خود ساختہ فرض کی ادائیگی نے دُنیا کے امن کو خطرے میں ڈال دیا اور نو آبادیات کا درجہ رکھنے والے ممالک کے باشندوں کی زِندگیاں غُربت، غُلامی اور محرومی کی لپیٹ میں آ گئیں، جبکہ دو عالمی جنگیں بھی سامراج کی اِسی ہوسِ مُلک گیری کا نتیجہ تھیں۔ اعظم کو ہندوستانیوں کے لیے اِستعمال کیا جانے والا تحقیر و استہزا سے بھرپور لفظ 'نیٹو' Native اِنتہائی ناگوار گزرتا ہے۔ سفید فام آقاؤں کی جانب سے اِس لفظ کا اِستعمال رنگت کی بُنیاد پر اِمتیاز کی علامت تھا۔ اعظم اسٹیشن پر جین کے اِنتظار میں وقت گزارتے ہوئے بورڈ پر چسپاں اِشتہاروں میں ہندوستان میں 'نیٹوز' کے مارے جانے کی خبر پڑھتا ہے تو اُسے خیال آتا ہے کہ انگریزی اخبار کس قدر حقارت سے ہندوستانیوں کا ذِکر کرتے ہیں۔ 'نیٹوز'، 'کالا لوگ'، 'بلیکی'، 'نِگر' Nigger یہ سارے الفاظ پُکار پُکار کر اپنے وضع کرنے والوں کے نسل پرست اور مُتعصب ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور برطانوی راج نے اپنی ہندوستانی رِعایا کو اِنہی نفرت انگیز ناموں سے موسوم کر رکھا تھا۔ پب میں شراب کے نشے میں بد مست ایک انگریز وہاں موجود راؤ اور اعظم کو 'بلیکی' کہہ کر آواز دیتا ہے تو دونوں غُلامی کے نتیجے میں خود پر مسلّط کی جانے والی ذِلّت کے احساس سے غُصّے میں کانپ اُٹھتے ہیں۔ اعظم غُصّے کے زیرِ اثر اُس شخص سے بدلہ لینے کی شدّید خواہش رکھتا ہے لیکن بے بسی کے عالم میں بیٹھا رہ جاتا ہے جبکہ راؤ خوف کے احساس سے دوچار ہو کر خود کو ہزاروں، لاکھوں گوروں کے بیچ گھِرا ہوا تصوّر کرنے لگتا ہے اور خیالات کے عالم میں اُن سے بچاؤ کی راہ ڈھونڈتا ہے۔ یہی نسلی تعصّب تھا جو شیلا گرین کے والدین کو اپنی بیٹی کو 'کالے لوگوں' سے دُور رہنے کی ہدایت دینے پر مجبور کرتا ہے۔ شیلا اپنے لوگوں میں پائے جانے والے نسل پرستانہ رویے سے بخوبی آگاہ تھی اور اپنی گفتگو کے دوران میں بار بار اِس کا اعتراف بھی کرتی ہے۔ وہ نعیم کو بتاتی ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں تعطیلات کے دوران میں ایک ہندوستانی لڑکے پال ہیرن سے اُس کی مُلاقات ہوئی، وہ اُس کے ہمراہ قہوہ خانے کی میز پر بیٹھی باتوں میں مصروف تھی جبکہ ایک انگریز اُسے ہندوستانی کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر اِشتعال کے مارے آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا، وجہ سوائے تعصّب کے اور کچھ نہ تھی۔ شیلا اور پال مُحبت کی ڈور میں بندھ جاتے ہیں لیکن شیلا اپنے اور اُس کے بیچ قوم، نسل، ملّت، سرمایے اور زمینی فاصلوں کی تفاوت حائل دیکھتی ہے اور یہ تفاوت جدائی کے اندیشوں کو جنم دیتی ہے جو غلط نہ تھے کہ حقائق کا ادراک کر لیے جانے پر پیدا ہوئے تھے۔

لندن کی ایک رات 'میں کرداروں کا لندن میں موجود ہونا ہی نو آبادیات کا شاخسانہ ہے، کہ وہ اس نو آبادیات کے استعماری چنگل سے نکلنے کی ایک انفرادی کوشش ہے۔ جسے آپ فرار بھی کہہ سکتے ہیں۔

لندن کی ایک رات میں لمحۂ موجود کی معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی اور سیاسی فضا سے لے کر ماضی کے طویل عرصوں بلکہ مدتوں تک کی ان ہی کیفیات اور حالات کو سامنے لایا گیا ہے۔ لندن ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی تاریخ کے

حوالے سے بیک وقت برطانوی سامراج کی چیرہ دستیوں اوران کی تعلیم وتہذیب کے پھیلاؤ کے اچھے اور برے یعنی مثبت اور منفی اثرات کا اشارہ بنتا ہے۔صفحات کی محدود تعداد کے باوجود ہم یہ سب کچھ جان کر اٹھتے ہیں۔

لندن کی ایک رات کے مختلف کردار سجاد ظہیر اوران کے دوستوں کے انہی خیالات کے عکاس ہیں۔احسان جواشتراکیت کا حامی ہے۔مارکس اور اینگلز کی تعلیمات سے متاثر ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احسان کوئی اور نہیں خود ''سجاد ظہیر'' ہیں۔احسان لندن کی ایک رات کے پانچویں اور چھٹے باب کے تیسرے حصے میں ہم عمر لڑکے لڑکیوں کے ساتھ بحث کرتا ہوا نظر آتا ہے۔یہ بحث لندن کی ایک رات کو بوجھل بناتی ہے مگر مجبوری یہ ہے کہ مصنف نے اسی گفتگو اوراپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے لندن کی ایک رات تحریر کیا ہے۔احسان کے ساتھ دوسرا کردار راؤ کا ہے جسے سیاسی وسماجی کشمکش کا احساس ہے۔وہ احسان کی باتیں بغور سنتا ہے۔بحث میں حصہ لیتا ہے۔احسان اور راؤ ہندوستان سے دُور لندن میں بے فکری کی زندگی گزارنے والے طالب علموں پر طنز کرتے ہیں۔احسان کہتا ہے:

''تم سب کے سب رئیس بنئے ،مہاجن ، بیرسٹر ، وکیل ، ڈاکٹر ، پروفیسر ، انجینئر ، سرکاری نوکر ، جونک کی طرح ہواور ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں کا خون پی کر زندہ رہتے ہو۔ایسی حالت قیامت تک قائم نہیں رہے گی۔کسی نہ کسی دن تو ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں مصیبت زدہ انسان خواب سے چونکیں گے بس اسی دن تم سب کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔''(۶۹)

اوراحسان کا دوست راؤ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

''مجھے احسان سے اتفاق ہے۔ہماری حیثیت کسی طرح چوروں اور ڈاکوؤں سے بہتر نہیں۔کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان کی دولت جو ہم یہاں لٹا رہے ہیں ہم کو اس کا حق ہے؟ ہماری زندگی سے ہندوستان کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ خاک پتھر۔۔۔''(۷۰)

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ احسان اور راؤ ایک ہی طرح سوچ رہے ہیں۔مگر احسان پُر جوش ہے وہ جو سوچتا ہے، چاہتا ہے ایسا ہی ہو جائے۔جب کہ راؤ کے یہاں غور وفکر کے ساتھ بے عملی ہے۔یہ بے عملی کاہلی یا سستی کے باعث نہیں بلکہ حالات کے جبر کا نتیجہ ہے جب آدمی خود کو بے بس پاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ،تو وہ راہ فرار اختیار کرتا ہے۔اوراس فرار کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں کہ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست یا پھر عبادت اور خانقاہ۔ اور نوآبادیات کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہر ہندوستانی کو یہ مسئلہ درپیش تھا۔راؤ نے پہلی صورت اختیار کی ہے۔وہ کہتا ہے:

''۔۔۔جب تک اس دنیا میں اتنے بے وقوف لوگ موجود ہیں جو ہم ایسے بے کاروں کو اس بات کا موقع دیتے ہیں کہ دن دہاڑے ان کی جیب کتریں ، جب تک ہندوستان کے محبت مزدوری کرنے

والوں کو جوتا کھانے میں مزہ آتا ہے اس وقت تک ان بھیڑ کے گلوں کے لیے سر کھپانا اور ان کی بھلائی کی کوشش کرنا محض تضیع اوقات ہے۔ہم لوگ جو خوش قسمت ہیں اور جن کے قبضے میں تھوڑی بہت دولت لوٹ گھسوٹ کر آ گئی ہے، ان کو چاہیے کہ وہ بے فکری کے ساتھ خوب مزے اڑائیں، خدا معلوم کل کو کیا ہو!''(۷۱)

راؤ کا کردار احسان کے مقابلے میں بڑا ہے۔وہ لندن کی ایک رات کے پہلے باب سے ہی اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔کیونکہ وہ جذباتی ہے، حالات پر نظر رکھتا ہے باخبر ہے مگر عمل سے بہت دور۔راؤ اس عہد کے ایسے نوجوانوں کی نمائندگی کر رہا ہے جو تعلیم یافتہ تھے، گفتار کے غازی تھے مگر عمل کے نام پر گریز پا اور تشکیک کے شکار۔عتیق احمد لکھتے ہیں:

''اعظم جیسا کردار جو اپنی دنیا میں آپ مگن ہے، اس کی پسند بھی گوری چمڑی ہے۔عارف جیسا موقع پرست ہے جس انگریز لڑکی سے اس کا واسطہ پڑتا ہے، اس کے ساتھ شب بستری کی کوشش بھی کرتا ہے۔نعیم جیسا فربہ اور کاہل مگر مجلسی زندگی کا دلدادہ کردار بھی ہے جو اس انگریز لڑکی پر ریجھ جاتا ہے جو اس کے ساتھ دو منٹ ہمدردانہ فہم کے ساتھ گفتگو کرنے لگتی ہے۔دوسری طرف راؤ جیسا حقیقت پسند معاملہ فہم مگر بے عمل کردار ہے، جسے ہندوستانیوں کی کم عقلی، ناعاقبت اندیشی اور آپسی رقابتوں سے بڑی چڑ ہے۔۔۔۔راؤ کو ہندوستانیوں کی غربت، جہالت، اوہام پرستی اور حسد و رقابت کی فہم ضرور ہے لیکن اس صورت حال سے متصادم ہونے اور ایک نئی منزل کے سراغ کی اس کے پاس کوئی کلید ہے اور نہ اسٹریجی۔''(۷۲)

ہندوستان کے پڑھے لکھے نوجوان یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کی اچھائیاں لے کر وہ اپنی مشرقی تہذیب میں شامل کر لیں تو ایک مہذب قوم بن سکتے ہیں، لیکن انھیں شاید یہ معلوم نہیں کہ اس عمل میں اپنی تہذیب کا کتنا حصہ انھیں گنوانا پڑے گا، اور وہ بھی اس مشینی عمل کا حصہ بن جائیں گے جو راستہ ترقی کی طرف تو جاتا ہے لیکن اس میں بہت کچھ کھونا بھی پڑتا ہے، کیونکہ معاشرتی اقدار کا تعلق ماحول، معاش اور بہت سے دیگر عوامل کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔اس منظر نامے کو کریمہ کے ساتھ گفتگو کرنے والے لڑکے کی زبانی یوں پیش کیا گیا ہے:

''آپ کی کوشش بالکل بے کار ہے۔آپ کہتی ہیں کہ ہمیں یورپ سے صرف یہاں کی اچھائیاں سیکھنا چاہئیں، برائیاں نہیں۔اور آپ ہمارے سامنے ایک ایسا نصب العین پیش کرتی ہیں جس میں ہندوستانی اپنی سب برائیاں چھوڑ کر اپنی اچھائیاں اور یورپ کی اچھائیاں ملا کر دنیا کی بہترین مخلوق بن جائیں!۔۔۔پہلے تو یہ کہ ایک سوسائٹی میں اچھائیاں اور برائیاں انسانوں کی ذاتی رائے اور ذاتی پسند کی وجہ سے رائج نہیں ہوتیں۔آپ یورپ کی بہت سی باتوں کو برا سمجھتی ہیں۔مثلاً آپ کہتی ہیں کہ

یہاں کی عورتوں کا آزادی کا معیار انھیں برے راستے پر لے جاتا ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ یہ رسم و رواج کیوں وجود میں آئے، یورپین زندگی میں نئے معیار کیوں قائم ہوئے۔ پانچ سو برس پہلے یہاں کی عورتوں کا قریب قریب وہی درجہ تھا جو ہندوستان میں آج کل ہے۔ لیکن اس درمیان میں یورپ کے معاشی نظام میں زبردست انقلاب ہوگیا جس کا اثر یہاں کے سماجی اور سیاسی نظام پر پڑا۔ اس وجہ سے یورپین ذہنیت میں بھی انقلاب واقع ہوا۔ یہاں کے رسم ورواج سب بدل گئے۔ آج کل یورپین انسان ان تمام تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔ اس کی اچھائیاں اور برائیوں کی جڑ اس کے سماجی نظام میں ہے۔ ہندوستان میں بھی بڑی بڑی بنیادی تبدیلیاں ہورہی ہیں، جسے آپ یورپ کا ضرورت سے زیادہ اثر کہتی ہیں، وہ انھیں تبدیلیوں کی وجہ سے بڑھ رہا ہے۔ ان میں اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ صرف ان کو دیکھنا اور اُن کی جڑ پر نظر نہ ڈالنا حماقت ہے۔'' (۷۳)

''لندن کی ایک رات'' اپنے عصر کا ترجمان ناول ہے اور نہ صرف اُس عہد کے حالات کی عکاسی کرتا ہے بلکہ آج کی صُورتِ حال پر بھی پُوری طرح سے مُنطبق ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب ایک سامراجی طاقت کی جگہ دُوسری سامراجی طاقت سنبھال چکی ہے اور غُلامی بھی جدید شکل اِختیار کر گئی ہے۔ عہدِ موجود کا نوجوان بھی کم وبیش ویسے ہی مسائل میں گھرا ہوا ہے اور ویسی ہی کش مکش سے دوچار ہے جو لندن کی ایک رات میں نظر آتی ہے۔

حوالہ جات/حواشی

۱۔ جامع اردو انسائیکلو پیڈیا، جلد۱، ادبیات، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۳ء، ص ۳۰۶، ۳۰۷

۲۔ محمد اشرف، ڈاکٹر، ترقی پسند تحریک اور اردو فکشن، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۴ء، ص ۸۲

۳۔ ''پریم چند کے خطوط سجاد ظہیر کے نام'' مشمولہ، نیا ادب، جنوری فروری ۱۹۴۰ء، ص ۲۲

۴۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، (خصوصی مطالعہ اور تجزیہ مع حیات وخدمات) مرتبہ، ڈاکٹر محمد فیروز، دہلی :ساقی بک ڈپو، ۲۰۰۶ء، ص ۵۰

۵۔ حنیف فوق، ڈاکٹر، اردو ادب میں ترقی پسند تحریک، مشمولہ ''پاکستانی ادب'' جلد پنجم (تنقید)، مرتبہ رشید امجد، فاروق علی، راولپنڈی: فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج طبع اول، ۱۹۸۲ء، ص ۳۶۸

۶۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۹ء، ص ۲۲۶

۷۔ سجاد ظہیر، روشنائی، کراچی: دانیال، ۲۰۰۵ء، ص ۳۰

۸۔ شمیمہ بیگم، ڈاکٹر، ترقی پسند تنقید کا ارتقاء اور احتشام حسین، کراچی: اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۴۹

۹۔ آل احمد سرور، تنقید کیا ہے، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۲۵ء، ص ۱۲۵

۱۰۔ قمر رئیس، پروفیسر، سید عاشور کاظمی، مرتبہ، ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، لاہور: مکتبہ عالیہ ایبک روڈ، ۱۹۹۴ء، ص ۳۹۹

۱۱۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، اسلام آباد: پورب اکادمی، طبع اول، اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۳

۱۲۔ مظہر جمیل، سیّد، انگارے سے پگھلا نیلم تک ۔ نئے گوشے نئے تناظر، کراچی: اکادمی بازیافت، پہلی اشاعت، دسمبر ۲۰۰۵ء، ص ۵۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۵

۱۴۔ کمال احمد صدیقی، لندن کی ایک رات، (مضمون) مشمولہ: سجاد ظہیر۔ ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک، ترتیب وتہذیب، گوپی چند نارنگ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۸۵

۱۵۔ وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۹۰ء، ص ۱۵۸

۱۶۔ سجاد ظہیر، روشنائی، کراچی: دانیال، ۲۰۰۵ء، ص ۳۰

۱۷۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، (خصوصی مطالعہ اور تجزیہ مع حیات و خدمات) مرتبہ، ڈاکٹر محمد فیروز، دہلی
:ساقی بک ڈپو، ۲۰۰۶ء، ص ۴۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۵۱

۲۰۔ خلیل الرحمان اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۲ء، ص ۲۰۹

۲۱۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، (خصوصی مطالعہ اور تجزیہ مع حیات و خدمات) مرتبہ، ڈاکٹر محمد فیروز، دہلی
:ساقی بک ڈپو، ۲۰۰۶ء، ص ۷۰

۲۲۔ ایضاً، ص ۷۳

۲۳۔ ایضاً، ص ۷۳

۲۴۔ ایضاً، ص ۷۴

۲۵۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، تلاش و توازن، دہلی: ادارۂ خرم پبلی کیشنز، ۱۹۶۸ء، ص ۳۷۔۳۸

۲۶۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، (خصوصی مطالعہ اور تجزیہ مع حیات و خدمات) مرتبہ، ڈاکٹر محمد فیروز، دہلی
:ساقی بک ڈپو، ۲۰۰۶ء، ص ۸۳

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۷۱

۲۸۔ ایضاً، ص ۷۴

۲۹۔ ایضاً، ص ۶۸

۳۰۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ او رتنقید، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۷ء، ص ۳۶۷

۳۱۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، (خصوصی مطالعہ اور تجزیہ مع حیات و خدمات) مرتبہ، ڈاکٹر محمد فیروز، دہلی
:ساقی بک ڈپو، ۲۰۰۶ء، ص ۷۳

۳۲۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، ص ۱۲۱

۳۳۔ عتیق احمد، لندن کی ایک رات، موضوع اور مواد، مشمولہ ''سجاد ظہیر۔ شخصیت اور فکر'' مرتب سید جعفر علی،
ڈاکٹر، کراچی: مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبرز ۲، ۲۰۰۵ء، ص ۶۹

۳۴۔ محمد عارف، ڈاکٹر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی،

۲۰۰۶ء،ص ۱۵

۳۵۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات ،(خصوصی مطالعہ اور تجزیہ مع حیات وخدمات) مرتبہ، ڈاکٹر محمد فیروز، دہلی
:ساقی بک ڈپو، ۲۰۰۶ء، ص ۶۶ تا ۶۹

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۳۷۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات ،(خصوصی مطالعہ اور تجزیہ مع حیات وخدمات) مرتبہ، ڈاکٹر محمد فیروز، دہلی
:ساقی بک ڈپو، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۰۔۱۱۱

۳۸۔ ایضاً، ص ۷۷

۳۹۔ ایضاً، ص ۹۷

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۵۰۔۱۵۱

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۴۳

۴۲۔ آصف فرّخی، ڈاکٹر، نگاہِ آئینہ ساز میں، کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۷۔۱۵۶

۴۳۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات ،(خصوصی مطالعہ اور تجزیہ مع حیات وخدمات) مرتبہ، ڈاکٹر محمد فیروز، دہلی
:ساقی بک ڈپو، ۲۰۰۶ء، ص ۶۵

۴۴۔ ایضاً، ص ۶۹

۴۵۔ ایضاً، ص ۷۲

۴۶۔ ایضاً، ص ۷۶

۴۷۔ ایضاً، ص ۷۷

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۵۴۔۱۵۵

۵۰۔ ایضاً، ص ۹۵

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۵۸

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۶۳۔۱۶۴

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۵۴۔ محمد اکرام،شیخ،رود کوثر،لاہور:ادارۂ ثقافت اسلامیہ،نومبر ۱۹۹۷ء،ص۴۶۴تا۴۶۶

۵۵۔ سجاد ظہیر،لندن کی ایک رات ،(خصوصی مطالعہ اور تجزیہ مع حیات و خدمات)مرتبہ،ڈاکٹر محمد فیروز،دہلی :ساقی بک ڈپو،۲۰۰۶ء،ص۱۱۴

۵۶۔ ایضاً،ص۱۲۵

۵۷۔ ایضاً،ص۱۵۳

۵۸۔ ایضاً،ص۱۴۳

۵۹۔ ایضاً،ص۷۲۔۷۳

۶۰۔ سجاد ظہیر کے قیامِ یورپ اور دیگر حالاتِ زندگی کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے:مظہر جمیل،سیّد،انگارے سے پگھلا نیلم تک۔نئے گوشے نئے تناظر،کراچی:اکادمی بازیافت،پہلی اِشاعت،دسمبر۲۰۰۵ء

۶۱۔ سجاد ظہیر،لندن کی ایک رات ،(خصوصی مطالعہ اور تجزیہ مع حیات و خدمات)مرتبہ،ڈاکٹر محمد فیروز،دہلی :ساقی بک ڈپو،۲۰۰۶ء،ص۱۲۶

۶۲۔ ایضاً،ص۱۰۷

۶۳۔ ایضاً،ص۱۰۷۔۱۰۸

۶۴۔ ایضاً،ص۶۹۔۷۰

۶۵۔ ایضاً،ص۷۸۔۷۹

۶۶۔ ایضاً،ص۸۰تا۸۳

۶۷۔ ایضاً،ص۸۲

۶۸۔ ایضاً،ص۸۱

۶۹۔ ایضاً،ص۱۲۱

۷۰۔ ایضاً،ص۱۲۲

۷۱۔ ایضاً،ص۱۲۲

۷۲۔ عتیق احمد،لندن کی ایک رات:ایک نو آبادیاتی مطالعہ ،مشمولہ سجاد ظہیر،ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک،مرتبہ گوپی چند نارنگ،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء،ص۷۸

۷۳۔ سجاد ظہیر،لندن کی ایک رات ،(خصوصی مطالعہ اور تجزیہ مع حیات وخدمات)مرتبہ،ڈاکٹر محمد فیروز،دہلی :ساقی بک ڈپو،۲۰۰۶ء،ص۱۱۵۔۱۱۶

باب سوم

عزیز احمد کا تہذیبی و نوآبادیاتی شعور بحوالہ ''گریز''

ا۔عزیز احمد: احوال و آثار

(۱۶ر دسمبر ۱۹۷۸ء۔۱۱ر نومبر ۱۹۱۳ء) ضلع بارہ بنکی، اتر پردیش، برطانوی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام بشیر احمد تھا۔ ان کے والد ایک اچھے وکیل تھے انھوں نے وکالت کے سلسلے میں ریاست حیدرآباد، دکن کا رخ کیا تو پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

عزیز احمد نے شروع شروع میں عزیز احمد عثمان آبادی کے نام سے لکھا۔ بعد میں اپنے اصلی نام سے لکھنے لگے۔ عزیز احمد نے میٹرک ۱۹۲۸ء میں مدرسۂ فوقانیہ عثمانیہ، عثمان آباد سے اور بی،اے ۱۹۳۴ء میں جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد سے پاس کیا۔ بعد ازاں مولوی عبدالحق کی کوششوں سے عزیز احمد کو اعلا تعلیم کے لئے وظیفہ ملا اور وہ ۱۹۳۵ء میں انگلستان چلے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۹۳۸ء میں بی،اے، آنرز، لندن یونی ورسٹی، لندن سے انگریزی زبان وادب میں کیا۔ کچھ وقت یورپ کی سیر و سیاحت میں گزارا۔ اسی عرصہ میں وہ فرانس کی سوربون یونی ورسٹی سے بھی منسلک رہے۔

لندن سے واپس آ کر لیکچرر، شعبۂ انگریزی، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد (۱۹۴۱ء۔۱۹۳۸ء) رہے، پھر شہزادی درشہوار کے پرائیویٹ سکریٹری (۱۹۴۵ء۔۱۹۴۱ء) رہے۔ بعد ازاں انھوں نے ریڈر، شعبۂ انگریزی، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد (۱۹۴۷ء۔۱۹۴۶ء) کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء وہ پروفیسر، شعبۂ انگریزی، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد رہے۔ پاکستان چلے جانے (۱۹۴۹ء) پر وہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر، محکمۂ اطلاعات مطبوعات و فلم سازی، حکومت پاکستان کے عہدے پر مقرر (۱۹۵۰ء۔۱۹۴۹ء) کیے گئے۔ محکمۂ مطبوعات کی ملازمت کے دوران کئی اردو، انگریزی رسالے ان کے زیر انتظام پاکستان سے شائع ہوئے جن میں ماہ نو اور ہلال بھی تھے۔ اس کے بعد ڈپٹی ڈائرکٹر، محکمۂ تعلقات عامہ و وزارت امور کشمیر حکومت پاکستان (۱۹۵۷ء۔۱۹۵۳ء) کے عہدے پر مامور رہے۔ سرکاری ملازمت ترک کرنے کے بعد وہ شعبۂ اردو، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز، لندن میں ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک استاد رہے اور پھر ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامیات، کی حیثیت سے ٹورانٹو یونی ورسٹی کناڈا میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۸ء تک خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کے کام کی اہمیت اور وقعت کے پیش نظر انھیں رائل سوسائٹی آف کینڈا کا فیلو مقرر کیا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں یونی ورسٹی

آف لندن نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کو ڈی لٹ کی ڈگری سے نوازا۔عزیز احمد کئی زبانیں جانتے تھے ۔اردو،انگریزی،فرانسیسی پر عبور حاصل تھا۔جب کہ ترکی ،اطالوی اور جرمن زبانوں میں گفتگو کر لیتے تھے۔آخری ایام میں ناویجن زبان سیکھ رہے تھے۔ان کی پہلی تنقیدی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' ہے۔۱۹۷۸ء میں بعارضۂ سرطان وفات پائی۔

عزیز احمد کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

افسانے:

آب حیات (سات مجموعے)،لاہور: مکتبہ میری لائبریری،طبع اول۱۹۸۶ء

بے کار دن بے کار راتیں،(سات افسانے)،لاہور: مکتبہ جدید،طبع اول دسمبر ۱۹۵۰ء

رقص ناتمام،(گیارہ افسانے)،لاہور: مکتبہ جدید،طبع اول ۱۹۴۷ء

زریں تاج،لاہور:تخلیقات،طبع اول۱۹۹۲ء

کلیسا،دہلی:موڈرن پبلشنگ ہاؤس (یہ طویل افسانے کتابی صورت میں شائع ہوئے)

ناول:

ہوس،لاہور: مکتبہ اردو،سویرا پریس،طبع اول۱۹۴۳ء

گریز،(لاہور: مکتبہ اردو،سویرا پریس،طبع اول۱۹۴۲ء)،(لاہور: مکتبہ جدید،طبع سوم،۱۹۵۱ء)

مرمر اور خون ،(حیدرآباد،دکن:عبدالحق اکیڈمی،طبع اول۱۹۴۳ء)(لاہور: مکتبہ اردو،سویرا پریس،طبع اول ۱۹۴۴ء)

آگ،لاہور: مکتبہ اردو،سویرا پریس،طبع اول۱۹۴۵ء

ایسی بلندی ایسی پستی،لاہور: مکتبہ جدید،طبع اول۱۹۴۸ء

شبنم،لاہور: مکتبہ جدید،طبع اول۱۹۵۱ء

تری دلبری کا بھرم ،(لاہور: مکتبہ میری لائبریری،طبع اول۱۹۸۵ء)(لکھنؤ:شبستان،کاشانۂ اردو،طبع اول۱۹۶۲ء)

ناولٹ:

اور یہ بستی نہیں ، مشمولہ عزیز احمد فکر وفن اور شخصیت: ناول نگاری اور ناولٹ،(جلد سوم) مرتب اعظم راہی،دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،طبع اول،۲۰۱۱ء

بــرے لو گ ،(دہلی: ناشر سلطان احمد تاجر کتب اردو بازار، طبع اول، س۔ن)، (مشمولہ عزیز احمد فکر وفن اور شخصیت: ناول نگاری اور ناوٗلـٹ، (جلد سوم) مرتب اعظم راہی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، طبع اول، ۲۰۱۱ء)

جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں ،رام پور: کتاب کار پبلیکیشنز، طبع اول ۱۹۶۶ء

خدنگ جستہ، پٹنہ: بک ایمپوریم، طبع اول ۱۹۸۹ء

دوتــاریــخی نــاولــٹ: (مشمولہ خدنگ جستہ، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں)، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، طبع اول ۱۹۸۵ء

مثلث ،لاہور: مکتبہ میری لائبریری، طبع اول ۱۹۸۵ء

شاعری:

ماہ لقا اور دوسری نظمیں، حیدرآباد دکن: اعظم اسٹیم پریس، طبع اول ۱۹۴۳ء

غزلیں بہ سلسلہ آغوش مرگ

ترتیب وتہذیب:

تـحقیق و ادبی مجلہ ، حیدرآباد دکن: مکتبہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ ، (پروفیسر عبدالقادر سروری کے شریک مدیر رہے)

چار لقمے مرتبہ، حیدرآباد دکن: مکتبہ ابراہیمیہ ، طبع اول ۱۹۴۷ء

تنقید:

ترقی پسند ادب ،حیدرآباد: دارالاشاعت، طبع اول ۱۹۴۵ء

شعرائے عصر کے کلام کا انتخاب جدید (بہ اشتراک آل احمد سرور) دہلی: انجمن ترقی اردو، طبع اول ۱۹۴۳ء

کلیاتِ نثر ۔عزیز احمد، مرتبہ صدیق جاوید، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۱۱ء

متاع عزیز (تنقیدی مضامین وتبصرے) مرتب: صدیق جاوید، لاہور: مکتبہ عالیہ، طبع اول ۱۹۹۱ء

اقبالیات:

اقبال نئی تشکیل ،کراچی: کتب خانہ تاج آفس، طبع اول ۱۹۵۰ء

اقبال اور پاکستانی ادب (عزیز احمد کے مضامین) مرتبؔ طاہر تونسوی، لاہور: مکتبہ عالیہ، طبع اول ۱۹۷۷ء

تراجم:

رڈیارڈ کپلنگ کے افسانے کا ترجمہ بچپن، ورٹیگور کے افسانے کا ترجمہ شریر لڑکا کے نام سے عزیز احمد نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا، اور عبدالقادر سروری کے ساتھ دنیا کے شاہکار افسانوں کا ترجمہ کیا تھا۔

تاتاریوں کی یلغار: ہیرلڈیم، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، طبع دوم، ۱۹۴۵ء

تیمور: ہیرلڈیم، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س۔ن

چنگیز خاں: ہیرلڈیم ، لاہور: مکتبہ جدید، طبع اول ۱۹۵۲ء

خراب آباد: ٹی۔ایس۔ایلیٹ، رسالہ اردو، ۱۹۳۶ء

رومیو جولیٹ: شیکپیئر ، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، طبع اول ۱۹۴۱ء

طربیہ خداوندی: دانتے، دو جلدیں، انجمن ترقی اردو ہند، طبع اول ۱۹۴۳ء

فن شاعری: ارسطو، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، طبع اول ۱۹۴۱ء

معمار اعظم: نیرک البن، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، طبع اول ۱۹۴۵ء

مقالات گارساں دتاسی، رسالہ اردو، ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۰ء

ان کے علاوہ چیخوف، گالزوردی اور موپساں کے افسانوں کا بھی ترجمہ کیا۔

تاریخ، پاکستانیات، اسلامیات، سماجیات:

(۱) نسل اور سلطنت (تاریخ)، دہلی: انجمن ترقی اردو، طبع اول ۱۹۴۱ء

(۲)Studies in Islamic Culture in the Indian Environment. London : Oxford University Press, 1964.

اس کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اسلامی کلچر کے عنوان سے کیا اسے ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے ۱۹۸۸ء میں پہلی بار کیا۔

(۳)Islamic Modernism in India and Pakistan, London: Oxford University Press. 1967.

اس کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے برصغیر میں اسلامی جدیدیت کے عنوان سے کیا، اسے ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے ۱۹۸۷ء میں پہلی بار شائع کیا۔

(۴)An Intellectual History of Islam in India.Germany: Edinburovgh University Press. 1969.

(۵)Reading in Muslim Self Statement in India and Pakistan (witj Wiesbaden) 1970.

(۶)A History of Islamic Sicity. Germany Edinburobgh. University Press. 1975.

(۷)Intellectual History of Muslims: Quid-e-Azam Memorial Lectures Islamabad 1975.

عزیز احمد کے بے مثال ناولٹ ،مرتبہ امجد طفیل، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۱۸

عزیز احمد ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر، ناقد، مبصر، مترجم، اقبال شناس اور اسلامی تاریخ نویس کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے ناول اور افسانے اپنے موضوعات کے تنوع اور اپنے اسلوب وتکنیک کے باعث اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی تخلیقات میں ہمیں ایک مربوط فکری نظام ملتا ہے جو جنس، عشق کی ماہیت ومعنویت، نظام ازدواج کے غلط رواجوں سے انحراف، عورت کی خودداریت وآزادیٔ عمل اور عورت ومرد کے درمیان ایک توازن کی تلاش سے عبارت ہے۔ اپنی تنقیدی تحریروں میں عزیز احمد نے داستان اور ناول کی مبادیات، افسانے کی شعریات، اردو غزل کی شعری روایات، ادیب کی آزادی وتجربہ پسندی اور مغرب کے نئے ادبی رجحانات ورویوں پر تفصیل سے لکھا ہے۔ زندگی کے آخری دور میں عزیز احمد نے اسلامی تاریخ نویس کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ان کی تاریخی تحریریں یورپ اور خصوصاً ہندوستان پر اسلامی فکر اور تہذیب کے اثرات سے متعلق ہیں۔ زیادہ تر مضامین انھوں مضامین انھوں نے انگریزی اور فرانسیسی میں لکھے۔(۱)

۲۔ گریز کا تہذیبی ونوآبادیاتی مطالعہ

ناول، افسانہ، تنقید، ترجمہ اور تاریخ وتہذیب عزیز احمد کے خُصوصی میدان تھے۔ اِظہار کے لیے دو زبانوں اُردو اور انگریزی کو وسیلہ بنایا۔ پہلا ناول ہوس ۱۹۳۱ء میں منظرِ عام پہ آیا، جس کے بعد مرمر اور خون (۱۹۳۲ء)، گُریز (۱۹۴۳ء)، ''آگ (۱۹۴۵ء) ایسی بلندی، ایسی پستی (۱۹۴۸ء) اور شبنم (۱۹۵۰ء) منصۂ شہود پر آئے۔ اِبتدائی دونوں ناول عزیز احمد کی کمزور تخلیقات میں شمار ہوتے ہیں، جس کا وہ خود بھی اعتراف کرتے ہیں۔ ابواللیث صدیقی رقم طراز ہیں:

> ''یہ دونوں ناول [ہوس، مرمر اور خون] نہایت معمولی درجے کے بلکہ فن کے اعتبار سے نہایت ناقص ہیں۔ عزیز احمد نے خود یہ بات تسلیم کی ہے وہ اس زمانے میں انیسویں صدی کے روسی اور فرانسیسی رومان پسند ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں سے متاثر تھے۔ اور بقول ان کے عشق اور جبریہ جنس کے جراثیم ان دونوں ناولوں میں اسی راہ سے داخل ہوئے۔''(۲)

عزیز احمد کے مذکورہ بالا دونوں ناولوں پر فرانس کی نیچرل ازم کی تحریک کے اثرات نُمایاں ہیں اور اِن میں کسی اعلیٰ فکر کی نُمائندگی بھی نظر نہیں آتی۔ اُن کے بعد میں آنے والے ناولوں گُریز، آگ اور ایسی بلندی، ایسی

پستی کوفکروفن کے حوالے سے ناقدین کی توجہ اور پذیرائی ملی، جبکہ خود عزیز احمد نے آگ کو اپنا بہترین ناول قرار دِیا میں حیدرآباد دکن اور یورپ کا دُوسری جنگِ عظیم سے قبل کا سیاسی، ثقافتی، مُعاشرتی اور تہذیبی منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔''آگ'' کشمیر کی زندگی میں معاشی ومُعاشرتی اِستحصال کی تصویر کشی پر مبنی ہے جبکہ ایسی بلندی، ایسی پستی میں حیدرآباد دکن کے تہذیبی زوال کی عکاسی کی گئی ہے۔ حسن عسکری نے اِسے اُردو کا اِجتماعی ناول قرار دِیا ہے جو افراد کے بجائے ایک مُعاشرے کی مجموعی تصویر پیش کرتا ہے۔ عزیز احمد کو شہزادی دُرِشہوار کی ملازمت کے ذریعے سے حیدرآباد دکن کی تہذیب کا نہایت قریب سے مُشاہدہ کرنے کا موقع میسّر آیا تھا۔

''عزیز احمد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے برصغیر ہندوستان میں جاگیرداری کے سب سے بڑے اور مضبوط ترین قلعہ حیدرآباد کے جاگیردار اور تعیش پسند معاشرے کی نہایت بے باکی اور جرأت مندی کے ساتھ نقاب کشائی کی اور دنیا کو دکھایا کہ برِصغیر کا جاگیردارانہ معاشرہ جو قرون وسطیٰ کے انسانیت سوز استحصال پر قائم ہے، اخلاقی اور سماجی طور پر کس قدر گل سڑ چکا ہے۔''(۳)

حیدرآباد کے حکمران طبقے کی ذاتی زِندگیوں کا قریب سے مُشاہدہ کرنے کی بنا پر اُنہوں نے رِیاست کی زوال پذیر تہذیب کو نہایت کامیابی اور عمدگی سے ایسی بلندی، ایسی پستی میں پیش کیا ہے۔ اُنہوں نے مُختلف پہلوؤں کی عکاسی سے رِیاست کی زِندگی کے خُفیہ گوشے بے نقاب کیے ہیں، بالخصوص امرا کا طرزِ حیات تفصیل سے دِکھایا ہے:

''اس ناول میں طبقۂ امراء کے گھر کلب پارٹیوں ضیافتوں، معاشقوں، ناجائز جنسی تعلقات، باہمی رقابتوں، محلاتی سازشوں غرض حیدرآباد کے طبقۂ اشرافیہ کی پوری زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پورا معاشرہ قارئین کی نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔''(۴)

عزیز احمد نے ایسی بلندی، ایسی پستی میں اِنحطاط پذیر جاگیردارانہ ماحول کی عکاسی کی ہے۔ انگریزوں کے راج نے مشرقیت کا پس منظر رکھنے والے مذکورہ ماحول پر مغربی تمدُّن کی گہری چھاپ لگادِی۔ طرزِ زِندگی بدل گیا اور مغربیت کے اثرات نُمایاں ہوتے چلے گئے۔ یہی مغربی طرزِ زِندگی ماڈرن ہونے کی نشانی قرار پایا۔ مغربیت کے زیرِ اثر عورتیں بھی کلب جانے اور پارٹیاں اٹینڈ کرنے کو معمول بنائے ہوئے تھیں۔ تاہم اِس ماحول پر مغربیت کی گہری چھاپ بھی مشرقیت کو مکمل طور پر شکست نہ دے پائی۔ عورتیں جدید مغربی تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور پردے کی رسم سے بھی چُھٹکارا حاصل چکی تھیں لیکن ہنوز اُن میں مشرقیت برقرار تھی۔ نور جہاں بھی ایک ایسی ہی عورت ہے جو ماحول کے زیرِ اثر مغربیت سے بھی مُتاثر ہے لیکن اپنی اصل پہچان مشرقیت کو بھی بہر حال برقرار رکھتی ہے۔ وہ مشرقی ومغربی تہذیبی خصوصیات

کے اِمتزاج کا نمونہ ہے۔جدید تعلیم نے جو شعور اُسے بخشا ہے اسی کے نتیجے میں وہ اپنے حقوق سے آگاہ ہے اور ان کے حُصول کا طریقہ بھی جانتی ہے۔وہ اپنے حقوق کے اِستعمال سے ہی اپنی زِندگی میں درآنے والی تلخیوں اور دُکھوں کو ختم کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔

اگر چہ مذکورہ بالا تینوں ناول عزیز احمد کے فن کے نُمائندہ اور فکری و فنی اعتبار سے مضبوط تخلیقات ہیں لیکن نیچرل ازم کی جانب مُصنف کے گہرے اور شاید فطری رُجحان کے اثرات اِن میں بھی نُمایاں ہیں۔ گریز کے حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

''ایک تو جنسی افعال کا کھلا اظہار ہے جس میں آرٹ کے تقاضوں کو پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے حالانکہ جنس کا بیان کوئی شجرِ ممنوعہ نہیں لیکن اس کے اظہار کا مقصد اہم ہوتا ہے۔عزیز احمد نیچرل ازم کے تحت بے قابو ہو جاتے ہیں۔''(۵)

شبنم میں ایک بار پھر عزیز احمد اپنے اوّلین دو ناولوں کی روش پہ چلتے دِکھائی دیتے ہیں، یہ ناول بھی فکری گہرائی سے عاری، محض سطحی اور غیر سنجیدہ عناصر پر مبنی ہے۔ جو فنی و فکری بلندی عزیز احمد نے اپنے نُمائندہ ناولوں سے حاصل کی، شبنم میں اُس کا زوال نظر آتا ہے۔

''لہٰذا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عزیز احمد کے [ناولوں] میں 'آگ'، 'گریز'، 'ایسی بلندی، ایسی پستی' ہی میں سماجی، معاشی، تہذیبی اور اخلاقی حوالوں سے معنویت برآمد ہوتی ہے۔''(۶)

اور فنی پختگی کے حوالے سے بھی یہی تین ناول مُصنف کے فن کی بخوبی نمائندگی کرتے ہیں۔

عزیز احمد اپنے قیامِ یورپ (۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۸ء) کے دوران میں اِشتراکی نظریات سے مُتاثر ہوئے۔ وہ اِنسان دوستی کی تحریک سے بھی مُتاثر تھے۔ اِنسان دوستی کی تحریک بُنیادی طور پر اِنسان کو غُلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کی کوشش تھی۔ جاگیردارانہ مُعاشروں اور کلیسا نے اِنسان کو جن زنجیروں میں مُقیّد کر رکھا تھا، یہ تحریک اُن پابندیوں کے خلاف جِدوجہد، نیز مساوات کے قیام اور اِنسان کو اُس کے بنیادی حقوق کی فراہمی پر مبنی تھی۔ترقی پسند تحریک بھی اِنہی نعروں پر وجود میں آئی۔عزیز احمد نے ترقی پسند تحریک سے بھی اثر لیا تاہم وہ کُلّی طور پر اِس تحریک سے مُتفق نہیں تھے اور نہ ہی اِس سے وابستگی اختیار کی۔ وہ تحریک میں موجود خلا سے واقفیت رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ لکھتے ہیں:

''اشتراکی ملک کا رہنے والا نیا انسان بھی جب تمام معاشی مسئلے حل کر چکے گا تو وہ ایک باطنی اور اندرونی خلا محسوس کرے گا جس کے لیے وجدانی احساس کی ضرورت ہوگی۔''(۷)

اُن کا یہی طرزِ فکر اور احساس اُنہیں اپنے ناولوں میں بلند آہنگ اِشتراکی پراپیگنڈے سے روکتا دِکھائی دیتا ہے۔

وہ محض جذباتیت یا جدّت پسندی کے زیرِ اثر اِنسان دوستی، آزادی، امن اور مساوات کے نعرے بلند نہیں کرتے اور جنس کو بھی ''ترقی پسندی کی نہیں بلکہ انتہا درجے کی تنزّلی کی نشانی''(۸) قرار دیتے ہیں۔ تاہم اُن کے ناولوں کا جائزہ اِس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ وہ خود اِسی ''تنزّلی کی نشانی'' کو روا رکھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ بالخصوص جب اُن کی اِس بات کو ذہن میں رکھا جائے کہ ''وہ واقعہ جو زندگی پر صحت منداثر نہ ڈالے۔۔۔اس کا ذکر نہ صرف تضیع اوقات ہے بلکہ انسانی بہبود کے لیے بھی مضر ہے۔''(۹) تو اُن کے ناولوں میں جذبات نگاری اور نیچرل ازم کے نام پر روا رکھی گئی عُریاں نگاری کی موجودگی پر ایک بڑا سوالیہ نشان اُبھرتا ہے اور یہاں عزیز احمد اپنی فکر اور نظریہ فن کے خلاف جاتے دِکھائی دیتے ہیں۔ گریز ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ یہ قسطوں میں لکھا گیا، اس دلچسپ کہانی کو ڈاکٹر حمیرا اشفاق یوں بیاں کرتی ہیں:

''عزیز احمد کا تیسرا ناول، جس سے حقیقی معنوں میں انھیں بہت شہرت ملی، گریز ہے۔ جس کے ابتدائی ابواب بہت عرصہ تک شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے۔ ۱۹۴۳ء میں سفر کشمیر کے دوران انھوں نے اسے مکمل کیا۔ عزیز احمد کے اپنے لفظوں میں یہی وہ ناول تھا جسے اپنا کہتے ہوئے انھیں کبھی شرم محسوس نہیں ہوئی۔ اس ناول پر فحاشی اور عریانی کے متعدد الزامات کے باوجود ''گریز'' ان کا پہلا بڑا سنجیدہ کام تھا۔ ۳۸۔۱۹۳۷ء کے دوران انھوں نے ناول کے ابتدائی دو تین ابواب لکھے۔ اس وقت تک وہ تین سال تک لندن میں قیام کر کے واپس آ چکے تھے۔ ۱۹۳۸ء کے بعد دو ایک باب مزید لکھے لیکن وہ دوسرے اہم کاموں کے باعث مصنف کی توجہ نہ لے سکے۔ دوسری عالمی جنگ زوروں پر تھی۔ ۱۹۴۲ء میں کشمیر جاتے ہوئے لاہور کے ریلوے بک سٹال پر ان کی نظر ادبِ لطیف کے سالنامہ اور فکشن کی چند دوسری کتابوں پر پڑی۔ جس میں احمد علی، کرشن چندر، اشک، بیدی، منٹو، عصمت اور فیض وغیرہ کی تحریریں چھپی ہوئی تھی۔ احمد علی کے علاوہ وہ کسی اور نام سے واقف نہ تھے۔ وہ ان تحریروں سے خاصے متاثر ہوئے۔ عزیز احمد نے ان تمام مصنفین کی کتابیں خرید کر پڑھیں اور اس موضوع پر ایک کتاب ''ترقی پسند ادب'' بھی لکھ ڈالی۔ اس ساری سرگرمی کا مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ''گریز'' کی تکمیل میں سنجیدہ ہو گئے۔''(۱۰)

عزیز احمد کے اپنے الفاظ میں اس کی کہانی یوں ہے:

''۱۹۴۳ء کے کشمیر کے سفر میں، میں وہ ابواب اپنے ساتھ لیتا گیا جو کئی سال پہلے لکھے تھے اور ناول کی تکمیل کر ہی ڈالی۔ یہ پہلا ناول ہے جس کو اپنا کہتے ہوئے مجھے شرم نہیں آتی۔ کئی لحاظ سے اس کو میں اپنا سب سے کامیاب ناول سمجھتا ہوں۔ اس پر عام اعتراض جو کیا جاتا ہے یعنی عریانی کام، وہ خالص مشرقی ہے۔ ''گریز'' میں اور بہت سی چیزیں ہیں۔ ۱۹۳۷ء کے قریب یورپ کی سیاست، ہروشا کا کردار، چیکوسلوا کیہ، نفسیاتِ شباب اور اس پر طنز اور کچھ اچھے خاصے فقرے۔ مجھے حیرت ہے کہ

پڑھنے والوں کی نظر صرف عریانی پر کیوں پڑتی ہے اور یورپ کے جدید ادب کا کون سا بڑا ناول ہے
جس میں عریانی نہیں۔''(۱۱)

گریز کا ایک پہلو تاریخی بھی ہے، جس کی طرف ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے اپنے مقالے میں توجہ مبذول کروائی ہے: ''اس ناول کا تاریخی تناظر دوسری جنگ عظیم اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج اور اثرات سے عبارت ہے۔ جنگ میں سوویت یونین کی شمولیت کے بعد دنیا واضح طور پر دو بلاکوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایک طرف جرمنی، اٹلی اور جاپان کی فاشی قوتیں تھیں جو آریائی نسلی تفوق کے لیے پوری دنیا کا امن غارت کر رہی تھیں۔ دوسری طرف مغربی ممالک تھے، جو جمہوریت اور انسانی آزادی کے آدرش کے لیے لڑ رہے تھے۔ سوویت یونین ان کا اتحادی بن کر ایک طرف ہٹلر کے فاشی عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے اپنی زمین کے چپے چپے کا دفاع کر رہا تھا تو دوسری جانب وہ فرانس، برطانیہ اور بعض دوسرے یورپی ممالک کی جدوجہد میں بالواسطہ طور پر شریک تھا۔ برطانوی نوآبادی ہونے کے باعث ہندوستان اس سارے معاملے سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ یہاں کی ترقی پسند تحریک جمہوری اتحاد کی مدد کر رہی تھی۔ خود عزیز احمد کی ہمدردیاں جمہوری اتحاد کے ساتھ تھیں جس کا اظہار انھوں نے اپنے پہلے غیر افسانوی مطالعے ''نسل اور سلطنت'' (۱۹۴۱ء) میں کیا ہے۔ گریز پر کام کرتے وقت، وہ ''نسل اور سلطنت'' شائع کر چکے تھے اور شدت اختیار کرتی ہوئی جنگ کے نتائج کو دلچسپی اور امید کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ اس تناظر میں ''گریز'' کی تکمیل کا یہ موزوں ترین وقت تھا۔ عزیز احمد کا ''گریز'' اپنے عہد کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ جب پوری دنیا پہلی عالمی جنگ کے مابعد اثرات کو بھگت رہی تھی اور دوسری عالمی جنگ اپنی پوری شدت سے امن کو تباہ کرنے کے درپے تھی، ایسے میں یورپ میں اٹھنے والی تحریکیں، عوام پر پڑنے والے اثرات ہمیں ''گریز'' کے صفحات پر جابجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ یورپ کے ناول نگار ای۔ ایم فاسٹر A passage to India لکھ کر ہندوستان کی تہذیب کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ''گریز'' میں بھی ہندوستانی ناول نگار نے دو تہذیبوں مشرق اور مغرب کو ایک بڑے کینوس پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ''گریز'' میں مختلف کرداروں کو اس طرح کہانی میں لایا گیا ہے کہ یہ ناول بیک وقت کئی تہذیبوں کا عکاس بن جاتا ہے۔ عزیز احمد کا اپنا مطالعہ بے حد وسیع تھا، پھر اس پر اِن کا یورپ میں رہنے کا تجربہ یہ سب چیزیں مل کر انھیں ایک حقیقت نگار کے رُوپ میں سامنے لاتی ہیں۔ ان کے کردار ان کے ماحول کی پیداوار ہیں۔ اسی لیے وراثت اور ماحول کے سنگم سے ابھرنے والے یہ کردار فطرت نگاری کا بھی اعلا نمونہ بن کر سامنے آتے ہیں۔''(۱۲)

گریز ایک ایسے ہندوستانی نوجوان کی کہانی ہے جو آئی سی ایس کے لیے منتخب ہوتا ہے اور امتحان دینے کے سلسلے میں انگلستان اور یورپ کی سیر کرتا ہے۔ ناول میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک کا زمانہ دکھایا گیا ہے۔ ایک ہندوستانی آئی سی

ایس کی ذہنیت انگلستان جا کر کیا ہو جاتی ہے، زندگی کو وہ کس رنگ سے دیکھتا ہے اور اس کی زندگی میں عیش کوشی اور لذت پرستی، یورپ کے ماحول سے جس طرح داخل ہوتی ہے اس کی بہترین تصویر گریز میں پیش کی گئی ہے۔ یہ ایک شخص کی کہانی نہیں ایک تہذیب پر دوسری تہذیب کے اثرات کا نمونہ بھی ہے۔ مشرقی اور مغربی تہذیب کے فرق کے ساتھ، نوآبادیاتی اثرات بھی سامنے آتے ہیں۔ ''گریز'' زندگی سے گریز، زندگی کے تلخ حقائق سے گریز ہے۔ حد یہ کہ محبت اور عشق کی تلخیوں سے بھی ہیرو نعیم گریز کرتا ہے۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

> ''فاسٹر نے اپنے ناولوں اور تحریروں میں ''ذاتی تعلقات'' کا نظریہ پیش کیا ہے یعنی دو افراد خواہ وہ کتنی ہی مختلف اور مخالف قوموں یا نسلوں سے تعلق رکھتے ہوں اگر آپس میں ایک دوسرے سے اپنی دوستی برقرار رکھیں اور چاہے جو کچھ ہو جائے اس میں فرق نہ آنے دیں تو اس بدنصیب انسانیت اور اس مائل بہ فنا دنیا کے لیے امید باقی ہے۔ اسی نظریہ پر ''گریز'' کی بنیاد ہے۔ جہاں اس میں ہر ہر قدم پر زندگی سے گریز ہے، وہاں یہ اثباتی پہلو بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ نعیم اور ہروشا اور کرا کسلے کی دوستی اور جذباتی سطح پر نعیم کا بلقیس سے عشق جو آخر میں بے غرض ہو جاتا ہے، زندگی سے اس مسلسل گریز کا توڑ اور اس کا علاج ہیں۔'' (۱۳)

گریز کی کہانی ایک روزنامچے کی شکل میں شروع ہوتی ہے جس کا آغاز جون ۱۹۳۵ء سے ہوتا اور کہانی کا اختتام جولائی ۱۹۴۳ء میں ہوتا ہے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۳ء تک کے درمیانی عرصے کو اگر تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو ناول ایک عہد کی تاریخ بن کر ابھرتا ہے، جس میں ہندوستانی تہذیب اور مغربی تہذیب اپنی اپنی سطحوں پر شکست و ریخت کا شکار ہو رہی تھی۔

گریز میں دو تہذیبیں اپنے تاریخی اور سماجی تناظر میں اسی طرح سامنے آتی ہیں کہ ہر بات دوسری کے ساتھ لازم و ملزوم کے رشتے میں جڑ جاتی ہے۔ ہندوستان میں برطانوی سامراج نے ہندوستانی عوام کے ذہنوں میں نوآبادیاتی طرزِ فکر کی بنیاد ڈال دی، جس کا نمونہ ہمیں ''نعیم'' اور ''بلقیس'' کے کرداروں میں نظر آتا ہے۔ ''نعیم'' جب ہندوستان میں مقیم ہوتا ہے تو اس کے لیے زندگی صرف بلقیس کے گھر تک ہی محدود ہوتی ہے۔ خانم، بلقیس اور نعیم خود انگریزی رنگ میں رنگنے کے لیے ہمہ وقت تیار نظر آتے ہیں۔ نعیم کا آئی۔ سی۔ ایس آفیسر بن کر یورپ کا سفر کرنا گویا ناول کے کینوس کو ہندوستان سے یورپ تک پھیلا دیتا ہے۔

اسی غلامانہ ذہنی رویے کو ناول میں بار بار پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ کہانی کے ہیرو سے پروفیسر عزیز احمد اس بات کا اقرار بھی کرواتے ہیں کہ ہم ایک غلام ملک میں رہ رہے ہیں۔ صرف یورپ جانا اور وہاں جا کر نعیم کا تعلیم حاصل کرنا گویا

اپنے مقام ومرتبہ کو بلند کرنے کی ایک کاوش کے سوا کچھ نہیں۔

تیسرے باب میں "نعیم" یورپ جانے کے لیے بحری سفر اختیار کرتا ہے۔ بحری جہاز میں ایشیا، افریقہ اور یورپ کی تینوں تہذیبیں ایک ساتھ نظر آتی ہیں۔ سفر کے دوران ہندوستانی تہذیب کی رنگارنگی بھی نظر آتی ہے۔ جس کی نمائندگی کہیں تو اینگلو انڈین لڑکیاں کر رہی ہیں اور کہیں حیدر آباد دکن کی تہذیب افراد کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ عزیز احمد، ہندوستانی نوجوانوں میں لیڈر شپ کے متمنی ایک کردار کا بھی دلچسپ انداز میں ذکر کرتے ہیں۔ عبدالرحیم فاروقی کے کردار کا تجزیہ ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:

> "پھر عبداللہ المامون سہروردی، سر راس مسعود، حکیم اجمل خاں مرحوم کے متعلق انھوں نے عجیب و غریب خیالات کا اظہار فرمایا۔ پھر مشہور ومعروف ترکوں سے اپنی دوستی کے قصے سنائے۔ سب سے آخر میں مصطفیٰ کمال پاشا اور رومن رسم الخط کو گالیاں دیں اور رخصت ہوئے۔ میں نے اپنے دل میں کہا "خدا ہندوستانی مسلمانوں کو نیم خام اور ناکام لیڈروں سے محفوظ رکھے۔" (۱۴)

نعیم ناول کا مرکزی کردار ہے۔ یہ کردار بیسویں صدی کے تمام اہم رجحانات اور میلانات کا آئینہ دار ہے، نہ تو اس کے پاس اخلاقی قدروں کا واضح تصور ہے، نہ ہی مذہبی بندشوں کا لحاظ۔ وہ ایک تشکیک کی حالت میں ہے۔ اور دیکھا جائے تو یہ تشکیک نوآبادیات کی پیداوار ہے، جس نے پڑھے لکھے نوجوانوں میں مشرقی تہذیب پر مغربی تہذیب کی بالادستی کو قبول کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور وہ مذہب اور اپنی اقدار کو تشکیک کی نظر سے دیکھتے ہیں، مغرب کا عقلی رویہ ان کے لیے زیادہ قابلِ قبول ہے، جو اعتقادات پر ضرب لگاتا ہے۔ وہ سائنس اور نئے علوم اور نظریات سے پوری طرح واقف ہے، لیکن اس آگہی کی وجہ سے وہ زندگی سے غیر مطمئن ہے۔ کیونکہ گریز کا ہیرو ذہین ہے فرانسیسی ناول میں ذہین ہیرو کے مرکزی اور محوری بن جانے کے متعلق وکٹر ہنری برومبرٹ (Victor Henri Brombert) نے کہا ہے کہ اس کی وجہ سماجی، تاریخی اور تہذیبی عوامل کے ساتھ نظریاتی ادب کے اثر ونفوذ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (۱۵)

گریز میں بھی ذہین ہیرو کا مرکزی کردار بن جانا اصل میں سماجی، تاریخی اور تہذیبی عوامل کا نتیجہ ہے۔ ان عوامل کی وجہ سے ہندوستانی زندگی میں تبدیلیاں آئیں وہ نوآبادیاتی اثرات ہیں جنھوں نے غور وفکر کو مہمیز لگائی اور جدید تعلیم عام ہونے لگی۔ اس علم کی وجہ سے دنیا کے مختلف بڑے بڑے نظریات سے آگہی حاصل ہوئی۔ پھر جدید سائنسی ترقی کی وجہ سے نقل وحمل کے ذرائع آسان ہو جانے کی بناء پر علوم ونظریات تیزی سے جدید ذہنوں کو متاثر کرنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے ناولوں کے ہیرو جس قدر ذہین ہیں اور دنیا کے مختلف علوم اور نظریات سے آگاہ ہیں اس سے پہلے کے کسی دور کے ہیرو نہیں ہیں۔ اسی لیے گریز میں صرف نعیم کی زندگی کے ذہنی اور جذباتی انداز سے سامنے آجانے کی وجہ سے جہاں اس

دور کے ہندوستان اور عالمی مسائل اور نظریات سامنے آتے ہیں، وہاں دو تہذیبوں کا فرق اور نوآبادیاتی اثرات بھی سامنے آتے ہیں۔اس کے علاوہ اس کردار کی اضافت سے ناول کے ہر واقعے اور کردار کو پیش کیا گیا ہے۔اس ناول میں مختلف واقعات بڑے یقین آفرین طریقے سے پیش کئے گئے ہیں۔یہ یقین آفرینی اس لئے بھی پیدا ہوگئی ہے کہ ناول میں اکثر جگہ واحد متکلم کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

مغربی تہذیب کی چکا چوند جس طرح ہندستانیوں کو لبھاتی ہے وہ نوآبادیاتی اثرات کا لازمہ ہے، جب فاتح قوم کی تہذیب مفتوح قوم پر غالب آجاتی ہے تو ترقی کے خیال سے مفتوح قوم زمین سے آسمان کی طرف جانا چاہتی ہے،اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''گریز'' کا مرکزی کردار نعیم اپنے عہد کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نمائندگی کرتا ہے اور بیک وقت دو دنیاؤں میں زندگی بسر کر رہا ہے۔وہ اس صنوبر کی طرح ہے جس کے پاؤں زمین کے گہرے پاتال میں گڑے ہوئے ہیں لیکن جو بلند اور آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے کا آرزومند ہے۔اور جب وہ اپنی دھرتی سے قطع تعلق کر کے لندن چلا جاتا ہے تو دوبارہ دھرتی اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔اس ناول کی ہیروئین بلقیس اس ہندوستانی دھرتی کی علامت ہے۔چنانچہ جب وہ نعیم کی مراجعت کے بعد اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے تو اس ناول کا اساسی المیہ ابھرتا ہے اور نعیم کے دل میں زیاں کا احساس بیدار ہو جاتا ہے۔''گریز'' پیچیدہ ذہنی کیفیات کا ناول ہے اور ایک مخصوص اخلاقیات میں مصنف کے ایقان کو اجاگر کرتا ہے۔''(۱۶)

گریز ایک پختہ ناول ہے،اس بات پہ بہت سے نقاد متفق ہیں۔ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''اس دور کے اہم ترین ناول نگاروں میں عزیز احمد ممتاز مقام رکھتے ہیں۔۱۹۴۷ء تک ان کے جو اہم کارنامے سامنے آئے ہیں،ان میں ''ہوس''، ''مرمر اور خون'' ان کے ابتدائی ناول ہیں لیکن ''گریز'' اور ''آگ'' ایسے ناول ہیں جن میں ان کے فن کا شباب نظر آتا ہے۔یہ ناول ان کی فنی پختگی اور فن کارانہ چابک دستی کی روشن مثالیں ہیں،اس لیے شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔''(۱۷)

مغربی اور مشرقی تہذیب میں ایک فرق جنسی جذبات کے اظہار کا ہے۔مشرقی تہذیب میں اسے سات پردوں میں چھپا کے رکھا جاتا ہے، جب کہ مغربی تہذیب میں اس کا بے باکانہ اظہار معیوب نہیں سمجھا جاتا۔عزیز احمد ایک تو مغربی ناول نگاروں سے متاثر تھے۔جن کے ہاں اس کا استعمال جا بجا ملتا ہے۔عزیز احمد لکھتے ہیں:

''بہت سے نقادوں نے فوراً میرا سلسلہ ڈی۔ایچ۔لارنس سے ملا دیا۔میں نے لارنس کی سب کہانیاں پڑھی ہیں مگر ''لیڈی چیٹرلی کے عاشق'' کے سوا اس کا کوئی اور ناول اتفاق سے نہیں پڑھا۔جس زمانہ میں

میں پڑھ رہا تھا ڈی ایچ لارنس کا فیشن ختم ہو چکا تھا، آلڈس ہکسلے اور ای۔ام فاسٹر کی مقبولیت بہت بڑھ گئی تھی۔انگریزی ناول نگاروں میں میں انہی دو سے بہت متاثر ہوا ہوں اور اب بھی متاثر ہوں۔ہکسلے سے تکنیک کی حد تک۔اس کے علاوہ ہکسلے نے Novel of Ideas کے فن کو تھامس مان سے لے کر طنز کی چاشنی میں جس طرح ڈبویا ہے اسی کا مجھ پر سب سے زیادہ اثر ہے۔ہکسلے کے یہاں عریانی جتنی بھی ہے طنزیہ ہے۔بالکل اسی طرح جیسے لوئی اراگاں کے یا ژاں پال سارتر کے یا آرتھر کوئسلر کے یا الکسئی ٹالسٹائے کے (چپ کے ہوں یا راست کے عریانی سب کے یہاں بہت ہے) ناولوں میں عریانی طنزیہ ہے۔کیا کیا جائے فرائڈ نے نہ صرف انسانی جسم کے بلکہ انسانی روح تک کے کپڑے اتار لیے اور اسے برہنہ کر دیا۔انتہائی چپ کے مارکسی ناول نگار بھی جب متوسط طبقے کی زندگی بیان کرنے لگتے ہیں تو باوجود فتوائے تکفیر متوسط کے اس غسال سگمنڈ فرائیڈ سے اپنے تجزیے کا پہلو بچا نہیں سکتے اور پھر وہی طنزیہ عریانی۔ڈی۔ایچ لارنس کے ناولوں میں عریانی عبادت ہے۔ایسی عبادت بیماری بھی ہے۔یہ اور بات ہے کہ بالواسطہ ڈی ایچ لارنس کا اثر آلڈس ہکسلے پر ہوا ہے اور ہکسلے کے توسط سے اس بیماری کے جراثیم کچھ مجھ تک پہنچے ہوں۔فاسٹر کا اثر بادی النظر میں اتنی آسانی سے نظر نہیں آتا کیونکہ وہ زیادہ مہذب ہے۔اس لیے لباس پہنے ہے اور مشرقی ناظر کی نظر سب سے پہلے عریانی پر پڑتی ہے لیکن فاسٹر کا اثر مجھ پر بہت گہرا رہا ہے۔ایک تو یہ کہ یہ صرف کتابی نہیں یہ ذاتی بھی ہے اور یہ ایک طرح کا فلسفۂ حیات ہے۔''(۱۸)

اور دیکھا جائے تو یہ عریانی عزیز احمد کے مغربی مطالعے تک محدود نہیں بلکہ ان کے ناولوں کے کرداروں اور واقعات میں بھی سرایت کر گئی ہے، لیکن نقاد عام طور پر اسے تہذیبی حوالے سے نہیں دیکھتے۔بلکہ اعتراض کرتے ہیں کہ عزیز احمد جنسی جذبات میں بے باکانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔علی عباس حسینی نے ان کی ناول نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے ''ہوس اور مرمر اور خون کو یہی کہہ کر رد کر دیا کہ ''زمانہ طالب علمی کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جب اعصاب پر جنسی ہیجان غالب تھا۔''(۱۹)

اور ''گریز'' کی تعریف کرتے ہوئے اس پر بھی یہی اعتراض کیا ہے کہ:

''جنسیات کے بیان میں وہ نامناسب افراط سے کام لیتے ہیں۔''(۲۰)

علی عباس حسینی نے تو عزیز احمد کے فن کے مختلف روشن پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ اعتراض کیا ہے لیکن دوسرے نقاد تو عزیز احمد کے پاس سوائے جنس کے کوئی اور چیز دیکھتے ہی نہیں۔وقار عظیم کو بھی سوائے کے کوئی دوسری قابل ذکر بات گریز میں نظر ہی نہیں آئی، وہ لکھتے ہیں:

''ناول کے سیاسی اور معاشی پس منظر میں جنسی حقائق کا غلبہ ہے۔ جنھیں مصنف نے مزے لے لے کر بیان کیا اور اپنے قاری کو اس مزے میں پوری طرح شریک ہونے کی دعوت دی ہے۔ جنسی معاملات کے اس طرح غیر ضروری آزادی اور بے باکی سے بیان کرنے میں بظاہر فرائڈ کی نفسیات کا سہارا لیا گیا ہے۔ لیکن اس ناول میں یہ سہارا نفسیاتی یا فنی سہارا ہونے کی بجائے محض اس کا فریب معلوم ہوتا ہے۔'' (۲۱)

ڈاکٹر احسن فاروقی نے بھی عزیز احمد کی ناول نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے جگہ جگہ یہی اعتراض کیا ہے۔ وہ گریز کے ہیرو کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس کی خاص بیماری جنسی بھوک ہے۔ وہ اپنے خاندان کی ایک لڑکی بلقیس سے محبت کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اس لڑکی کی جوان ماں کے بدن میں بھی اپنے درجہ کے موافق دلچسپی لیتا ہے۔۔۔۔ مگر عزیز احمد تو اس رنگ پر مچل گئے اور باوجود تمام علمیت اور قابلیت یہ نہ سمجھے کہ یہ عریاں نگاری کیا تھی۔'' (۲۲)

اس طرح عزیز احمد کی ناول نگاری کو صرف جنس کی کسوٹی پر کس کر رد کر دینا صحیح نہیں ہے۔ معترضین نے یہ اعتراضات بیسویں صدی کی انقلابی تبدیلیوں اور باغیانہ رجحانات کو پیش نظر رکھ کر نہیں کئے تھے۔ بلکہ اسے صرف مشرقی تہذیب کے حوالے سے دیکھا تھا، اگر مشرقی تہذیب اور نوآبادیاتی اثرات کو پیش نظر رکھا جاتا اور دنیا کے بدلے ہوئے حالات پر نظر رکھی جاتی کہ کیسے سائنس نے مذہب اور قدیم اخلاقی اقدار کی بنیادیں ہلا دی تھیں، اور جدید نفسیاتی علم نے کیسے انسانی زندگی کی حقیقت شعارانہ عکاسی کے لیے جنسی کیفیات کے اظہار کو لازمی اور ضروری قرار دے دیا تھا، کیسے عریاں نگاری اور جنس سے دلچسپی جدید عالمی ادب کا امتیازی نشان بن گئی تھی۔ اگر ان سب عوامل کو مد نظر رکھا جاتا تھا، نقادوں کا رویہ گریز کے ساتھ ہمدردانہ ہوتا۔

گریز ۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۲ء تک کے زمانہ پر محیط ہے۔ اس کا ہیرو زندگی اور اس کی تلخ سچائیوں، عشق اور اس کی تلخ حقیقتوں سے گریز کرتا ہے۔ دراصل گریز زندگی ہی سے گریز ہے۔ لہٰذا نعیم سوچتا ہے:

''میں اس طرح کب تک گریز کرتا رہوں گا۔ کب تک یہ ذہنی اور جذباتی انتشار باقی رہے گا۔ کب تک میں زندگی سے گریز کرتا رہوں گا۔ کب تک میں زندگی سے بچ بچ کے خوابوں کی دنیا میں، عاشقی میں پناہ لیتا رہوں گا۔'' (۲۳)

اس ناول کا مرکزی کردار نعیم اپنے عہد کے اہم رجحانات اور میلانات کا نمائندہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عزیز احمد نے جس دور میں آنکھیں کھولیں مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی قدریں بتدریج فنا ہوتی جا رہی تھیں۔ نت نئی تبدیلیوں، تحریکوں اور رجحانوں نے انسانی ذہن کو حقیقت پسندی سے قریب کر دیا تھا۔ سائنس اور جدید نفسیاتی علوم نے جنس کی اہمیت اور ماہیت

کی وضاحت کردی تھی۔ جنسی نظریات اور کیفیات کا اظہار عالمی ادب میں معیوب نہیں تھا۔ بلکہ اس سے دلچسپی اتنی بڑھی کہ اس کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق اور تجرنے کئے جانے لگے۔ زندگی کی سچائیوں کو حقیقت پسندانہ طور پر پیش کیا جانا اس دور کے ناول نگاروں کی اہم ترین خصوصیت تھی۔ ظاہر ہے کہ جدید علوم وفنون، رجحانات ومیلانات اور افکار ونظریات نے ہندوستان کے لوگوں کو بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر کیا۔ سیاسی، تاریخی اور تہذیبی عوامل وعواقب کے نتیجے اور ردعمل میں مشرقی روایات سے انحراف وبغاوت جدید اور ذہین انسانوں کا مقدر بن گیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے قطعیت اور آگہی میں اضافہ کر دیا۔ ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں:

''نعیم جن داخلی کیفیات، ذہنی انتشار، اور نفسیاتی الجھنوں کے علاوہ جن خارجی حالات اور عوامل سے گذرتا ہے اس کی آئینہ سامانی بڑے ہی فنکارانہ طور پر کی گئی ہے۔'' (۴۳)

یہ حقیقت ہے کہ عزیز احمد نے ناول کے موضوعات کے انتخاب، واقعات کی پیش کش میں جس بے باک فنی شعور کا مظاہرہ کیا ہے اور ناول کی تکنیک کے سلسلے میں ایسے تجربات کئے جن سے اردو ناول نگاری واقف نہ تھی۔ انھوں نے شہری زندگی کی الجھنوں، جذباتی پیچیدگیوں، ذہنی کرب، مغربی اور مشرقی اقدار کے تصادم، ہندوستانی تہذیب کی شکست وریخت، اعلیٰ اور متوسط طبقے کی نفسیاتی کش مکش کو بڑی فنی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جنسی اظہارات اور بیانات کے سلسلے میں ناول کے کچھ معتبر اور مقتدر ناقدین کا خیال ہے کہ گریز میں عزیز احمد نے جنسی مسائل اور واقعات کو لذت آمیز بنا کر پیش کیا ہے، اس لیے اس کا نفسیاتی اور فنی پہلو دب گیا ہے۔

عزیز احمد پر عریاں نگاری اور فحش بیانی کا الزام لگایا گیا ہے، انھوں نے جہاں بھی جنسی مسائل اور جنسی پہلو پر بے باکی سے روشنی ڈالی ہے قارئین اس کے تلذذ میں خود کو شریک محسوس کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ماحول اور واقعہ کے پیش نظر کہیں کہیں فحش اور عریاں الفاظ کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے اس کے بغیر وہ کیفیت مکمل طور پر ابھر کر سامنے نہیں آسکتی جو ناول نگار کے ذہن میں ہے۔ ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں:

''جنس اور محبت کی باہمی وابستگی ایک مسلمہ حقیقت ہے اور جنسی اتصال محبت کی معراج۔ اس سے تعلقات میں استواری اور پختگی آتی ہے۔۔۔عزیز احمد نے سگمنڈ فرائیڈ کے نظریات جنسی اور نفسیاتی نقطہ نظر کی روشنی میں اپنے ناولوں کی معنوی اور ذہنی فضا کی تشکیل کی ہے۔ یہ موضوع اس وقت بالکل نیا تھا اس لیے فطری طور پر ان ناولوں نے ہنگامے پیدا کیے۔ ترقی پسند تحریک کے نتیجہ میں نئے نئے تجربات کئے جا رہے تھے اور روایتی قدروں سے ہٹ کر چلنے اور نئی راہ نکالنے کی کوششیں جاری تھیں۔ لیکن جنسی میلانات ومطالبات کے ساتھ ساتھ عزیز احمد نے معاشرتی مسائل وحالات کو بھی نظر

انداز نہیں کیا اور زندگی کے رنگارنگ اور متنوع پہلوؤں کی ترجمانی بھی کی۔۔۔۔چونکہ عہد جدید میں محبت کے فرسودہ اور روایتی نظریے اور اقدار میں تبدیلی آ گئی۔لہٰذا عزیز احمد نے ''گریز'' میں محبت کے مختلف نظریوں، جہتوں اور نوعیتوں کو پیش کیا ہے۔نعیم کی بلقیس، ایلس، میری پاول اور برتھا سے جذباتی وابستگی کی نوعیت مختلف ہے۔اس نے جنسی، افلاطونی، اور دوستانہ نوعیت کی محبت کیں۔''(۲۵)

ابتدا میں ایلس، سے اس کی قربت صرف جنسی نوعیت کی رہتی ہے لیکن بتدریج یہ جنسی قربت سچی محبت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

''۔۔۔اس کا دل نرم ہونے لگا۔یہ ایسی نرمی تھی جو اس نے اب تک کسی عورت کے لیے محسوس نہیں کی تھی وہ ایلس کے لیے محسوس کرنے لگا۔اسے بات بات کا خیال رہنے لگا۔اگر رات زیادہ آ گئی ہے اور دونوں کھلی سڑکوں پر ہیں تو اس کا خیال ہوتا کہ کہیں ایلس کو سردی نہ لگ جائے۔جس دن اس کی طبیعت کسلمند ہوتی نعیم اس سے زیادہ پست ہو جاتا۔''(۲۶)

پہلی جنگ عظیم کے بعد کی نسل کتنی حساس ہو گئی۔اس کے ذہنی انتشار، روحانی کرب، خوف مرگ، جذباتی نا آسودگی، جنسی ہیجان، اور نفسی کیفیت کی عکاسی عزیز احمد نے اتنی فن کاری سے کی ہے کہ اس عہد کی روشن تصویریں نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔مذہب، اخلاق، تہذیب، نظریہ اور اعتقاد کی ساری قدریں ٹوٹ پھوٹ گئیں اور لوگوں کا اعتماد و ایمان متزلزل ہو گیا۔جنگ کے بعد کی غیر یقینی صورت حال، نظریاتی بے سمتی، ذہنی ہیجان اور اضطراری کیفیت ملاحظہ ہو۔اور زندگی جس نا آسودگی، غیر محفوظیت اور انتشار سے دوچار ہے اس کا اظہار نعیم کے کردار میں ہو جاتا ہے۔حالات سے فرار کی شعوری کوشش کا احساس نعیم کو بھی ہے:

''کب تک میں زندگی سے بچ بچ کے خوابوں کی دنیا میں، عاشقی میں پناہ لیتا رہوں گا اور عاشقی میں خالص عاشقی جس میں کوئی ذہنی اطمینان نہیں۔''(۲۷)

ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں:

''عزیز احمد چونکہ جنسی اور ذہنی طور پر مریض نہیں ہیں اس لیے ان کے یہاں عریانی تو ہے لیکن فحش نگاری نہیں۔ان پر فحش بیانی کا الزام لگا کر ان کے ناولوں کی اہمیت سے انکار کرنا اپنی تنگ نظری اور رجعت پسندی کا ثبوت پیش کرنا ہے۔اس لیے کہ داخلی جذبات و احساسات اور اندرونی کیفیات و واردات کو فنکارانہ انداز میں پیش کرنا سب کے بس کی بات بھی نہیں۔''(۲۸)

گریز میں روایتی ناولوں کی طرح باضابطہ پلاٹ اور قصہ ملتا ہے، لیکن اس کا اسلوب جدید اور منفرد ہے۔اس لحاظ سے عزیز احمد ڈی۔ایچ۔لارنس سے قریب ہیں مگر عزیز احمد اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے کہ وہ ڈی۔ایچ۔لارنس سے

براہ راست متاثر ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے لارنس کی ساری کہانیاں پڑھی ہیں لیکن ناولوں میں صرف 'لیڈی چیٹر لی کے عاشق' کو پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔عزیز احمد اعتراف کرتے ہیں کہ وہ لارنس سے زیادہ ہکسلے اور فارسٹر سے بے حد متاثر ہیں۔ہکسلے کے علاوہ لوئی ارکان، ژاں پال سارتر، آرتھر کوئسلر، الکسی ٹالسٹائے سبھوں کے یہاں عریانی طنزیہ ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر اسلم آزاد کا کہنا ہے:

''عزیز احمد نے سب سے زیادہ اثر فارسٹر سے قبول کیا ہے۔صرف کتابی نہیں بلکہ ذاتی طور پر بھی فارسٹر نے اپنی تحریروں میں ذاتی تعلقات کو بطور فلسفۂ حیات پیش کیا ہے۔کسی ملک، علاقہ، قوم یا نسل کے دو افراد اگر باہمی دوستی اور یگانگت کو راہ دیں تو یہ اس مادی اور مائل بہ انحطاط دنیا کے لیے امید کی ایک کرن ہے۔عزیز احمد نے اس فلسفۂ حیات کی بنیاد پر ''گریز'' لکھی ہے۔''گریز'' میں یوں تو ہر قدم پر زندگی سے گریز کا احساس ملتا ہے۔لیکن اس میں زندگی کے اثباتی پہلو کو بھی روشن کیا گیا ہے۔نعیم، ہروشا، کراسکے، اور بلقیس کے کردار یگانگت اور باہمی تعلقات اس گریز کا مداوا ہیں۔''(۲۹)

قیامِ یورپ کے دوران میں نعیم کی زِندگی کے واقعات اور اُس کی سرگرمیوں کے ذریعے سے عزیز احمد نے نہ صرف اپنے نظریات کی عکاسی کی ہے بلکہ نہایت کامیابی سے یورپ کے تہذیبی و سیاسی ماحول اور یورپی اذہان پر روشنی ڈالی ہے، جس کے لیے خود اُن کے اپنے قیامِ یورپ کے تجربات و مشاہدات کام میں آئے۔اُنہوں نے فنکارانہ انداز میں اپنے تجربات اور مُشاہدات کو ناول کا حصہ بنا کر یورپی زِندگی کی عکاسی کی ہے۔نعیم ہندوستانی ہے لیکن یورپ میں یورپی دوست احباب کا حلقہ میسر آجانے سے وہاں کی سماجی و تہذیبی زِندگی کو قریب سے دیکھنے اور جاننے میں کامیاب ہوتا ہے۔''گریز'' کے حوالے سے سیّد وقار عظیم رقم طراز ہیں:

''گریز یورپ اور انگلستان کی زندگی کے ایک پُرشورش زمانہ کا ناول ہے اور اسے پڑھ کر اس سیاسی اور معاشی فضا کا ایک منتشر سا خاکہ ہمارے سامنے آتا ہے جو یورپ کے اثرات نے ساری دنیا میں عام کر دی۔اس ناول میں جنسی حقائق کے بیان میں بھی نسبتاً زیادہ آزادی ہے اور اس آزادی کے پیچھے فرائڈ کے اس نفسیات کا سہارا ہے جو ناول کے فن میں اب رفتہ رفتہ معمولی سی چیز بنتی جارہی ہے۔''(۳۰)

عزیز احمد نے گریز میں دُوسری جنگِ عظیم سے کچھ قبل کا زمانہ دِکھایا ہے۔یورپ جنگ کے دہانے پر کھڑا تھا اور اِقتصادی مسائل کی لپیٹ میں تھا۔پہلی جنگِ عظیم اپنے پیچھے بھیانک سیاسی، سماجی اور اِقتصادی مسائل چھوڑ کر ختم ہوئی تو نہ صرف سیاسی و اِجتماعی سطح پر نظامِ زِندگی کو تہہ و بالا کیا بلکہ اِنفرادی سطح پر بھی اِنسان گُوناگُوں مسائل سے دوچار ہوا، ایسے مسائل جن کا حل اُس کی بساط سے باہر تھا۔یورپی نوجوانوں کے سامنے مُستقبل کے غیر یقینی ہونے اور زِندگی کی اقدار سے

متعلق ان گنت سوالات کھڑے ہو گئے۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے اُن کے اذہان اور طرزِ زندگی کو بے پناہ مُتاثر کیا۔ جنگِ عظیم دوم سے قبل کا یورپ بے شُمار مسائل سے دوچار تھا جن میں ۱۹۳۰ء کی عالمی کساد بازاری کے اثرات، دنیا بھر میں اِشتراکیت و اِشتمالیت کا بڑھتا ہوا اثر ونفوذ، سیاسی اُتار چڑھاؤ اور معاشی عدم توازن شامل تھے۔ جنگ چھڑی تو غُربت، بھوک اور بے روزگاری کا نیا سلسلہ شروع ہوا۔ یورپی نوجوان اِن مسائل کی گھمبیرتا کے زیرِ اثر طرح طرح کے مسائل سے نبرد آزما تھے۔ بڑی تعداد میں مردوں کے محاذِ جنگ پر چلے جانے سے عورتوں کی ذِمے داریوں میں پہلے سے کہیں زیادہ اِضافہ ہوا، اور جنگ میں حصہ لینے والوں کے موت کا شکار ہو جانے یا اپاہج ہونے کی بنا پر آبادی میں مردوں اور عورتوں کے تناسب میں پیدا ہونے والے عدم توازن نے صورتِ حال کو مزید خوف ناک بنا ڈالا۔ جنگ نے اخلاقی قدروں کو روند ڈالا اور بے راہروی کے کئی جواز پیدا کر دیے۔ یورپی عورت کو زِندگی کے کئی محاذوں پر تنہا لڑنا پڑ رہا تھا، یہ محاذ معاشی بھی تھے اور جذباتی بھی۔ اُسے گُزر بسر کے لیے کمانا بھی تھا اور موزوں جیون ساتھی بھی تلاش کرنا تھا۔ تاہم عملی صُورتِ حال یہ تھی کہ شوہر کے اِنتخاب کا حق رکھتے ہوئے بھی وہ اپنے اِس حق کا اِستعمال کرنے سے قاصر تھی، جس کی بڑی اور اہم ترین وجہ مردوں کی کم ہو جانے والی تعداد تھی۔ اُس زمانے میں ایک مرد سیر وتفریح کے لیے بیک وقت کئی عورتوں کے ہمراہ گھومتا پھرتا نظر آتا جسے غیر معمولی نہ سمجھا جاتا۔ عملاً عورت سے اِنتخاب کا حق چھن چکا تھا اور وہ بے راہروی پر مجبور تھی۔ یہ دور ہر اعتبار سے پُر آشوب تھا اور عزیز احمد نے اِس کی تصویر کشی بڑی تفصیل سے کی ہے۔ وہ یورپی تہذیب و مُعاشرت کی آنکھوں دیکھی تفصیلات کو گُریز کا حصہ بناتے ہیں۔ نعیم کے شب وروز کی سرگزشت یورپی تہذیب کے کئی پہلوؤں کو آشکار کرتی ہے۔ نعیم کے حلقۂ احباب میں یورپی اور امریکی نوجوان لڑکے لڑکیاں شامل ہیں۔ وہ اُن کی مجلسوں میں فکری بحث ومباحثوں میں حصہ لیتا بھی دِکھائی دیتا ہے اور رقص وسُرود سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ تاہم اُس پر یورپی تہذیب کے منفی اثرات زیادہ شدّت سے مُرتّب ہوتے ہیں اور وہ مے نوشی، مخلوط محفلوں، رقص گاہوں، آزادانہ جسمانی تعلقات اور قحبہ گاہوں میں آمد و رفت سے اِن اثرات کا اِظہار کرتا دِکھائی دیتا ہے۔ یہاں یہ ذِکر بے جا نہ ہوگا کہ نعیم کی فطرت میں اِس ماحول کے لیے پہلے ہی سے قبولیت موجود تھی۔ حیدر آباد دکن میں اُس کی زندگی کی جو جھلک ناول کے اِبتدائی حصے میں نظر آتی ہے وہ اِس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ وہ بلقیس کی طرف مائل تھا اور دونوں کی شادی کے واضح اِمکانات بھی موجود تھے اس کے باوجود وہ بلقیس کی ماں خانم کو جس نگاہ سے دیکھتا ہے اُس سے نعیم کی اخلاقی حالت اور میلانات پر کئی سوال جنم لیتے ہیں:

> ''خانم دالان میں تخت ہی پر لیٹے لیٹے اونگھ رہی تھیں اور بے خیالی میں ان کے پیر گھٹنوں تک کھلے ہوئے تھے۔ نعیم ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا پڑھ رہا تھا۔ اس کی نظر خانم کے پیروں پر پڑی۔ پھر خانم کے چہرے پر

جو نینڈ میں اور بھی بھلا معلوم ہوتا تھا اور اس کے ذہن میں برنرڈ شا کے ان ڈراموں کا خیال آیا جن میں کم عمر نوجوان تیس سالہ عورتوں کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں۔'' (۳۱)

نعیم کا یہ اندازِ نظر اخلاقی بے راہروی اور سوچ کی کجی پر دلالت کرتا ہے۔ بلقیس کم عمر ہے، خوب صُورت ہے، نعیم کو پسند بھی ہے لیکن وہ اُس سے شادی سے گُریز کرتا ہے جبکہ یورپ میں قیام کے دوران میں بھی بلقیس اُس کے خوابوں اور خیالوں پر چھائی رہتی ہے۔ دراصل نعیم کا فلسفۂ محبت بجائے خود قابلِ اعتراض ہے اور اس پر کئی سوالات جنم لیتے ہیں۔ وہ اُس جذبۂ لطیف سے عاری دِکھائی دیتا ہے جسے عشق یا محبت کا نام دِیا جاتا ہے اور بلقیس، ایلس، میری پاول، مارگریٹ، برتھا اور دیگر بے شمار لڑکیاں محض اس لیے اُس کی توجہ حاصل کر لیتی ہیں کہ وہ بآسانی اُن کا اِستحصال کر سکتا ہے۔ حالات موافق ہونے کے باجود وہ بلقیس سے کسی قانونی اور پائیدار بندھن میں بندھنا پسند نہیں کرتا۔ امریکی لڑکی ایلس فرانسیسی زبان کی کلاس میں نعیم کی ہم سبق تھی جس سے وہ بعد ازاں منگنی بھی کرتا ہے، اِبتداً اُس کے بارے میں جو سوچ رکھتا ہے وہ ناول نگار کے اِس جملے سے عیاں ہے:

''نعیم اس زمانے میں اُس کا باقاعدہ ''تعاقب'' کر رہا تھا اور کامیابی کی اچھی خاصی امید بندھ چکی تھی۔'' (۳۲)

یہاں ''کامیابی'' سے مُراد ایلس کا جسمانی قُرب حاصل کرنا تھا جس کے لیے نعیم مسلسل کوشاں رہتا ہے اور ناکامی کی صورت میں قحبہ خانوں کے چکر لگانے سے بھی گُریز نہیں کرتا۔

ناول میں ایلس اخلاقی اعتبار سے نعیم سے برتر دِکھائی دیتی ہے۔ آزاد مغربی ماحول کی پروردہ ہونے کے باوجود وہ کچھ اخلاقی حدود و قیود کی پابند نظر آتی ہے۔ وہ بیک وقت کئی لڑکوں کے بجائے ایک ہی لڑکے سے دوستی کی قائل ہے اور اِس دوستی میں بھی کچھ پابندیوں کو بہر طور ملحوظ رکھتی ہے۔ مغربی اقدار کے پس منظر میں اُس کا تصوّرِ پارسائی بھی اُسے بلند تر سطح پر کھڑا دِکھاتا ہے۔ ایلس مغربی مُعاشرے سے تعلق رکھنے کے باوصف اپنے کردار کی جس سطح پر نگران دِکھائی گئی ہے اس سے تقابل پر نعیم کا کردار بے حد پست دکھائی دیتا ہے، جو اپنے دائرۂ شناسائی میں آنے والی ہر لڑکی کو ایک ایسی مہم تصوّر کرتا ہے جسے سر کرنا ہی اُس کا اوّلین و آخرین مقصد ہے۔ وہ جذبۂ محبت کے کسی اعلیٰ وارفع تصوّر کا قائل دِکھائی نہیں دیتا، صرف وقتی اغراض کا قیدی ہے اور اُس کے جذبات کسی گہرائی یا پائیداری سے عاری محض سطحی نظر آتے ہیں۔

گُریز میں نعیم اپنے یورپی دوستوں اور ساتھیوں سے اخلاقی اعتبار سے کسی طور الگ اور ممتاز نظر نہیں آتا اور مغربیت کا رنگ پوری طرح سے اُس پر چڑھ چکا ہے۔ وہ وفا اور محبت کے مشرقی تصوّر سے بے بہرہ ہے اور رُوح کے بجائے

جسم کو حقیقت سمجھتا ہے اور اِسی کا متلاشی ہے۔ اُس کا بنیادی فلسفہ ''تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی'' پر مبنی ہے جس کا عملی ثبوت وہ بار بار فراہم کرتا ہے۔ ایک شام تفریح سے واپسی پر ایلیس اُس کے اصرار کے باوجود نہیں رُکتی اور بورڈنگ ہاؤس واپس چلی جاتی ہے جس پر نعیم احساسِ تنہائی لیے اپنے کمرے کو لوٹ آتا ہے۔ اُس کے محسوسات اور ردِعمل کی تصویر کشی ناول نگار نے اِن الفاظ میں کی ہے:

''اُس رات اُس نے اپنی زندگی میں خلا محسوس کیا۔ خلا اور بڑی ہی سخت تنہائی۔ ایسی تنہائی جو کبھی کبھی برسات کی راتوں میں حیدرآباد میں محسوس کیا کرتا تھا۔ یہاں تنہائی کی شدت زیادہ تھی۔ پیرس کے جگمگاتے ہوئے انسانی جنگل میں وہ اکیلا تھا۔ اکیلا اور بالکل اکیلا۔ اگر ایلیس آجاتی تو اُس کا کیا بگڑ جاتا۔''(۳۳)

نعیم کی اِس سوچ کا اِنتہائی سطحی نتیجہ نکلتا ہے، وہ اپنے کمرے سے باہر نکلتا ہے اور اپنی تنہائی کا مداوا کرنے کے لیے ایک بار پھر پیرس کے اُنہی قحبہ خانوں کا رُخ کرتا ہے جہاں وہ وقتاً فوقتاً جایا کرتا ہے۔ اِس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لیے غیر معمولی سوچ بچار کی ضرورت نہیں کہ نعیم ایلیس سے اپنے تعلق کو کس نظر سے دیکھتا اور کیا مقام دیتا ہے۔ اُس کے کردار کا یہ پہلو اِس صُورت میں معنی خیز بن جاتا ہے کہ وہ مشرق کا باشندہ ہوتے ہوئے بھی رُوحانی اقدار سے کوسوں دُور نظر آتا ہے اور عملاً مغربی تہذیب کی نمائندگی کے درجے پر فائز نظر آتا ہے۔ وہ مشرقی رسوم وقیود کی پابندی کے بجائے محض فطرت کی پابندی پر عمل پیرا ہے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ مشرقیت اور مغربیت کا تعلق جُغرافیائی حدود سے ہے یا فکر وعمل اور ذہنی سانچوں سے؟ اِس سوال کا جواب نعیم کی صُورت میں خاصا واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔

گـریـز میں نعیم کے علاوہ چند دِیگر ہندوستانی مرد بھی ضمنی کرداروں کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔ یہ کردار بھی نعیم سے چنداں مختلف نہیں۔ یورپ میں قیام کے دوران میں وہ سرتاپا مغربی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لباس، زبان، مشروبات و ماکولات، رہن سہن، ڈانس پارٹیاں اور دیگر مشاغل ہی نہیں، صنفِ مخالف سے آزادانہ میل جول اور مراسم میں وہ یورپیوں کی نہ صرف مکمل تقلید کرتے ہیں بلکہ بعض معاملات میں اُن سے کہیں آگے دِکھائی دیتے ہیں۔ نعیم کے علاوہ راجہ ہمت نواز، قاضی ہاشم اور غازی الدین وغیرہ بھی اِسی روش کی پیروی کرتے ہیں۔ پارٹی میں موجود سویڈش لڑکی برتھا اُن سب کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ دُوسروں کی طرح نعیم بھی اُس کی توجہ کا طلب گار تھا تاہم برتھا کے بارے میں اُس کی سوچیں بے یقینی کا شکار تھیں:

''اُسے یقین نہیں تھا کہ برتھا کی نیلی آنکھیں اُس کی طرف مائل تھیں یا راجہ ہمت نواز کی طرف یا قاضی کی طرف یا تینوں کی طرف۔ تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا۔''(۳۴)

ستم ظریفی کی اِنتہا تو یہ ہے کہ برتھا کے بارے میں نعیم کے خیالات دراصل خود نعیم پر بخوبی صادق آتے ہیں اور

بڑی آسانی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نعیم کا دِل بلقیس پہ مائل تھا، گُلِ سرخ میری پاول پہ، ایلس پہ یا کسی بھی ایسی عورت پہ جس سے نعیم کا زِندگی میں کبھی واسطہ پڑا ہو۔ لیکن اپنے ہرجائی پن کے باوجود وہ پہلے ایلس اور پھر برتھا کے کردار کی جانب سے مشکوک ہوتا ہے تو اُس کی تنگ نظری کُھل کر سامنے آجاتی ہے۔ وہ دوہرے معاییر کا مُظاہرہ کرتے ہوئے لمحہ بھر کو بھی نہیں سوچتا کہ اپنے روابط اور وابستگیوں کے معاملے میں اُس کی اپنی اخلاقی پستی کس اِنتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

کردار کے لحاظ سے نعیم اُسی مخصوص مغربی تہذیب کا نمائندہ ہے جس میں کسی ایک سے وفاداری کا تصوّر موجود نہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ مغرب نے اپنی تمدُّنی اور تہذیبی رِوایات میں جس آزادہ روی کو اپنایا ہوا ہے، مشرقی تہذیب کا پروردہ نعیم اور دِیگر ہندوستانی مرد کردار جو یورپ میں محض اپنی ایک جھلک دِکھا کر غائب ہو جاتے ہیں اُن سب پر مغربیت کا یہی رنگ طاری ہے۔ وہ مغربی طرزِ زِندگی کو اِس کے منفی پہلوؤں سمیت اِختیار کیے ہوئے ہیں، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ محض منفی پہلو ہی اپناتے نظر آتے ہیں، شراب، شباب، رقص اور دِیگر قبائح میں ملوّث ہوتے ہوئے وہ ذرا دیر نہیں لگاتے تاہم تہذیبِ مغرب کے مثبت پہلو اُن کے مزاج کا حصہ نہیں بن پاتے یا خلافِ مزاج ہونے کے باعث وہ انہیں بآسانی جذب کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

یورپ میں نعیم کا حلقۂ احباب جدید فکر رکھنے والے، روشن خیال نوجوانوں پر مُشتمل ہے۔ جیمز کرا کسلے، مارگرٹ کرا کسلے، میری پاول معروف بہ گُلِ سرخ، ایلس کلاڈل اور زیدنک ہروشا پر مُشتمل اِس گروہ کے لوگ ہر طرح کے تعصّبات سے بالاتر ہو کر نعیم کے دوست ہیں۔ وہ مختلف فکری و عملی محاذوں پر جد و جہد میں مصروف ہیں اور اُس دور کے مقبول اِشتمالی و اِشتراکی نظریات کے علم بردار ہیں۔ وقتاً فوقتاً ہونے والی فکری بحثوں میں اُن کے نظریات کُھل کر سامنے آتے ہیں۔ اِن میں سے اکثر لوگ اشرافیہ سے تعلّق رکھتے ہیں تاہم طبقاتی و نسلی تعصّبات سے پاک ہیں اور نعیم کو اُس کے رنگ یا نسل کی بُنیاد پر کسی اِمتیاز کا نشانہ نہیں بناتے۔ نعیم کے یورپی دوست روشن خیالی اور اِنسان دوستی کا عملی ثبوت دیتے نظر آتے ہیں۔ تاہم قیامِ یورپ کے دوران میں نعیم کو رِوایتی یورپی اذہان کی مخصوص تنگ نظری، تعصّب پر مبنی رویے بالخصوص نسلی اِمتیاز کا تلخ تجربہ بھی بار بار ہوتا ہے۔ نعیم کا المیہ یہ ہے کہ وہ سفید فام نہیں، رنگ دار نسل سے تعلق رکھتا ہے اور اس پر مُستزاد یہ کہ ایک غُلام ملک کا باشندہ ہے۔ رنگ دار نسل سے واسطہ پڑنے پر روشن خیالی کی علم بردار مغربی تہذیب رنگ و نسل کے غرور میں اِنسان دوستی کے نعرے کو فراموش کر جاتی ہے اور اُس کا دائرہ سمٹ کر سفید فام نسل تک محدود رہ جاتا ہے۔ نسلی اِمتیاز کی لکیر کھینچ کر وہ خود کو نہ صرف نسلی بلکہ تہذیبی اعتبار سے بھی برتر سمجھنے لگتی ہے۔ 'سفید آدمی کا بوجھ' The White Man's Burden وہ خود ساختہ اُصول یا نظریہ ہے، جس کی بنا پر 'غیر مُہذب' اقوام کو تہذیب سکھانے کا بار سفید نسل نے اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا ہے اور مُہذب

صرف وہی کہلا سکتا ہے جو مغربی تہذیب کے طے کردہ معاییر اور پیمانوں پر پُورا اُترے۔ کھانے پینے، اوڑھنے پہننے، سونے جاگنے، ملنے جُلنے وغیرہ کے مغربی آداب سے کماحقہٗ واقف اور ان پر عمل پیرا بھی ہو۔ نعیم کو بحری جہاز کے سفر ہی میں کھانے پینے کے دوران میں اِس کا بخوبی تجربہ ہو جاتا ہے۔ ذائقے ہی نہیں آدابِ طعام بھی یکسر مختلف اور پیچیدہ، جن سے عدم واقفیت غیر مُہذب ہونے کا ثبوت بن جاتی ہے جبکہ نعیم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور آئی۔ سی۔ ایس کا اُمیدوار ہے۔ یورپ میں نعیم کو ایسے افراد سے بھی واسطہ پڑتا ہے جو ہندوستانیوں یا کسی بھی رُنگ دار نسل کے فرد سے برابری کی سطح پر بات نہیں کر سکتے۔ کرنل ریمزے اور مسز کرا کسلے انہی افراد کی نمائندگی کرتے دِکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی نظروں میں رنگ دار افراد نسلی اعتبار سے کم تر درجے کے اِنسان ہیں اور بالخصوص برطانوی نو آبادیات کے باشندے غُلام ہونے کے باعث کسی طور انگریزوں کے ہم پلہ قرار نہیں دیے جاسکتے۔ تہذیب و تمدُّن پر بزعمِ خود سفید نسل کی اجارہ داری ہے جس پر رنگ دار قوموں کو مہذب بنانے کی ذِمے داری آن پڑی ہے اور وہ بادلِ نخواستہ اپنی اِس خود ساختہ ذِمے داری کو نبھانے پر مجبور ہے۔ یہ نسل پرست، مُتعصّب افراد اس احساسِ برتری کو جو سفید رنگت نے اُنہیں عطا کیا ہے، اپنی اگلی نسلوں کو ایک وراثت کے طور پر منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ مارگرٹ کرا کسلے نعیم کے اِس اِستفسار پر کہ کیا اپنی والدہ کی طرح وہ بھی رنگ دار لوگوں سے نفرت کرتی ہے، تسلیم کرتی ہے کہ اُس کی والدہ نے یہ نفرت اُس میں منتقل کرنے کی کوشش کی، تاہم مارگرٹ اپنے بھائی جیمز کرا کسلے کے نقشِ قدم پر چلنا پسند کرتی ہے جو اِنسان دوستی کا حقیقی علم بردار ہے۔ اُس کے بقول جیمز فطرتاً اِنسان دوست ہے، جبکہ خود اُس کی اپنی اِنسان دوستی اِکتسابی ہے۔ مسز کرا کسلے ظاہراً نعیم سے اچھا سلوک کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن اپنے تعصّب پر پوری طرح قابو پانا اُن کے لیے ممکن نہیں۔ اِس تعصبّ کے مُظاہرے اُس وقت بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جب وہ باہر نکلتا ہے اور عام، اجنبی لوگوں سے اُس کا واسطہ پڑتا ہے:

''انگلستان کی زیادہ عمر کی عورتیں اُسے ناپاک رنگ والا، دیسی، مقبوضات کا باشندہ اور معلوم نہیں کیا کچھ سمجھ کے گھورتیں۔ یا شاید محض اجنبی سمجھ کے۔ کیونکہ انگلستان میں اجنبی ہونا بھی گناہ تھا۔'' (۳۵)

اِس ساری صورتِ حال میں ایسے معاندانہ رویے کا شکار ہو کر نعیم ذہنی کش مکش کا شکار ہو جاتا ہے اور ردِ عمل میں اُس کے اندر کمتری کا احساس جنم لیتا ہے۔ اُسے اپنی سیاسی غُلامی اور رنگ دار نسل سے تعلق رکھنے پر جس تعصّب اور تکبّرانہ رویے کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ یورپی تہذیب کے دوہرے معیار کی واضح دلیل ہے۔ منگنی ہو جانے پر بھی ایلس سے اُس کی شادی نہیں ہو پاتی جس کا بُنیادی سبب اُس کا ہندوستانی ہونا تھا۔ ایلس کے والد نعیم سے اپنی لڑکی کی شادی پر رضامند نہیں ہو پاتے اور یہ رِشتہ محض اِس لیے ختم ہو جاتا ہے کہ نعیم رنگ دار نسل کا غُلام فرد تھا جسے ایک آزاد، سفید فام لڑکی سے شادی کا کوئی حق نہ تھا۔ اور بظاہر اِس مُعاملے پر ایک بھی لفظ منہ سے نکالے بغیر وہ اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ پسِ پردہ وہی

تعصّب، احساسِ برتری اور نسلی تفاخر کارفرما تھا جو سفید فام اقوام رنگ دار نسلوں سے روا رکھتی ہیں۔

عزیز احمد کے ناول گُریز میں جو نسوانی کردار نظر آتے ہیں وہ زیادہ تر مغربی عورتیں ہیں اور اپنی تہذیب کی نُمائندگی بخوبی کرتی ہیں۔ وہ آزاد ماحول اور مُعاشرت کی پروردہ ہیں اور اُن کے اخلاقی معاییر مشرق سے مُختلف ہیں۔ وہ اپنے ملنے جلنے والے لڑکوں سے میل جول کو کسی سے چھپانے کی کوشش نہیں کرتیں کہ یہ رویہ اُن کی تہذیب میں قابلِ قبول ہے تاہم ایلس نے اپنے لیے ایک حد مقرر کی ہوئی ہے جس کی پابندی کرنے کی وہ بھرپور کوشش کرتی ہے۔ مجموعی طور پر عزیز احمد جدید خیالات کے زیرِ اثر آزاد اور بے راہروی پہ مائل کردار پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عقیلہ بشیر نے اِس سلسلے میں لکھا ہے:

> ''عزیز احمد کے ہاں عورت ایک ذی ہوش انسان ہے۔ معاشرہ اگرچہ اس کا استحصال کر رہا ہے لیکن عورت کی روح کی بالیدگی تر و تازہ ہے۔ عزیز احمد جدید خیالات کے تحت عورت کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی آزادی میں جنسی آزادی بھی شامل ہے۔ جس کے تحت عزیز احمد کے ہاں عورت کے کرداروں کی پیش کش میں شدت پسندی پائی جاتی ہے۔ وہ عورت کو مرد کے دوبدو پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں اہمیت صرف جنس کو حاصل ہے اور وہ کوئی اعلیٰ نظریۂ حیات دینے میں ناکام رہے ہیں۔'' (۳۶)

اِس رائے سے کُلّی طور پر اِتفاق کرنا مشکل ہے کیونکہ عزیز احمد کے نسوانی کردار ذی ہوش ہونے کا مُظاہرہ کم ہی کرتے دِکھائی دیتے ہیں اور بیشتر اپنی جبلّتوں کے اِظہار اور فطرت کی آواز سننے تک ہی محدود نظر آتے ہیں اور جیسا کہ آگے چل کر ڈاکٹر عقیلہ بشیر نے خود بھی لکھا ہے کہ عزیز احمد کے ہاں آزادی سے مراد جنسی آزادی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے ناولوں میں مشرقی کردار ہوں یا مغربی اُن کی آزادی کا تصوّر اِسی مخصوص دائرے میں گردش کرتا دِکھائی دیتا ہے۔ وہ مغربی تہذیب کے اِس پہلو سے بے حد مُتاثر ہیں اور اپنی تخلیقات میں بار بار پیش کرتے ہیں۔ اُن کے ناول شبنم میں مرکزی نسوانی کردار شبنم ایک آزاد خیال، تعلیم یافتہ اور خودمُختار لڑکی کے روپ میں سامنے آتی ہے جو ادبی ذوق اور ذہنی ہم آہنگی رکھنے والے مردوں سے ملنے جلنے میں کوئی عار نہیں سمجھتی۔ اس طرزِ عمل کے مُظاہرے پر اُس کے کردار کے بارے میں شکوک و شبہات بھی جنم لیتے ہیں لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ راشد کی جانب سے شکوک کے اِظہار پر وہ اپنے بارے میں صفائیاں دیتے دیتے تھک جاتی ہے لیکن وہ اُس کے کردار کے بارے میں مطمئن نہیں ہو پاتا۔ تاہم شبنم ایک روایتی مُعاشرے میں رہتے ہوئے بھی اپنے لیے زِندگی گُزارنے کا جو طریق اِختیار کرتی ہے، ہزارہا دُشواریوں کے باوجود اس پر مضبوطی سے جمی رہتی ہے۔ وہ اپنی زِندگی اپنے اِختیار میں رکھنا چاہتی ہے اور اِسی سوچ پر قائم رہتی ہے۔ وہ مغرب کی آزاد خیال عورت سے اخلاقی بے راہروی کی حد تک تو مُختلف ہے لیکن اپنے مُعاشرتی معیار اور اقدار کے حوالے سے خاصی آزاد ہے اور خودمُختار بھی۔ جدید مغربی عورت کے برعکس وہ خود کو بے راہروی کی پستیوں میں گرانے پر آمادہ نہیں لیکن مُعاشرے کی

نظروں میں مردوں سے ذہنی ہم آہنگی، مشترکہ ادبی مذاق کے نام پر سماجی روابط کی حد تک میل جول بھی معیوب قرار پاتا ہے اور نتیجے میں شبنم کے کردار پر سوالیہ نشان قائم رہتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں:

> ''عزیز احمد کے ناولوں کی سب سے اہم صفت ان کی ترقی یافتہ تکنیک ہے۔ ناول کے اسلوب کو بھی انھوں نے مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے کردار عورت اور شراب کے رسیا تو ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے کرداروں کی نفسیات سے کما حقہ واقف ہونے کے باعث ان کی داخلی زندگی کے مدوجزر کی تصویر کشی میں بھی درک رکھتے ہیں۔ ناول نگار ہر انداز فکر اور طرز عمل کا نفسیاتی جواز پیش کر کے اپنے نقطۂ نظر کی حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہے۔ عزیز احمد ایک باشعور اور بیدار مغز ناول نگار ہیں۔ جن کا میلان جنسی مسائل اور مطالبات کی طرف ہے۔ انھوں نے ناول نگاری کو منفرد طرز احساس تازہ انداز تحریر اور نئے آفاق سے آشنا کیا ہے۔''(۳۷)

نعیم اور ایلس گریز کے اہم اور مرکزی کردار ہیں ان کے علاوہ بلقیس، مارگریٹ، جیمس کرا کسلے، میری پاول وغیرہ ضمنی کردار ہیں۔ گریز ایک حد تک کرداری ناول ہے۔ ضمنی کرداروں میں بلقیس کا کردار قاری کو زیادہ متاثر کرتا ہے۔ ایسی بلندی ایسی پستی کی نور جہاں کی طرح یہ بھی حیدرآبادی ہے اور کیمبرج تک پڑھی ہوئی۔ اس کا مزاج بھی خالص ہندوستانی اور مشرقی ہے۔ اسے بھی جذباتی محرومیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کی شادی بھی ایسے ماحول اور گھرانے میں کر دی جاتی ہے جہاں وہ خوش نہیں رہتی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں نسوانی کرداروں میں بڑی مشابہت اور یکسانیت ہے۔

مارگریٹ بہت کم عمر، حسین، جذباتی اور حساس لڑکی ہے۔ وہ اپنے شعور کی ناپختگی کے باعث ہر نوجوان سے جذباتی لگاؤ محسوس کرتی ہے اور اس کی قربت کی متمنی رہتی ہے۔ نعیم کو بھی وہ اپنی عشوہ طرازیوں سے مسحور کر لیتی ہے لیکن مارگریٹ کی ماں ہندوستانیوں اور کالے لوگوں سے بے حد نفرت کرتی ہے۔ لہٰذا اس پر یہ خوف مسلط رہتا ہے کہ کہیں دونوں شادی نہ کر لیں۔

میری پاول اور کرا کسلے فرانس اور انگلینڈ کی بےفکر اور رنگین سوسائٹی کے نمائندہ کردار ہیں۔ آزاد خیال، لاابالی اور حال میں مست رہنے والے کردار۔ لہٰذا ان دلچسپ کرداروں کے ذریعہ لندن اور پیرس کے باشندوں کے مزاج اور ذہن کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

گریز کی کہانی دراصل نعیم کے گرد رقص کرتی ہے۔ یہ ہندوستان کا ایک نادار طالب علم ہے اور والدین کے سایہ سے محروم۔ اپنی ذاتی محنت اور صلاحیت اور ذہانت کی بدولت وہ آئی سی ایس کے مسابقتی امتحان میں کامیاب ہوتا ہے اور

لندن چلا جاتا ہے جہاں اسے ایک باکل نیا، ترقی یافتہ اور آزاد ماحول ملتا ہے۔ نعیم امریکن ایلس کی محبت میں ہندوستان کی بلقیس کو فراموش کر دیتا ہے۔

''اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ ایلس اس کے لیے کتنی ضروری ہوتی جارہی ہے جب وہ ہنستی تو اس کے سرخ سرخ ہونٹوں میں اس کے دانت کتنے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ چمکتے ہوئے اور سفید دانت، اس کے ہونٹ کتنے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا گول چہرہ، اس کے پیلے پیلے بال اور اس کی سخت چھاتیاں۔'' (۳۸)

لیکن یہ شدت احساس ایک جذباتی ٹھیس بن کر رہ جاتی ہے۔ محبت میں ناکامی ہوتی ہے تو وہ مخبوط الحواس ہو جاتا ہے۔ ایلس کو کھو کر گویا وہ سب سے قیمتی چیز کھو بیٹھتا ہے۔ چنانچہ پیرس دے لندن واپس آ کر وہ پھر اپنے تعلیمی مشغلوں میں کھو جاتا ہے۔ میری پاول لندن آتی ہے تو ایک بار پھر اس کے احساسات جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ دل وجان سے پاول کو اپنا بنانا چاہتا ہے۔ پاول کی قربت نے ایلس کے غم کو بھلا دیا۔ مگر اس بار بھی اسے ناکامی ہوتی ہے۔ پاول کراکسلے سے شادی کر لیتی ہے اور اسے پھر جذباتی صدمے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ نعیم کے اندر ناکامی کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے اور اس کے اضملال میں اضافہ وہ اپنا غم غلط کرنے کے لیے ایک دعوت میں شریک ہوتا ہے اور قاضی ہاشمی سے دورانِ گفتگو کہتا ہے:

''میرے ساتھ کیوں وقت ضائع کر رہے ہو۔ میں تو پیدا ہی محبت اور غم اٹھانے کے لیے ہوا ہوں۔ عشق اور درد کا ساتھ ہے۔ آپ ناچئے۔'' (۳۹)

نعیم کی گفتگو اور ذہنی کیفیت قارئین پر گہرا اثر چھوڑتی ہے اور اس کی جذباتی قلبی اور حسی سطح کا بہ آسانی اندازہ ہو جاتا ہے۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد جب وہ ہندوستان آتا ہے، بلقیس کی شادی ہو چکی ہوتی ہے۔ نعیم نے بلقیس کو ہندوستان میں بے انتہا پیار دیا تھا۔ ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں:

''نعیم کے کردار میں جان داری تو ہے لیکن وسعت نہیں۔ اس کا انداز فکر اور طرز احساس بہتر سے بہتر تعلیم کے بعد بھی کسی اہم تغیر سے آشنا نہیں ہوتا۔ شروع سے آخر تک اس کی زندگی مخصوص پیمانوں میں ڈھلتی رہتی ہے۔ ایلس ایک امریکن لڑکی ہے لیکن اس کا مزاج تغیر آشنا ہے۔ یہ نعیم سے محبت کرتی ہے تو پوری شدت اور خلوص سے جذباتی گمراہیوں میں بھی مبتلا ہوتی ہے لیکن ایسے مرحلوں کی ناپاکی کا اسے احساس بھی ہوتا ہے۔ مشرقی تہذیب کی لڑکی کی طرح۔'' (۴۰)

ایلس جب نعیم کی جنسی بھوک کا نشانہ بنتی ہے تو اس مرحلے پر اسے ناپاکی اور شرم کا احساس ہوتا ہے:

''مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے، بڑی قدامت پرستی کی بات ہے لیکن۔۔۔ لیکن مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے اب مجھ میں وہ پاکی باقی نہیں رہی۔'' (۴۱)

یہ احساسِ ندامت ایک ایسی لڑکی کو دامن گیر ہے جو امریکی ماحول کی زائیدہ اور پروردہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عصمت کی حرمت اور کردار کی پاکیزگی کا تصور مغربی تہذیب میں بھی موجود ہے۔ ایلس کے کردار میں محبت کا شدید جذبہ بھی ہے اور خلوص کے اثرات بھی۔ ''گریز'' کے یہ دونوں کردار اپنی گتھیوں کے اعتبار سے مکمل اور دلکش ہیں۔

ناول نگار اپنے ناولوں میں متعلقہ معاشرے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ تاریخی، جغرفیائی، سماجی، سیاسی ماحول معاملات اور مسائل سے بھی چشم پوشی نہیں کرسکتا۔ آداب واطوار اور رسوم وروایات کی جھلکیاں بھی اچھے ناولوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ موضوعات کے پیش نظر پہاڑوں، جنگلوں اور دریاؤں کے علاوہ بازاروں، ہوٹلوں اور کلبوں کی تصویر کشی بھی ناگزیر ہوجاتی ہے کیونکہ اپنے عہد اور معاشرہ کی مکمل اور جامع تفسیر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں:

> ''عزیز احمد نے زندگی کے گہرے تاثرات، انمٹ نقوش اور معاشرتی حالات کو اتنی سچائی، جامعیت اور قطعیت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس عہد کی تصویریں ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ ان کے ناولوں میں صرف ایک عہد اور اس کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کی پرچھائیاں ہی روشن نہیں ہوتیں بلکہ اس پس منظر میں آنے والے کرداروں کے ذہنی میلانات، سیاسی رجحانات قلبی جذبات اور نفسیاتی کیفیات بھی سامنے آجاتی ہیں۔ لہٰذا ان کے ناول اپنے عہد کی زریں تاریخ بن گئے ہیں۔''(۴۲)

عزیز احمد نے گریز میں معاشرہ اور ماحول کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس عہد کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی حالات بالکل روشن ہوجاتے ہیں۔ ان کی جزئیات نگاری بڑی توانا، خوبصورت اور اثرانگیز ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ناول کے موضوع، کردار اور معاشرے کی تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی پس منظر سے بخوبی واقف ہیں۔

گریز کو دو حصوں میں تقسیم کر کے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ جس کا پہلا حصہ حیدرآباد کے ایک مسلم گھرانے کے افراد نعیم، بلقیس اور خانم وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ گریز کے ابتدائی حصے میں ہندوستانی تہذیب پر انگریز اور ان کی زبان و تہذیب کے غالب نقوش بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔ خانم انگریزی تہذیب پر جس طرح تبصرہ کرتی ہیں اس سے اس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ نعیم آئی۔سی۔ایس۔ پاس کر کے انگلستان جاتا ہے مگر انگلستان جانے سے قبل وہ زندگی کی حقیقتوں سے گریز کرتا ہے اور بلقیس کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر اس سے قبل ہی انگلستان چلا جاتا ہے۔

دوسرا حصہ اس کے انگلستان جانے کے بعد سے وابستہ ہے۔ فرانس جاکر وہ ہر قسم کے جدید علم سے واقف ہوتا ہے۔ وہ پہلی جنگِ عظیم کے نتائج اور دوسری جنگ عظیم کے خافناک خطرات سے دوچار ہے۔ وہاں اس کی ملاقات کراکسلے، ہروشا، ہیرن پال اور ہندوستانی نوجوان شجاعت، اعجاز اور حلیمہ سے ہوتی ہے۔ یہ سب جدید علم سے واقف اور دانشورانہ ذہنیت کے حامل ہیں۔ یہ نوجوان چیکوسلوواکیہ، جرمنی، ناروے، امریکہ اور ہندوستان وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں اور پہلی جنگِ

عظیم کے بعد فرانس، جرمنی، اٹلی، آسٹریا، امریکہ، چکوسلوواکیہ اور ہندوستان کے سیاسی حالات پر بھرپور تبصرہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ ترقی، انقلاب، سرمایہ داری، اور مزدوروں کے مسائل پر گفتگو کرتے ہیں اور دوسری جنگِ عظیم کی آمد کی نشاندہی بھی۔

اسی درمیان نعیم جنسی جذبات سے مغلوب ہوتا ہے، اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مصنف ایلس (امریکن لڑکی)، طناز برتھا (ناروے)، اکسل سن اور کرا کسلے کی بہن مارگریٹ کو ضمنی طور پر ناول میں لے آتا ہے۔

صرف ایلس ایسا کردار ہے جس سے نعیم شادی کرنا چاہتا ہے۔ مگر ایلس کا باپ ہندوستانیوں کو ذلیل، غلام اور کالے کہہ کر، ایلس کو لے کر اپنے وطن امریکہ چلا جاتا ہے۔ نعیم اپنی خواہشات سے جب سیراب ہو جاتا ہے تو اس کی آئی۔سی۔ایس۔کی تعلیم پوری ہو جاتی ہے اور وہ ہندوستان واپس آنے کے بعد شادی، عشق، محبت، جنسی جذبات کی تکمیل سب کو محض افزائش نسل سمجھ کر ان سب سے گریز کرتا ہے۔

گریز کا کینوس بہت وسیع ہے جو ہندوستان سے انگلستان تک پھیلا ہوا ہے۔ عزیز احمد نے نعیم کی تعلیم اور اس کے کردار کے حوالے سے مختلف کرداروں کو پیش کیا ہے۔ جو ملکوں، سیاسی حالات اور تہذیب پر روشنی ڈالتے ہیں۔ نعیم کی جنسی خواہشات نوجوانوں کی ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی کیفیات کو خوب صورتی سے پیش کرتی ہیں۔ جس سے پہلی جنگِ عظیم کے بعد زندگی کی افراتفری کے ماحول کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

گریز کا ہیرو نعیم ایک متوسط طبقے کا نوجوان ہے وہ اپنی خوبصورت چچازاد بہن کی محبت میں گرفتار ہے چونکہ نعیم یتیم ہے اس لیے اپنی محبوبہ بلقیس کو حاصل نہیں کر پاتا۔ بعد میں جب نعیم آئی۔سی۔ایس کے لیے منتخب ہوتا ہے تو بلقیس کے والدین اپنی بیٹی کی شادی نعیم سے ہی کرنا چاہتے ہیں لیکن آئی۔سی۔ایس کا انتخاب بلقیس کے متعلق اس کا اشتیاق ختم کر دیتا ہے اور اس کی جگہ دل چسپی، لطف، اور مادی قسم کے جذبات لے لیتے ہیں۔

آئی سی ایس کے سلسلے میں نعیم کو یورپ کے مختلف ممالک میں جانے کا موقع ملتا ہے اور یہیں سے اُس کی شخصیت کا جو ابھی تک ناآسودہ تھی اور ایک مخصوص معاشرے کی پروردہ تھی اور اسی مخصوص معاشرے کے مطابق اُس نے اپنی امنگوں اور آرزوؤں کو بھرلانا یا پھر دبائے رکھنا سیکھا تھا لیکن یورپی سوسائٹی میں پہنچ کر اُس کے بند ایک ایک کر کے کھل جاتے ہیں اور وہ کلب، ڈانس، شراب، ریستوران، جنس، عارضی معاشقہ اور اس قسم کی رنگ رلیوں میں کھو جاتا ہے۔ یہاں آکر اُس کی سوچ میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور وہ ہر قدم پر ایک احساس کم تری کا شکار ہوتا ہے دراصل اسی احساس سے نجات پانے کے لیے وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے گریز کرنا چاہتا ہے لیکن ناکام ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان تمام نگارخانوں کے چکر لگانے کے بعد جب وہ ہندوستان لوٹنا چاہتا ہے اور ہندوستان پہنچتے پہنچتے بلقیس بھی کسی اور کی ہو چکی ہوتی ہے اور نعیم کی کہانی احساسِ شکست

پر یوں اختتام کو پہنچتی ہے:

''میں اپنی زندگی کے بارے میں سوچنے لگا ہوں اور بے مقصد زندگی جیسے متوسط طبقے کے تمام نوجوانوں کی ہوتی ہے۔محنت روپے کے لیے، محبت کسی لڑکی کو بیوی بنانے کے لیے اور روپیہ اور بیوی مل جانے کے بعد گھریلو زندگی، ہم متوسط طبقے والے وہی کام کس خوش اسلوبی سے کرتے ہیں جیسے کیڑے مکوڑوں، کتے، گائے بھینس سب کرتے ہیں۔افزائش نسل، اب میں اپنی گذشتہ چند سال کی زندگی دیکھتا ہوں تو بجز احساسِ محرومی، احساس شکست، بجز رکاوٹ کے احساس کے اور کچھ نہیں۔''(۴۳)

گریز اس دور کی داستان ہے جب کہ یورپ میں دوسری جنگ لڑی جارہی تھی۔ جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے ۔جنگ کی تباہ کاریوں سے یورپ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا متاثر ہو رہی تھی۔ یورپ میں نسلی تعصب، جذبہ مساوات کا نعرہ، حب الوطنی، اجتماعی احساس، مارکس اور اسٹالین کے نعروں کی گونج سنائی دیتی تھی۔ان چیزوں کا اثر سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی نظام پر بھی پڑا۔اور یہ بات شدت سے محسوس کی جانے لگی کہ جنگ کے شعلے یوں ہی رہے تو دنیا تباہ ہو جائے گی۔لیکن عزیز احمد نے ''گریز'' میں جس طرح جنسی مسائل کو ابھارا ہے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ یورپ میں کئی سال رہے اور وہاں کی جنسی بے راہ روی کو بہت غور سے دیکھا اور پھر فرائیڈ کے اثرات سے وہ ہر بات کا حل جنس میں ہی تلاش کرنے لگے۔وقار عظیم لکھتے ہیں:

''گریز دوسری جنگ عالمگیر جنگوں کے درمیانی وقفے کے پرشورش یورپ اور انگلستان کی زندگی کا ناول ہے۔اس میں اس عہد کی سیاسی اور معاشرتی منظر پر جنسی مسائل کا غلبہ ہے جنھیں مصنف نے مزے لے لے کر بیان کیا ہے اور اپنے قاری کو اس مزے میں پوری طرح شریک ہونے کی دعوت دی ہے جنسی معاملات کی اس طرح غیر ضروری آزادی اور بے باکی سے بیان کرنے میں بظاہر فرائڈ کی جنسی نفسیات کا سہارا لیا گیا ہے لیکن اس ناول میں یہ سہارا نفسیاتی یا فنی سہارا ہونے کی بجائے محض اس کا فریب معلوم ہوتا ہے۔''(۴۴)

جب ہم جنسی حقائق مزے لے لے کر بیان کرنے کے فلسفے پر غور کرتے ہیں تو ہمیں قاری کا خیال آتا ہے جو اس ''بیان'' میں لذتیت محسوس کرتا ہے اور اس کی اپنی نفسانی خواہشات ابھر کر سامنے آجاتی ہیں اس وقت ذہن ایک مخصوص انداز سے سوچتا ہے اور اس کی سوچ کی راہیں پستی کی طرف مائل ہونے لگتی ہیں۔عزیز احمد تو اپنے انداز و بیان میں قاری کو الجھائے رکھتے ہیں ورنہ ان کی تقلید کرنے والے دوسرے ادیبوں کے ہاں فن کاری نہ ہونے کی وجہ سے وہ ماحول پیدا ہو جاتا ہے جہاں قاری جانوروں جیسی حرکتیں کرنے لگتا ہے اکثر لوگوں کی جنسی ناآسودگی ابھر کر سامنے آتی ہے اور سے ہمیں عزیز احمد کے ہی الفاظ میں ''یہ ترقی پسندی کی نہیں بلکہ انتہا درجے کی تنزلی کی نشانی ہے۔'' کہنا پڑتا ہے۔

گریز نعیم کی یورپ کی سرگذشت ہے۔نعیم ایک نوجوان ہے حیدرآباد دکن کا رہنے والا ہے اور جنس اس کی سوچ کا محور ہے۔ابتدا میں حیدرآباد کے ایک مسلمان خاندان کا نقشہ ہے نعیم کا بلقیس سے عشق محض اس کے جنسی رجحانات کو نمایاں کرتا ہے۔اس لیے بھی کہ بلقیس کی والدہ کے جسم کی طرف بھی عجیب وغریب طریقے سے متوجہ نظر آتا ہے اس کی یہ ذہنی کیفیت عجیب سی ہے اور اپنی اس کیفیت سے نعیم بے حد لطف اندوز ہوتا ہے۔جب وہ آئی سی ایس میں منتخب ہونے کے بعد انگلستان پہنچتا ہے تو وہاں مختلف لوگوں سے ملتا ہے لیکن زیادہ تر اس کی توجہ کا مرکز نوجوان عورتیں ہوتی ہیں۔اس کی سوچ کا محور چونکہ جنس ہے لہٰذا اسے انگلستان میں وہ ماحول ملا جس میں جنسی کوئی بری بات نہیں۔جن لڑکیوں سے نعیم ملا ان میں ایک مس پاول ہے جو کہ بڑی علم دوست نظر آتی ہے مگر آخر میں ایک دن ملاقات ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دوستی محض حسن فروشی کا ایک ذریعہ تھی۔نعیم ہندوستان آجاتا ہے لیکن بلقیس کی شادی کسی اور شخص سے ہو جاتی ہے۔

گریز میں عزیز احمد نے بڑی محنت سے کام لیا ہے جنگ کے واقعات،اس کے اثرات،انگریزوں کا نسلی تعصب ،اور اس دور کی سیاسی ومعاشرتی نظام کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے۔ان کے یہاں شاعرانہ تخیل اور صنعت گری کے نمونے بھی ملتے ہیں۔نفسیاتی اور جذباتی کیفیات کی تحلیل بھی ان کے ہاں ہے،ان کا سیاسی شعور بھی نکھرا ہوا ہے۔اور تاریخی واقعات بھی ناول کی فضا سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔منظر کشی بھی وہ خوب کرتے ہیں،مکالمے بھی مختصر اور جامع ہیں۔

عزیز احمد کے یورپ کے مشاہدے بڑے کامیاب ہیں،۱۹۳۷ء کے یورپ کی پرشورش زندگی کو انھوں نے ہو بہو پیش کیا ہے۔انھوں نے جس طرح محسوس کیا ہے جو دیکھا ہے اس کے بیان کرنے میں ان کی واقفیت کمال ہے۔اس طرح گـــریـــز کے تاثر میں اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ اس طریقے کی وجہ سے اس کردار کے تجربات اور اس کے محسوسات ہی کے ذریعے ناول کا پلاٹ ابھرتا ہے اور ایک ڈرامائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔نعیم کی مسز چند کے متعلق گفتگو کچھ اس طرح ہے:

> ''انصاری نے کہا۔'راجہ صاحب اور مسز چند کے کے تعلقات کچھ زیادہ گہرے ہیں'۔میں نے دریافت کیا۔'پہلے سے یا ابھی یہ سلسلہ شروع ہوا ہے؟'۔نصیر نے کہا۔'آپ تو احمق واقع ہوئے ہیں ورنہ جہاز پر جتنے نوجوان ہندوستانی ہیں سب نے کچھ نہ کچھ لطف اٹھایا ہے۔'مجھے یقین نہ آیا اور اس خیال سے کہ اور پوچھوں گا تو یہ لوگ اور زیادہ بے وقوف بنائیں گے۔خاموش ہو گیا۔''(۴۵)

لیکن نعیم اس بات کی تصدیق کے لیے راجہ صاحب کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے:

> ''میں درجہ اول میں سیدھا راجہ صاحب کے کیبن میں پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی اور مسز چند کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔اس کی آواز سن کے میں پلٹنے ہی والا تھا کہ راجہ صاحب نے دروازہ کھولا۔ابھی سہ پہر کا وقت تھا مگر وہ اس قدر پیئے ہوئے تھے کہ لڑکھڑا رہے

تھے۔ مجھے دیکھ کر کہا،'اندر آؤ'۔ میں گیا تو دیکھا کہ مسز چند بستر پر شال سے ڈھکی پڑی تھی اور وہ تقریباً مدہوش تھی۔ راجہ صاحب نے اسی طرح سے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔'یہ کیا شرارت ہے۔ تم سے اس وقت آنے کو کس نے کہا تھا۔ میں سمجھا چند ہے۔ میں نے دروازہ کھولا کہ آ اپنی جورو کو دیکھ۔ کل اسے پچاس پونڈ دئے تھے۔ میں اکیلا بے وقوف ہوں، نہیں تو اس جہاز پر کون سا ہندوستانی لڑکا ہے جس نے اسے چھوا نہ ہو۔ کسی نے ایک پیسہ خرچ نہیں کیا میں بے وقوف ہوں بے وقوف۔'' (۴۶)

گـــریـــز میں شعور کی رو کا زیادہ استعمال تو نہیں کیا گیا لیکن کرداروں کی ذہنی کش مکش اس طرح بیان کی گئی ہے کہ کرداروں کی نفسی زندگی بے نقاب ہوگئی ہے۔ نعیم کے ذہن کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

''دماغ نے ذراسی کوشش کی تو بلقیس سامنے کھڑی تھی۔ مذاق اڑا رہی تھی کہ سمندر کے اس ذرا سے تلاطم میں آپ کا یہ حال ہو گیا۔ فاروقی صاحب تو کہہ رہے تھے کہ اس کو طوفان نہیں کہتے محض تلاطم کہتے ہیں۔ جب تک سمندر میں اتنا تلاطم نہ ہو جہاز کے سفر میں لطف نہیں۔ واہ نعیم صاحب واہ۔ پھر مذاق اڑاتے اڑاتے مجھے بیمار اور پریشان دیکھ کر وہ خود بھی پریشان ہوگئی اور تسلی دینے لگی۔ جہاز نے دائیں جانب حرکت کی تو اس نے میرے بائیں کان میں جھک کر محبت کا اقرار کیا۔ پھر وہ مسکرائی۔ پھر میرا مذاق اڑایا، پھر ہنسی، پھر میری ہنسی اڑائی، پھر فرشتوں کی طرح میری پریشانی سے پریشان ہوئی۔ مجھے تسلی دی اور نیند کے ساتھ مل جل کر غائب ہوگئی۔'' (۴۷)

گـــریـــز کا یہ انداز وہ ہے جس میں حال ماضی میں گھ کر کبھی خواب کی شکل میں کبھی نیم خوابی کی شکل میں اور کبھی خیال کی شکل میں سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور قاری کو موقع ملتا ہے کہ وہ کردار کے ذہن و زندگی میں جھانک سکے اور گہری نظر سے اس کا مطالعہ کر سکے۔

خود کلامی اور خیال کے علاوہ عزیز احمد نے گـــریـــز میں اظہار کے لیے ایک اور وسیلے کا بھی استعمال کیا ہے۔ خود نوشت یعنی ڈائری کے اوراق پر کردار اپنے احساسات اور جذبات کا اظہار۔ ایک موقع پر نعیم اپنی ڈائری کے صفحات میں اپنے ذہن سے یوں پردہ اٹھاتا ہے:

''جب سے میں نے سنا تھا کہ خانم چاہتی ہیں، اس کی شادی مجھ سے ہو، تب سے بلقیس کی 'شانِ نارسائی' میں فرق آ گیا تھا۔ کشش کا بہت بڑا باعث یہ تھا کہ میری مفلسانہ طالب علمی کے زمانے میں وہ میری پہنچ سے باہر تھی۔ آئی۔ سی۔ ایس کے انتخاب نے مجھے اتنا اوپر اٹھا دیا کہ میرا ہاتھ اس تک پہنچ سکتا تھا۔ اس سے نا امیدانہ اشتیاق کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اور اس کی جگہ دلچسپی، لطف اور زیادہ مادی قسم کے جذبات نے لے لی تھی۔'' (۴۸)

اس طرح عزیز احمد نے ڈائری اور خطوط کے ذریعے کرداروں کی ذہنی تہیں کھولنے کا کام لیا ہے ان سب مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں تک نئی تکنیک کو برتنے کا تعلق ہے عزیز احمد اردو ناول میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔احسن فاروقی جوان کے فن کے قائل نہیں، وہ بھی ان کی تکنیک کے بارے میں لکھتے ہیں:

''عزیز احمد کا تکنیک پر قابو داد کے قابل ہے۔ان کے مطالعے اور علم نے اس معاملے میں ان کی پوری مدد کی اور اردو ناول کا تکنیکی معیار انھوں نے بہت بلند کیا۔''(۴۹)

گـریـز کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے عہد کی شکست خوردگی، مایوسی اور کرب کا آئینہ ہے جنگ عظیم کے دوران ہندوستان اور دنیا کی کیا کیفیت تھی۔دو جنگوں کے درمیان کن مسائل کا سامنا تھا یہ سب اس ناول میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اس وقت کا ذہین انسان ذہنی انتشار میں مبتلا تھا۔مہلک ہتھیاروں نے زندگی کو بے وقعت بنا دیا تھا۔

''یہ زندگی کیا ہے جو محض ایک کارتوس سے بجھائی جا سکتی ہے۔یہ زورِ حرکتِ حیات کیا ہے کہ اگر درجہ حرارت ذرا کم ہو جائے تو اس کائنات کا خاتمہ ہو جائے۔۔اس وقت فرانس میں کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھا ایک شخص ارتقائے تخلیقی کا افسانہ گھڑ رہا ہے اور ایک ہزار کارخانے کارتوس بنا رہے ہیں۔''(۵۰)

موت کا احساس ذہن پر پوری طرح مسلط ہے۔

''ایک سواری سنبھل نہ سکی، اور جوش حرکتِ حیات ہمیشہ کے لیے خاموش۔اور زندگی کی ساری دلچسپیاں کیا ہیں؟اس خاموشی اور اس خاتمے کو بھول جانے کی ناکام کوششیں۔تمام عشق محض افزائش نسل اور افزائش نسل کا انجام فنا۔''(۵۱)

موت کے اس احساس کا نتیجہ ہے غیر یقین زندگی۔کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

''اس دنیا کا رہنے والا کون انسان کہہ سکتا ہے کہ کل کیا ہوگا؟''(۵۲)

ذہنی انتشار، افراتفری، بے یقینی اور زندگی سے فرار کی کیفیت ''گریز'' میں جا بجا نظر آتی ہے:

''نعیم۔۔۔سوچنے لگا کب تک میں اس طرح گریز کرتا رہوں گا۔کب تک یہ ذہنی اور جذباتی انتشار باقی رہے گا۔اور کوئی ترکیبی نتیجہ، کوئی امتزاج میری روح اور ذہن اور جسم کی فضا میں نہ ابھرے گا۔کب تک میں زندگی سے بچ بچ کے خوابوں کی دنیا میں، عاشقی میں پناہ لیتا رہوں گا اور عاشقی بھی خالص جذباتی عاشقی، جس میں کوئی ذہنی اطمینان نہیں۔''(۵۳)

بیسویں صدی کا ذہین اور حساس انسان، جنگ کا مارا انسان، مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گھرا کھڑا ہے۔امید کی کرن بھی دکھائی نہیں دیتی، پرانی قدریں پامال ہو چکی ہیں، نئی قدروں پر بھروسہ نہیں۔موت کا احساس ہر دل پر مسلط ہے۔انسان کی شخصیت ریزہ ریزہ ہو رہی ہے۔ذہنی انتشار اور عدم یقین کا دور دورہ ہے۔حال پریشانیوں میں گھرا ہے اور

مستقبل اس سے زیادہ مایوس کن ہے۔ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ ہے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے گریز اور فرار۔

مشرقی تہذیب:

مشرقی تہذیب کے منظر نامے سے ناول کا آغاز ہوتا ہے، خاص طور پر برائے نام سردی کا موسم اور ترقی پذیر معاشرے کی بودوباش، نعیم کے کمرے کا منظر یوں پیش کرتا ہے:

> ''صبح سویرے سے لے کر بارہ بجے تک دالان میں دھوپ رہتی۔ایک در پر جوہی کی بیل ہے۔اس حصے میں ٹھنڈک رہتی تھی۔بیچ کے در سے آنے جانے کا راستہ تھا۔اسی در کے سامنے دالان میں ایک میز اور ٹوٹی ہوئی کرسیاں تھیں۔میز پر کتابوں کا انبار رہتا۔اور آخری در کے مقابل پلنگ بچھا ہوا تھا۔جس پر ایک موٹا سا گدا تھا اور اس کا بچھونا جو ایک سوزنی، دو تکیوں اور ایک کمبل پر مشتمل تھا۔دن کو کتابیں پڑی رہتیں۔جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ فروری کے ان دنوں میں سے تھا جب حیدرآباد میں جاڑے (برائے نام ہی سہی) گرمی کے موسم میں بدلنے لگتے ہیں۔دن بھر خفیف سی لیکن ناگوار گرمی تھی جس کی وجہ سے نعیم نے پڑھتے پڑھتے کئی بار دل میں کہا 'ابھی سے اس قدر گرمی شروع ہوگئی۔''(۵۴)

ناول کے پہلے باب میں ہندوستانی معاشرت اپنی پوری جزئیات کے ساتھ نظر آتی ہے۔جس میں ''بلقیس'' کو ''میم'' بنانے کے لیے اس کی ماں ''خانم'' ہر ممکن کوشش کرتی نظر آتی ہے۔

> ''خانم اپنے دل میں کہتیں کہ بڑی ہوکر یہ لڑکی میموں سے زیادہ خوبصورت نکلے گی۔۔۔۔جوں جوں بلقیس بڑھنے لگی خانم کا شوق بھی بڑھنے لگا کہ ان کی لڑکی کسی میم سے کم نہ ہو۔انگریزی، انگریزوں کی طرح بولے۔انہی کی طرح رہے۔۔۔۔عاقل خان نے یہ تصفیہ کیا ان کی لڑکی انگریزی پڑھے گی اور انگریزی بولے گی اور جب تک سن بلوغ کو نہ پہنچے (اس کے بعد دیکھا جائے گا) انگریزی کپڑے پہنے گی۔''(۵۵)

مشرقی تہذیب کے بارے میں بھی یورپی باشندوں کے خیالات کو ناول میں کہیں کہیں سامنے لایا گیا ہے۔جرمنوں کے خلاف، فرانس میں پھیلی نفرت کو مختلف کرداروں کی زبانی پیش کیا گیا ہے۔جرمنی سے نفرت دراصل فسطائیت سے نفرت ہے۔ناول میں مختلف نوجوان گپ شپ کے انداز میں بظاہر لایعنی گفتگو کرتے ہوئے نظر آئیں گے لیکن ان جملوں، یا طنزیہ لے والے مزاح کو اس ماحول میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔مثلاً ''کراسلے'' جب اپنے دوستوں میں بیٹھا اپنی محبوبہ کے تخیلاتی پیکر بناتا ہے تو کسی نہ کسی بہانے جرمنوں سے اپنی محبوبہ کا انتقام لینے کی بات کرتا ہے۔اس خیالی محبوبہ کو جرمنوں کے چنگل میں قید دکھانے سے مراد دنیا کو اپنے قبضے میں رکھنا بھی ہوسکتا ہے۔ناول میں چند جملے اس نفرت کا برملا اظہار کرتے ہیں:

> ''۔۔۔۔جس مکان میں وہ رہتی تھی اس کے مغرب میں ایک بڑی سی چٹان کے پیچھے ایک موٹا لحیم شحیم

جرمن رہتا تھا جو اڈالف ہٹلر کے پردادا کا رشتے کا بھائی تھا۔ وہ اکثر اندھیری رات کو کھڑکی کے راستے یا دیواریں پھاند پھاند کے اس مکان میں گھس آتا اور۔۔۔۔اور ظاہر ہے تمھاری محبوبہ کو اس موٹے بیئر پینے والے جرمن سے نفرت تھی؟۔۔۔۔اس جزیرے میں ایک جرمن نے ہارون الرشید کے نکالے ہوئے درباریوں سے حرم کے آداب سیکھے اور ذرا ذرا روشن خیالی سیکھی'۔۔۔۔وہ بھی کیا زمانہ تھا لوگ مشرق سے تہذیب سیکھتے تھے اور نتیجے کے طور پر نشاۃ ثانیہ ظہور میں آیا۔ اب مسٹر نعیم حسن مغرب میں تہذیب سیکھ رہے ہیں اور دوسری عالمگیر جنگ کے ظہور میں آنے کی توقع ہے۔'' (۵۶)

ہندوستانی معاشرے کے افراد جب تبدیلی کی راہ پر نکلتے ہیں تو ان کی اپنی تہذیبی اقدار داؤ پر لگ جاتی ہیں۔ وہ کبھی ایک انتہا اور کبھی دوسری انتہا کی طرف نکل جاتے ہیں۔ مغرب کی گوری عورتیں محبت کا کھیل تو کالے مردوں سے بھی رچا لیتی ہیں لیکن شادی کے لیے وہ گورے مرد کا انتخاب ہی کرتی ہیں۔ نعیم بیک وقت بلقیس کے ساتھ ساتھ گوری عورتوں کی زلف کا بھی اسیر ہے اور اس پر طرہ یہ کہ وہ ان سے مشرقی عصمت کا متقاضی بھی ہے۔ نعیم کا دوست شجاعت اس صورتِ حال پر بے لاگ تبصرہ کرتا ہے:

''بھئی، دو صورتیں ہیں، اگر تم بیوی سے عصمت، عفت وغیرہ کے طالب ہو تو یہاں مت پھنسو ہندوستان میں تمھیں اپنے مطلب کی گھر والی مل جائے گی۔ دب کے رہے گی، جتنا چاہنا اتنا فیشن کرانا اس سے زیادہ نہ بڑھنے دینا۔ ایک آدھ وقت مار بیٹھو گے تب بھی بے چاری خاموش ہو جائے گی دوسری صورت یہ ہے کہ اگر تم کو واقعی اس امریکن لڑکی سے محبت ہے تو محض محبت کی خاطر شادی کرو اور عصمت، عفت کو ڈالو چولہے میں۔'' (۵۷)

مشرقی تعلیم، سیاحت، روزگار خواہ کی غرض سے یورپ جائیں انھیں وہاں کھل کھیلنے کا موقع آسانی سے دستیاب ہوتا ہے۔ ایسے میں وہاں اس قماش کی عورتیں بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہیں:

''ایک اور ہندوستانی نوجوان کے ساتھ ایک سویدستانی (جو کم از کم اپنے انگریزی لہجے سے سویدستانی معلوم ہو رہی تھی) لڑکی کھانا کھا رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر ہروشا نے افسوس کا اظہار کیا کہ اس کے ڈھلکتے ہوئے سینے سے شباب پھسلتا جا رہا ہے، پھر بھی وہ نعیم کے اس ہم وطن کو کس کامیابی سے بے وقوف بنا رہی ہے۔'' (۵۸)

مشرقی مرد بھی شاید عورت کی اس آزادی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں جو انھیں مشرق میں میسر نہیں، اس وجہ سے نعیم مشرقی گھر گرہستی کو صرف افزائش نسل سمجھتا ہے:

''میں اپنی زندگی کے متعلق سوچنے لگا ہوں۔ بے مقصد زندگی جیسے متوسط طبقے کے تمام نوجوانوں کو ہوتی

ہے۔محنت روپیہ کے لیے، محبت کسی لڑکی کو بیوی بنانے کے لیے اور روپیہ اور بیوی مل جانے کے بعد گھریلو زندگی۔ہم متوسط طبقے والے وہی کام خوش اسلوبی سے کرتے ہیں جیسے کیڑے مکوڑے، کتے ،گائے بھینس سب کرتے ہیں۔افزائش نسل۔''(۵۹)

جب نعیم ڈاکٹر راجندر کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ایک جگہ کار روکتے ہیں اور ایک لڑکی موٹر سائیکل ایکسیڈنٹ میں ماری جاتی ہے تو پھر یہی زندگی کی بے معنویت نعیم کا پیچھا کرتی ہے، وہ سوچتا ہے: ''یہ زندگی کا ڈرامہ تھا۔ایک منٹ کے اندر انسانی جسم کی شکست، چند لمحوں میں موت۔ برتھا اکسل سن کی ہرجائی نگاہوں، ایلس کی وفا اور بے وفائی، بلقیس کے متعلق شاعرانہ تخیلات، میری پاول کے عشق، کرا کسلے اور ہروشا کی دوستی، خانم کی دنیا داری سب کھیل تھے۔مگر قدرت کے اس معمولی کھیل کے سامنے ہیچ۔ایک سواری سنبھل نہ سکی، اور جوش حرکتِ حیات ہمیشہ کے لیے خاموش۔اور زندگی کی ساری دلچسپیاں کیا ہیں؟ اس خاموشی اور اس خاتمے کو بھول جانے کی ناکام کوششیں۔تمام عشق محض افزائشِ نسل اور افزائشِ نسل کا انجام فنا۔انسان جب اپنے آپ کو حیوان سمجھنے سے انکار کرتا ہے، موت اسے سمجھا دیتی ہے۔''(۶۰)

مشرقی تہذیب کے بارے میں شگریز ایک تصویر وہ بھی سامنے آتی ہے، جب ایلس نعیم سے شادی کے بارے میں سوچتی ہے، اسے شادی کا خوف اس لیے بھی ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان جانے سے ڈرتی ہے۔ پیرس میں ہندوستان کے متعلق دکھائی جانے والی دو تین فلموں اور کپلنگ کے ناول اور افسانے پڑھنے سے اس کے ذہن میں ہندوستان کی یہ تصویر بنتی ہے:

''تپتے ہوئے میدان، اتنا گرم سورج کہ صرف گرم ہوا سے لوگ وہاں مرجاتے ہیں، 'رینگتی ہوئی چیزیں'۔ یہ فقرہ اس ایجاد تھا۔اس میں چھپکلیاں، بچھو، کیڑے، پتنگے، سانپ سب ہی شامل تھے۔''(۶۱)

ایلس کو تجسس ہے کہ ہندوستان کی زندگی کے بارے میں جان سکے۔اس لیے وہ ہندوستان کی تہذیب کے بارے میں شجاعت سے پوچھتی ہے:

''کیا ہندوستانی لڑکیوں کو لڑکوں سے ملنے کا موقع نہیں دیا جاتا؟'۔'وہاں دو الگ الگ کیمپ ہیں'، شجاعت نے کہا۔'ایک میں لڑکے ایک میں لڑکیاں۔ جب کوئی لڑکا برسرِ روزگار ہو جاتا ہے۔جس سے زیادہ تر سرکاری نوکری مراد ہے۔تو جتنی اس کی بازاری قیمت ہوتی ہے، اسی قیمت کے لحاظ سے اسے ایک لڑکی مل جاتی ہے'؟'محبت کئے بغیر'؟' ایلس نے ذرا دلچسپی سے کہا۔'وہاں محبت ذرا کم کی جاتی ہے۔اس کو بدمعاشی سمجھتے ہیں۔ہاں اب کہیں کہیں بعض تعلیم یافتہ خاندانوں میں شادی سے پہلے بھی ذرا راہ و رسم ہو جاتی ہے'۔۔۔۔ایلس مسکرائی۔پھر اس نے شجاعت سے پوچھا۔'کیا وہاں لڑکے لڑکیاں شادی سے پہلے عموماً ایک دوسرے سے ملتے بھی نہیں؟' شجاعت نے کہا 'ملنا تو ایک طرف۔

اسی (۸۰) فی صدی صورتوں میں تو وہ ایک دوسرے کو شادی کے دن پہلی بار دیکھتے ہیں۔'' (۶۲)

مشرقی معاشرے کا ایک پہلو طبقاتی استحصال ہے۔ نعیم آخر پر یعنی ناول کے آخر پر چھٹیاں گذارنے کے لیے کشمیر پہنچتا ہے جہاں وہ ان مزدوروں سے بھی ملتا ہے جن کی صورت مفلسی اور بے کسی کی تصویر ہے جن پر ظلم و ستم ہوتا رہتا ہے یہ ظلم شخصی راج کا ظلم یا جاگیرداروں کا ظلم ہے جس کی اندوہ ناک مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں۔ حسین و جمیل مناظر اور جنت ساماں فضاؤں میں رہنے والا مزدور کس طرح جہنم کی آگ سے گزر رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس اقتباس سے ہوتا ہے:

''جناب ہم کیا کرے گا، ہمارے واسطے تو یہ جہنم ہے جناب ادھر غربت بہت ہے، ہم پر بڑا ظلم ہوتا ہے سال میں چھ مہینے بخشیش مل جاتا ہے۔ چھ مہینے میں ہم گھر بیٹھتا ہے۔ بھیڑ کی اون سے کپڑا بناتا ہے جناب کپڑا بہت مہنگا ہو گیا ہے اِدھر غریب پر بہت ظلم ہوتا ہے۔'' (۶۳)

مزدوروں اور محنت کش مردوں اور عورتوں کے اس جہنم کدے کی ایک اور تصویر ملاحظہ ہو:

''۱۹۴۲ء کشمیر گلمرگ کے مزدور اب بھی کئی کئی من کے ٹرنک اپنی پیٹھ پر لاد کر تین ہزار فٹ کی بلندی پر چڑھ رہے تھے اب بھی جہلم کے کنارے مزدور سینوں پر رسیاں باندھے دریا کے بہاؤ کے خلاف ڈونگوں کو کھینچے جاتے ہیں گویا دانتے کے جہنم میں گنہگاروں کی روحیں جانوروں کی طرح اپنے گناہوں کے بوجھ کھینچ رہی ہیں کبھی کبھی مرد تو ڈونگوں اور کشتیوں کو کھینچتے ہیں اور نعیم کو تعجب ہوتا کہ کیا ان عورتوں کے شفاف سینے اسی لیے بنائے گئے ہیں۔ اب بھی ٹٹو والے اپنے ٹٹو کے ساتھ پہلگام سے چندن واڑی تک اٹھارہ میل کا چکر لگاتے تو اُن کو روروپے تین آنے مزدوری ملتی ہے۔ اور اگر وہ پہلگام کے ایک ہوٹل میں کسی مسافر سے اپنے کرائے کے پیسے مانگنے آتے تو ہوٹل کا مالک چھڑی سے انھیں جانوروں کی طرح مارتا۔'' (۶۴)

جنت نظیر کشمیر اور معاشی و معاشرتی سطح کے جہنم بداماں کشمیر میں اس تضاد کو پیش کرتے ہوئے عزیز احمد نے اشتراکی نقطۂ نظر کو سامنے رکھا ہے۔ وہ لوگ کہ جو سرمایہ رکھتے ہیں دور دور سے کشمیر کی سیاحت کے لیے آتے ہیں ان کی نظر میں لہلہاتے ہوئے کھیتوں، سبزہ زاروں، چمکتی تھرکتی ندیوں، برف پوش پہاڑوں اور اس طرح کے دوسرے مناظر کا حسن کوئی معنی رکھتا ہے لیکن وہ لوگ جو یہاں کے باشندے ہیں لیکن پیٹ کی آگ میں جل رہے ہیں۔ ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں ، دوسروں کے لیے پسینہ بہاتے ہیں۔ اُن کے لیے یہ حسن بے معنی ہے۔ ان کے لیے حسین شے وہی ہے جو افادی ہو، جو بھوک، غربت اور مظلومیت سے انھیں نجات دلا سکے۔

مغربی تہذیب:

عزیز احمد کے ہاں مغربی کردار ہندوستان کی معاشرت میں بھی سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یورپ کی

وادیوں میں بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے۔ان کے ہاں بہت سے اینگلو انڈین کردار مثلاً مس آسکرو بھی ملتے ہیں اور ہندوستان کی معاشرت پر ان کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ خالص برطانوی باشندے بھی ''گریز'' ناول میں ملتے ہیں۔ان سب کرداروں کی پیش کش میں انگلستان کی آزادخیالی کو بہت حد تک نبھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

گریز میں یورپی تہذیب کی جلوہ گری بھی عروج پر نظر آتی ہے اور ناول کے یورپی ہی نہیں، ہندوستانی کردار بھی مذکورہ تہذیب کی عکاسی کرنے میں برابر کے شریک ہیں۔

مغربی تہذیب میں بھی غربت ،استحصال اور اس طرح کے وہی مناظر ہمیں دیکھنے کو مل جاتے ہیں جو مشرقی تہذیب میں عام ہیں،لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کا تناسب مشرق سے کم ہے۔ایسا ہی ایک منظر ہمیں تب نظر آتا ہے جب جہاز کے سفر کے دوران مشرقی تہذیب کا پروردہ شخص ،مغربی طرزِ طعام سے ناواقفیت کی بناء پر حزیمت بھی محسوس کرتا ہے لیکن یہ سب ایک فطری اور دلچسپ انداز میں ناول کے پلاٹ میں سمویا گیا ہے۔ناول کا ہیرو ''نعیم'' جب جہاز کے انجن کے پاس سے گزرتا ہے تو شکم پروری کا نظارہ دیکھ کر مغرب میں بھی بھوک کے تصور کو تجزیاتی انداز میں دیکھتا ہے۔

''انجن میں کام کرنے والے نوکر (جو سب کے سب اطالوی تھے) میلے متعفن کپڑے پہنے گوشت کی بڑی بڑی بوٹیاں کھا رہے تھے۔اس خیال سے خوشی ہوئی کہ غربت اگر ہندوستان میں بہت ہے تو یورپ میں بھی سرے سے مفقود نہیں۔مسولینی حبش فتح کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے اور اس کے ہم وطن مزدور وحشیوں کی طرح نیم برشت بوٹیاں کھا رہے ہیں۔''(۶۵)

مغربی معاشرے میں جنس ایک عام سی چیز ہے،اس میں مشرق والی حیا اور شرم کا کوئی کام نہیں۔گریز کی جس عریانیت پر اعتراض کیا جاتا ہے وہ دراصل مغربی تہذیب کا حصہ ہے،مشرقی تہذیب کے لحاظ سے یہ نامناسب بات ہے لیکن مغربی معاشرت کی عکاسی میں اسے فن سمجھا جائے گا۔گریز میں ایسے کئی مناظر مل جاتے ہیں:

''ایک گلاس اس نے برتھا کو دیا، برتھا کو پھر اپنی گود میں کھینچ کر بٹھایا۔ برتھا کے پستان بڑے بڑے تھے اور نرم نہیں تھے۔برتھا نیم دراز حالت میں اس کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا سنہرے بالوں سے بھرا ہوا جسم نعیم کے شانے کا سہارا لیے ہوئے بڑا خوب صورت معلوم ہوتا تھا۔نعیم نے اس کا بوسہ لینا چاہا تو اس نے اپنے لب اوپر اٹھائے نعیم نے اسی حالت میں اسے اور اچھی طرح اپنی آغوش کی گرفت میں لے کے اور اس کے سینے پر پنجہ گاڑ کے بوسہ لیا۔نعیم کے دانت اس کے دانت سے ٹکرائے اور وہ نعیم کی زبان چوسنے لگی۔پل اوور کے نیچے وہ زیر جامہ پہنے ہوئے تھی۔بے دردی سے گویا میری کا انتقام لینے کے لیے نعیم نے اپنے دانتوں سے اس کے ہونٹوں کو کاٹا۔لیکن برتھا اس کو انتقام کہاں سمجھ رہی تھی۔اس کے نزدیک تو یہ استوائی جوشِ محبت تھا۔''(۶۶)

مغربی معاشرے میں سرِ عام جنسی جذبات کا اظہار کرنا عام سی بات ہے، ہروشا اور نعیم جب زیرِ زمین ریل کے ایک ڈبے میں سفر کر رہے ہوتے ہیں تو ایسا ہی ایک منظر دیکھنے کو ملتا ہے:

''ایک نشست پر ایک مزدور ایک نوجوان لڑکی کا بوسہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نخرے کر رہی تھی اور اس کے پاس کی نشستوں پر لوگ ہنس رہے تھے۔''(۶۷)

مغربی تہذیب میں کنواری یا باکرہ کا تصور یا ناموس کی حفاظت کا تصور مشرقی تہذیب سے شاید مختلف ہے، اس لیے عزیز احمد نے گریز میں ایک لطیفہ جو مشہور تھا لکھا ہے:

''ایک اجنبی کئی گھنٹے ٹریفالگر اسکوائر میں نیلسن کے مجسمے کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ لندن کا ایک خاموش اور باوقار پولیس مین اسے دیکھتا رہا۔ آخر جب رات کے بارہ بج گئے تو اس نے پوچھا۔' آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟'۔ اجنبی نوجوان نے کہا۔' میں کسی کنواری کا منتظر ہوں'۔ پولیس مین نے کہا۔' یہ پہچان لینا تو بہت آسان ہے کہ کوئی لڑکی کنواری ہے یا نہیں کیونکہ جب انگلستان کی کوئی کنواری لڑکی اس جگہ سے گذرتی ہے تو نیلسن کا مجسمہ اپنی ٹوپی اتار کر جھک کر اس کی تعظیم کرتا ہے، اور یہ دونوں پتھر کے شیر چیختے ہیں۔''(۶۸)

مغربی تہذیب میں جنس وہ شجرِ ممنوعہ نہیں ہے جو مشرقی تہذیب میں ہے، گریز میں اس کے نمونے کئی جگہ ملتے ہیں۔

''بیتابی سے اس نے مارگریٹ کا بوسہ لیا۔ مارگریٹ کے پستان چھوٹی چھوٹی ناشپاتیوں اور فولاد کے سے سخت تھے۔ اس کا ہاتھ ادھر ادھر پھرتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے جسم پر مارگریٹ کی انگلیوں اور نوکدار ناخنوں کی سرسراہٹ محسوس کی۔''(۶۹)

نعیم جب بیئر کے نشے میں ہوتا ہے تو فریڈا گارٹ کی طرف یوں مائل ہوتا ہے: ''نعیم اسے گھر تک چھوڑنے اس کے ساتھ چلا۔ ٹرام سے اتر کے جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچی تو راستے کے لمپ کی دھندلی روشنی میں اور بولتے ہوئے پانی میں اس کا حسن سی سالہ اور اس کا چھریرا بدن جو برساتی میں لپٹا ہوا تھا، جسے وہ ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھی، بڑا خوبصورت معلوم ہوا۔ نعیم نے اس کا منہ اپنی طرف پھیر کے اور آہستہ سے اسے اپنی طرف کھینچ کے اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا جن پر بارش کے قطروں کا مزہ بے نمک سا معلوم ہوا۔ فریڈا نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا' شرارت مت کرو۔ سڑک کی روشنی میں نہیں'۔ چند قدم پیچھے ہٹ کے ایک اندھیری سی گلی میں نعیم نے فریڈا گارٹ کی چھاتیوں پر ہاتھ ڈالا، انھیں سہلایا۔ پھر بوسے لیے اور اسے گوئٹے اشتر سا اپنی پاں سیاں کو چلنے کو کہا۔ فریڈا نے کہا' بہت دیر ہوگئی ہے' ایک دو اور بوسوں کے بعد اس نے کہا' اب جاؤ۔ نہیں تو پانی میں زکام ہو جائے گا۔''(۷۰)

''تمھاری دوسری رائے۔ یورپی محبت کے تصور۔ سے مجھے بنیادی اختلاف ہے۔ یورپی محبت کا تصور تمھارے نزدیک خودبینی، خودغرضی اور حیاتی کشش پر مشتمل ہے۔ میں یہ ضرور مانتی ہوں کہ حیاتی کشش یاتم چاہوتو اسے حیوانی کشش کہہ لو، ضرور اس میں شامل ہے لیکن محبت اگر حیاتی یا حیوانی نہیں تو اور ہے کیا؟ کیا مرد عورتیں حیاتی ہستیاں، حیوان نہیں؟ ممکن ہے کہ سچی محبت روحانی بھی ہوسکتی ہو۔ اس کا مجھے تجربہ نہیں، لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سچی محبت حیاتی اور حیوانی اور جنسی سیری کے بغیر ممکن ہے۔ یورپی محبت کو تم خودغرضی کی محبت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ عورت ہو یا مرد، جو فریق ہو، جتنا اسے دوسرے سے ملتا ہے اتنا وہ خود بھی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ اگر روحانی کشش۔ ذہنی کشش، جذباتی مفاہمت، ہمدردی ہو۔ تو محبت مکمل ہوسکتی ہے۔'' (۷۱)

اسی جلسے کا ایک اور منظر ملاحظہ ہو: ''آخر میں اشتراکی انجمن کی عورتیں سنگت میں ناچیں۔ ان کی برہنہ ٹانگیں اور رانیں اشتمالیت کی تبلیغ کرنے والوں اور اسٹالن کے پیرووں کے اس جلسے میں بھی اس طرح بلند ہورہی تھیں جیسے ان کی بہنوں کی ٹانگیں پیرس یا نیویارک کے کسی ایسے نائٹ کلب میں جہاں وہ لکھ پتیوں کا شکار کھیلتی ہیں۔ ان کی ٹانگیں سر کے قریب بلند ہوتیں اور پھر روشنی میں جگمگاتی ہوئی فرش تک واپس آتیں۔ ہلکے سفید کپڑوں کے نیچے ان کی چھاتیاں تھرک رہی تھیں اور ان کے جسم کی اچھل کود سے ان کے بال ہوا میں بلند ہوتے اور پھر سر اور شانوں پر گرتے تھے۔'' (۷۲)

ایلس اور نعیم کا ایک پارٹی سے واپسی کا منظر:

''ٹیکسی میں خوب بوس و کنار ہوا۔ مگر جب ایلس نے ضد کی کہ وہ سیدھی اپنے بوڈنگ ہاؤس جائے گی تو نعیم اس کو وہاں پہنچا کے پیچ و تاب کھاتا ہوا، اکیلا اپنے کمرے کو واپس لوٹا۔'' (۷۳)

''زمین دوز ریلوے کے اسٹیشن کی سرنگ میں نعیم نے ایلس کا ایک طویل بوسہ لیا۔ اس کے ہونٹ خشک اور گرم تھے۔ نعیم نے خیال کیا کہ اسے بھوک لگ رہی ہوگی۔ ایلس نے اس کے بازو میں اپنا ہاتھ حمائل کیا اور اس کے سہارے چلنے لگی۔ تھوڑی دور آگے بڑھ کر دونوں پھر رکے پھر ایک طویل بوسہ لیا۔'' (۷۴)

''دوستوں کی طرح ان کا شعور اور ان کی محسوس اور غیر محسوس نفسیاتی کیفیتیں ایک دوسرے کی سمجھ میں آ گئی تھیں۔ اور دونوں کی دوستی میں خلوص تھا، لیکن اس دوستی کا جنسی پہلو ابھی بہت تشنہ تھا۔ ایلس سینکڑوں بار کہہ چکی تھی۔ 'میں تمھیں بہت پسند کرتی ہوں۔ مگر مجھے تم سے محبت نہیں'۔ اسے کسی طرح بھی اس سے عشق نہ تھا۔ اس کی رفتار گفتار، وضع تراش، اس کی ہنسی، اس کے دانت، سب نعیم کو اچھے معلوم ہوتے مگر دل ویسا کا ویسا سرد رہتا۔ جنسی تعلقات بھی تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ بوس و کنار میں اسے شروع سے انکار نہ تھا۔ لیکن نعیم کی دست درازی دیکھ بھال سے آگے بڑھنے نہ پاتی۔ دو ایک بار

جب نعیم نے حد سے تجاوز کرنا چاہا تو وہ اس قدر بگڑ گئی کہ نعیم کو ہٹ جانا پڑا۔'' (۷۵)

''اب تک ہزاروں بار وہ ایلس کے بوسے لے چکا ہے لیکن ان بوسوں میں کوئی خاص کیفیت نہ تھی۔ جیسے اور کسی لڑکی کے بوسے لیے جائیں۔ جیسے ان تمام لڑکیوں کے بوسے جو اس نے اب تک لیے تھے۔ مگر اب وہ ایلس کا بوسہ لیتا تو معلوم ہوتا کہ اس کا دل اس کے ہونٹوں میں آ گیا ہے۔ معلوم ہوتا کہ جتنی لذت اس ایک بوسے میں ہے اتنی لذت اور کسی چیز میں نہیں اور ایلس کی انگلیوں کے ناخن تک اسے عزیز معلوم ہوتے۔'' (۷۶)

نعیم جب ایلس کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اسے بلقیس بہت کم تر محسوس ہوتی ہے:

''اس کے دانت زیادہ سفید نہ تھے۔ ایلس کے دانتوں کے مقابل وہ کچھ نہ تھے۔۔۔۔ بلقیس کے شانے کتنے بھرے ہوئے تھے اور کے پستان ڈھلکے ہوئے تھے۔ دانت اور پستان، اگر ان دونوں میں بھی وہی کمال ہوتا جو میری کے جسم کے اور ہر حصے میں تھا تو وہ شہزادی نہیں دیوی معلوم ہوتی۔'' (۷۷)

مارگرٹ ایک رات جو وہ نعیم کے فلیٹ پر گزارتی ہے اس کا منظر: ''شب بخیر نعیم۔' کہتی ہوئی مارگرٹ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ شب خوابی کے لباس میں الجھی۔ نعیم نے اسے سنبھال لیا۔ 'ٹھہرو'۔ اس نے ہنس کر نعیم سے کہا۔ اس کی نوجوان آنکھیں چمک رہی تھیں۔ 'مجھے شب بخیر کہنے کا بوسہ تو دو۔' نعیم نے اس کی پیشانی کو چامنا چاہا۔ مگر سرکشی کر کے اس کے لب نعیم کے سامنے آ گئے۔ سرخ نوجوان لب۔ نعیم کی سراسیمگی پر مارگرٹ کی نوجوان آنکھیں شوخی سے مسکرانے لگیں اور اس کے لب نعیم کے اور قریب آ گئے۔ اس قدر قریب کہ ایک لحظہ کے اندر دونوں کے لب ایک طلسمی قوت سے ایک دوسرے کے لبوں سے پیوست ہو گئے۔ لحظہ بھر کے بعد نعیم نے محسوس کیا کہ مارگرٹ اس کی آغوش میں ہے، اس کے سینے کے مقابل مارگرٹ کا جواں سال سینہ تھا اور مارگرٹ کی گرم گرم سانس اس نے اپنے چہرے پر محسوس کی۔ دفعتاً اس نے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ 'مارگرٹ معاف کرنا۔ تم میرے دوست کی بہن ہو۔ تمھارا جسم میرے لیے مقدس ہے۔' 'مگر کیوں۔ کیا تمھارے ملک میں دوستوں کی بہنیں حرام ہوتی ہیں؟' 'لیکن مجھ پر اعتبار کر کے کراکسلے نے تمھیں یہاں بھیجا۔' 'تمھاری انھی باتوں پر تو مجھے غصہ آتا ہے۔ گویا میں بچہ ہوں اور اپنے بھائی کی ولایت میں ہوں۔' 'تم خفا کیوں ہوتی ہو، مگر مارگرٹ تمھیں کہیں نقصان نہ پہنچ جائے۔ ابھی تم بہت کم سن ہو۔' 'میں سترہ سال کی ہوں۔ معاف کرنا۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ جسمانی حیثیت سے میں اتنی قابل نفرت ہوں۔ شب بخیر۔' اس کا ہاتھ پکڑ کر نعیم نے کہا۔ 'مارگرٹ! بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ تم انتہا درجے کی خوبصورت ہو۔ اگر تم کراکسلے کی بہن نہ ہوتیں تو میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت تصور کرتا۔' 'اچھا خیر۔ خدا حافظ۔' وہ اپنے پلنگ پر جا کے لیٹ رہی۔ نعیم نے احتیاط سے کمبل اڑھایا اور شب بخیر کہہ کر اس کا ہاتھ دبایا۔ پھر

اپنے پلنگ کے قریب آ کے روشنی گل کی۔ آدھے گھنٹے کے قریب کروٹیں بدلتے بدلتے گذر گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نعیم کے سارے جسم میں کسی نے خون کے بجائے جلتا ہوا سیسہ پگھلا کے بہا دیا ہے۔ اس کی کنپٹیاں خون کی گرمی سے پھٹی جا رہی تھیں۔ بالآخر اس سے رہا نہ گیا۔ وہ اٹھا۔ اندھیرے میں آہستہ آہستہ وہ مارگرٹ کے پلنگ کی طرف بڑھا اور جھک کر مارگرٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ اندھیرے میں بھی اس نے دیکھا کہ مارگرٹ کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور وہ سانس روکے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ خوف سے؟ حیرت سے؟ کشش سے؟ اس نے آہستہ سے کہا 'مارگرٹ' مارگرٹ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دیوار کی طرف کھسک گئی اور نعیم کے لیے جگہ کر دی۔ نعیم بلانکٹ کے اندر آ گیا۔ بے تابی سے اس نے مارگرٹ کا بوسہ لیا۔ اس نے اپنے جسم کو مارگرٹ کے جسم سے لپٹے محسوس کیا۔ مارگرٹ کے پستان چھوٹی چھوٹی اور فولاد کی سی سخت ناشپاتیوں کے سے تھے۔ اس کا ہاتھ ادھر ادھر پھرتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے جسم پر بھی مارگرٹ کی انگلیوں اور نوکدار ناخنوں کی سرسراہٹ محسوس کی۔ اور جب مارگرٹ کا سانس زور زور سے چل رہا تھا تو اس نے کہا 'مارگرٹ ہم دونوں بوس و کنار سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ میں تمھارا کنوار پن اگر تم سے چھینوں گا تو ہمیشہ میرا دل مجھے ملامت کرے گا کہ میں نے جیمز اور میری کا بدلہ تم سے لیا؟' مارگرٹ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خود بھی شاید حد سے زیادہ نہ بڑھنا چاہتی تھی۔ انگریز لڑکی ہمیشہ ڈرتی ہے کہ کہیں سانولا بچہ پیدا ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اس طرح ایک دوسرے کی آغوش میں رات گذر گئی اور صبح کی روشنی میں نعیم نے مارگرٹ کا عریاں جسم دیکھا جو کسی یونانی مجسمے کی طرح خوبصورت تھا۔ رات بھر کے ضبط سے نعیم کے اعصاب بالکل جواب سے چکے تھے مگر اسے اس کی خوشی تھی کہ وہ اس امتحان سے کامیاب گذر چکا۔ اب اسے کرا کسلے سے یا اپنے ضمیر سے شرمانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔'' (۷۸)

مارگرٹ کے بعد پھر آوارہ گردی بلکہ جہاں گردی، وہ مختلف ممالک کی سیر کرتا ہے، ایسے میں برتھا کے دیس اشتوک ہولم بھی جاتا ہے، وہاں کا ایک منظر ملاحظہ ہو:

''پھر اشتوک ہولم میں آدھی رات کو ایک ایکٹرس کے چھوٹے چھوٹے پستان اور بے طلف بوسے۔'' (۷۹)

پھر میری پاول سے ایک اتفاقی ملاقات اور بوسہ: ''نعیم نے میری کا ہاتھ اٹھا کر چوما اور کہا' خدا حافظ۔ خدا تمھیں خوش رکھے۔' اور ایک ثانیہ کے اندر ایک ہی خیال دونوں کے ذہن میں پیدا ہوا۔ دونوں کے لب ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور نعیم نے میری کا بوسہ لیا تو محسوس کیا کہ اس کے لب بھی سچائی سے جواب دے رہے ہیں۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ نے محسوس کیا کہ میری کا سینہ ڈھلک رہا ہے۔'' (۸۰)

مغربی معاشرت کے رنگ میں ہندوستان کا دولت مند طبقہ پوری طرح رنگا گیا تھا۔ بحری جہاز میں مسز چند کا مختصر

لباس نعیم کی توجہ اپنی جانب کھینچتا ہے: ''دوسرے درجے کے عرشے پر راجہ ہمت نواز ونت بہادر مسز چند سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بلایا اور مسز چند سے ملایا۔ ہاتھ ملاتے وقت میں نے اپنے سر میں خون کی گرمی اور تیز محسوس کی۔ مسز چند وہی نہانے کا لباس پہنے ہوئے تھیں جس سے ان کی پیٹھ اور سڈول کاندھے اپنی پوری شانِ عریانی کے ساتھ باہر تھے۔ اس سے پہلے میں نے ایسے منظر صرف فلموں میں دیکھے تھے۔ اپنے دل میں کہا کہ یورپ میں ایسے ہزاروں منظر دیکھنے میں آئیں گے۔'' (۸۱)

بحری جہاز میں راجہ صاحب سے نعیم کی ایک ملاقات:

> ''انصاری نے کہا راجہ صاحب بلا رہے ہیں۔ پہلے درجے میں ہم لوگ ان کے پاس پہنچے تو بیر کا شغل فرما رہے تھے۔ ضیافت کرنا چاہی تو میں نے معافی چاہی۔ میرے لیے لیمونیڈ منگوایا اور کہا یہ تو عورتوں کے پینے کی چیز ہے۔ ان کے درجے میں ایک امریکن لڑکی سفر کر رہی تھی۔ راجہ صاحب اس کے حسنِ جسمانی سے آج سہ پہر سرخرو ہوئے تھے۔ اس لیے بہت خوش تھے اور مجھ سے اور انصاری سے اپنے کارنامے کی تفصیلات بیان کر رہے تھے۔'' (۸۲)

''میں درجہ اول میں سیدھا راجہ صاحب کے کیبن میں پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی اور مسز چند کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کی آواز سن کے میں پلٹنے ہی والا تھا کہ راجہ صاحب نے دروازہ کھولا۔ ابھی سہ پہر کا وقت کا مگر وہ اس قدر پیے ہوئے تھے کہ لڑکھڑا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہا 'اندر آؤ'۔ میں گیا تو دیکھا کہ مسز چند بستر پر شال سے ڈھکی پڑی تھی اور وہ تقریباً مدہوش تھی۔ راجہ صاحب نے اسی طرح سے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔ 'یہ کیا شرارت ہے۔ تم سے اس وقت آنے کو کس نے کہا تھا۔ میں سمجھا چند ہے۔ میں نے دروازہ کھولا کہ آ اپنی جورو کو دیکھ۔ کل اسے پچاس پونڈ دئے تھے۔ میں اکیلا بے وقوف ہوں، نہیں تو اس جہاز پر کون سا ہندوستانی لڑکا ہے جس نے اسے چھوا نہ ہو۔ کسی نے ایک پیسہ خرچ نہیں کیا میں بے وقوف ہوں بے وقوف۔'' (۸۳)

''مسٹر چند اس وقت پورٹ سعید کی سیر فرما رہے تھے۔۔۔ ایک مصری لڑکے نے ان کا پیچھا کیا اور برابر پوچھتا گیا 'کوئی فرانسیسی لڑکی چاہیے؟' اور جب وہ چائے پینے ایک ہوٹل کے برامدے میں پہنچے تو سامنے کی میز پر ایک فرانسیسی لڑکی بیٹھی تھی۔ لڑکے نے کہا 'یہ لڑکی بھی مل سکتی ہے' اور مسٹر چند کو اس کا ہلکا رنگ سانولا رنگ اور اس کی مسکراہٹ بہت اچھی معلوم ہوئی۔ وہ مسکرائے اور وہ لڑکی بھی مسکرائی اور انھوں نے اس لڑکے کو کچھ انعام دے کر رخصت کیا اور وہ پھر مسکرائے اور وہ اٹھ کر ان کی میز پر آئی اور ان سے پوچھا 'وُلے وہ فیر امواَوک موآ؟' اور یہ باوجود اس ک ے کہ معنی نہ سمجھے تھے، مطلب سمجھ گئے اور کہا 'ہاں'! اور پھر انگریزی میں معاملہ طے ہوا اور وہ ایک پونڈ قرار پایا (پچاس پونڈ راجہ صاحب نے دیئے تھے)۔ اور پھر

مسٹر چنڈلر کی کو ہوٹل میں لے گئے اور کمرے کا کرایہ پانچ شلنگ ادا کیا۔''(۸۴)

لیکن پورے مغربی معاشرے کو بے راہ روی کا شکار سمجھ لینا ایک مغالطہ ہے۔ فرانسیسیوں کے متعلق عزیز احمد لکھتے ہیں:

''نگار خانوں کے سرپرست اجنبی ہی تھے۔ فرانسیسی بہت کم پیرس کی عشرت گاہوں میں جاتے ہیں۔ خاندانی زندگی میں یہاں اتنی ہی روک ٹوک اور ٹھہراؤ ہے کہ انگلستان میں نہیں۔ متوسط طبقے میں لڑکیوں پر پابندیاں بہت ہیں۔''(۸۵)

مغربی تہذیب جس میں پہاڑ اور میدان کے لینڈ اسکیپ اکثر نظر آتے ہیں ایسے میں موں مارتر کی پہاڑی سے پیرس کا ایک منظر جس سے معلوم ہوتا کہ صرف دور سے یہ منظر ہی بھلا نہیں لگتا، اس کے بازاروں میں بھی کتاب اور علم دوستی کے خوب صورت مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں: ''موں مارتر کی پہاڑی سے تینوں نے پیرس کو دیکھا۔ یہ شہر جوان کے قدموں کے نیچے جگمگا رہا تھا، اس کی میلی میلی دیواریں، اور اس کی کھڑکیاں جو لندن کی کھڑکیوں سے کہیں زیادہ بدشکل معلوم ہوتی ہیں ،لیکن جن میں قدامت کی بے نیازانہ شان ہے اور اس کے آباد اور بارونق محلے۔ اس کی روشوں پر بساطیوں اور کتاب فروشوں کی دکانیں ،اس کی سڑکوں پر شہریوں کے باس، اور ان کی مجموعی آوازوں کا ایک ہلکا شور۔ پیرس دنیا کا حسین ترین شہر۔''(۸۶)

مغربی تہذیب اپنی تمدنی ترقی کا نمونہ بھی دکھاتی ہے، اس دور میں نہ صرف وہاں میترو موجود تھی بلکہ عالی شان ہوٹل بھی ،ایسا ہی ایک منظر: ''اس نے بجائے میترو سے جانے کے ٹیکسی لی تا کہ جلد پہنچ سکے۔ اوتل وپیری روشنیوں اور شراب کے گلاسوں سے جگمگا رہا تھا۔ امیر فیشن ایبل بوڑھیاں ،شانے ہلا ہلا کے باتیں کرنے والے فرانسیسی ،شانے ہلا ہلا کے ناواقفیت کا اظہار کرنے والے خادم، اعلیٰ ترین قسم اور قیمت کے ڈنر جیکٹ پہنے ہوئے انگریز جن کے ایک ہاتھ میں گلاس ہوتا اور دوسرا ہاتھ پتلون کی جیب میں اور ان کا اعلیٰ پبلک اسکول کا لہجہ۔ ان سب کو دیکھتا ہوا نعیم ہوٹل کے کاؤنٹر کے قریب بڑھا۔''(۸۷)

اسی مادی ترقی کے دیگر نمونے ہوائی اور بحری جہاز اور ان میں زندگی کے تعیّشات:

''خوب صورت جہاز جن کے عرشوں پر رات بھر ناچ ہوتا ہے اور جن کے حوضوں میں ننگی پیٹھ والی امیر زادیاں نہایا کرتی ہیں۔ اور ان سے اوپر خاموش طائروں کی طرح اڑتے ہوئے طیارے۔''(۸۸)

مادی ترقی کی بنیاد بھی علم اور آگہی ہے۔ مغربی تہذیب یونی ورسٹیوں اور کتاب دوستی کی وجہ سے مشہور ہے، لیکن ہندوستانی وہاں کے آزاد ماحول کے دلدادہ ہیں:

اسی شہر میں لودر بھی ہے اور قومی کتب خانہ بھی۔ یورپ کی قدیم ترین یونی ورسٹی بھی ہے اور دنیا بھر سے چنے ہوئے آرٹ کے نادر نمونے بھی۔ پھر بھی میرے ہم وطنوں کے قدم موں مارتر کی طرف ہی کیوں اٹھتے ہیں۔ برہنہ جسموں کی خیرگی کیوں ان کے دماغوں پر اس قدر چھائی ہوئی ہے۔'' (۸۹)

مغرب کے آزادی کو ہم جو مرضی کہیں لیکن پھر بھی ان کی کچھ روایات ہیں، نئے بادشاہ ہو محض اس بنا پر بادشاہت سے دست بردار ہونا پڑا کہ اس کی بیوی مطلقہ تھی:

''مسز سمپ سن دو بار طلاق لے چکی تھی۔ بھلا انگریزی اخلاق عالیہ۔ جو در پردہ سب کچھ گوارا کر لیتے۔ یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ ایسی خاتون ان کی ملکہ بنے۔ نعیم نے بہت سے انگریز دوستوں کے ساتھ ایڈورڈ ہشتم کی دست برداری کی تقریر سنی۔'' (۹۰)

مغرب میں بادشاہ کی حیثیت گو علامتی ہوتی ہے، لیکن اس کی تاج پوشی کا جشن دھوم دھام سے منایا جاتا ہے، جارج ششم کی تاج پوشی کا منظر ملاحظہ ہو، اس میں خاص طور پر راجے مہاراجوں کا نوآبادیاتی اثر بھی قابل ذکر ہے: ''براعظم یورپ میں بڑے اسٹیشنوں پر 'شاہ انگلستان کی تاج پوشی دیکھنے انگلستان آؤ' کے اشتہار مہینوں پہلے سے لگ گئے۔ شہر لندن تاج پوشی کے زمانے میں جھنڈیوں سے آراستہ ہونے لگا۔۔۔ کئی بادشاہ سر اطاعت خم کرنے اور داد اطاعت دینے آئے۔ ہوٹل اس قدر بھر گئے کہ چوگنے پنج گنے کرائے پر بھی جگہ ملنی ناممکن تھی۔ ہندوستانی راجے مہاراجے آئے۔ نائیجریا اور مشرقی افریقہ کے حبشی سردار آئے اعلیٰ سے اعلیٰ سوٹ پہنے ہوئے۔ ان میں سے ایک آدھ اپنا تعارف چٹکی بجا کر یوں کراتا 'میں پرنس اُبا ہوں' اور اس کے سیاہ اور موٹے حبشی چہرے پر اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ راجاؤں کے ساتھی افسروں اور خادموں کی وجہ سے لندن کے ہوٹل اور قہوہ خانے ہندوستانیوں سے بارونق ہو رہے تھے۔ ایک بہت بڑے ہوٹل نے ایک نیا سوپ (شوربہ) ایجاد کیا اور اس کا نام 'مہتر چترال کے تاج کے موتیوں کا سوپ' رکھا۔'' (۹۱)

اس تاریخی، موقع کو ہر شخص یادگار بنانا چاہتا تھا: ''تاج پوشی سے ایک شام پہلے یعنی ۱۱ مئی کی شام کو مغربی لندن میں عجب بہار تھی۔ رات کو تو بہت سے راستوں پر موٹر کا گذر موقوف ہو گیا۔ خلقت دریا کی طرح امڈی پڑتی تھی۔ بہت سے لوگ تیس چالیس گھنٹے اپنی نشستوں سے ہٹے نہیں کہ جلوس دیکھنے کے لیے پھر جگہ ملے نہ ملے۔'' (۹۲)

نوآبادیاتی اثرات:

مجموعی طور پر عزیز احمد کے ہاں مغربی تہذیب کے اثرات بہت نُمایاں اور بکثرت نظر آتے ہیں۔ ہندوستانی مُعاشرے پر یہ اثرات بہت دُور تک پھیل گئے تھے اور اپنی جڑیں گہری اور مضبوط کر لی تھیں۔ بالخصوص جاگیردارانہ طرزِ زندگی اِن اثرات سے بھرپور تھا جس کی ایک اہم وجہ انگریزوں سے وابستہ مفادات تھے جن کے تحفظ کے لیے مذکورہ طبقہ اُن

کی خوشنودی حاصل کرنے کی ہر مُمکن کوشش کرتا تھا اور مغربی تہذیب کو اپنانے میں بھی یہی خیال کارفرما تھا۔عزیز احمد کے ہاں ایسے نسوانی کردار موجود ہیں جن پر مغربیت اثر انداز ہو چکی تھی اور اُن کی زِندگیوں کا ڈھنگ اِسی تہذیب کے مقررہ سانچوں میں ڈھلتا دِکھائی دیتا ہے۔اُنہوں نے ہندوستانی نوجوانوں کو آئی۔سی۔ایس کو منزل قرار دیتے ہوئے اور اپنی ساری توانائیاں اِس کے حُصول میں صرف کرتے دِکھایا ہے۔نتیجہ یہ کہ وہ ذہنی طور پر مغربی تمدُّن کے اسیر ہو جاتے ہیں اور اُن کا اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، گفتگو، لباس، آداب سبھی کچھ مغربی رنگ میں رنگ جاتا ہے۔تاہم عزیز احمد نے مغربیت کے اثرات اِس تہذیب کو تنقید کا نشانہ بنانے کے لیے نہیں دِکھائے۔وہ مغرب کی حد سے بڑھی ہوئی آزاد خیالی اور اخلاقی بے راہروی کو بھی تفصیل سے دِکھاتے ہیں جبکہ اُن کے مرد کردار کہیں کہیں عورتوں کے حوالے سے مشرقی ذہن کے نُمائندہ شکوک وشبہات کا اِظہار بھی کرتے ہیں۔لیکن عزیز احمد مغربی تہذیب کے اِس منفی پہلو کی عکاسی تنقید کا نشانہ بنانے یا منفی تاثر کو اُجاگر کرنے کی غرض سے نہیں کرتے بلکہ محض ایک فوٹوگرافر کی طرح تصویریں دِکھانے میں دِلچسپی رکھتے ہیں۔اُن کے بیشتر کردار خواہ وہ مشرق سے تعلّق رکھتے ہوں خواہ مغرب سے بے راہروی کے سیلِ تند میں بہتے چلے جاتے ہیں اور یہی عزیز احمد کے ناولوں کا سب سے اہم سروکار ہے۔وہ مغرب کے اِس تہذیبی مظہر کو نہ صرف بالتفصیل اپنے ناولوں میں پیش کرتے ہیں بلکہ کہیں بھی محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اسے منفی تاثر اُبھارنے کے لیے دِکھا رہے ہیں۔تاہم مغرب کے رنگ ونسل کے اِمتیاز اور تعصب کو اُنہوں نے اِس کے منفی تاثر سمیت پیش کیا ہے اور ایک بھرپور تصویر کی عکاسی میں کامیاب رہے ہیں۔اُن کے مُعاصر ناول نگاروں کے ہاں بھی مغرب کا مذکورہ تہذیبی رویہ پوری شدّت سے اُبھرتا نظر آتا ہے جس سے یہ اندازہ لگانا چنداں دُشوار نہیں کہ اُس عہد میں نوآبادیات کو مغرب کی سیاسی ومعاشی بالادستی کے نتیجے میں کہاں کہاں پسپائی کا سامنا تھا اور یہ محاذ سیاسی کے ساتھ ساتھ زِیادہ تر تہذیبی نوعیت رکھتے تھے۔گُریز میں صفدر نگر کا علاقہ مشرقی تہذیب کا نمونہ ہے لیکن اس میں نوآبادیاتی اثرات بھی ملتے ہیں:

''سیمنٹ کی سڑکوں پر سے ہوتا ہوا وہ ایک گلی میں مڑا۔جہاں نیچی نیچی دکانوں میں ٹین کا سامان، غلہ اور مٹھائیاں بکتی تھیں۔اس کے آگے سینڈی خانہ تھا جس کے سامنے سرِ شام ایک ہجوم رہتا تھا اور آگے پختہ مکانات تھے لیکن چھوٹے چھوٹے۔ان میں دیسی عیسائی رہتے تھے۔ان کی لڑکیاں کبھی گہرے نیلے یا گہرے آسمانی رنگ کی فراکیں پہن کے نکلتی تھیں اور نعیم ان کی طرف بڑی حسرت کی نظروں سے دیکھتا تھا۔اس کے بعد کچھ کھلا ہوا حصہ تھا۔کچھ اور دکانیں تھیں۔بیچوں بیچ ایک نالی بہتی تھی۔دکان دار اور ان کے گاہک سڑک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے والوں کو باہم گالیاں دیا کرتے۔اس سے آگے کچھ کھلا ہوا میدان تھا، جس میں بدبودار نالیاں بہتی تھیں اور پھر وہ محلّہ آتا تھا جو جدید حیدرآباد

کے اچھے محلوں میں شمار ہوتا ہے۔یعنی صفدر نگر۔یہاں سیمنٹ کی ایک سڑک تھی جس پر بند اور کھلی موٹروں کا تانتا لگا رہتا تھا۔پیدل چلنے والے سڑک کے کنارے اس حصے پر چلتے تھے جہاں سیمنٹ کی تہہ نہیں ہے۔''(۹۳)

نوآبادیاتی اثرات میں سے ایک ذریعہ تعلیم کی تبدیلی تھی،مقامی زبان کی بجائے انگریزی زبان کی تعلیم اور مغربی تقلید نے بورڈنگ ہاؤس کو جنم دیا۔ان بورڈنگ ہاؤسز نے معاشرت کی تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا۔ایسے ہی ایک بورڈنگ ہاؤس کا نقشہ عزیز احمد نے یوں کھینچا ہے،جس میں بلقیس کو داخل کرایا جاتا ہے:''اس زمانے میں کئی اینگلو انڈین عورتوں نے بورڈنگ ہاؤس کھول رکھے تھے جن میں حیدرآباد کے ترقی پسند نواب اپنی چار ست آٹھ نو برس کی عمر کی لڑکیوں اور اسی عمر کے لڑکوں کو داخل کر دیا کرتے اور ان کے بچے ان کو پاپا اور اپنی ماؤں کا ماما یا ممی کہا کرتے۔نیز انگریزی اتنی اچھی بولنے لگتے کہ یونی ورسٹی کے گریجوایٹ کو ان بچوں کے سامنے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ان بچوں کے والدین کا یہ خیال تھا کہ سب سے اچھا بورڈنگ ہاؤس وہی ہے جس کی فیس سب سے زیادہ ہو۔انھی میں ایک بورڈنگ ہاؤس کا نام کارنش کلف Cornish Cliff تھا۔بلقیس کو عاقل خاں نے اس میں داخل کر دیا۔میڈم جب ٹوٹی پھوٹی اردو میں باتیں کرتیں تو عاقل خاں اس اعزاز سے پھولے نہ سماتے اور خانم اس درجہ مرعوب تو نہ ہوتیں مگر خوش ضرور ہوتیں۔بلقیس جب تعطیلوں میں گھر آتی تو خانم اس کے لیے انگریزی کھانے پکواتیں اور جب اسے دیکھنے کارنش کلف جاتیں تو چاکلیٹ لے جاتیں۔''(۹۴)

مشرقی معاشرے میں شادی سے پہلے لڑکی لڑکا کا ملنا معیوب سمجھا جاتا ہے،لیکن خانم نے بلقیس کو ایسا کرنے کی اجازت دے دی،اور بلقیس کا نعیم کی موجودگی میں اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق کھل کر رائے دینا،انگریزی تمدن نے یہاں کی معاشرت کو بدلنا شروع کر دیا:

> ''خانم نے کہا'جمیل الحق صاحب کی بیوی مجھ سے بولیں۔آپ اجازت دیں تو میں بلقیس بی بی کو اپنے لڑکوں سے ملاؤں۔میں نے کہا۔لے جایئے،یہ ایسا کیا پردہ کرتی ہیں اور سچ بھی یہ پردہ ہی کیا کرتی ہیں۔خیر تو وہ لے گئیں۔ان کو ملایا۔یہ تو کہہ رہی ہیں کہ صورت اچھی نہیں،ذرا کالی ہے؟''(۹۵)

گریز میں نوآبادیاتی اثرات کے کئی واقعات ملتے ہیں،مثلاً۔بلقیس انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان لڑکی ہے۔اسی آزاد ماحول کی وجہ سے وہ اپنے ایک رشتہ دار داؤد سے بہت گہری دوستی کرتی ہے لیکن اس دوستی کے مثبت معانی معاشرہ سمجھنے سے انکار کر دیتا ہے۔یہ مثبت معانی مغربی تہذیب کا حصہ تو ہو سکتے ہیں،مشرقی تہذیب اسے اس طرح قبول نہیں کر سکتی۔نوآبادیاتی اثرات نے جب یہاں کی نوجوان نسل کو آزادی کے مفہوم سے آشنا کیا تو یہ اس آزادی کو اپنا حق سمجھنے لگے۔ان

دونوں کی ملاقاتوں کو سختی سے روک دیا جاتا ہے۔ ادھر داؤد کی بیوی اس پر شک کرنے لگتی ہے۔ جب داؤد سے ملنے پر پابندی لگا دی جاتی ہے تو بلقیس اس سے ملنے کے لیے ہوٹل چلی جاتی ہے۔ اس ملاقات کا علم جب بلقیس کے باپ کو ہوتا ہے تو وہ مار پٹائی پر اتر آتا ہے جس کے ردِعمل میں بلقیس خودکشی کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ بعد میں ڈاکٹروں کی کوششوں سے اسے بچالیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ انگریزی تہذیب اور ہندوستانی تہذیب کی یہ کشاکش ہر گھر کا حصہ بن چکی تھی۔ جدید نظامِ تعلیم کے باوجود گھریلو پابندیاں عائد کرنا، اس دور کے دوسرے معیارات کی نشاندہی کرتا ہے۔ نوآبادیاتی ہندوستان کی اس طرح نوجوان نسل نہ تو پوری انگریز بن پائی تا کہ ان جیسے ہنر سیکھ لے اور نہ ہی اپنی تہذیبی میراث کی حفاظت کر سکی۔ جدید اور قدیم کے اس سنگم نے مثبت اور منفی دونوں طرح کی تبدیلیاں مرتب کیں۔

مغرب کی اندھی تقلید نے مشرقی اقدار کو کس طرح ملیامیٹ کیا۔ ہندوستانی روایات، مذہبی رواداری، نسوانی حیا، خاندانی وقار اور مشرقی تہذیب کی شکست و ریخت کا المیہ بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ عزیز احمد نے ہندوستان کے اعلیٰ طبقے کی مغربی زندگی اور فیشن پرستی پر جابجا گہرا طنز کیا ہے اور ان کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ فرنگی آقاؤں کی تقلید اور ان کی نقل میں ان سے چند قدم آگے ہی نکل جانے کی سعی کرتے ہیں تو مصنوعی اور کھوکھلی مغربی تہذیب کے دلدادہ ہندوستانی اس وقت تماشا بن جاتے ہیں۔ نتیجتاً ان کی چال ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ بحری جہاز میں مسز چند کا مختصر لباس نعیم کی توجہ اپنی جانب کھینچتا ہے:

> ''دوسرے درجے کے عرشے پر راجہ ہمت نواز ونت بہادر مسز چند سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بلایا اور مسز چند سے ملایا۔ ہاتھ ملاتے وقت میں نے اپنے سر میں خون کی گرمی اور تیز محسوس کی۔ مسز چند وہی نہانے کا لباس پہنے ہوئے تھیں جس سے ان کی پیٹھ اور سڈول کاندھے اپنی پوری شانِ عریانی کے ساتھ باہر تھے۔ اس سے پہلے میں نے ایسے منظر صرف فلموں میں دیکھے تھے۔ اپنے دل میں کہا کہ یورپ میں ایسے ہزاروں منظر دیکھنے میں آئیں گے۔'' (۹۶)

مغربی معاشرت کے رنگ میں ہندوستان کا دولت مند طبقہ پوری طرح رنگا گیا تھا۔ اس کا اندازہ بحری جہاز میں راجہ صاحب سے نعیم کی ایک ملاقات میں ہوتا ہے:

> ''انصاری نے کہا راجہ صاحب بلا رہے ہیں۔ پہلے درجے میں ہم لوگ ان کے پاس پہنچے تو بیر کا شغل فرما رہے تھے۔ ضیافت کرنا چاہی تو میں نے معافی چاہی۔ میرے لیے لیمونیڈ منگوایا اور کہا یہ تو عورتوں کے پینے کی چیز ہے۔ ان کے درجے میں ایک امریکن لڑکی سفر کر رہی تھی۔ راجہ صاحب اس کے حسنِ جسمانی سے آج سہ پہر سرخرو ہوئے تھے۔ اس لیے بہت خوش تھے اور مجھ سے اور انصاری سے اپنے

کارنامے کی تفصیلات بیان کر رہے تھے۔'' (۹۷)

ناول کا ایک کردار مسٹر چند کلکتہ کے ایک مشہور سیٹھ ہیرا چند کے صاحبزادے ہیں، انھوں نے اپنی والد کی ٹائپسٹ جو بہت معمولی طبقے کی انگریز لڑکی ہے سے شادی کی۔ گویا انگریز لڑکی سے شادی کرنا ہی تفاخر کی نشانی تھی خواہ اس کا کردار کیسا ہی ہو۔ مسز چند کے کردار کی وضاحت اس منظر نامے سے ہوتی ہے:

''میں درجہ اول میں سیدھا راجہ صاحب کے کیبن میں پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی اور مسز چند کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کی آواز سن کے میں پلٹنے ہی والا تھا کہ راجہ صاحب نے دروازہ کھولا۔ ابھی سہ پہر کا وقت تھا مگر وہ اس قدر پیے ہوئے تھے کہ لڑکھڑا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہا، 'اندر آؤ'۔ میں گیا تو دیکھا کہ مسز چند بستر پر شال سے ڈھکی پڑی تھی اور وہ تقریباً مدہوش تھی۔ راجہ صاحب نے اسی طرح سے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔ 'یہ کیا شرارت ہے۔ تم سے اس وقت آنے کو کس نے کہا تھا۔ میں سمجھا چند ہے۔ میں نے دروازہ کھولا کہ آ اپنی جورو کو دیکھ۔ کل اسے پچاس پونڈ دیئے تھے۔ میں اکیلا بے وقوف ہوں، نہیں تو اس جہاز پر کون سا ہندوستانی لڑکا ہے جس نے اسے چھوا نہ ہو۔ کسی نے ایک پیسہ خرچ نہیں کیا میں بے وقوف ہوں بے وقوف۔'' (۹۸)

مسٹر چند بھی کسی سے کم نہیں، ظاہر ہے انھیں بھی معلوم ہوگا کہ راجہ صاحب نے کس خوشی میں انھیں پچاس پونڈ عطا کیے تھے: ''مسٹر چند اس وقت پورٹ سعید کی سیر فرما رہے تھے۔۔۔ ایک مصری لڑکے نے ان کا پیچھا کیا اور برابر پوچھتا گیا 'کوئی فرانسیسی لڑکی چاہیے؟' اور جب وہ چائے پینے ایک ہوٹل کے برامدے میں پہنچے تو سامنے کی میز پر ایک فرانسیسی لڑکی بیٹھی تھی۔ لڑکے نے کہا 'یہ لڑکی بھی مل سکتی ہے' اور مسٹر چند کو اس کا ہلکا رنگ سانولا رنگ اور اس کی مسکراہٹ بہت اچھی معلوم ہوئی۔ وہ مسکرائے اور وہ لڑکی بھی مسکرائی اور انھوں نے اس لڑکے کو کچھ انعام دے کر رخصت کیا اور وہ پھر مسکرائے اور وہ اٹھ کر ان کی میز پر آئی اور ان سے پوچھا 'ڈُ لے وہ فیرامواَ ک موآ؟' اور یہ باوجود اس ک ء کہ معنی نہ سمجھے تھے، مطلب سمجھ گئے اور کہا 'ہاں'! اور پھر انگریزی میں معاملہ طے ہوا اور وہ ایک پونڈ قرار پایا (پچاس پونڈ راجہ صاحب نے دیئے تھے)۔ اور پھر مسٹر چند لڑکی کو ہوٹل میں لے گئے اور کمرے کا کرایہ پانچ شلنگ ادا کیا۔'' (۹۹)

ایسا ہی ایک کردار بلقیس کا شوہر راحت خاں بھی ہے، خانم نعیم کو بتاتی ہے: ''بھئی شروع میں تو راحت خاں پردے کے بڑا اخلاف تھا۔ خود ہی تمام دوستوں سے ملایا، ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا۔ کئی دفعہ ڈانس میں لے گیا تھا۔ میں اور تمھارے چچا الٹے کہتے تھے کہ حیدرآباد میں اتنی آزادی اچھی نہیں۔ مگر یہ دونوں کب مانتے تھے۔ اور میاں حیدرآباد کا حال تو تم جانتے ہو، چیل اُڑے تو لوگ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ بھینس اُڑی۔ مگر راحت خاں کو عقل ہوتی تو اتنا تو پہچانتا کہ میں نے ہی

آزادی دی ہے۔وہ الٹا جلنے لگا۔یہاں مت آؤ، وہاں مت جاؤ۔اس کے سامنے مت نکلو۔اس سے پردہ کرو۔اور بلقیس کچھ کرے یا نہ کرے وہ لڑائیاں ہوتی ہیں کہ الٰہی توبہ۔۔۔خیر بلقیس نے پردہ کرنا شروع کر دیا۔اس کا کہنا ماننے لگی۔گھر سے باہر جانا چھوڑا تو خود راحت خاں نے عیاشی شروع کی۔اب سکندر آباد میں ایک اینگلو انڈین عورت کو گھر میں ڈال لیا ہے۔اس کے لیے سو روپیہ مہینے کرائے کا ایک مکان لیا ہے اور اسے موٹر میں لیے لیے پھرتا ہے۔''(۱۰۰)

نوآبادیاتی دور میں ایک طرف تو وہ طبقہ تھا جو مغرب کی اندھی تقلید میں اپنی روایات کو پامال کر رہا تھا تو دوسری طرف کچھ لوگ اپنی تہذیب کو بچانے کی سعی بھی کر رہے تھے۔یہ وہ لوگ تھے جو جدید علوم سے استفادہ تو کر رہے تھے لیکن اپنی تہذیب سے دست بردار نہیں ہوئے تھے۔اس کا سب سے عمدہ نمونہ حیدر آباد کا مدرسۂ علومِ آثار قدیمہ ہے۔اس کا نقشہ عزیز احمد یوں کھینچتے ہیں:

''جب حیدر آباد میں یہ مدرسہ قائم ہوا تو اس کا مقصد زیادہ تر یہ تھا کہ آثار قدیمہ کی تحقیق کے لیے نوجوانوں کو تیار کیا جائے۔لیکن بہت جلد اس میں بہت سے شعبوں کا اضافہ ہو گیا، اس کا نام تو مدرسہ علومِ آثار قدیمہ ہی رہا لیکن یہاں، تاریخ، فنونِ لطیفہ، تاریخِ ثقافت، طبقات الارض اور بہت سے علوم کی تعلیم دی جانے لگی۔''(۱۰۱)

برطانوی نوآبادیات میں ہندوستان کی ایک خاص سیاسی اہمیت بھی تھی۔گریز کی تخلیق ۱۹۴۳ء میں ہوئی، یہ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے کا زمانہ تھا جو سیاسی لحاظ سے پوری دنیا میں بہت ہی اُتھل پتھل کا زمانہ تھا۔گریز میں اس اُتھل پتھل کا زیریں اظہار بھی ملتا ہے۔ہندوستان کی سیاسی صورت حال، انگریزوں کا ظلم وستم، لندن میں انگریزوں کا ہندوستانیوں سے متعلق لوگوں کو خوش فہمی میں رکھنا، ہندوستان کی تحریکِ آزادی، یہاں کی غربت، یہاں کے رسوم ورواج، سیاسی بیداری، اشتراکیت کی طرف بڑھتا ہوا رجحان وغیرہ پہلو بھی اس ناول میں ملتے ہیں۔

لندن کے ایک ریستوران میں کچھ ہندوستانی نوجوان ہندوستان کی سیاست پر بحث کرتے ہیں وہ ہندوستان کے تحریک آزادی سے مجموعی طور پر متفق نہیں ہیں یا تحریکِ آزادی سے متعلق اُن کے ذہن میں مختلف سوالات اُبھرتے ہیں ایک نوجوان کہتا ہے:

''میں نے جواہر لال نہرو سے یہیں کہا تھا کہ پنڈت جی یہ تو فرمایئے کہ آپ اپنے ملک میں جو لڑائی لڑ رہے ہیں وہ ہندوستانی سرمائے اور برطانوی سرمائے کی لڑائی ہے یا ہندوستانی مزدور اور برطانوی سرمایہ دار کی۔''(۱۰۲)

دوسرا نوجوان کہتا ہے:

> ''گاندھی جی کے آشرم میں جاکے مجھے تیسرا روز تھا کہ ولبھ بھائی پٹیل سیوا گرام تشریف لائے۔ میں نے اُن دونوں سے کہا کہ آپ کی تحریک ڈاکوؤں کی تحریک ہے جو دوسرے ڈاکوؤں کو لوٹنا چاہتے ہیں مجھے یہ بتائیے کہ ہندوستانی کسان یا مزدور کا آقا گورے کے بجائے کالا ہو جائے تو کیا اُس کا پیٹ بھر سکے گا۔''(۱۰۳)

ان دونوں اقتباسات سے اُس دور کے نوجوانوں کی تشکیک کا پہلو اُبھرتا ہے یہ نوجوان اشتراکی ذہن رکھتے ہیں اور ہندوستان میں مزدور عوام کی حکومت چاہتے ہیں جو اشتراکیت کا بنیادی مطالبہ ہے، وہ تحریک آزادی کو سرمایہ داروں کے خلاف سرمایہ داروں کی جنگ تصور کرتے ہیں جس سے عوام کی بھوک اور غربت کا خاتمہ ناممکن ہے۔

مختلف نوجوان عالمی سیاست پر اشتراکیت اور اشتمالیت پر بحث کرتے نظر آتے ہیں اس کے ساتھ ہی وہ ملکی سیاست سے بھی بے بہرہ نہیں ہیں۔لندن کی ایک رات کی طرح گریز میں بھی ہندوستانیوں کے تئیں انگریزوں اور انگریزی اخباروں کے رویہ پر روشنی پڑتی ہے۔فرق یہ ہے کہ یہاں ہندوستانی عوام کو بالکل غیر مہذب اور پسماندہ تصور کیا جاتا ہے:

> ''نعیم نے ٹائمز کے ایک کونے میں گوشے میں ہندوستان کے معلق ایک چھوٹی سی خبر پڑھی۔ پھر سوچنے لگا کہ برطانوی پبلک ہندوستانی معاملات کے متعلق کس قدر تاریکی میں رکھی جاتی ہے یکا یک ہندوستان کے معلق خبریں پڑھنے کو اس کا جی چاہنے لگا اور پھر یہ خیال آیا کہ ہندوستان میں اِسے ہندوستان کی سیاسیات اور ہندوستانی خبریں پڑھنے میں کیسی الجھن ہوتی تھی۔ جہاں صبح کی امید ہی نہ ہو وہاں رات کو بار بار گھڑی دیکھنے سے کیا حاصل۔''(۱۰۴)

عام انگریزوں کے ذہنوں میں ہندوستان کی جو تصویر ہے وہ ایلس کے استفسار کی صورت میں یوں ہے: ''اور وہاں کے انسان۔۔۔کیا وہ جھونپڑوں میں رہتے ہیں کیا جیسا انگریزوں کا خیال ہے صرف راجاؤں اور مہاراجاؤں کو رہنے کے لیے مکانات ملتے ہیں۔باقی سب جنگلوں، جھونپڑوں، ٹیٹوں کے گھروں میں رہتے ہیں۔کیا وہاں کے مرد ظالم ہوتے ہیں اور عورتوں کو بند کر دیتے ہیں۔انھیں مارتے ہیں۔کیا وہاں ایک ایک مرد کئی کئی شادیاں کرتا ہے۔''(۱۰۵)

بعض موقعوں پر ہندوستانیوں کے تئیں انگریزوں کی نفرت کا جذبہ بھی ابھارا گیا ہے۔اور ساتھ ہی یہاں کے راجاؤں، مہاراجاؤں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی عیاشی کی تصویریں بھی پیش کی گئی ہیں کرنل ریمز جو ہندوستان میں رہا ہے ایلس کو ہندوستان کے بارے میں لکھتا ہے:

> ''ان بدمعاش کالی چمڑی والوں کو ذرا سر چڑھاؤ تو مصیبت ہو جاتی ہے۔ایلس نے احتجاج کے طور پر کہا 'یہ تو ہندوستان کے غریب اور جاہل طبقے کا حال ہوگا لیکن وہاں متوسط طبقے کے لوگ تو بڑے

شائستہ ہوں گے۔۔۔۔کچھ بابولوگ ضرور ہماری نقل کرتے ہیں ان بابوؤں کے سوا کسانوں اور راجاؤں کے درمیان اِس نے ہندوستان میں کسی مخلوق کو نہ دیکھا تھا پھر وہ مہاراجاؤں کے ساتھ اپنے شکار کے قصے سنانے لگا کس طرح وہ ڈیڑھ ڈیڑھ سو، دو دو سو بیویوں کے حرم رکھتے ہیں اور یہ راجاؤں ہی پر کیا موقوف ہے ہندوستان میں شاید ہی کوئی آدمی ہو جس کی دو تین بیویاں نہ ہوں۔'' (۱۰۶)

اس طرح انگریز برطانیہ میں ہندوستان کی بہت ہی مکروہ تصویر پیش کرتے لیکن اس میں بعض باتیں مبنی برحقیقت بھی ہیں جن سے دولت کی غلط تقسیم اور مزدوروں پر ظلم کی طرف بھی واضح اشارے ملتے ہیں۔اشتراکیت اس دور کا عام رجحان تھا اِسی لیے ان نوجوانوں کو اشتراکی انقلاب کی کرنیں ہر سو پھوٹتی نظر آتی ہیں۔نعیم بھی ہندوستان آکر اسی نوآبادیاتی حکمرانوں کا نمائندہ بن جاتا ہے:

''برہم پتر کی زندگی اس کی اپنی زندگی سے کچھ ملتی جلتی تھی، کچھ مختلف۔وہ اکثر شام کے وقت کچہری سے واپس آکر برہم پتر کو دیکھ دیکھ کر یہی سوچا کرتا۔اس کی زندگی کی روانی بھی اس ندی ہی کی سی تھی۔جہاں نشیب آیا۔پانی ڈھل گیا۔بارش زیادہ ہوئی، برف زیادہ گری تو پانی آ گیا۔کبھی کبھی سیلاب آ گیا اور غریبوں کے گھر تباہ ہو گئے۔برہم پتر کا سیلاب اور ڈپٹی کمشنر صاحب کا غصہ۔دونوں کی اپیل نہ سرکار کے پاس تھی نہ خدا کے پاس۔دونوں میں رعونت یکساں تھی مگر رعونت کی وجہیں مختلف تھیں۔برہم پتر کی رعونت اس کی وسعت، اس کے بہاؤ کے زور، اس کی گہرائی میں تھی اور نعیم کی رعونت کا باعث نہ کوئی وسعت تھی نہ گہرائی اور نہ کوئی زورِ حیات۔یہ رعونت زیادہ جھوٹی تھی۔برہم پتر کی روانی تو خیر صدیوں سے جغرافیائی حدود کی حد تک کم و بیش متعین ہے لیکن نعیم کی زندگی میں زورِ حیات اتنا معدوم تھا کہ مستقبل کی تخلیق اس کے بس سے باہر تھی۔'' (۱۰۷)

آئی۔سی۔ایس آفیسر کی زندگی نوآبادیاتی حکمرانوں کے نمائندہ کی تو ہوتی ہے لیکن اس میں بھی وہی شان و شوکت ہوتی ہے جو انگریز حاکموں کی زندگی کا حصہ ہوتی ہے:''یہ آرام کی، دوروں کی اور شکار کی زندگی۔کرسمس میں کلکتہ کا سفر، چورنگی کے ہوٹلوں میں ناچ، گرمیوں میں دارجلینگ، یہ زندگی جس میں ایک پورے ضلع کی رعایا اس کے نام سے کانپ جاتی تھی۔ہزاروں کا سلام، سینکڑوں کو سلام، یہ خوشامد پسند، خوشامد کرنے والی زندگی جو آہستہ آہستہ عمر کا ایک ایک سال کاٹتی جاتی ہے۔ہر سال پہاڑ پر بھیجتی ہے، انگریزوں سے دوستیاں کراتی ہے اور ان دوستیوں میں ذلت سی محسوس کراتی ہے۔یہاں تک کہ پنشن کا زمانہ آ جاتا ہے اور اس وقت اس زندگی میں مقام کی تبدیلی ہوتی ہے۔وقت گذرتا جاتا ہے لیکن زمان و مکان دونوں انسان کی گرفت سے باہر رہتے ہیں۔یہ عزت کی زندگی، یہ ناکامی کی زندگی یوں ہی گذر جاتی ہے۔اور سینکڑوں نوجوان جو آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں فیل ہوتے ہیں، عمر بھر اس کا ماتم کرتے رہتے ہیں۔'' (۱۰۸)

نوآبادیاتی اثرات میں جدید تعلیم کا بھی ایک کردار تھا، اگرچہ جدید تعلیم سے مشرقی اقدار ختم یا کم ہوتی جا رہی تھی ۔لیکن جدید تعلیم نے بہر حال شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ایک مقامی کالج میں جلسہ تقسیم انعامات کا منظر:

''جلسے کی کارروائی شروع ہوئی ۔مرد مہمان کم تھے۔لڑکیوں کے اقارب اور سب ہی طرح کی لڑکیاں تھیں ۔ہندو،مسلمان ،عیسائی ،پارسی ۔رنگ کے اعتبار سے کئی گوری لڑکیاں بھی تھیں ۔کالی بھی ، سانولی بھی ۔ہندوستان کے ہر صوبے کی لڑکیاں ۔''(۱۰۹)

اس جلسے میں نعیم کو دستخط کے واسطے ایک لڑکی اپنی آٹوگراف بک دیتی ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے آتا ہے اور اس آٹوگراف میں دوسرے لوگوں کی آرا بھی پڑھتا ہے، اس آٹوگراف بک میں ایک مرد خالد کی بھی رائے ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح مشرقی تہذیب مغربی رنگ میں رنگی جا رہی تھی:

''ایسی کتاب میں کچھ لکھنا\
جسے خواتین دیکھیں\
اور جسے مرد چھپ چھپ کے پڑھیں\
یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا\
میں شرمیلا ہوں\
اس لیے خدا حافظ\
بے انتہا پیار کے ساتھ۔۔۔\
تمھارا اپنا\
خالد''(۱۱۰)

مجموعی طور پر گریز نہ صرف تہذیبی اور نوآبادیاتی عوامل پر روشنی ڈالتا ہے بلکہ اس میں ہمیں عزیز احمد کا علم اور وسیع معلومات کی بھی جھلک ملتی ہے۔

حوالہ جات/حواشی

۱۔ جامع اردو انسائیکلو پیڈیا، جلد ا، ادبیات، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۳ء، ص ۳۸۹۔۳۸۷

۲۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، آج کا اُردو ادب، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۷۰ء، ص ۲۳۲

۳۔ شہزاد منظر، جدید اُردو افسانہ، کراچی: منظر پبلی کیشنز، مئی ۱۹۸۲ء، ص ۲۰۰

۴۔ شہزاد منظر، پاکستان میں اُردو ادب کی صُورتِ حال، ترتیب و تہذیب: ڈاکٹر اسد فیض، اِسلام آباد: پورب اکادمی، طبع اوّل، فروری، ۲۰۱۴ء، ص ۹۳

۵۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اُردو ناول، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۷ء، ص ۶۴

۶۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اُردو ناول کے ہمہ گیر سرو کار، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء، ص ۸۹

۷۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، دہلی: چمن بک ڈپو، اردو بازار، س۔ن، ص ۴۷

۸۔ ایضاً، ص ۴۸

۹۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، مطبوعہ: رسالہ اُردو، اکتوبر ۱۹۴۴ء، ص ۵۳۲

۱۰۔ حمیرا اشفاق، عزیز احمد کا تصور تاریخ و تہذیب، مقالہ پی ایچ ڈی، اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، ۲۰۱۲ء، ص ۱۹۹

۱۱۔ عزیز احمد، ہوس، بدتر از گناہ، لاہور: مکتبہ جدید، تیسری بار، ۱۹۵۱ء، ۱۶۴۔۱۶۳

۱۲۔ حمیرا اشفاق، عزیز احمد کا تصور تاریخ و تہذیب، مقالہ پی ایچ ڈی، اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، ۲۰۱۲ء، ص ۲۰۰۔۲۰۱

۱۳۔ عزیز احمد، ہوس، بدتر از گناہ، لاہور: مکتبہ جدید، تیسری بار، ۱۹۵۱ء، ص ۱۴۴۔۱۴۳

۱۴۔ عزیز احمد، گریز، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، ۱۹۸۲ء، ص ۴۹

۱۵۔ Victor Henri Brombert, *The Intellectual Hero*: Studies in the French Novel, 1880-1955, (Philadelphia and New York: Lippincott, 1961; Chicago: University of Chicago Press, 1964.) P,14.

۱۶۔ انور سدید، گریز مشمولہ، نیرنگ خیال، راولپنڈی: جلد ۵۹، شمارہ ۶۵۹، ستمبر اکتوبر ۱۹۸۲ء، ص ۲۷۲

۱۷۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، حیدرآباد: نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان، پہلی بار، دسمبر ۱۹۷۳ء، ص ۳۲۱

۱۸۔ عزیز احمد، ہوس، بدتر از گناہ، لاہور: مکتبہ جدید، تیسری بار، ۱۹۵۱ء، ص ۱۴۴۔۱۴۳

۱۹۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ او رتنقید، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۷ء، ص ۴۳۶

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۳۸

۲۱۔ وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۹۰ء، ص ۸۵

۲۲۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ لکھنؤ: ادارۂ فروغ اردو، امین آباد، دوسرا ایڈیشن، اگست ۱۹۶۲ء، ص ۳۳۵۔۳۳۴

۲۳۔ گریز، ص ۲۲۰

۲۴۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، اردو ناول آزادی کے بعد، یوپی: نکھار پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن، طبع اول، دسمبر ۱۹۸۱ء، ص ۷۶

۲۵۔ ایضاً، ص ۷۸۔۷۹

۲۶۔ عزیز احمد، گریز، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، ۱۹۸۲ء، ص ۱۳۵

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۲۰

۲۸۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، اردو ناول آزادی کے بعد، یوپی: نکھار پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن، طبع اول، دسمبر ۱۹۸۱ء، ص ۸۰۔۸۱

۲۹۔ ایضاً، ص ۸۱۔۸۲

۳۰۔ وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۹۰ء، ص ۱۶۰۔۱۵۹

۳۱۔ عزیز احمد، گریز، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۰۹

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۴۸

۳۶۔ عقیلہ بشیر، ڈاکٹر، اُردو ناول میں عورت کا تصور، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، غیر مطبوعہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ص ۱۴۱

۳۷۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، اردو ناول آزادی کے بعد، یوپی: نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، طبع اول، دسمبر ۱۹۸۱ء، ص ۸۷

۳۸۔ عزیز احمد، گریز، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، ۱۹۸۲ء، ص ۱۳۵

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۰۱

۴۰۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، اردو ناول آزادی کے بعد، یوپی: نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، طبع اول، دسمبر ۱۹۸۱ء، ص ۸۹

۴۱۔ عزیز احمد، گریز، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، ۱۹۸۲ء، ص ۱۷۳

۴۲۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، اردو ناول آزادی کے بعد، یوپی: نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، طبع اول، دسمبر ۱۹۸۱ء، ص ۱۰۲۔۱۰۳

۴۳۔ عزیز احمد، گریز، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، ۱۹۸۲ء، ص ۲۸۸

۴۴۔ وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۹۰ء

۴۵۔ عزیز احمد، گریز، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، ۱۹۸۲ء، ص ۵۵

۴۶۔ ایضاً، ص ۶۳

۴۷۔ ایضاً، ص ۴۶

۴۸۔ ایضاً، ص ۲۸

۴۹۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، لکھنؤ: ادارۂ فروغ اردو، امین آباد، دوسرا اڈیشن، اگست ۱۹۶۲ء، ص ۲۳۵

۵۰۔ عزیز احمد، گریز، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، ۱۹۸۲ء، ص ۱۴۹

۵۱۔ ایضاً، ص ۳۰۲

۵۲۔ ایضاً، ص ۳۳۱

۵۳۔ ایضاً، ص ۲۲۰

۵۴۔ ایضاً، ص ۷

۵۵۔ ایضاً، ص ۱۴

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔۱۳۸

۵۷۔ ایضاً،ص ۱۷۱

۵۸۔ ایضاً،ص ۱۸۳۔۱۸۴

۵۹۔ ایضاً،ص ۲۸۸

۶۰۔ ایضاً،ص ۳۰۲

۶۱۔ ایضاً،ص ۱۶۷۔۱۶۸

۶۲۔ ایضاً،ص ۱۷۷۔۱۷۸

۶۳۔ ایضاً،ص ۳۴۶

۶۴۔ ایضاً،ص ۱۳۵۔۱۳۶

۶۵۔ ایضاً،ص ۵۵

۶۶۔ ایضاً،ص ۲۷۷۔۲۷۸

۶۷۔ ایضاً،ص ۹۰

۶۸۔ ایضاً،ص ۱۶۹

۶۹۔ ایضاً،ص ۲۹۱

۷۰۔ ایضاً،ص ۲۳۳۔۲۳۴

۷۱۔ ایضاً،ص ۲۵۹

۷۲۔ ایضاً،ص ۹۳

۷۳۔ ایضاً،ص ۱۰۲

۷۴۔ ایضاً،ص ۱۱۱۔۱۱۲

۷۵۔ ایضاً،ص ۱۱۳۔۱۱۴

۷۶۔ ایضاً،ص ۱۳۶

۷۷۔ ایضاً،ص ۲۷۰

۷۸۔ ایضاً،ص ۲۸۶۔۲۸۸

۷۹۔ ایضاً،ص ۲۹۶

۸۰۔ ایضاً،ص۳۰۸

۸۱۔ ایضاً،ص۵۳

۸۲۔ ایضاً،ص۵۳

۸۳۔ ایضاً،ص۶۳

۸۴۔ ایضاً،ص۶۳۔۶۴

۸۵۔ ایضاً،ص۸۹۔۹۰

۸۶۔ ایضاً،ص۱۸۰

۸۷۔ ایضاً،ص۱۸۲

۸۸۔ ایضاً،ص۱۹۱

۸۹۔ ایضاً،ص۲۱۰

۹۰۔ ایضاً،ص۲۷۲۔۲۷۳

۹۱۔ ایضاً،ص۲۷۳۔۲۷۴

۹۲۔ ایضاً،ص۲۸۳

۹۳۔ ایضاً۔ص۹

۹۴۔ ایضاً،ص۱۵۔۱۶

۹۵۔ ایضاً،ص۳۰

۹۶۔ ایضاً،ص۵۳

۹۷۔ ایضاً،ص۵۳

۹۸۔ ایضاً،ص۶۳

۹۹۔ ایضاً،ص۶۳۔۶۴

۱۰۰۔ ایضاً،ص۳۲۰

۱۰۱۔ ایضاً،ص۷۱

۱۰۲۔ ایضاً،ص۹۵

۱۰۳۔ ایضاً،ص۹۶

۱۰۴۔ ایضاً،ص۱۰۵

۱۰۵۔ ایضاً،ص۱۶۸

۱۰۶۔ ایضاً،ص۱۷۵۔۱۷۶

۱۰۷۔ ایضاً،ص۳۱۶۔۳۱۷

۱۰۸۔ ایضاً،ص۳۱۷

۱۰۹۔ ایضاً،ص۳۳۶۔۳۳۷

۱۱۰۔ ایضاً،ص۳۴۰

باب چہارم

عبداللہ حسین کا تہذیبی و نوآبادیاتی شعور بحوالہ اُداس نسلیں

ا۔ عبداللہ حسین: احوال و آثار

عبداللہ حسین ۱۴/اگست ۱۹۳۱ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ اس کا اصل نام محمد خان تھا۔ والد محمد اکبر خان برطانوی راج میں راولپنڈی میں ایکسائز انسپکٹر کی حیثیت سے ملازمت کرتے تھے، جن کا آبائی وطن پاکستان کا صوبہ خیبر پختونخوا کا ضلع بنوں تھا۔ عبداللہ حسین کے والدین وطن کو خیر باد کہہ کر پنجاب میں آ بسے تھے۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ عبداللہ حسین اپنے والد کی پانچویں مگر آخری بیوی کی پہلی اور آخری اولاد تھے اور پانچ برس کی عمر سے ہی اپنے آبائی شہر گجرات میں رہنے لگے تھے۔ چونکہ عبداللہ حسین کے والد سرکاری ملازمت میں تھے اس وجہ سے انھیں ملک کے مختلف علاقوں میں منتقل ہونا پڑا۔ وہ راولپنڈی کے علاوہ فیروز پور اور جھنگ میں بھی رہے۔ (۱)

عبداللہ حسین کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی تھی۔ محمد اکبر خان اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت اور رہن سہن پر پوری توجہ دیتے تھے اور ان کا ہر وقت خیال رکھتے تھے۔ نو برس کی عمر میں عبداللہ حسین کی مذہبی درس و تدریس کے سلسلے میں صدرالدین نام کے ایک مولوی کو رکھا گیا۔ انھوں نے پرائمری کی تعلیم سناتن دھرم اسکول میں حاصل کی جو ۱۹۶۰ء کے بعد مدرسۃ البنات کہلایا اور ۱۹۴۶ء میں گجرات کے اسلامیہ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۲ء میں انھوں نے زمیندار کالج، گجرات سے بی ایس کی۔ (۲)

عبداللہ حسین جب تعلیمی مراحل میں تھے اور گریجوایشن کے لیے کالج میں گئے تھے تو وہاں انگریزی زبان سے ہی زیادہ واسطہ پڑتا تھا چاہے وہ تاریخ ہو، جغرافیہ ہو یا اکنامکس۔ انگریزی ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے ان کو اس زبان پر دسترس حاصل ہوگئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے کئی انگریزی ناول پڑھے۔ پھر دیگر یورپی ادب کا انگریزی ترجمہ پڑھا۔ روسی اور فرانسیسی ناول پڑھے۔ انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے ترجمے خود کیے اور براہِ راست انگریزی میں بھی ان کی تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ (۳)

ان کے گھریلو حالات بہت اچھے نہیں تھے اس وجہ سے وہ اس ملک میں آگے کی تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور اسی سال ضلع جہلم کے ڈنڈوت میں واقع ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری اور نیشنل فیکٹری میں بطور اپرینٹس کیمسٹ ملازمت اختیار کر لی۔ بعد

ازاں میانوالی کے داؤدخیل میں واقع میپل لیف سیمنٹ فیکٹری میں کیمسٹ کے عہدہ پر تقرری ہوئی۔۱۹۵۹ء میں عبداللہ حسین کو کولمبو پلان کا فیلوشپ ملا۔میک ماسٹر یونی ورسٹی کینیڈا سے کیمیکل انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کرنے کی غرض سے کینیڈا جانا پڑا لیکن صرف ایک سال دو مہینے بعد ہی پاکستان لوٹ آئے جہاں ان کو پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن میں سینئر کیمسٹ کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔(۴)

عبداللہ حسین کی طبیعت میں ٹھہراؤ یا یکسانیت کم تھی۔وہ اپنے والد کی طرح ہمیشہ باغیانہ ذہن کی طرح کام کرتے رہے۔ممکن ہے یہ ذہنیت بچپن کے دور کی حکومتی پالیسیوں یا برطانوی سامراج میں رونما ہونے والے واقعات یا حالات سے تجربوں کی شکل میں ان کی زندگی کا حصہ بن گئی ہو۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۶۵ء میں پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کی ملازمت سے استعفادے دیا اور فاروقیہ سیمنٹ فیکٹری میں چیف کیمسٹ کی حیثیت سے ملازمت کرلی لیکن یہاں بھی وہ اپنی بے چین طبیعت کی وجہ سے زیادہ دن نہ ٹک سکے اور دسمبر ۱۹۶۶ء میں اس فیکٹری کو بھی خیرباد کہا۔پھر پاکستان سے لندن چلے گئے اور وہاں برمنگھم شہر کے ایک ادارے کول بورڈ (Coal Board) میں اپرینٹس کیمسٹ کی حیثیت سے ۱۹۶۷ء میں ملازمت اختیار کی لیکن محض دو سال ہی یہ ملازمت رہی اور اسے چھوڑ دیا اور لندن کے ایک ادارے نارتھ تھامس گیس بورڈ سے وابستہ ہوگئے، لیکن کچھ عرصہ بعد قدرتی گیس دریافت ہوئی تو معاشی حالت کچھ زیادہ بہتر نہ ہونے کے سبب ادارے نے اپنی مرضی سے ملازمت سے سبکدوش ہونے والوں کو خصوصی پیکیج دینے کا اعلان کیا اور عبداللہ حسین نے ۱۹۷۵ء میں استعفادے دیا، ان کے اہل خانہ کو یہاں آئے ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے۔ایک سال بعد انھوں نے پھر پاکستان کا رخ کیا اور وہاں مستقل سکونت کا ارادہ کیا لیکن اس زمانے میں پاکستان میں سیاسی ہنگامہ آرائی عروج پر تھی۔انھوں نے انتخاب کے دوران اپنے دوست حنیف رامے کا خوب بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا لیکن وہ الیکشن ہار گئے تو ان کو کافی صدمہ پہنچا۔انتخابی سرگرمیوں کے باعث وہ نئی حکومت کی نگاہ میں بھی آچکے تھے اس لئے مجبوراً ۱۹۷۷ء کے درمیانی عرصہ میں برطانیہ چلے گئے۔چند مہینوں بعد ان کی بیوی کو لیبیا کی ایک کمپنی میں ملازمت مل گئی اور عبداللہ حسین پھر لیبیا کو روانہ ہوگئے۔اب ان کو قدرے سکون حاصل تھا اور فرصت کے لمحات میسر تھے۔(۵)

عبداللہ حسین کی شادی ڈاکٹر فرحت آرا سے ۱۹۶۳ء میں ہوئی جن سے ایک بیٹا علی خان اور ایک بیٹی نور فاطمہ ہیں۔(۶)

عبداللہ حسین کے والد کو شکار کا بڑا شوق تھا۔اپنی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کی دلچسپی شکار سے خوب بڑھی معاشی حالات بہتر نہ ہونے کے سبب انھیں زراعت کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔گجرات میں زراعت کے لئے ان کے پاس

اراضی تھی۔کھیتی باڑی اور دیہی زندگی سے قریب تر رہنے کے باعث عبداللہ حسین کی نشو ونما میں یہ سارا ماحول، مناظر اور حالات کارفرما رہے۔عبداللہ حسین کو اپنے والد سے شدید محبت تھی۔عبداللہ حسین کا کہنا تھا کہ ان کے والد کو مطالعہ کا شوق تھا اور بہت اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ان کی ذاتی لائبریری بھی تھی، ان کے پاس سترہ جلدوں پر مشتمل کتاب *The Secrets of the Court of King James* موجود تھی۔اس کتاب کا اس زمانے میں رکھنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔وہ برطانوی حکومت کے ملازم ہونے کے باوجود اپنے باغیانہ مزاج کی وجہ سے اس پابندی سے ذرا خائف نہ تھے۔جب ذہنی تربیت اور اس کی پرداخت ایسے ماحول میں ہو تو پھر عبداللہ حسین میں اس طرح کی خصوصیات کا در آنا لازمی تھا۔(۷)

اپنے والد سے بے پناہ محبت اور شیفتگی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

''میں اپنے والد کا اکلوتا بیٹا تھا۔لڑکپن کے زمانے میں ان کے ہمراہ پندرہ پندرہ بیس بیس میل شکار کے پیچھے گھومتے ہوئے انھوں نے مجھے زمین اور آسمان کی ساری جاندار اور بے جان چیزوں کے بارے میں، جو کچھ وہ جانتے تھے بتایا۔کھیت، فصلیں، کسان، دھوپ، بادل، بارش، چرند پرند، رنگ، موسم، سب! پھر جاڑوں کی صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے کی روشنی میں کمر کمر تک یخ پانی میں کھڑے بندوقیں کندھے پر رکھے مرغابیوں کا انتظار کرتے ہوئے انھوں نے مجھ سے مردوں اور عورتوں۔۔۔۔انسانوں اور آدمیوں کے بارے میں باتیں۔لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا، محبت اور نفرت اور جنس، دوستی اور دشمنی اور قربانی اور غیرت۔۔۔۔زندگی کی دوسری بڑی بڑی باتوں کا ذکر کیا۔جب تک وہ رہے ان کی دھیمی، متوازن، دانا آواز میرے ساتھ ساتھ رہی اور کسی شخص، کسی شے کے خوف کا سایہ بھی پاس نہ پھٹکا۔''(۸)

ماں کا وجود ان کے لئے اتنا ہی اہم تھا جتنا والد کا۔وہ اس بات پر ملول تھے کہ انھوں نے تمام زندگی صدمے سہے اور کبھی کبھار تو ایسا محسوس کرتے تھے جیسے وہ کوئی عظیم Shock Absorber قسم کی کوئی چیز ہوں۔انھوں نے زندگی کے تلخ حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، پرکھا اور سمجھا۔ان سے جو بھی تجربات ملے یا تو سکھ کی شکل میں، یا کبھی صدمات کے روپ میں۔دراصل ان سے حاصل شدہ موخذہ سے ہی انھوں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں کی بنت کاری کی۔ان کے یہ جملے ملاحظہ ہوں:

''میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ماں کی کمی میری شخصیت کی تکمیل میں اتنا ہی اہم رول ادا کرتی ہے جتنا کہ والد سے میری وابستگی۔میرے اندر ماں کی ضرورت ہمیشہ ایک دبی دبی سطح پر موجود رہی ہے جسے آپ لاشعوری کہہ سکتے ہیں۔میں نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا۔وہ مجھے یاد تک نہیں لیکن یہ کمی کبھی دور نہیں ہوئی ہمیشہ موجود رہی ہے اور میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ کمی، یہ تلخی کا احساس جو لاشعوری ہے بعض اوقات اس

وابستگی سے زیادہ شدید ہو گیا جو مجھے والد سے تھی۔ تلخی کا یہ پرانا احساس زیادہ گہرا اور اثر دار تھا اور اس نے مجھے زیادہ متاثر کیا ہے۔ میں نے اپنے والد کا زیادہ ذکر کیا ہے کیونکہ وہ زیادہ حقیقی تھے ایک جسمانی اور حقیقی سطح پر، لیکن ماں کسی اور سطح پر، گہری سطح پر زیادہ اصلی معلوم ہوئی ہے اور پوشیدہ طاقت ثابت ہوئی ہے اور شاید زیادہ اثر دار۔ میں اس سکون اور طمانیت سے محروم رہا ہوں جو میں نے لوگوں کو اپنی ماؤں سے حاصل کرتے دیکھا ہے۔ مجھے یہ سکون اور سکھ حاصل کرنے کا موقع ہی نہ ملا، یہ سکون مجھے کسی اور سے نہ مل سکا، نہ والد سے، نہ بہنوں سے۔ اس وجہ سے میرا بچپن بہت دکھ میں گزرا۔ اگر میں نے اس طرح دکھ نہ اٹھایا ہوتا تو اس طرح لکھا بھی نہ ہوتا۔ کسی اور طرح لکھا ہوتا شاید بالکل ہی نہ لکھتا۔ میرا یقین ہے کہ جسمانی تکلیف سے، کسی قسم کی تکلیف سے کسی نہ کسی طرح کی تخلیقی چیز جنم لیتی ہے۔''(۹)

عبداللہ حسین نے جب اپنے لئے کوئی قلمی نام اختیار کرنا چاہا تو انھیں خود اپنا نام محمد خان پسند نہ آیا صرف اس لئے کہ کرنل محمد خان وہاں پہلے سے موجود تھے۔ انھیں سیمنٹ فیکٹری کا ہم منصب ''طاہر عبداللہ حسین'' کا نام اچھا لگا اور انھوں نے ''عبداللہ حسین'' بطورِ قلمی نام اختیار کر لیا۔

عبداللہ حسین نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات کہانی لکھنے سے کی تھی اور باقاعدہ اشاعتی سلسلہ ۱۹۶۲ء میں رسالہ سویرا لاہور میں شائع ہونے والی کہانی ندی سے ہوتا ہے۔ ندی کی اشاعت کے ایک برس بعد اسی رسالے میں ان کی تین کہانیاں سمندر، جلاوطن، پھول کا بدن شائع ہوئیں۔ ۱۹۶۳ء میں عبداللہ حسین کی ایک اور کہانی دھوپ چھپی۔ پھر انھوں نے طویل خاموشی اختیار کر لی۔ ۲۷ر فروری کو ایک گفتگو (مطبوعہ سویرا، لاہور، شمارہ ۳۵) میں عبداللہ حسین نے کہانی لکھنے کے اپنے ابتدائی دور کی دلچسپی کے تعلق سے کہا تھا:

''یہ جو لکھنے کا معاملہ ہے، یہ میں نے بہت پہلے سے شروع کر دیا تھا۔ میں نے اپنی پہلی کہانی اس وقت لکھی تھی جب میں میٹرک میں پڑھتا تھا۔ وہ کچھ ایسی تھی کہ، ایک ہمارے بھائی ہیں، ایک ہماری بھابھی ہیں اور ایک بھابھی کی بہن ہیں۔ وہ ہمارے گھر آئیں اور میں ان سے ملا۔ Boy Meets Girl قسم کی رومانی چیز تھی۔ اس کا نام مجھے یاد ہے۔ ''سورج کی کرنیں'' یہ کہانی بہت عرصے تک میرے پاس رہی، پھر پتہ نہیں کہاں گئی۔ اس کے بعد میں نے ایک اور کہانی لکھی اس میں بھائی کا ذکر تھا۔ حالانکہ میرا کوئی بھائی نہیں لیکن پتہ نہیں کیا چکر تھا، میرے ذہن میں۔ خیر، کہانی میں یہ تھا کہ بھائی کی جہاں شادی ہوئی ہے، میں اس گھر میں جاتا ہوں۔ کہانی کا صیغہ واحد متکلم تھا اور وہاں دو بہنیں تھیں۔ ایک بڑی ہے اور ایک چھوٹی ہے اور دونوں مجھے ایک طرح سے Seduce کرتی ہیں یا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بس ایسی ہی کچھ کہانی تھی۔ مجھے اس کا نام بھی یاد نہیں۔ یہ کہانی چھپی بھی تھی۔ میں

لاہور میں فرسٹ ائیر میں پڑھتا تھا۔ لاہور سے ایک زمانے میں بڑا واہیات سا رسالہ نکلا کرتا تھا جس کا نام حسن پرست تھا، اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر کوئی خراب چیز میں نے اس زمانے میں لکھی ہے تو اب میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ وہ میں نے نہیں لکھی۔ وہ میری پہلی کہانی تھی جو چھپی۔ اس کے چند سال بعد میں نے تین اور کہانیاں لکھیں۔ اس وقت میں بس ایس سی میں پڑھتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ ان کہانیوں میں کیا تھا، بہر حال وہ تین کہانیاں تھیں۔ ان دنوں نقوش نیا نیا نکلا تھا۔ ہم نے پڑھا، بڑا پسند آیا۔ وہ تینوں کہانیاں ان کو بھیج دیں۔ نقوش کے مدیر نے کہانیاں واپس کر دیں اور کوئی اس قسم کی بات لکھی کہ آپ کو لکھنے کی سمجھ تو ہے لیکن سلیقہ نہیں۔ یا لکھنے کا سلیقہ تو ہے لیکن سمجھ نہیں اور ذرا مشق کریں۔ بہر حال ہم بڑے بددل ہوئے کہ اپنی طرف سے ہم نے بڑی شاہکار کہانیاں لکھیں اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ پھر تین چار سال اسی طرح گزر گئے۔''(۱۰)

عبداللہ حسین کو ان کے ناول اداس نسلیں پر ۱۹۶۳ء میں آدم جی ادبی انعام اور اکادمی ادبیات پاکستان نے ادبی خدمات کے صلے میں کمال فن ادب انعام ۲۰۱۲ء میں دیا۔

تصانیف:

(۱) رات، (ناول) لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

(۲) نادار لوگ، (ناول) لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء

(۳) سات رنگ (ناول)

(۴) بانجھ (ناول)

(۵) اداس نسلیں، (ناول) لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء

(۶) قید، (ناول) لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

(۷) باگھ، (ناول) لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۲ء

(۸) واپسی کا سفر، (ناول) ۱۹۸۰ء

(۹) نشیب، لاہور: قوسین، ۱۹۸۱ء، ۲۱۴ص (ناولٹ اور افسانے)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء

(۱۰) فریب (چھ افسانوں کا مجموعہ)، ۲۰۱۲ء

(۱۱) آزاد لوگ (نامکمل، نادار لوگ کا دوسرا حصہ، غیر مطبوعہ)

(۱۲) *Emigre Journeys*، (انگریزی ناول)، ۲۰۰۰ء

(۱۳) *The Afghan Girl* (انگریزی ناول)

(۱۴) *The Weary Generations*، (اداس نسلیں کا ترجمہ)

۲۔اداس نسلیں کاتہذیبی ونوآبادیاتی مطالعہ

اداس نسلیں کا موضوع برطانوی ہندوستان ہے۔یہ ناول اپنے اندر جہاں ایک عہد کی تاریخ سموئے ہوئے ہے وہاں اس دور کی مشرقی اور مغربی تہذیب کا بھی ایک حوالہ ہے جس سے اس دور کا نوآبادیاتی ہندوستان سامنے آتا ہے۔ناول کے واقعات کی ابتدا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے ہوتی ہے اور اختتام قیام پاکستان پر ہوتا ہے۔ناول میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، جاگیردارانہ ذہنیت کا پھیلاؤ، کانگریس کی سیاست، آل انڈیا مسلم لیگ کی جدوجہد، جلیانوالہ باغ کا سانحہ، مسلم تشخص کا احساس، دوسری جنگ عظیم اوراس کے ہندوستان پر اثرات، ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد، تقسیم ہند کے فسادات اور قیام پاکستان کے واقعات کو خاص طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔اداس نسلیں کی تخلیق کے بارے میں عبداللہ حسین کا کہنا ہے:

''۱۹۵۶ء میں والد فوت ہوئے، پھر میں بیمار ہوگیا، اسپتال میں رہا۔جب میں ٹھیک ہوگیا تو میں نے یہ ناول (اداس نسلیں) لکھنا شروع کیا۔''(۱۱)

اداس نسلیں لکھنے کے لئے عبداللہ حسین نے مواد کی فراہمی کا کام جون ۱۹۵۶ء سے ہی شروع کردیا تھا۔وہ پانچ سال تک اس پر محنت کرتے رہے اور مئی ۱۹۶۱ء میں یہ پایۂ تکمیل کو پہنچا لیکن اس کی اشاعت ۱۹۶۳ء میں عمل میں آئی۔اس ناول میں تین نسلوں کے کوائف بیان کئے گئے ہیں۔اس ناول کے پلاٹ اور مرکزی خیال کے بارے میں ان کا کہنا ہے:

''اس کا جو پلاٹ ہے، مرکزی پلاٹ، وہ شروع سے آخر تک ایک ہی دفعہ ذہن میں آیا تھا۔جب لکھنا شروع کیا تو اس وقت یہ میرے لئے اتنی اہم نہ تھی، پھر میں نے باقاعدہ اس بارے میں پڑھنا شروع کیا۔کتابیں پڑھیں، لوگوں سے ملا، شروع کے کئی باب لکھنے کے بعد کی بات ہے۔میں نے باقاعدہ تاریخ پڑھی، اپنے عہد کی تاریخ، جنگ کے سلسلے میں بڑے دور دور کے گاؤں میں جاکر پرانے سپاہیوں سے ملا۔''(۱۲)

عبداللہ حسین کے اس ناول کو لکھنے کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ ایک صوبیدار خداداد خان سے ملنے کے لئے جنھیں پہلی جنگ عظیم میں وکٹوریہ کراس ملا تھا، پندرہ میل پیدل چلنا پڑا۔عبداللہ حسین چاہتے تھے کہ ناول میں حقیقی واقعات بھی شامل ہوں۔وہ اس زمانے کے حقائق کو اس انداز سے فکشنائز کرنا چاہتے تھے کہ تاریخی وقوعے سامنے آجائیں۔تاریخ کے اوراق کا مطالعہ ان کا ذوق وشوق بن گیا اور انھوں نے کافی کتابیں پڑھیں۔اس کے باوجود انھوں نے اس کا اعتراف کیا کہ اداس نسلیں کو بہت شعوری طور تاریخی ناول سمجھ کر نہیں لکھا اور نا کا خیال ہے کہ نہ ہی یہ تاریخی ناول ہے۔وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بنیادی طور پر اس ناول کو ایک محبت کی کہانی (Love

Story) سمجھ کر لکھا تھا اور آخر وقت تک ان کے ذہن میں یہی تصور تھا۔ یونیسکو نے اداس نسلیں کو انگریزی ترجمے کے لئے منتخب کیا۔ برطانیہ میں اپنے دورانِ قیام عبداللہ حسین نے اداس نسلیں کا انگریزی ترجمہ The Weary Generations کے نام سے کیا تھا۔ اس کی اشاعت سے انگریزی حلقوں میں بھی اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ ہندوستان میں ہارپر کولنز اور پاکستان میں سنگ میل پبلی کیشنز نے اسے چھاپا۔ عبداللہ حسین کی اصل پہچان ان کے ناول اداس نسلیں سے ہے۔ اب تک اس کے پچاس سے زائد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر زیب النساء سعید کے بقول:

''بلاشبہ یہ ناول عالمی ادب کے معیار پر پورا اترتا ہے۔''(۱۳)

عبداللہ حسین نے اپنے ناول اداس نسلیں میں کسی ایک کردار کو موضوع نہیں بنایا بلکہ انھوں نے دیہاتی زندگی کی عکاسی کے علاوہ دیہاتیوں کی تمام تر سیاسی جدوجہد اور عوامی کشمکش کو اپنے ناول میں بیان کیا ہے۔ یہ ناول پوری ایک نسل کی تاریخ بن جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ایک پُرآشوب دور سے ہمکنار ہو کر آزادی سے آشنا ہونے والی اس نسل نے ہندوستان میں قائم جاگیردارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھا کر مصیبتوں کو دعوت دی۔ بنیادی طور پر نعیم اور عذرا باغی کرداروں کے طور پر سامنے آتے ہیں لیکن باقی تمام باغی کردار اجتماعی طور پر یعنی بے نام کارکنوں کی صورت میں سرگرمِ عمل نظر آتے ہیں۔ عذرا بنیادی طور اتنا مؤثر کردار نہیں ہے لیکن نعیم کی محبت اور اس کی ترغیب کے نتیجے میں وہ باغی خیالات کی مالک بن جاتی ہے اور بعد میں وہ نعیم کی مددگار کے طور پر اس کے ہی کردار کا ایک پرتو بن کر سامنے آتی ہے۔ نعیم نہ صرف ذاتی بلکہ اجتماعی سطح پر بھی بغاوت کرتا ہے۔ ذاتی سطح پر وہ اپنے ہی طبقے یعنی زمینداروں کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور اجتماعی سطح پر وہ دیگر کسانوں کو تحرک دلا کر ان کا سرخیل بن جاتا ہے۔ وقتی ناکامیاں اس کے حوصلے پست نہیں کرتیں بلکہ وہ لائحۂ عمل بدل کر نئے سرے سے اپنی بغاوت کو جاری رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

عبداللہ حسین کو اردو ناول کے معماروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ ایسی خوش قسمت شخصیت ہیں جنھیں ان کے پہلے ناول اداس نسلیں (۱۹۶۲ء) کی بناء پر ہی مستند ناول نگار ہونے کی چھاپ لگ گئی۔ ان کے زیادہ تر ناول دیہی زندگی کے عکاس ہیں۔ اداس نسلیں پر پریم چند کے ناول گئو دان اور قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا کے گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناول میں پنجاب کے ایک دیہات روشن پور کا ذکر ملتا ہے۔ کہانی میں نہ صرف دیہی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے بلکہ دیہاتیوں کی تمام تر سیاسی جدوجہد اور عوامی کشمکش کو بھی منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

زمان و مکان کے اعتبار سے اداس نسلیں متحدہ ہندوستان کی تہذیبی و معاشرتی فضا کی پیش کش سے عبارت ہے۔ کس کا اختتام بھی تقسیم کے المیے پر ہوتا ہے۔ تقسیم سے پہلے اور تھوڑے بعد کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی حالات اس ناول

کا پس منظر ہیں۔لیکن فکری سطح پر یہ ناول ہندوستان تو اریخ اور تہذیب کے پورے پس منظر کا احاطہ کرتا ہے۔

''عبداللہ حسین نے 'اداس نسلیں' میں جس فکری رو کو موضوعاتی تشخص دیا ہے، اس کا دائرہ نسلوں کی تاریخ وتہذیب کے جذباتی اور فکری تارو پود کی محض ادھیڑ بن تک محدود نہیں بلکہ اس طبقے کا محاکاتی استعارہ بھی ہے جو سیاسی ثقافتی اور تہذیبی زاول و انقاء کے تحت الشعوری ادراک سے ہم آمیزی کرتا ہے۔''(۱۴)

اداس نسلیں میں اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے:

'' آج جو کچھ بھی نہیں ہے، ہمارا ضمیر یا مذہب یا احساس ذمہ دار نہیں۔ ہماری شخصیت ہے ہم کھو چکے ہیں، ضائع کر چکے ہیں، ہماری انفرادیت ہے۔آج فرد نہیں ہے۔محض ہم غول ہیں۔تم جانتے ہو آج جو خوفناک احساس تنہائی ہم سب پر طاری ہے کس لیے ہے، تم جانتے ہو، تم خوب جانتے ہو۔''(۱۵)

اداس نسلیں میں متحدہ پنجاب کا دیہات پوری طرح نمایاں ہے۔تقسیم سے قبل کے پنجاب کے گاؤں کے کسانوں کی زندگی ان کی تہذیبی و معاشرتی اقدار کی عکاسی اس ناول کو اپنے عہد کے دوسرے ناولوں سے ممیز کرتی ہے۔ڈاکٹر قمر رئیس اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''گئو دان'' کی طرح اس ناول میں اس دھرتی کی بو باس، کھیتوں اور کھلیانوں کی حیات بخش کھلی فضا، البیلے موسموں کا تغیر اور ایک کسان کی زندگی کے ظاہری لوازم اور باطنی کوائف کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔''(۱۶)

عبداللہ حسین نے اپنے ناول اداس نسلیں میں کسی ایک کردار کو موضوع نہیں بنایا بلکہ پوری نسل کی تاریخ کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ اداس نسل ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد ایک آشوب سے ہمکنار ہوئی تھی اور نوے سال کی تگ ودو کے بعد آزادی سے آشنا ہوئی۔ناول میں اسی نسل کی جدوجہد کی عکاسی کی گئی ہے۔عنوان کے اعتبار سے ناول میں کرداروں کی بھرمار ہے اور مختلف طبقہ ہائے زندگی سے منسلک لوگ یعنی سیاستدان، کسان، مہاجرین سبھی لوگ شامل ہیں۔

فرزانہ سید اداس نسلیں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''اداس نسلیں'' ان تمام مسائل کو اپنے گھیرے میں سمیٹے ہوئے ہے اس نے ہماری منافقتوں کا پردہ بھی چاک کیا اور ہماری آنکھوں پر خوش عقیدگی اور خوش فہمیوں کی جو پٹیاں بندھی ہوئی تھیں وہ بھی کھول دیں اس طرح پہلی دفعہ اپنی حقیقت کا ادراک ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ ناول مسلم معاشرے کے تہذیبی خدوخال کی عکاسی کرتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کے سماجی اثرات میں پلنے والی زندگی کی ہی تصویر پیش کرتا ہے۔''(۱۷)

اداس نسلیں دوخاندانوں کی زندگیوں کواس طرح پیش کرتا ہے کہ جس کے مطالعہ سے ہندوستان کے تاریخی اور سیاسی پس منظر میں پنجاب کے جاگیردارانہ نظام میں کسانوں اور مزدوروں کے رہن سہن اور وقت کے ساتھ ان کی بدلتی ہوئی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔دونوں خاندان مشرقی پنجاب اور دلی کے درمیانی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔روشن پور گاؤں کی تاریخ بہت مختصر ہے۔لیکن اپنے اختصار کے باوجود یہ مشترکہ تہذیب کا خوب صورت نمونہ ہے۔

ناول میں روشن آغا، جاگیردار روشن پور، اوران کے دوست مرزا محمد بیگ کی نسلیں اپنی حرکت وعمل اور کارکردگیوں سے ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی سیاسی جدوجہد، ۱۹۱۹ء جلیاں والا باغ، پہلی جنگ عظیم، ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت اور نچلے طبقے پر جاگیرداروں کے ظلم، فیکٹریوں اور ملوں پر انگریزوں کے کسے ہوئے شکنجوں، مزدور یونین، انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ، ہندوستان کے گرم دل کے دہشت پسندوں کے سیاسی عمل، ملک کی آزادی، اور تقسیم تک ایک لمبا سفر طے کرتی ہیں۔جہاں سیاسی اور تاریخی رفتار کے ساتھ ہندوستان کی ان نسلوں کی تہذیب، ان کی سماجی زندگی، خیالات اور نفسیات کو بھی متاثر کرتی ہیں۔اس ناول میں وقت ایک کردار کی حیثیت رکھتا ہے جس سے دونوں خاندانوں کی نسلیں متاثر ہوتی ہیں۔جاگیردار روشن آغا (انگریزوں نے جنھیں روشن پور کی جاگیر عطا کی تھی) کی نسل پر انگریزی تہذیب کا اثر دکھائی دیتا ہے۔جس کی پہلی پیڑھی کے ہندوستان کے مشہور سیاسی لیڈر رانی بیسنٹ، تلک اور پٹیل وغیرہ سے تعلقات ہیں۔لیکن اس نسل کا ملک کی سیاسی سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ اپنے عیش وآرام اور انگریزوں کی خاطر ومدارات میں منہمک نظر آتی ہے۔دوسری نسل روشن آغا کی اولاد غلام محی الدین اوران کی نسل جس میں پرویز، عذرا، نجمی وغیرہ شامل ہیں۔روشن آغا کی اولادوں میں صرف عذرا میں سیاسی بیداری نظر آتی ہے۔تیسری نسل نجمی، مسعود اور پرویز کے بچے عمران وغیرہ کی ہے۔جو تقسیم ملک کے بعد پاکستان کے باشندوں میں شریک ہوجاتے ہیں۔ان کی زندگی امیرانہ اور عیش پرورانہ ہے۔یہ ملک پر برطانوی حکومت کے ظلم وستم سے بے بہرہ ہیں۔جلیانوالہ باغ کے سانحہ سے بھی ان کے ضمیر متزلزل نہیں ہوتے اور نہ ہی سیاسی جہدوجہد میں حصہ لیتے ہیں اگر چہ تقسیم کا ان پر وقتی اور لمحاتی اثر دکھائی دیتا ہے۔انتقالِ مکانی پر بھی انھیں ان دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا جس سے روشن پور کے عوام دوچار ہوئے۔

دوسرا خاندان مرزا بیگ یعنی روشن آغا کا دوست ہے۔یہ دوستی مرزا بیگ کی موت کے بعد معاشی حالات کی ابتری کی وجہ سے ختم ہوجاتی ہے جو بعد میں طبقاتی فرق کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔مرزا بیگ کو زراعت اور صنعت وحرفت سے دلچسپی تھی جس کی وجہ سے اس خاندان کی پہلی نسل نیاز بیگ اور ایاز بیگ کے حصے میں کاشتکاری آئی۔اس نسل کا تعلق پنجاب کے کھیتوں اور کسانوں سے ہے۔یہ جاگیرداروں کے ظلم سہتے ہیں ان کو لگان سیتے ہیں۔اور رات دن کاشتکاری کرتے ہیں۔تیسری

نسل نیاز بیگ کی اولا دوں نعیم اور علی کی ہے۔علی فیکٹری مزدور ہے۔جو فیکٹریوں میں انگریزوں کے ظلم وستم کو برداشت کرتا ہے۔اور مزدور وغیرہ کے وجود اور ان کی سیاسی جدوجہد سے متاثر ہوتا ہے۔اس کے ساتھی آزادی اور انقلاب کے خواہش مند ہیں۔نعیم ایک ایسا کردار ہے جو تعلیم یافتہ ہے۔کلکتہ سے سینئیر کیمبرج کرنے کے بعد اپنے باپ نیاز بیگ کے ساتھ کاشت کاری کرتا ہے اور پھر روشن پور کے نوجوان کسانوں، مہندر سنگھ وغیرہ کے ساتھ اسے ہندوستان کی انگریز حکومت فوج میں بھرتی کر کے پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کے محاذ پر بھیج دیتی ہے جہاں نعیم کا ایک ہاتھ زخمی ہو جاتا ہے۔یہ ایک طرح سے ہندوستان پر انگریزوں کی بالا دستی اور دباؤ کی نشاندہی کرتا ہے۔اس قربانی کے بدلے اسے وکٹوریا کراس اور بہت سی سرکاری زمین ملتی ہے جو بعد میں نعیم کے انڈین کانگریس اور ہندوستان کی سیاسی جدوجہد میں شامل ہونے کے سبب واپس لے لی جاتی ہے۔

اس طرح اداس نسلیں طبقاتی سماج اور زندگی کے فرق کو بخوبی پیش کرتا ہے۔ان طبقات کا درمیانی فرق تقسیم کے بعد تک پاکستان میں بھی برقرار رہتا ہے۔ایک طرح سے یہ ناول ۱۹۱۹ء کے بعد ہندوستانی عوام کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ پیش کرتا ہے۔ناول کا اہم کردار نعیم کانگریس پارٹی کی نمائندگی میں کسانوں کو بتانا چاہتا ہے کہ ان کا کس طرح سے استحصال ہو رہا ہے۔گرم دل کے دہشت پسند اپنے ساتھ ہوئی صدیوں کی ناانصافی اور سماجی نابرابری کا انتقام دہشت گردی کے ذریعہ لینا چاہتے ہیں۔وہ مال گاڑیوں کی پٹریوں اور انگریزی افسروں کو مار کر آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔علی کے ذریعہ ناول نگار نے مل مزدوروں کی ہڑتال اور مزدور یونین کی صورت حال پر روشنی ڈالی ہے۔جس سے مارکسی خیالات کی طرف بھی واضح اشارے ملتے ہیں۔ناول کے ابتدائی حصوں میں نوجوان نسلوں میں غلامی کا شدید احساس بھی نظر آتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ حسین نے شعوری طور پر ان تحریکات اور مختلف سیاسی نظریات کو ناول کے کینوس میں سمونے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے تقسیم کی طرف ناول کا رخ موڑنے میں مدد ملتی ہے۔

ناول میں جس زمانے کا ذکر کیا گیا ہے اس زمانے میں ہندوستان جاگیردارانہ نظام کے شکنجے میں تھا اور اس وقت آزادی کے لیے آواز اٹھانا نہ صرف بہت بڑی بغاوت تھی بلکہ مصیبتوں کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔اس ناول کے بہت سے کرداروں نے نہ صرف اپنے لیے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی آزادی کا علم اٹھا کر حکومتِ وقت سے بغاوت کی البتہ ہمیں ناول کے ہیرو نعیم اور ہیروئن عذرا کی بغاوت کا تذکرہ جا بجا ملتا ہے جبکہ باقی باغی کرداروں کی باغیانہ جدوجہد کو زیر بحث لایا گیا ہے لیکن ان کرداروں کو اجتماعی طور پر بے نام یعنی کارکنوں کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔

کہانی روشن پور کے ایک گاؤں سے شروع ہوتی ہے جو دہلی اور پنجاب کی سرحد پر واقع ہے جہاں یوپی اور پنجاب

کی تہذیب اور تمدن ہے گاؤں کا ماحول مخلوط تمدن کا حامل تھا۔اس گاؤں کا جاگیر دار روشن آغا ہے جس سے ایک کہانی منسوب ہے کہ اس نے کس طرح جنگ آزادی کے دور میں ایک انگریز جانسن کی جان بچائی اور جب جنگ آزادی ناکام ہوئی تو انگریزوں نے اسے اس کارنامے کے صلے میں پانسو مربعوں پر مشتمل ایک جاگیر دی تھی اور آغا کا خطاب بھی دیا تھا۔روشن پور کے تمام لوگ سوائے مرزا محمد بیگ کے آغا صاحب کے مزارعین میں سے ہیں ۔مرزا صاحب اور آغا صاحب گہرے دوست ہیں ۔مرزا محمد بیگ کے دولڑکے تھے نیاز بیگ اور ایاز بیگ ۔دونوں بھائیوں کی فطرت میں بڑا فرق تھا۔ایاز نے ریلوے میں نوکری کر لی اور کلکتہ چلا گیا اور تعلیم کی غرض سے نیاز بیگ کے لڑکے نعیم کو بھی لے گیا۔نعیم نے وہاں سے سینئر کیمرج کا امتحان پاس کیا۔نعیم کی ملاقات روشن محل کے نواب محی الدین کی لڑکی عذرا سے ہوئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا۔نعیم ناول کا ہیرو ہے۔اس کی عذرا سے پہلی ہی ملاقات میں جنسی حرکتیں سامنے آنے لگتی ہیں ۔پرویز (عذرا کا بھائی) کے پاس ہونے کی خوشی میں جو پارٹی ہوئی اس میں نعیم بھی تھا اور عذرا سے علیحدہ کنج میں بیٹھ کر باتیں کر رہا تھا:

> ''تمھارے ہونٹ ربڑ کی طرح پھیل جاتے ہیں ۔میرا جی کرتا ہے ہاتھ لگاؤں ۔۔۔۔نعیم نے ہاتھ بڑھا کر اندھیرے میں اس کے ہونٹوں کو چھوا اور ان پر انگلی پھیرتا رہا۔پھر اس کی ناک اور آنکھوں کو چھوا، پھر گالوں کو دبا کر محسوس کیا، پھر جبڑے اور ٹھوڑی پر سے پھسلتا ہوا اس کا ہاتھ عذرا کے گول، مضبوط کندھے پر آ گرا اور وہیں پڑا رہا۔گیلے جسموں اور ہرے پتوں کی بو اُن کے ناک میں داخل ہو رہی تھی۔''(۱۸)

یہاں عبداللہ حسین کا نعیم ۔عزیز احمد کے گریز والے نعیم سے بہت قریب آ گیا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ عزیز احمد کا نعیم ذرا زیادہ سمجھ دار ہے ذہین ہے۔

نیاز بیگ نعیم کا باپ ایک جفا کش کسان ہے۔اس میں بہت سی خوبیاں ہیں اسے اپنے کھیتوں سے محبت ہے۔اپنی فصل سے محبت ہے ۔اس بڑھاپے میں وہ اپنی دو بیویوں کو مطمئن رکھ سکتا تھا۔عبداللہ حسین نے نعیم کی دونوں ماؤں کے باہمی تعلقات پر چونکا دینے والے واقعات کا انکشاف کیا ہے۔ان عورتوں میں ایک جوان ہے اور دوسری ادھیڑ عمر۔ان دونوں میں سے کسی کا نام نہیں معلوم ہو پاتا لیکن ان کی گفتگو، ان کے آپس کے لڑائی جھگڑے، ان کا سوت کی حیثیت سے ایک دوسرے سے جلن اور فحش مکالمے جنسی حقیقت نگاری کے طور پر پیش کئے گئے ہیں:

> ''پرسوں میں نے اسے کھلایا اور لے کے آج تو اسے گھس گئی۔گرم کتیا۔'' بوڑھی عورت نے کہا۔'اور پچھلے مہینے کھلا پلا کر میں میکے چلی گئی تھی تو تو نے گل چھرے نہیں اُڑائے میرے مال پر'۔'تمھارا یار جو مر گیا تھا، تیرا جانا تو ضروری تھا۔اور کھا پی کر کیا وہ تیری ماں کے پاس جا کے سوتا'۔'زبان بند کر چڑیل۔ میرا مال مفت میں نہیں آیا۔تیرا جوان بیٹا کل آیا ہے۔آج ہی رات کو۔آج ہی رات کو تو نے۔چ

ہیں؟' 'تجھے شرم نہیں آتی کم ذات ۔نو مہینے ہوئے نہیں اسے لوٹے اور لے کے بچہ باہر پھینک دیا۔استغفراللہ' 'بدمعاش ۔تیرے سفید بالوں کا لحاظ ہے ورنہ میں تیرے بیٹے سے ڈرتی نہیں ہوں' ۔چھوٹی عورت نے عمداً سر ننگا کر کے اپنے سیاہ بال بڑھے کی طرف جھٹکے۔''(۱۹)

نعیم کا باپ دونوں عورتوں کی گفتگو سن کر اس طرح مخاطب ہوتا ہے:

''چپ رہو بے وقوفو۔تم دونوں کو باہر نکال دوں گا۔دونوں کو مار دوں گا۔دونوں کو پیٹوں گا۔دونوں کو۔۔۔۔بھونکنا بند کرو۔کتیو۔دونوں کو کتے خرید دوں گا۔دونوں کو گدھے خرید دوں گا۔دونوں کو سؤر خرید دوں گا۔پھر ٹھیک ہے۔''(۲۰)

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ باتیں سارے گاؤں کو معلوم ہیں۔سکھ نوجوان مہندر سنگھ جو گاؤں میں نعیم کا دوست بنا۔اس نے نعیم سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا:

''تین دن ایک چودھری کو مکھن کا پیڑا اور مرغا کھلاتی ہے،تین دن دوسری۔ساتویں دن چودھری کھیتوں میں جا کر سوتا ہے مگر جب ایک کا کھا کر دوسری کے پاس چلا جاتا ہے تو لڑائی ہو جاتی ہے ۔۔۔جب چودھری جیل میں تھا تو دونوں بہنوں کی طرح رہیں اور ایک ہی تھالی میں کھاتی رہیں اور کسی غیر مرد کی ران نہیں دیکھی۔''(۲۱)

نعیم سینئر کیمبرج پاس کر کے اپنے باپ کے پاس گاؤں میں آجاتا ہے یہاں اس کے کئی دوست بن جاتے ہیں۔سکھ نوجوان مہندر سنگھ اس کا گہرا دوست ہے۔وہ ایک دلچسپ اور جاندار کردار ہے۔نعیم اس کے ساتھ جوگندر کے چچیرے بھائی کے قتل کا انتقام لینے بھی جاتا ہے۔وہاں جو قتل ہوئے وہ ایک ڈرامائی سین ہے،وہاں مردوں نے قتل کئے اور عورتوں نے ان لاشوں کے ٹکڑوں کو ٹوکریوں میں ڈال کر دریا میں بہا دیا۔

نعیم پھر فوج میں بھرتی ہو کر چلا جاتا ہے۔جنگ کے مناظر بے حد دلچسپ ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ حسین نے جنگ اور اس سے متعلق واقعات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔جنگ میں نعیم کا ایک بازو ضائع ہو جاتا ہے لیکن بہادری کے صلے میں اسے کراس ملتا ہے۔

آغا محی الدین جو کہ گاؤں کا جاگیردار تھا موٹرانہ لینے کے سلسلے میں اپنے ہرکاروں کو گاؤں بھیجتا ہے یعنی یہ کہ انھوں نے موٹر خریدنی تھی اس کی قیمت غریب کسانوں سے زبردستی وصول کی جارہی تھی۔آغا کا منشی گاؤں کے ایک بوڑھے احمد دین کی بے عزتی کرتا ہے اس کے گلے میں پٹکا باندھ کر آغا صاحب کی بگھی کے پاس لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔اس واقعے سے نعیم بہت متاثر ہوتا ہے اسے انسان کی اس انتہائی ذلت پر بہت افسوس ہوتا ہے۔اسے ایک ماسٹر دہشت پسندوں کے

گروہ میں شامل ہونے کی دعوت دیتا ہے اور نعیم اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہاں عبداللہ حسین نے تاریخ کے اس دور کے واقعات دہرائے ہیں جب کہ انگریزوں کے خلاف ایک طرف کانگریس برسرپیکار تھی اور دوسری طرف یہ دہشت پسند حکومت کو ہر طرح سے نقصان پہنچا رہے تھے۔ لیکن دہشت پسندوں کی ہر بات انتہا پسندی کی مثال تھی۔ دہشت پسند آمرانہ پالیسی کے تحت اپنی تحریک کو منظم رکھتے تھے۔ چنانچہ نعیم یہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد چلا جاتا ہے لیکن یہاں کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں عبداللہ حسین نے نعیم کی جنسی بے راہ روی کے لیے ایک لڑکی شیلا تخلیق کی ہے۔ یہاں پھر عزیز احمد کے ''گریز'' کی سی فضا ہوگئی ہے۔ شیلا کی کہانی اپنی جگہ پر انتہائی پراثر اور دلچسپ ہے۔ اس کا کردار بہتر ہے، لیکن عبداللہ حسین یہاں نعیم کی جنسی تسکین کا سامان کرتا ہے۔ یہاں شیلا اور نعیم کے جنسی تعلقات ہو جاتے ہیں۔ نعیم شیلا کو بوسوں کے بارے میں بتا رہا ہے:

> ''اچھا سنو۔ یہ پانی کی طرح ہوتے ہیں جب پیاس لگی ہو تو پانی میٹھا لگتا ہے جب نہ لگی ہو تو بدمزہ ہے ، دراصل اس کا کوئی مزہ ہی نہیں ہوتا۔'' (۲۲)

نعیم ایک رات شیلا کو اکیلا چھوڑ کر وہاں سے بھاگ لیتا ہے۔ کچھ دن گاؤں میں وہ کھیتی باڑی کرتا رہا پھر دلی چلا گیا وہاں وہ روشن محل کی شان دار پارٹیوں میں مدعو کیا جانے لگا۔ عذرا نے باوجود سخت مخالفت کے نعیم سے شادی کر لی۔ اور وہ وہیں پر بڑی حویلی میں رہنے لگے۔ اتنے میں جلیاں والے باغ میں گولی چلنے کا واقعہ پیش آیا اور وہ دونوں امرتسر پہنچے جہاں درندہ صفت جنرل ڈائر اور اس کے سپاہیوں نے نہتے لوگوں کے سینوں پر گولیاں برسائی تھیں۔ امرتسر میں انھیں ایک مچھلی والا ملا۔ جس نے پہلے تو اپنی داستان سنائی پھر جلیاں والا باغ کے سانحے کی تفصیل بتائی۔ دراصل یہ سارے واقعات تاریخ بیان کرنے کے سلسلے میں آئے ہیں۔ مشہور واقعات کی ترتیب سے انھوں نے ہندوستان کی سیاسی تاریخ دہرائی ہے۔ اور جب وہ دونوں دلی واپس جا رہے تھے تو انھیں اپنے ڈبے میں چند برٹش آرمی کے افسر نظر آئے ان میں ایک جنرل وہ بھی تھا جس کے حکم سے گولیاں چلائی گئی تھیں وہ بڑے جارحانہ انداز میں اپنی شجاعت کے قصے سنا رہا تھا اور حکومت نے جس ہنٹر کمیٹی کو انکوائری کے لیے مقرر کیا تھا تلخ الفاظ میں یاد کر رہا تھا۔ پرنس آف ویلز جب ہندوستان آیا تو عذرا اور نعیم دونوں کلکتہ گئے وہاں جو واقعات پیش آئے ان کا بیان ہے اور دل چسپ ہے۔ Tell your mother we are not happy اور Tell your mother we are hungry کے جو بورڈ لگے ہوئے تھے ان کا خاص ذکر ہے۔ پھر نعیم نے جاٹ نگر کے کسانوں کے سامنے تقریر کی اور گرفتار کر لیا گیا۔ اور اسے لکھنؤ جیل بھیج دیا گیا۔ اور جب سائمن کمیشن لکھنؤ آیا تو عذرا وہاں پہنچی۔ جلیاں والا باغ کا سانحہ، جاٹ نگر میں باغیانہ تقریریں اور گرفتاریاں، سائمن کمیشن کی لکھنؤ میں آمد، پرنس آف ویلز کا دورہ ہندوستان۔ یہ سب ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں آنے والے واقعات ہیں جس میں ہیرو یا تو خود شامل ہے

یااس جگہ پر گیا ہے۔

نعیم قید سے رہا ہو کر پھر اپنے گاؤں کی حویلی میں آ گئے۔ یہاں آکر پھر نعیم کو اپنی بیوی کے شان دار بدن کا خیال آتا ہے۔اپنے چکنے شان دار بدن والی، بھرے ہونٹ، خواہشات سے سلگتی ہوئی عورت سے مل کر قوی انسانی خواہشوں کا احساس ہوا جن سے وہ اتنے سال ناآشنا رہا تھا۔انھوں نے رات کو میاں بیوی کی محبت کی۔مگر وہ ایک دبی دہشت کے اثر سے اپنی خیالی خوشبودار عورت کے جسم کو اپنے وجود میں مدغم نہ کر سکا۔جیل کی پُرصعوبت زندگی اور مضر خوراک نے اس سے قوت مردانگی چھین لی تھی۔گاؤں کی تندرست زندگی، کھلی ہوا اور شکار کھیلنے کے بعد گوشت کی خوراک نے جلد ہی اسے توانا بنا دیا اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ جسمانی اور ذہنی سکون کی زندگی بسر کرنے لگا۔

کہانی تاریخ کی روشنی میں آگے بڑھتی ہے۔نعیم اور عذرا دونوں دلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک بڑے اجلاس میں شرکت کرتے ہیں۔جس کی صدارت آغا خان نے کی تھی۔پھر گاندھی جی کی سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی اور نعیم کی نگرانی میں نمک تیار ہوا۔نعیم ایک دفعہ پھر گرفتار ہوا۔رہائی کے بعد وہ اپنے گاؤں گیا اور اس پر فالج کا حملہ ہوا۔عذرا اسے دلی لے آئی جہاں ڈاکٹر انصاری نے اس کا علاج کیا۔اب تقسیم ہند کے واقعات پیش آتے ہیں وہ وزارت تعلیم میں انڈر پارلیمنٹری سیکریٹری تھا اسے شاید یہ عہدہ اس کی کانگریس پارٹی کی خدمات کے صلے میں ملا تھا۔لیکن یہاں کے ماحول اور خود کو سرکاری افسروں میں Adjust نہ کر سکا اور اپنے گاؤں چلا جانا چاہتا تھا یہاں وہ مطالعہ میں غرق رہنے لگا۔یہاں اس کا دوست تھا انیس الرحمٰن پارلیمنٹری سیکریٹری۔نعیم نے اپنے دل کی ساری باتیں اسے بتائیں۔انیس الرحمٰن نے اسے بتایا کہ صحیح عمل اور صحیح قدم میں ہی راہ نجات ہے۔انیس کا وجودی دہریت کا فلسفہ بھی اسے تسکین نہ دے سکے۔شہر میں ہندو مسلم فسادات کی آگ بھڑکی ہوئی تھی وہ اپنی بیوی کو (جس کے متعلق اسے بعد میں شدید احساس ہوا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا) چھوڑ کر اس ہجوم میں شامل ہو جاتا ہے جو آزادی زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا۔نعیم ایک قافلے کے ساتھ پاکستان آرہا تھا کہ راستے میں بلوائیوں نے اسے مار دیا۔(عذرا اپنے بھائی کے ساتھ پاکستان جا چکی تھی) پاکستان میں عذرا نے اپنے دل کی بے چینی پر فتح پالی اور سادہ زندگی گذارنے لگی۔نعیم فسادات میں شہید ہو جاتا ہے اور یہاں کہانی کو ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن پاکستان بننے کے واقعات کو بیان کرنا ضروری تھا اس لیے کہانی نعیم کے سوتیلے بھائی علی کے سہارے چلتی ہے۔علی ایک محنتی انسان کا کردار ہے۔اسے عائشہ سے محبت تھی جس سے اس کی شادی ہو گئی۔فسادات کے زمانے میں جب وہ بیمار عائشہ کو لے جا رہا تھا تو اس کی ملاقات نعیم سے ہوئی۔اس نے اسے بھی گاڑی میں بٹھا لیا۔جب نعیم اور عائشہ مارے جاتے ہیں تو علی پاکستان پہنچتا ہے۔یہاں اس کی ملاقات بانو سے ہوتی ہے۔یہ وہی بانو ہے جو کبھی شیلا تھی اور جس نے نعیم

کے ساتھ کئی راتیں گذاری تھیں۔ بانو علی کو اپنی کہانی سناتی ہے اور پھر علی کی شادی بانو سے ہو جاتی ہے۔

ناول کا مرکزی کردار نعیم ہے۔ نعیم ابھی تین برس ہی کا تھا کہ اس کے باپ کو نیم سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی بنا پر بارہ سال کی قید ہوئی اور ان کی کافی زمین بھی ضبط کر لی گئی۔ نعیم کو اس کے چچا ایاز بیگ اپنے ساتھ کلکتہ میں لے آئے اور اسے اعلیٰ انگریزی سکول سے تعلیم دلوائی۔ وہ نعیم کی پرورش میں اس درجہ مصروف رہے کہ خود رشتہ ازدواج میں منسلک نہ ہو سکے۔ نعیم کو شروع ہی سے سیاست سے دلچسپی تھی جبکہ چچا اسے سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد جب نعیم اپنے چچا کے ساتھ روشن آغا (نواب علی خان) کے گھر دعوت پر گیا تو اس کی ملاقات روشن آغا کے بچوں عذرا اور پرویز سے ہوئی۔ اس ملاقات میں اس نے سیاسی معاملوں پر دل کھول کر اظہارِ خیال کیا۔ نعیم اور اس کے خاندانی پس منظر کے بارے میں ڈاکٹر محمد عارف رقمطراز ہیں:

''......نعیم کے بزرگ تنے ہوئے رسے پر چلتے ہوئے لوگ تھے۔ ایک بھائی خیر خواہ اور دوسرا باغی تھا۔ نعیم خیر خواہ چچا کے زیر کفالت پلنے بڑھنے والا، باغی باپ کا بیٹا تھا۔ لہٰذا، عمر بھر وہ خیر خواہانہ اور باغیانہ رجحانات کا جھولا جھولتا رہا۔'' (۲۳)

نعیم والد کی رہائی کے بعد گاؤں میں اپنے باپ کے ساتھ زمینوں کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ نعیم نے دیہات میں جاگیرداروں اور زمینداروں کی طرف سے مزارعوں پر کیے جانے والے مظالم کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اسی لیے وہ ان ظالموں سے نفرت کرنے لگا۔ وہ ان دل شکن رویوں پر افسردہ ہوتا۔ اس نے دل میں ٹھان لی کہ وہ غریب کسانوں کو ضرور نجات دلائے گا۔ اس نے اپنی زندگی کے لیے کسی اور راستے کا انتخاب کر لیا تھا اسی لیے دوبارہ چچا سے ملنے کی زحمت نہ کی حالانکہ چچا نے کئی بار پیغام بھی بھجوائے۔ نعیم نے کسانوں کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی لیکن وہاں جا کر اسے حالات کی اصل سنگینی کا احساس ہوا اور اس احساس نے اس کے باغیانہ رویے کو پنپنے کا موقع فراہم کیا۔ اس حوالے سے سجاد حارث لکھتے ہیں:

''......لانس نائیک نعیم کے ساتھ جب کہانی سرکاٹ کیمپ اور ہولی بیک منتقل ہوتی ہے تو سامراجی منڈیوں اور منافع کی خاطر لڑی جانے والی عالمی جنگ میں ہزاروں معصوم اور خوبصورت نوجوانوں کی لاشیں بنی نوع انسان کے خلاف مغربی سامراج کی سازشوں کا پردہ فاش کر دیتی ہے۔'' (۲۴)

پہلی جنگ عظیم کے محاذ پر لڑتے ہوئے نعیم اپنے بائیں بازو سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس سانحے کے بعد وہ ملازمت سے اعزازی طور پر ریٹائر ہو کر گاؤں واپس آ جاتا ہے اور کمیٹی کے اسسٹنٹ بالمکند کے کہنے پر کانگرس کے لیے کام کرنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ باقاعدہ سیاسی زندگی کا آغاز کر لیتا ہے اور دہشت پسند گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات شیلا نامی لڑکی اور اس کے بھائی مدن سے ہوتی ہے۔ نعیم مدن سے مدد مانگتا ہے کہ وہ نعیم کے ساتھ مل کر کسانوں میں شعور پیدا

کرے اور انھیں ان کی حق تلفی سے آگاہ کرے۔ مدن نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور جواز پیش کیا کہ ایسا کر کے کچھ کیے بغیر ہی جیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مدن کی یہ بات سنتے ہی نعیم آگ بگولا ہو گیا اور تقریباً چلاتے ہوئے بولا:

''جیل جانے سے پہلے تم ہندوستان بھر میں آگ لگا سکتے ہو۔ تم بھی اپنی طاقت سے بے خبر ہو مدن۔
جب تم چلے جاؤ گے تو وہ لوگ دوسرے لوگوں کو بتائیں گے، اور جب وہ چلے جائیں گے تو دوسرے
دوسروں کو بتائیں گے اور جب وہ کمر سیدھی کر کے کھڑے ہوں گے تو۔'' (۲۵)

درج بالا اقتباس سے نعیم کی باغیانہ سوچ کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ نعیم انقلاب کا خواہاں ہے۔ شیلا کے کہنے پر نعیم کو دہشت پسند تنظیم سے الگ ہونا پڑتا ہے کیونکہ تنظیم اسے خفیہ پولیس کا ایجنٹ سمجھ لیتی ہے۔ اس طرح نعیم واپس گاؤں آجاتا ہے۔

نعیم عذرا سے ذہنی مطابقت رکھنے کی وجہ سے شادی کر لیتا ہے۔ عذرا اور نعیم نے سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ کانگریس سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اسے انکوائری کمیٹی میں شامل کر لیا گیا جو کانگریس نے غیر سرکاری طور پر امرتسر فائرنگ کی تفتیش کے لیے مقرر کی تھی۔ ایک بوڑھے مچھلی فروش نے سانحۂ امرتسر کا آنکھوں دیکھا حال نعیم اور عذرا کو بتایا۔ نعیم کو واقعہ سننے کے بعد جنرل ڈائر سے نفرت ہو گئی۔ دورے سے واپسی پر جب جنرل ڈائر انھیں ٹرین میں نظر آیا تو نعیم کے جسم میں غم و غصے کی ایک لہر اٹھی۔ نعیم کی اس حالت کو مصنف نے یوں بیان کیا ہے:

''نعیم کے ہاتھ اسے مار گرانے کے لیے کانپنے لگے۔'' (۲۶)

امرتسر کے دورے کے بعد نعیم تلخ حقائق سے آگاہ ہوا اور اسی وجہ سے اس کے اندر پیدا ہونے والی بغاوت کی آگ مزید بھڑکنے لگی۔ اسے حکومت کی مکاریوں سے نفرت ہونے لگی کیونکہ حکومت نے سانحہ امرتسر میں مارے جانے والوں کی تعداد چار سو بتائی تھی حالانکہ مرنے والے اس سے کہیں زیادہ تھے۔

امرتسر میں بھڑکنے والی آگ نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس عرصے میں نعیم اور اس کی بیوی عذرا بھی کسانوں میں پھرتے رہے۔ نعیم کسانوں میں شعور پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں وہ ہمت و حوصلہ پیدا کرنا چاہتا تھا جس کے بل بوتے پر وہ اپنے حق کے لیے سینہ تان کر کھڑے ہو جائیں۔ نعیم اس بات سے بھی بخوبی آگاہ تھا کہ جب تک کسان خود اپنے حق کے لیے صف آرا نہ ہوں گے، اس وقت تک ان کے لیے حصولِ حق ناممکن ہے۔

عذرا کو کسانوں کی زندگی سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی وہ شہری زندگی کو پسند کرتی تھی۔ لیکن نعیم سے محبت نے اسے اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ رہے۔ عذرا شہری زندگی کے خواب دیکھتی رہتی جبکہ نعیم نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور روشن آغا کو بتائے بغیر دیہاتی گھر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔ نعیم کے اس مشن میں اس جیسے خیالات رکھنے

والے کئی دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔انھوں نے کسانوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کی زمینوں کا مالک ان کا ہمدرد نہیں ہے بلکہ ان کا دشمن ہے۔شروع شروع میں تو کسانوں کے لیے یہ باتیں نئی اور سمجھ سے بالا تھیں۔بقول مصنف:

''پہلے پہل ان کو یہ باتیں وحشت ناک معلوم ہوئیں، کیونکہ ان باتوں میں کوئی فلسفہ نہ تھا اور یہ سیدھی سادی، ننگی بغاوت کی باتیں تھیں۔ان پڑھ اور پیدائشی لاعلم کسانوں کے لیے یہ قبول کرنا بڑا مشکل کام تھا کہ ان کی زمینوں کا مالک، جاگیردار، ان کا محسن نہیں بلکہ دشمن تھا۔''(۲۷)

نعیم اور اس جیسے دوسرے کارندوں نے آخر کار کسانوں کے دلوں میں زمینداروں کے خلاف بغاوت کی آگ کو بھڑکا ہی ڈالا۔ ہوا یہ کہ ایک گاؤں جو چند ماہ پہلے ہی سیلاب جیسی آفت سے نبرد آزما ہو چکا تھا۔ان کے پاس نہ صرف انسانوں کے لیے بلکہ جانوروں کے لیے بھی کچھ کھانے پینے کو نہ تھا۔ایسی صورتحال میں کسان زمیندار کی طرف سے مقرر کی گئی فصل کی مقدار کی ادائیگی نہ کر سکے تو زمیندار کے آدمی ان کے پاس آئے اور کہا کہ یا تو وہ ٹیکس ادا کریں یا پھر ان کے نام قرض کا اندراج کیا جائے گا۔ٹیکس ادا نہ کرنے والے کسانوں اور ان کے خاندان پر تشدد شروع کر دیا گیا۔نعیم کی لگائی گئی بغاوت کی آگ اس ظلم کو نہ دیکھ سکی اور شعلوں کی شکل اختیار کر گئی۔کسان اپنے حقوق کی پامالی پر بھڑک اٹھے اور کہہ دیا کہ بھاگ جاؤ ورنہ ہم سب کچھ جلا ڈالیں گے۔کسانوں کے غم وغصہ کا نقشہ مصنف نے یوں کھینچا:

''کسانوں میں جانوروں کے گلے کی سی بلبلاہٹ بلند ہوئی اور وہ خالی ہاتھ اوپر اٹھا کر بڑھے۔ سواروں نے ٹھٹک کر دیکھا اور خاموشی سے گھوڑے موڑ کر واپس چلے گئے۔اس کے بعد کوئی اس فصل کا حساب وصول کرنے کے لیے نہ آیا اور اس چھوٹی موٹی بغاوت کو عمداً نظر انداز کر دیا گیا۔''(۲۸)

پرنس آف ویلز کے ہندوستانی دورے کے سلسلے میں حکومت نے تمام سیاسی پارٹیوں کو دبانا شروع کر دیا۔انڈین نیشنل کانگریس نے اس دورے کا مکمل بائیکاٹ کیا۔اس کے نتیجے میں اس پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور والنٹیر وں کے نام کی فہرستیں شائع ہوئیں۔عام ہڑتال اور حکومت کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔عذرا نے نعیم کو گرفتار ہونے سے منع کیا اور مشورہ دیا کہ ہم کلکتہ میں مظاہرہ کر سکتے ہیں۔اس غرض سے وہ کلکتہ چلے گئے۔نعیم جیسے دوسرے کارکنوں نے مظاہرے کے مختلف طریقے اپنائے شہزادہ ویل جس جس راستے سے گزرتا وہاں وہاں مظاہرے کیے جاتے۔جس کا ذکر ناول میں یوں کیا گیا:

''تقریبی گیٹ کی لکڑی پر برقی روشنی سے نکلے ہوئے یہ الفاظ بار بار ظاہر اور غائب ہو رہے تھے:

Tell your mother, we are unhappy---

اگلے دروازے پر چند لوگوں کا ایک گروہ نمودار ہوا۔ان کے جسم ننگے اور سیاہ تھے اور سر منڈے ہوئے

تھے جن پر لکھا تھا:

Tell your mother

we are hungry

اسی گلی سے چند گائیں باہر ہانک دی گئیں جو فوجیوں کے درمیان سے سر نکال کر کھڑی ہو گئیں۔ ان کے گلوں میں بھی بورڈ لٹک رہے تھے جن پر رقم تھا:

Tell your mummy we are dry.‘‘ (۲۹)

جاٹ نگر جو کہ جلسے جلوسوں کے لیے ممنوعہ علاقہ تھا وہاں پر نعیم کو جلسہ منعقد کرانے کی ہدایات دلی سے ملی تھیں۔ جاٹ نگر کافی بڑا گاؤں تھا۔ جب گاؤں میں جلسے کی خبر پھیلی تو پولیس کی بھری نفری نے منڈی کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور داخلی راستے کو تختوں کے ساتھ بند کر دیا۔ دلی سے نہ صرف نعیم بلکہ اس کے چند اور ساتھی بھی لوگوں سے خطاب کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ یہ لوگ داخلی دروازے کے سامنے ہی بیٹھ گئے۔ ادر گرد کے گاؤں والے بھی جلسے میں شرکت کے لیے آ گئے۔ داخلی راستہ چونکہ بند تھا اس لیے نعیم ادھر ادھر یعنی کہیں سے راستے کی تلاش میں تھا۔ نعیم نے ٹوٹا ہوا تختہ دیکھا اور وہاں سے چھلانگ لگا کر منڈی میں داخل ہو گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی سب لوگوں نے اس تختے کو پھلانگنا شروع کر دیا۔ پولیس نے یہ منظر دیکھا تو لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ نعیم خطاب کرنے کے لیے کسی اونچی جگہ کی تلاش میں تھا۔ بقول مصنف:

’’نعیم بھاگتا ہوا کپاس کی گیلی گانٹھوں کے ایک ڈھیر پر جا چڑھا۔ سب سے اونچی گانٹھ پر کھڑے ہو کر اس نے لوگوں کو خاموش کرانے کے لیے سیدھا بازو فضا میں بلند کیا۔ آگے آگے کے لوگ خاموش ہو کر قریب سرک آئے اور آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ عقب میں مجمع ابھی تک دوڑ بھاگ رہا تھا اور پولیس کی لاٹھیاں برس رہی تھیں۔ نعیم نے بولنا شروع کیا۔‘‘ (۳۰)

نعیم کو آزادی کے لیے تقریر کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ آخر کار نعیم رہا ہو کر گھر آ جاتا ہے۔ گاؤں سے باہر نعیم کی حویلی میں نمک بنایا جاتا ہے۔ نعیم اپنے دوست کے پاس پشاور گیا ہوتا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں نمک بنانے والوں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور بعد میں اسے (نعیم کو) بھی گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ نعیم پر فالج کا حملہ ہوتا ہے۔ جب عذرا اس سے ملنے آتی ہے تو وہ اپنے چچا کے بارے میں اسے بتاتا ہے:

’’میں جیل میں تھا جب مجھے اطلاع ملی وہ میرے جیل جانے پر سخت خفا تھے۔ کئی بار میں نے پیغام بھیجا کہ آ کر مل جائیں لیکن نہ آئے۔ انھوں نے کہا: ’’نعیم سے جا کر کہہ دو میرا اس کا کوئی تعلق نہیں رہا، میں اس کے بغیر آسانی سے رہ سکتا ہوں۔‘‘ (۳۱)

نعیم روشن آغا کے سیاسی اثر ورسوخ کی وجہ سے وزارت تعلیم میں انڈر پارلیمینٹری سیکرٹری کے فرائض منصبی نبھانے

لگا۔ ہندوستان میں سیاسی حالات سازگار نہ تھے اس لیے فسادات شروع ہو گئے۔ روشن محل کو آگ لگا دی گئی۔ تقریباً پچاس لوگوں کا قافلہ دلی سے چل پڑا۔ ان لوگوں میں نعیم بھی شامل تھا۔ راستے میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ بلوائیوں کے حملے بھی ہوتے رہے۔ نعیم کا پتا نہ چل سکا کہ وہ مارا گیا یا بچ گیا۔ البتہ عذرا پاکستان آ گئی۔ ڈاکٹر فاروق عثمان نعیم کے کردار کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''دیہات کی سخت کوش زندگی، لا حاصل جنگ، دہشت گرد تنظیم سے وابستگی، کانگرس میں شمولیت جیل یاترا جلسے جلوس ان سے نعیم کے تجربوں کی دنیا تخلیق ہوتی ہے اور انہی حوالوں سے عبداللہ حسین نے عصری زندگی کے بعض اہم مسائل اور حیات انسانی پر ان کے تصرفات کی معنویت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔'' (۳۲)

اداس نسلیں کا دوسرا اہم کردار عذرا کا ہے۔ عذرا میں بھی بغاوت کے عناصر موجود ہیں۔ جن کا ذکر ناول میں جابجا ملتا ہے۔ اس کی بغاوت دونوں سطحوں پر ہے۔ ذاتی سطح پر وہ اپنے طبقے سے بغاوت کر کے نعیم سے شادی کرتی ہے اور سیاسی سطح پر حکومت اور جاگیردارانہ سماج کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ عذرا روشن پور کے جاگیردار غلام محی الدین (روشن آغا) کی بیٹی ہے۔ عذرا کا صرف ایک بھائی ہے جس کا نام پرویز ہے۔ عذرا ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے اور وہ سیاسی رجحان بھی رکھتی ہے۔ وہ باپ سے چھپ چھپا کر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہے۔

عذرا نچلے طبقے یعنی ایک کسان کے بیٹے نعیم کی شخصیت سے متاثر ہوتی ہے اور اسے اپنا شریک حیات بنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ یہ بات اس کے باپ (روشن آغا) کے لیے کافی پریشان کن ہوتی ہے۔ باپ کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے عذرا کی خالہ اسے (عذرا کو) سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ روشن پور والوں کی لڑکیاں نچلے طبقے میں شادی نہیں کر سکتیں۔ عذرا خالہ کے دلائل پر اختلاف رکھتی ہے۔ وہ نعیم کو نچلے طبقے کا فرد نہیں گردانتی بلکہ وہ اسے تعلیم یافتہ اور باشعور ہونے کی بدولت اسے مساوی سمجھتی ہے۔ جب خالہ نے اسے بار بار سمجھانے کی کوشش کی تو وہ خالہ سے کہنے لگی:

''نچلا طبقہ، نچلا طبقہ، نچلا طبقہ کیا ہے!۔۔۔۔ کیا وہ کمین ہے؟ کیا وہ ہماری زمین کاشت کرتا ہے؟ اس کے پاس اپنے مویشی نہیں ہیں اور گھوڑے، اور مکان۔'' (۳۳)

عذرا کے ارادے مصمم تھے۔ خالہ کے سمجھانے کے باوجود بھی اس پر اثر نہ ہوا۔ نہ صرف گھر والوں نے بلکہ جتنے بھی جاننے والے اور اثر ورسوخ والے لوگ تھے سب نے ہی اس شادی کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ اسے روکنے کی کوشش بھی کی۔ عذرا چونکہ ضد کی پکی تھی اس کی ہٹ دھرمی کے سامنے کسی کی بھی دال نہیں گلی۔ آخر اس کی شادی نعیم سے ہو ہی گئی۔ عذرا کے کردار کے متعلق محمد عاصم بٹ رقمطراز ہیں:

''عذرا ایک جاگیردار گھرانے کی چشم و چراغ ہے۔ جس کی تمام تر جاہ وحشمت برطانوی حکومت کی دین ہے۔ وہ اعلیٰ انگریزی سکولوں کی تعلیم یافتہ ہے اور نہایت ناز ونعم میں پلی بڑھی ہے۔ وہ اشرافیہ کے طبقے کی نمائندہ ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ نعیم سے محبت بھی کرتی ہے۔ اور اس کے لیے اپنے طبقے سے بغاوت بھی کرتی ہے۔'' (۳۴)

عذرا نے نعیم سے شادی کر کے ہی بغاوت کی رسم نہ ڈالی بلکہ اپنے باپ دادا کے نظریات کو پس پشت ڈال کر سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اور بھی بڑی بغاوت تھی۔ عذرا اپنے شوہر کے ساتھ کئی سیاسی سرگرمیوں میں شامل رہی۔ مثلاً شہزادہ ویل کی آمد پر کلکتے میں مظاہرے کی غرض سے جانے کا مشورہ بھی عذرا ہی نے دیا تھا۔ اسی طرح جب کانگرس کے حامیوں کو گرفتار کیا گیا تو عذرا نے نعیم کو گرفتاری دینے سے منع کیا اور اسے مظاہروں اور ہڑتالوں میں حصہ لینے کی طرف راغب کیا۔ نعیم جب گرفتار ہو کر جیل چلا گیا تو پھر بھی عذرا نے ہمت نہ ہاری۔ وہ سیاسی سرگرمیوں کا حصہ بنی رہی۔

عذرا اپنی سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے لکھنو چلی جاتی ہے کیونکہ روشن پور میں روشن آغا کے ڈر کی وجہ سے وہ کسی بھی مظاہرے میں شرکت نہیں کر سکتی تھی۔ جب وہ نعیم سے ملنے آتی ہے تو اسے اپنی سیاسی سرگرمیوں سے آگاہ کرتے ہوئے کہتی ہے:

''ہم نے کل سائمن کمیشن کے لیے مظاہرہ کیا تھا۔۔۔ہم نے سائمن کمیشن کا کالی جھنڈیوں سے جلوس نکالا۔'' (۳۵)

نعیم نے عذرا کے ماتھے پر زخم دیکھا (جو دوران احتجاج آیا تھا) اور اسے گھر رہنے کی تلقین کی۔ عذرا سیاسی سرگرمیوں میں اس قدر رچ بس چکی تھی کہ شاید ایسا کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ عذرا نے حکومت وقت کے خلاف اپنی تگ و دو جاری رکھی۔ دورانِ ہجرت نعیم کہیں کھو گیا کچھ پتا نہ چل سکا کہ وہ بلوائیوں کے ہاتھ مارا گیا، پھر کہیں اور چلا گیا۔ عذرا پاکستان میں رہائش پذیر ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اداس نسلیں کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''عبداللہ حسین پر ''آگ کا دریا'' کے مثبت اثرات اور نقالی سے آزاد فنکارانہ اثرات نمایاں ہیں۔ اداس نسلیں پہلی جنگ عظیم سے لے کر قیام پاکستان تک کے سیاسی و تاریخی واقعات کی موثر دستاویز ہے ایک مربوط پلاٹ کے اندر تاریخ و سیاست کے دھاروں کو اس ناول میں خوب سمویا گیا ہے۔ اس کا ہیرو نعیم ذہنی مختلف المرکزیت کا اچھا نمونہ ہے۔ اس کا آزادی کی دھند میں گم ہو جانا انسانی اداسی کی ایک موثر جہت کے طور پر ابھرتا ہے۔'' (۳۶)

نعیم کا کردار ذاتی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر بغاوت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ذاتی طور پر وہ اپنے طبقے یعنی زمینداروں کے خلاف بغاوت کر کے کسانوں کا ساتھ دیتا ہے اور اجتماعی سطح پر محکوم ہندوستان کا باشندہ ہونے کے ناطے سامراج کے

خلاف بغاوت کرتا ہے۔اس کے کردار میں بڑا تحرک ہے اوراس کے عزائم بلند اور حوصلہ قوی ہے۔ وہ وقتی ناکامی سے دل برداشتہ ہوکر بیٹھ جانے والوں میں سے نہیں بلکہ اپنا لائحہ عمل بدل کر ایک نئے ولولے اور نئے حوصلے کے ساتھ اپنی جدو جہد کو آگے بڑھاتا ہے۔اس کی قائدانہ صلاحیتیں بھی قابل توجہ ہیں۔وہ بہت سے کسانوں کو اپنا ہم خیال بنا کر اپنے مؤقف کو ایک تحریک بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔عذرا کا کردار اتنا پر اثر نہیں جتنا نعیم کا ہے تاہم نعیم کی محبت میں اور اس کی کوششوں کے نتیجے میں عذرا کے کردار میں بھی باغیانہ عناصر نمایاں ہونے لگتے ہیں۔اور بعد میں وہ مؤثر طور پر اس کی مددگار بن جاتی ہے۔ عذرا کا باغیانہ رویہ بہت حد تک نعیم کے باغیانہ رویے ہی کا پرتو ہے۔

مشرقی تہذیب:

برصغیر کے سماج کا ستر فی صد حصہ دیہی سماج پر مشتمل ہے۔متحدہ ہندوستان میں بھی مختلف تہذیبوں کا مجموعہ تھی۔متحدہ ہندوستان اپنی ایک قدیم تاریخ رکھتا ہے۔جس کی اپنی تہذیب اور ثقافتیں تھیں۔دنیا کے ہر ملک میں تقریباً وہی قوم آباد ہوتی ہے جو وہاں پر مستقل طور پر رہائش پذیر ہو اور وہ باشندے وہاں پل بڑھ کر جوان ہوئے ہوں۔لیکن برصغیر پاک و ہند کی سرزمین کے متعلق کسی قوم کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اس کی ہے اور نہ ہی کوئی قوم اس بات کا دعویٰ کرتی ہے کہ یہ سرزمین صرف اس کی ہے۔ بلکہ آریاؤں سے لے کر مسلمانوں تک مختلف قومیں اپنا وطن چھوڑ کر یہاں آباد ہوئیں۔انھوں نے اسی ملک کو اپنا وطن تو بنایا لیکن اپنی تہذیبی اور تمدنی روایات، رسم ورواج معاشرت، مذہب کو بدستور اپنائے رکھا۔جس کے باعث یہاں پر بسنے والی مختلف اقوام ایک سرزمین پر بسنے کے باوجود مذہب سے لے کر تہذیب وتمدن تک ہر چیز میں ایک دوسرے سے مختلف رہیں۔

یہ بات درست ہے کہ مزاجوں کے اختلاف نے ان اقوام کی انفرادیت پر اثر ڈالا۔ جہاں کسی قوم نے دوسری قوم سے کچھ حاصل کیا تو وہاں کچھ دیا بھی کچھ کھویا بھی اور کسی چیز کو چھوڑ بھی دیا اور اسی کی جگہ نئی چیز کو اپنالیا۔

چنانچہ ہندوستان میں آریا اب وہ نہیں ہیں جو آج سے ہزاروں سال پہلے نقل مکانی کے وقت تھے اور مسلمانوں کا قافلہ بھی ایسا نہیں ہے جیسا کہ آج سے ایک ہزار سال پہلے تک تھا۔ بلکہ اس میں بھی تبدیلی آچکی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ برصغیر میں وسیع وعریض سرزمین کے ہر علاقہ میں آب وہوا مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ وہاں کے باشندوں کے مزاج بھی مختلف ہیں۔مثلاً پشاور، لاہور، مدراس، ڈھاکہ، بمبئی وغیرہ میں بسنے والے مسلمان اپنے اپنے علاقے کی آب وہوا اور ماحول کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔اسی طرح ہندو جو ڈھاکہ میں رہتے ہیں وہ دوسرے علاقوں میں رہنے والے اپنے اپنے مذہب میں متحد ہونے کے باوجود اپنے خطہ کی مناسبت سے دوسرے خطہ کے ہندوؤں سے

مختلف ہیں۔

ناول کا آغاز ایک ایسے ہی گاؤں کے تعارف سے ہوتا ہے، جس کے منظر نامے میں ہندو، مسلمان، سکھ سب شانہ بہ شانہ نظر آتے ہیں، اور یہ گاؤں اس دیہی سماج کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے، روشن پور نامی اس گاؤں کا تعارف ''اداس نسلیں'' میں یوں کرایا گیا ہے: ''سارا گاؤں مشکل سے سو گھروں پر مشتمل تھا، اس گاؤں کا نام روشن پور تھا۔ یہ راستے سے ہٹ کر واقع تھا اور کوئی کچی یا پکی سڑک بھی یہاں تک نہ آتی تھی۔ اس طرف کے دیہات میں آمد و رفت کا سلسلہ اکّوں یا تانگوں پر یا پیدل چل کر طے ہوتا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی، ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں تھیں، جو کثرت سے ایک دوسری کو کاٹتی تھیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کچی یادداشت والے مسافر اور اکہ بان غلط راستے پر پڑ جاتے تھے اور کسی اجنبی گاؤں میں پہنچ کر پریشانی اٹھاتے تھے۔ مگر یہ روز کی بات تھی اور گاؤں والوں کو ایسے مسافروں سے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ بعض اوقات ان لوگوں کو پہر دو پہر ستانے کے لیے کھاٹ اور پیاس بجھانے کے لیے لسی پانی بھی مل جاتا تھا۔ پگڈنڈیوں پر سارا دن سورج چمکا کرتا۔ دھوپ کی ماری ہوئی وہ بڑی مسکین اور صاف ستھری لیٹی رہتیں۔ مگر ان کی کمینگی اس وقت ظاہر ہوتی جب کوئی سواری ان کے اوپر سے گزرتی۔ تب وہ پگڈنڈیاں گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھاتیں، جو فضا میں دیر تک منڈلاتا رہتا اور دور و نزدیک جو بھی انسان، حیوان یا شجر اس کی زد میں آتا یکساں سب کی دل آزاری کا سبب بنتا۔ کسان مسافروں کو غلط راستے پر ڈال دینا اور گرد اڑا اڑا کر آس پاس کے جانداروں کو تنگ کرنا ان پگڈنڈیوں کے پاس اپنی بدحالی پر خاموش احتجاج کرنے کے دو مؤثر طریقے تھے۔ روشن پور جانے کے لیے آپ کو رانی کوٹ کے چھوٹے سے قصباتی اسٹیشن پر اتر کر ایسے ہی راستوں پر مغرب کی سمت دور تک چلنا پڑتا تھا۔ رستے میں آپ کو کتے ملتے۔ یہ ایسے ہی معمولی، آوارہ کتے تھے، جو ہر گاؤں میں ہوتے ہیں اور گاؤں والوں کی رائے یا خواہش کے بغیر ہی اپنے اوپر سارے گاؤں کی حفاظت اور دیکھ بھال کا ذمہ لے لیتے ہیں۔ یہ کتے عموماً قریب سے گزرنے والے مسافر کو بیرونی حملہ آور اور گاؤں کی سلامتی کے لیے سخت خطرے کا باعث سمجھتے، اپنے خدشات کا اعلان اونچی آواز میں بھونک بھونک کر کرتے۔ اور اس طرح مخالفت کا اظہار کرتے ہوئے اگلے گاؤں تک تعاقب جاری رکھتے، جہاں وہ آپ کو اپنے جیسے ہی معمولی اور شکی المزاج کتوں کے حوالے کر کے بہ اطمینان واپس لوٹتے، کمزور دل و دماغ رکھنے والے مسافر اکثر طیش میں آ کر رک جاتے، انھیں کوستے، پتھر اٹھا اٹھا کر مارتے، پیچھے بھاگتے اور طرح طرح کی حرکتوں سے سخت ناراضگی کا اظہار کرتے۔ لیکن طبع سلیم کے مالک لوگ کتوں کی نسبت اپنے وقار اور برتر حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتے اور درگزر کر کے نکل جاتے۔ اس طرح چودہ کوس کی لمبی مسافت کے بعد گرد میں اٹے اور اکتائے ہوئے، تھک ہار کے آپ روشن پور پہنچتے۔ یہ گاؤں نہر کے کنارے آباد تھا۔ نہر کا پانی یہاں کی زمینوں کو سیراب کرتا

تھا۔"(۳۷)

متحدہ ہندوستان میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب مل جل کر رہتے تھے، جو گنگا جمنی تہذیب کا ایک روپ ہے، یہ روپ ہمیں روشن پور میں بھی نظر آتا ہے:

"علاقائی طور اس گاؤں کی حیثیت، کم از کم رائے عامہ کے لحاظ سے، غیر مسلم تھی۔ ایک گروہ، جس کا سربراہ گاؤں کا سب سے عمر رسیدہ کسان احمد دین تھا، مدعی تھا کہ گاؤں صوبہ دلی میں، اور دوسرا گروہ جو سکھ کسان ھرنام سنگھ کی سربراہی میں تھا، دعویٰ کرتا تھا کہ گاؤں صوبہ پنجاب میں واقع ہے۔ اس بات پر اکثر چوپال میں مناظرے ہوا کرتے تھے۔ بہر حال یہ امر مسلم تھا کہ اس گاؤں ہر دو صوبہ جات کی مشترکہ سرحد پر کسی جگہ واقع تھا۔ اس گاؤں کی تہذیب بھی اسی دوئی کا نمونہ تھی۔ جو سکھ قوم کے افراد یہاں آباد تھے وہ پنجاب کے سکھ کسانوں کی طرح پہنتے کھاتے اور پنجابی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ ہندو اور مسلمان طبقہ یو۔ پی کے کسانوں کی معاشرت کا روادار تھا۔ اس کے باوجود گاؤں کے دو ڈھائی سو افراد بڑے امن اور صلح جوئی کے ساتھ اپنے اپنے طور پر اپنی اپنی زندگیاں بسر کر رہے تھے۔"(۳۸)

اس ناول میں پنجاب کے دیہاتوں کی تصویریں بڑی ہنر مندی اور دلآویزی کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ ایک طرف وہ فطری لینڈ اسکیپ ہے، جو دیہاتوں کے پسِ پشت اپنی بہار دکھاتا ہے؛ مویشی، کھیت کھلیان، کنوئیں اور چشمے، چوپال کی ہماہمی، جسے رشید احمد صدیقی کے بقول دیہات کی پارلیمنٹ کہہ لیجئے، معمولی حیثیت کے مکانات، ان پر ان کے مکینوں کی توجہ، فصلوں کے بوئے جانے اور کاٹے جانے کے اوقات، ان کی شروع سے آخر تک دیکھ بھال، ان کے سلسلے میں مختلف معاہدے اور ان پر عمل درآمد کی نوعیت اور دوسری طرف اس فضا میں رہنے اور بسنے والوں کی زندگی کے معمولات، ان کے ان لکھے اخلاقی ضابطے، رسومات اور مختلف قسم کی تقریبات، سرراہے معاشقے اور جنسی روابط، جذبات اور محسوسات کا برملا اور بے خوف اظہار، بلکہ یہ کہئے کہ ان جذبات کی مصوری، جو بغیر کسی مزاحمت کے سامنے آتے رہتے ہیں، اور اپنی اظہاریت میں برہنہ ہوتے ہیں۔ پھر ان کے ابلاغ کے لیے جو زبان استعمال کی جاتی ہے، وہ بھی ہر طرح کے تکلف، احتیاط، خوف اور پیش بینی سے بے نیاز ہوتی ہے۔ خاص طور پر سکھ گھرانوں میں نشت و برخاست کے طور طریقے اور سکھوں کی عجیب وغریب نفسیات کے نمونے سامنے آتے ہیں۔ اس ذیل میں مہندر سنگھ، اس کی بیوی کلدیپ اور جوگندر سنگھ کے کردار خاص طور پر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ مہندر سنگھ سے نعیم کی پرانی دوستی چلی آرہی ہے، اس کی تجدید جنگ کے محاذ پر ہوتی ہے۔ اس ناول میں بڑے وسیع رقبے پر وہی سب کچھ نظر آتا ہے جو ہمیں بلونت سنگھ اور احمد ندیم قاسمی کے پنجاب سے متعلق افسانوں میں نظر آتا ہے، بلونت سنگھ کا ناول چیک پیراں کا جسا تو اس کا عمدہ نمونہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عبداللہ حسین

کے ہاں دیہات کی زندگی اور اس کے باسیوں نے زبان پالی ہے اوران کا کردار متعین ہوگیا ہے۔ یہاں ٹھوس اور خارجی حقائق بھی ہیں اوران پر منحصراوران سے وابستہ کردار بھی، جن کے ہاں بنیادی انسانی جذبات میں بے باکی بھی ہے اورخروش وتلاطم اورناترشیدگی اور شعلگی بھی۔

اداس نسلیں میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے حالات وواقعات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں پہلی مرتبہ تحریک آزادی اورحکومت برطانیہ کے خلاف پنجاب کے گاؤں کے کسانوں نے حصہ لے کر جو قیمت ادا کی اس کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ غریب دیہاتی کسانوں اورمزدوروں کے جنگ میں حصہ لینے اوران پراس کے ہونے والے اثرات کی عکاسی وسیع پیمانے پر کی گئی ہے، اورصرف یہی نہیں بلکہ ناول میں تہذیبی، فکری، ثقافتی عناصر کو بھی بھرپور طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اداس نسلیں ایک طرف تو ہمیں پریم چند کے گئو دان کی کڑی معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف اس پر آگ کا دریا کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پس منظر سے اگر دیکھا جائے تو انگریز کے خلاف اٹھنے والی بغاوت کی کئی وجوہات تھیں جن میں سے ایک وجہ ہندوستانیوں کا معاشی استحصال تھا جس کا شکار ہندوستان کے غریب عوام اورخصوصی طور پر کسان ہورہے تھے۔ اس کے برعکس بڑے زمیداروں اور تعلقہ داروں کو انگریزوں کی حمایت حاصل تھی۔ کیونکہ وہ اس بات سے بخوبی آشنا تھے کہ اس طبقے کی خوشنودی کے بغیر ان کے لیے اس خطے میں پاؤں جمانا انتہائی دشوار تھا۔ اس لیے انگریز سرکار نے جاگیرداری نظام اور طبقاتی کشمکش کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا اورحکومت ہند نے اس بات کی خوب حمایت کی کہ:

> ’’ہندوستان میں زمین دار امراء کے طبقہ کا قیام اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی خاطر ہم اس نظام کو قربان کرسکتے ہیں۔ جس نے کاشت کاروں کی آزادی میں اضافہ کیا ہے اوران کے حقوق کو محفوظ کیا ہے۔‘‘(۳۹)

یہ وہ حالات تھے جنہوں نے غریب کسانوں اورعوام کی زندگی دوبھر کردی۔ ایک طرف انگریز افسران اوران کے لگان جرمانے اور بھاری وصولیوں نے کسانوں کو تنگ کررکھا تھا تو دوسری طرف جاگیرداراورزمیندار طبقہ طرح طرح سے ان کی توہین کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ جس کے باعث یہ مجبور طبقہ ذلت بھری زندگی گزاررہا تھا۔ انگریز کی بالادستی نے بھی جاگیرداروں کو کافی مضبوط کردیا تھا۔ جس کے باعث جاگیرداروں اور برطانوی حکومت کے درمیان ہونے والے اس اتحاد سے ہندوستان کو ایک طرف سے زرعی بحران میں مبتلا کردیا تھا۔ جس کے اثرات آج تک ہمارے ہاں واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس اقتصادی اورسیاسی اتحاد کے اثرات سماجی اورتمدنی سطح پر بھی اثرانداز ہوئے۔

اداس نسلیں تقسیم ملک سے پہلے کے پنجاب کی دیہی زندگی کے حوالے سے تمام ترسیاسی اتارچڑھاؤ اور

عوامی اضطراب کا مرقع ہے۔جس میں ایک کسان کی محبت،نفرت محنت، جفاکشی اور انگریز کے ساتھ ساتھ جاگیرداروں اور سرمایہ کاروں کی لوٹ کھسوٹ اور جبر واستحصال کی تمام جزیات کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ڈاکٹر خالد اشرف ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''گئودان'' کے بعد ''اداس نسلیں'' پہلا ناول ہے۔جس میں اس دھرتی کی بو باس، ایک کسان کے ظاہر و باطن کی جیتی جاگتی تصویریں، اس کی محبت اور نفرت، جفاکشی اور ظلم سہنے کی قوت اور انگریزوں کے جبر واستحصال اس مکمل پیانہ پر نظر آتے ہیں کہ عبداللہ حسین کا یہ ناول ایک رزمیہ کی بلند آہنگی اور وسعت کا حامل بن گیا ہے۔''(۴۰)

عبداللہ حسین نے تمام حالات وواقعات کا نقشہ ناول اداس نسلیں میں پیش کیا ہے۔ناول کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلا دور حکومت برطانیہ، دوسرا جدوجہد آزادی اور تیسرا تقسیم ہند کے فوری بعد کا دور ہے۔

ناول میں پنجاب کے ایک گاؤں روشن پور کی سرزمین کا ذکر کیا گیا ہے۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران روشن علی خان ضلع رہتک کے ایک دفتر میں معمولی اہل کار تھے اور جنگ آزادی کے دوران انھوں نے ایک انگریز کی جان بچائی جس کے صلہ میں انھیں انگریز کی طرف سے پانچ سو مربع زمین عطا کی گئی تھی۔اس وجہ سے اس گاؤں کا نام روشن پور پڑ گیا تھا۔ناول میں پنجاب کے اسی گاؤں کی دیہی زندگی کے بارے میں تمام تر سیاسی جدوجہد کے ساتھ ساتھ عوام میں پائی جانے والی بے چینی، سماجی اور معاشی صورت حال اور اضطراب دکھائی دیتا ہے۔ناول میں ہندوستان کے غریب کسان، مزدور کی زندگی کو تاریخ کے تناظر میں دکھایا گیا ہے۔جس کے تمام اتار چڑھاؤ سلیقے سے ناول میں بیان ہوئے ہیں۔

اداس نسلیں کے آغاز میں ہی جاگیردارانہ نظام کی جھلک واضح دکھائی دیتی ہے۔جوں جوں ناول آگے بڑھتا ہے سامراجی نظام کی تمام برائیاں اپنی شدومد کے ساتھ دکھائی دیتی ہیں۔ناول میں نیاز بیگ اور ایاز بیگ دو بھائی تھے۔نیاز بیگ کو کسی جرم میں گرفتار کرلیا جاتا ہے اور اس کا بیٹا نعیم اپنے چچا کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔

نواب روشن علی خان کے محل میں ایک دعوت کا اہتمام ہوتا ہے اور ایاز اپنے بھتیجے نعیم کے ساتھ اس میں شرکت کرتا ہے۔دعوت میں سیاسی حالات وواقعات کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے اور نعیم کی ملاقات عذرا سے ہوتی ہے جو ایک زمیندار کی بیٹی ہے۔نعیم وہاں سے اپنے گاؤں روشن خان چلا جاتا ہے اور کھیتی باڑی کرتا ہے کہ جنگ عظیم کا آغاز ہوجاتا ہے۔

انگریز کا استحصالی رویہ یہاں سے ہی شروع ہوجاتا ہے۔فصل کی کٹائی اور اس کو محفوظ کرنے کے دن ہیں لیکن انگریز زبردستی کسانوں کو پکڑ پکڑ کر فوج میں بھرتی کرتے ہیں ادھر نعیم اپنی مرضی اور خوشی سے فوج میں شمولیت اختیار کرلیتا ہے۔

عبداللہ حسین نے اس جبری بھرتی کے منظر کو ناول میں بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔جب فصلیں پک چکی تھیں

کٹنے کے لیے تیار تھیں اور سارجنٹ سب کسانوں کو میدان میں لا کر محاذ پر چلنے کا حکم سنا رہا تھا جب کہ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ جنگ کون لڑ رہا ہے اور کس کے ساتھ لڑی جا رہی ہے۔ اس منظر کو یوں بیان کرتے ہوئے عبداللہ حسین لکھتے ہیں:

''ہجوم میں جنبش پیدا ہوئی کسان اپنے بیلوں کے ساتھ جسم رگڑنے لگے۔ ہم کیا کھائیں گے؟ فصل گیدڑ اٹھائیں گے؟ ہم نہیں جائیں گے۔ سارے برس ہم نے سوروں کے لیے محنت کی؟ ''دیکھو' ہمارے ہاتھ دیکھو...... آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں نے اس کا گانٹھ دار پرانے سوکھے ہوئے چمڑے والا ہاتھ دیکھا...... اپنی فصلیں اب تم اس سے کاٹو گے اور میدان جنگ میں کاٹو گے۔ یہ کہہ کر اس نے سنگین ہوا میں لہرائی...... سنگین لگی رائفلوں سے جوانوں کو ہانکا جانے لگا۔'' (۴۱)

اس وقت دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا اور فوج میں بھرتی ہونے اور زبردستی کیے جانے والے فوجیوں کو مختلف راستوں سے بلجیئم بھیج دیا جاتا تھا۔ ناول میں لڑائی کے مناظر کو عمدہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ نعیم کے ساتھ اس کے گاؤں کے باسیوں میں سے بھی کچھ اس کے ساتھ ہی بھرتی ہوئے تھے۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہیں۔ وہاں سب ہندوستانیوں کی ایک ہی سوچ ہے۔ جس کو کچھ اس انداز میں بیان کیا گیا ہے:

''تمھیں پتا ہے ہم کیوں لڑ رہے ہیں'' اچانک مہندر نے پوچھا۔

جرمنوں نے حملہ کر دیا ہے۔ لانس نائیک نعیم نے جواب دیا۔

''کیا روشن پور پر؟''

''یہاں''

جرمن انگریزوں کے دشمن ہیں اور انگریز ہمارے مالک ہیں بس۔

''ہمارے مالک روشن آغا ہیں۔ میں اتنا جان سکتا ہوں۔''

''انگریز روشن آغا کے مالک ہیں چنانچہ۔۔۔'' (۴۲)

نعیم جو کہ ناول کا مرکزی کردار ہے جرمنوں کے خلاف لڑتے لڑتے اس کا بازو ضائع ہو جاتا ہے اور لکڑی کا بازو لگوا کر جب گاؤں پہنچتا ہے تو سیاست میں دلچسپی لیتا ہے اور کانگرس میں شمولیت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی سیاسی جدوجہد کے دوران وہ جیل میں چلا جاتا ہے اور واپس آنے پر ہر قسم کی ممانعت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے عزرا سے شادی کر لیتا ہے جو انتہائی وفا شعار اور محبت کرنے والی بیوی ہے۔ اس زمانے میں جلیاں والا باغ کا واقعہ رونما ہوتا ہے اور عذرا اور نعیم امرتسر چلے جاتے ہیں۔ نعیم معزور ہو جاتا ہے اور اس کا علاج معالجہ ڈاکٹر انصاری کرتے ہیں۔ جو مذہب کے ناجائز استعمال پر خوب بحث مباحثہ کرتے ہیں۔ اس دوران ہندوستان کے سیاسی حالات ناگفتہ بہہ ہو جاتے ہیں فسادات کے باعث لوگ مجبوری اور بے بسی کے عالم میں اپنی بقاء کے لیے ہجرت کرتے ہیں۔ یہاں پر روشن آغا کو بھی محل کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ نعیم اور

عزرا بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہجرت کے دردناک کرب کو سہتے ہیں۔ ہجرت کے دوران نعیم ایک بلوائی کے حملے سے مارا جاتا ہے اور عذرا اپنے گھر والوں کے ساتھ پاکستان جاتی ہے۔

ادھر نعیم کا چھوٹا بھائی علی سرمایہ دارانہ نظام کی چکی میں پستا ہے اور وہ بھی تقسیم ہند کے بعد بھوک پیاس اور قتل وغارت گری سے بچتا بچاتا پاکستان پہنچ جاتا ہے۔

اداس نسلیں میں دیہی اور شہری زندگی کی معاشرتی صورت حال کو بیان کیا گیا ہے۔ تحریک آزادی میں زیادہ ظلم وستم کا شکار وہ ہوئے جن کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے نہ تھا۔ ناول میں ایک طرف روشن آغا اور ان جیسے کئی زمیندار اور جاگیردار اس دور کے کسانوں اور مزدوروں کی محنت پر شاہانہ زندگی بسر کر رہے تھے ان لوگوں نے نہ صرف خود ان غریبوں کا استحصال کیا۔ ان کا خون چوسا بلکہ انگریز حکمرانوں کی خوشنودی کے لیے غریب کسانوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کروا کے انگریزوں کو سپاہیوں کی صورت میں نذرانے کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ تو دوسری طرف عام مزدوروں اور کسانوں کا استحصال بھی اسی طرح کیا جاتا تھا جس کے باعث وہ سخت مصیبت اور پریشانی میں مبتلا تھے۔ یہ نظام عوام کے لیے دوطرفہ مظالم کا پیش خیمہ تھا۔ ایک طرف تو انگریز حکمرانوں کے لگائے گئے بھاری بھرکم ٹیکس لگان اور ان کی وصولیاں کسانوں کے لیے مصیبت بنے ہوئے تھے جو نہ صرف یہ بلکہ جاگیرداروں کی طرف سے بھی ان سے بھاری بھرکم اور وسیع پیمانے پر نذرانے وصول کیے جاتے تھے۔ یہی صورت پورے ناول میں جابجا دکھائی دیتی ہے۔ کسان طبقہ ہر طرح کی مظلومیت کا شکار تھا۔ اس کے ساتھ ناگہانی آفات بھی تھیں۔ کسانوں کی محنت تو بارشوں، آندھیوں، طوفانوں اور دیگر مصائب کے پیش نظر ضائع ہو جاتی اور جو فصل بچ جاتی وہ ان آفات کے باوجود بھی لگان کی صورت میں ادا کرنا پڑتی تھی۔

ادھر روشن آغا جیسے جاگیردار تھے جو انگریزوں کی خوشنودی کے لیے مزارعوں پر طرح طرح کے مظالم روا رکھنے سے بھی نہ چوکتے تھے اور کسی نہ کسی طرح ان کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ جاگیردار اپنی جھوٹی شان وشوکت برقرار رکھنے کے لیے بڑی بڑی گاڑیاں رکھتے تھے اور انگریزوں کی دعوتیں آئے روز کرتے تھے۔ جس کی قیمت وہ غریب کسان مزدور سے کبھی ''موٹرانہ'' اور کبھی کسی اور صورت میں وصول کرتے تھے، اور اگر کوئی اس نذرانے کا متحمل نہ ہو تو اس سے انتہائی ظالمانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ جسے ناول میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> ''اس کے مٹکے اناج سے بھرے ہیں۔ اس نے ''موٹرانہ'' نہیں دیا۔ روشن آغا کے سامنے پیش کیا جائے۔'' منشی نے کہا۔۔۔ بیل کی طرح۔ بیل کی طرح'' منشی نے کڑک کر کہا اور دونوں جوان لڑکوں کی طرف دیکھا۔ لڑکوں نے اٹھ کر اس کی بغلوں میں ہاتھ دیئے اور گھٹنوں کے بل گرا دیا۔ ایک لفظ نکالے بغیر وہ چاروں ہاتھ پاؤں پر ہو گیا۔ منشی نے جھٹک کر اس کی پگڑی اتاری اور لڑکے کے ہاتھ

میں دی۔ ''بیل کو رسی ڈالو'' ۔۔۔اس کے منہ میں چارہ دو۔۔۔ایک لڑکا خشک گھاس لا کر اس کے منہ میں ٹھونسنے لگا۔۔۔اس کی باچھوں سے گھاس کے تنکے لٹک رہے تھے۔لڑکوں نے گھاس ٹھونس کر اس کا منہ مضبوطی سے بند کر دیا ''چلو'' منشی رسی کھینچتے ہوئے بولا۔بوڑھا کسان چوپائیوں کی طرح زمین پر چلنے اور جلد جلد آنکھیں جھپکانے لگا۔'' (۴۳)

اداس نسلیں میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ جنگ آزادی کے بعد کسانوں پر مظالم زیادہ کیے گئے۔ برطانوی حکومت نے برصغیر کا بری طرح استحصال کیا۔عوام حصول آزادی کے لیے جان نثار کر رہے تھے۔جب انہیں آزادی ملی تو فسادات شروع ہو گئے۔شہر ویران اور گاؤں کے گاؤں جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔بچوں کو بے رحمی سے قتل کیا گیا،عورتوں کی عصمت دری کی گئی،ان کو اغوا کیا گیا۔معصوم بچوں اور بے بس عورتوں کے ساتھ جانوروں کا سلوک روا رکھا گیا اور لوگوں کو مجبور ہو کر اپنے گھر بار چھوڑنے پڑے۔ہجرت کے ان واقعات کی تصویر کشی ناول میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''روشن آغا اور حسین پچھلے دروازوں سے جان بچا کر بھاگے جاتے جاتے انھوں نے بلوائیوں کی جھلک دیکھی وہ لمبے تڑنگے سکھ کسان اور چھوٹی ذاتوں کے کالے کالے لوگ تھے۔جو ان کا سامان نکال کر لان میں جمع کر رہے تھے اور آگ لگا کر بھتنوں کی طرح شور مچا رہے تھے۔'' (۴۴)

اداس نسلیں میں طبقاتی تفریق بھی ہمیں جا بجا دکھائی دیتی ہے۔ایک طبقہ روشن آغا جیسے جاگیرداروں کی نمائندگی کرتا ہے تو دوسرا طبقہ نیاز بیگ اور اس کے خاندان پر مشتمل ہے۔ناول میں طبقاتی سلوک اور طبقاتی امتیاز ہمیں اس وقت محسوس ہوتا ہے جب نعیم کراسی حاصل کرنے کے بعد روشن آغا کی ایک تقریب میں روشن محل جاتا ہے۔تو اس کو ہر شخص عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ہر کوئی اس کے ساتھ دوستی اور یارانہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن جب وہ پہلی مرتبہ اپنے چچا کے ساتھ اس تقریب میں شرکت کرتا ہے تو وہ اپنے بھرپور سراپے کے ساتھ وہاں جاتا ہے اس نے اس وقت سرخ پھندے والی ٹوپی پہن رکھی تھی۔جس کی وجہ سے محفل میں موجود نوجوان اس کا مزاق اڑاتے ہیں۔اس کے برعکس آج اس محفل میں وہ ایک معزز شخص ہے اور ہر کوئی اس طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے اور گہرا دوست بننے کا متمنی ہے۔

ناول میں نعیم اور عذرا کے مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ نعیم کے چھوٹے بھائی علی اور اس کی بیوی عائشہ کے کردار بھی ہیں۔جو ایک محنتی اور جفا کش کسان کا کردار ہے۔دیہات کے پر فضا اور کھلے ماحول میں جوان ہوتا ہے۔ناخواندگی کے باعث اس کے مزاج میں سادگی کی جھلک نمایاں ہے اور ایک مل مزدور بن جاتا ہے۔دونوں میاں بیوی وہاں تنگ و تاریک کوٹھڑی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔لیکن مل کا سخت ماحول،سخت محنت اور کام اور بہت کم آمدنی اس کی شخصیت کو بالکل توڑ دیتی ہے۔شہری زندگی کی سردسری اور وہاں کا استحصالی رویہ اس کو سخت پریشان کرتا ہے۔گاؤں کی کھلی ہوا،کسانوں کا روایتی میل جول، بھائی

چارہ اور مشترکہ زندگی اس کو رہ رہ کر یاد آتے ہیں۔ ناول میں گاؤں کے اس ماحول کو کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''گاؤں کی وہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتی ہوئی چھتیں اور حدیں جہاں ہر کسی کو اپنی اپنی جائیداد پر فخر ہوتا تھا۔ جو لامحدود تھی۔ جس میں لاتعلقی نہ تھی۔ سانجھے کے صحن اور ساجھے کی دیواریں، منڈیریں، جن پر ہر کوئی بیٹھ سکتا تھا اور جن کی ہر کوئی مرمت کر سکتا تھا۔ ٹیڑھے میڑھے گھر جن کا پتہ نہ چلتا تھا کہ کہاں سے شروع ہوتے تھے اور کہاں پر ختم۔ مڑتی ہوئی بے ترتیب گلیاں کہیں سے چوڑی کہیں سے تنگ اور بیچ میں گندے پانی کی نالی، چلتے چلتے جس میں پاؤں پھسل کر جا پڑے اور چھینٹے اڑا اڑ کر ٹانگوں کو خراب کر دیں۔''(۴۵)

غرض اداس نسلیں میں عبداللہ حسین نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت وہاں کے رسم و رواج، تقریبات، ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے تہواروں، دوستی، دشمنی، دیہات کا ماحول، کسانوں کی فصلیں، ان کی غربت و افلاس کی تصویر کشی بڑی مہارت سے کی ہے۔ روشن محل کی چہل پہل کی تصویر ناول میں اس طرح کھینچی گئی ہے:

''گوئنز روز کے آخر میں روشن محل تھا۔ ایک قدیم وضع کی وسیع دو منزلہ کوٹھی تھی۔ آگے کرزن روڈ شروع ہوتی ہے...... پھاٹک پر کاغذی جھنڈیاں اور رنگ برنگے بجلی کے قمقمے لٹک رہے تھے۔ برآمدے میں دو میزیں پڑی تھیں۔ ایک پر میز پوش تہہ کیے رکھے تھے۔ دوسرے کے گرد بہت سی لڑکیاں کھڑی، نیپکن بنا رہی تھیں برآمدے کے وسیع لان میں میزیں اور کرسیاں لگائی جا رہی تھیں دن کی روشنی باقی تھی مگر برآمدے اور باغ میں قمقمے جل رہے تھے۔''(۴۶)

ناول میں ہمیں دیہی معاشرت کے خوبصورت مرقعے بھی دکھائی دیتے ہیں کہ قاری جب ان کو پڑھتا ہے اور اپنے آپ کو بالکل اس ماحول کا حصہ سمجھنے لگتا ہے اور اس خوبصورت ماحول سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ناول میں دیہی معاشرت کو اس حقیقت سے منصف نے بیان کیا ہے جس کی کوئی مثال نہیں۔ وہ روشن پور کی فصلوں، کھیتوں، مکانوں، درختوں کے سائے اور مال و مویشیوں کو خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سبز گھاس کے قطعات نمودار ہو رہے تھے۔ باقی جگہ پر بھوسے کی ناڑیں اور خشک، سخت جڑیں بکھری ہوئی تھیں۔ تازہ تازہ کٹائی کے بعد جگہ جگہ کبوتروں اور دوسرے پرندوں کے غول کے غول بیٹھے چگ رہے تھے۔ زیادہ تر شیشم اور آم کے گھنے پیڑ تھے جن کے سائے میں مویشی باندھے گئے تھے۔ اور چارپائیوں پر کسان سو رہے تھے۔''(۴۷)

ہندوستان میں سیاسی ابتری کے باعث ہر طرف حالات خراب تھے۔ شہر ویران اور دیہات تباہ حالی کا شکار تھے۔

درندگی اور بربریت کا عالم تھا۔خون پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا اور یہ سب کچھ سیاست اور مذہب کے نام پر ہو رہا تھا۔اس وجہ سے بعض ناقدین نے اداس نسلیں کو وجودی فلسفہ کے تحت لکھا جانے والا ناول قرار دیا ہے اور فلسفہ وجودیت کے بارے میں ایک عام تاثر یہ ہے کہ ہر وہ تحریک جس میں فرد کی تباہی اور بربادی کی ہولناک نقشہ کشی کی گئی ہو۔ ہر وہ ناول جس کے کردار ابدی اور ذہنی طور پر منتخل دکھائی دیتے ہوں اور ہر وہ ڈرامہ جو ہماری شخصیت کا ارتقاء کرنے کی بجائے ہمیں مایوسی اور پستی کی اتھاہ گہرائی میں پھینک دے وہ وجودی ادب کا شہر پارہ ہوگا۔

یہ تاریخ کا وہ ظالمانہ رویہ تھا جو برصغیر کے باسیوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ ہر طرف قتل وغارت اور منافرت کی مسموم ہوائیں چل رہی تھیں۔اداس نسلیں میں ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کے پریشان حال اور لٹے پٹے قافلوں کی تصاویر جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔

جہاں پر ناول میں ظلم وبربریت کے مناظر دکھائے گئے ہیں وہاں پر ہجرت کے وقت خواتین کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کی جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں۔عبداللہ حسین جس طرح چیزوں کو دیکھتے ہیں،سوچتے ہیں اور جس طرح محسوس کرتے ہیں اس کو اسی طرح حقیقت کے ساتھ بیان بھی کر دیتے ہیں اور قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ تمام واقعات اس کے سامنے وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔

عبداللہ حسین نے ناول میں جہاں دیہی معاشرت کے خوبصورت مرقعے پیش کیے ہیں اور صرف مسلم تہذیب وثقافت کو ہی پیش نظر نہیں رکھا اور بلکہ سکھ اور ہندو تہذیب وثقافت اور رسم ورواج کی منظر کشی بھی خوب کی ہے۔مہندر سنگھ جو کہ ناول کا ایک اہم کردار ہے۔اس کے گھر میں اس کے بھائی کی شادی کے موقع پر یوں عکاسی کی گئی ہے:''جاڑوں کی ایک شام کو مہندر سنگھ کے گھر چند لوگ جمع ہوئے۔مجمع زیادہ تر گاؤں کے نوجوانوں پر مشتمل تھا جو اس کے بھائیوں کے دوست تھے اور مختلف ٹولیوں میں بیٹھے تھے۔ ہر ایک ٹولی کا سرغنہ مہندر سنگھ کا ایک بھائی تھا جو اپنے دوستوں کے حلقے میں بیٹھا ڈینگیں مار رہا تھا اور بڑی انکساری کے ساتھ دودھ کے گلاس پیش کرتا جا رہا تھا۔سب نوجوان نہا دھو کر،کھیتوں کی مٹی اتار کر،آنکھوں میں سرمہ اور سر میں تیل ڈال کر آئے تھے۔انھوں نے اپنے اپنے بہترین بھڑکیلے لباس اور رنگے ہوئے کچے چمڑے کی جوتیاں پہن رکھی تھیں۔سکھوں کا گھر گاؤں کے جوہڑ کے کنارے پر تھا۔دالان میں جہاں لوگ جمع تھے،چند چارپائیاں پڑی تھیں،اور دیوار کے ساتھ دو لالٹینیں لٹک رہی تھیں۔کچھ لوگ چارپائیوں پر بیٹھے تھے،باقی چٹائیوں پر،جو نیچے بچھی تھیں۔کمرہ دھوئیں،مٹی کے تیل کی بو،قہقہوں اور باتوں کے شور سے بھرا ہوا تھا۔مہندر سنگھ کا بڑا بھائی اس رات کا دولہا تھا۔اس نے سفید جھوٹے ریشم کا لباس پہن رکھا تھا اور سر سے ننگا تھا۔کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا لیکن اپنے اپنے لباس دکھانے کے شوق

میں سب نو جوانوں نے لوئیاں اور کمبل اتار کر کونے میں ڈھیر کر دیے تھے اور اب کچے دودھ کے نشے میں قہقہے لگا رہے تھے۔' میری گندم میں تو گھٹنے نظر نہیں آتے۔ مہندرو' فقیر دین نے کہا، جو منشی کا خاص جاں نثار تھا، گنجی آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔'ہاں بے۔ تمھاری فصل میں تو منشی اور اس کی بیوی نے ایک پودے پر پیشاب کیا ہے۔ کل کو تمھارا پینڈا بھی نظر نہ آئے گا' مہندر سنگھ نے کہا، جو اکیلا اکیلا پھر رہا تھا۔ جوگندر سنگھ کو مہمانوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں بار بار باہر جانا پڑ رہا تھا، لیکن کیکر کی شراب کے نشے میں اسے سردی کا احساس نہ تھا اور وہ تیز ہوا میں خالی قمیص پھڑ پھڑاتا ہوا اندر باہر جا رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں، جہاں بھوسہ بھرا ہوا تھا، خالی جگہ پر چٹائی بچھا کر شراب کی مٹکی دھری تھی اور پینے والے کسان اردگرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔''(۴۸)

عبداللہ حسین نے دیہات کی عکاسی میں انتہائی گہرے مشاہدے کو بیان کیا ہے۔ کیونکہ انہیں کسانوں کے افعال و کردار، ماحول اور گاؤں کی فضا سے بخوبی آگاہی تھی۔ اس لیے دیہات کی تمام جزیات کو بہت باریک بینی سے بیان کرتے ہوئے کسان کی محنت کوشش اور بھوک اور افلاس کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''کڑکتی دھوپ اور لو کی وجہ سے کسانوں کے جسم سیاہ ہو گئے تھے اور عورتوں کی مٹکیوں میں گھی ختم ہو چلا تھا۔ ہر کٹائی کرنے والے کو پاؤ سیر مکھن روٹی پر لگانے کے لیے چاہیے تھا۔ چوپائیوں کی پسلیاں نکل آئی تھیں۔ عورتوں کے چہروں اور ہاتھوں پر خشکی کے سفید دھبے پڑ گئے تھے اور ان کے بال کھردرے ہو چکے تھے۔''(۴۹)

مصنف نے دیہی مناظر میں چرندوں، پرندوں، جھیلوں، آبشاروں، کھیتوں کی فصلوں، کڑی دھوپ چھاؤں کو ایک اور جگہ پر یوں بیان کرتے ہیں:

> ''پیپل کی پھیلی ہوئی جڑوں پر بیٹھ کر وہ دونوں پینپیاں بناتے اور بجاتے رہے۔ سورج کے اٹھنے کے ساتھ ساتھ ہوا گرم ہوتی جا رہی تھی اور جیٹھ کی کڑی دھوپ کھیتوں اور فصلوں پر پھیلتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ مویشی اور کسان ہانپتے ہوئے جا کر سائے میں بیٹھ گئے اور گاؤں کی زمینوں اور گلیوں میں ایک عام دیہاتی وحشت پھیل گئی۔ مشقت اور گرمی کے اس وقت میں میں علی اور عائشہ پیپل کی جڑوں پر بیٹھے پینپیاں بنا رہے تھے اور گپیں مار رہے تھے۔''(۵۰)

دیہی زندگی، فصلیں اور کسانوں کے طرز زندگی کے بارے میں عبداللہ حسین نے اپنے ناول میں مشرقی تہذیب کی بہت خوب صورت عکاسی کی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''مویشیوں کے باڑے احاطے میں دو بھینسیں بیٹھی جگالی کررہی تھیں ،دو بیل چارہ کھا رہے تھے۔''(۵۱)

''دروازے کے باہر دو کتے چہلیں کررہے تھے۔ایک پلی ہوئی بھینس اطمینان سے جگالی کررہی تھی۔ایک کوا اس کے سر پر بیٹھا چونچ مار رہا تھا اور دو باتونی چڑیاں اس کے گوبر کو کرید رہی تھیں۔رات والا سکھ لڑکا چھینٹ کی بنیان پہنے کتوں کے پاس کھڑا جمائیاں لے رہا تھا۔سامنے کھاد کے ڈھیر پر ایک کتیا اپنے متعدد بچوں کو دودھ پلا رہی تھی۔''(۵۲)

''سکھ نے ایک نوعمر کتے کو کان سے پکڑ کر اٹھایا اور گھما کر جوہڑ میں پھینک دیا۔کتا چیختا ہوا بھینسوں کی پیٹھ پر جا چڑھا جو وہاں نہا رہی تھیں۔چھوٹے چھوٹے لڑکے جو بھینسوں کی دمیں پکڑے تیر رہے تھے کتے کی نقل میں چیخنے اور اس پر پانی پھینکنے لگے۔''(۵۳)

''سامنے وسیع ننگے کھیت تھے۔بائیں طرف گاؤں کے چھوٹے چھوٹے کچے مکان تھے۔سورج کافی اٹھ آیا تھا اور گرم چمک دار دھوپ کھیتوں میں پھیل گئی تھی۔فصل کاٹ لی گئی تھی اور کہیں کہیں سبز گھاس کے قطعے نمودار ہورہے تھے۔باقی جگہ پر بھوسے کی ناڑیں اور خشک ،سخت جڑیں بکھری ہوئی تھیں۔تازہ تازہ کٹائی کے بعد جگہ جگہ کبوتروں اور دوسرے پرندوں کے پرے بیٹھے چگ رہے تھے۔درخت صرف گاؤں کے اردگرد اور جوہڑ کے کنارے پر تھے۔زیادہ تر شیشم اور آم کے گھنے پیڑ تھے جن کے سائے میں مویشی بندھے تھے اور چارپائیوں پر اکا دکا کسان سو رہے تھے۔دور مغرب میں گھنے درختوں کی قطار تھی اور کسی کسی کھیت میں پکی ہوئی فصل کھڑی تھی۔''(۵۴)

''جیسے ہی انھوں نے نالہ پار کیا وہ گندم کے کھیت کے کنارے کھڑے تھے۔سونے کے رنگ کی فصل تیز دھوپ میں چمک رہی تھی۔ہوا بالیوں میں سرسرا رہی تھی۔فصل کی اوٹ میں چند کسانوں کے باتیں کرنے کی کرخت آوازیں آرہی تھیں۔ایک بڑا سا لکڑی کا کانٹا تھوڑے تھوڑے وقفے پر فصل کے اوپر لہراتا۔وہ گیہوں الگ کررہے تھے۔''(۵۵)

''ایک بڑے تھال میں سفید ابلے ہوئے چاول نکال کر بڈھی نے ان پر سرخ شکر چھڑکی اور گرم گرم مکھن انڈیلا جو شکر اور چاولوں میں جذب ہوگیا۔''(۵۶)

عبداللہ حسین کسانوں کے خارجی ماحول میں کسانوں کی عسرت کی داخلی تصویر کشی بھی بڑے خوب صورت انداز میں کرتے ہیں:

''دیوار پر لٹکی ہوئی لالٹین کی روشنی اپلوں کے دھوئیں میں اور بھی مدھم ہوگئی تھی۔نیاز بیگ کی آنکھوں کے حلقے آدھے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔رخساروں کی ہڈیاں سیاہ تھیں۔گالوں میں گڑھے پڑ گئے

تھے اور جبڑے کی ھڈی مضبوط اور ننگی ہوگئی۔ وہ ایک فاقہ زدہ بوڑھے بیل کی طرح چہرے کی تمام ہڈیوں اور پٹھوں کی نمائش کرتا ہوا کھا رہا تھا۔'' (۵۷)

بیائی کے انداز کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے:

''دونوں نے مل کر گندم کی بوری گھوڑی کی پیٹھ پر رکھی اور باہر نکل آئے۔ ہاتھ سے بوری تھامے وہ گھوڑی کے برابر کھیتوں کے بیچوں بیچ چلتا رہا۔ نیاز بیگ، جو پیچھے پیچھے آ رہا تھا، کبھی کبھی تیز، بے سری آواز میں گانے لگتا۔ چاندنی اس قدر صاف تھی کہ چیونٹی تک نظر آ رہی تھی۔ پچھلی رات کا بوجھل، نم دار ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی اور وہ چلتے چلتے اونگھنے لگا۔ کیکر کے نیچے ایک گیدڑ منہ اٹھائے کھڑا غور سے بیلوں کو دیکھ رہا تھا۔ نیاز بیگ نے دور سے اسے دیکھ لیا۔ اس نے فوراً نعیم کو روکا، چکر کاٹ کر دبے پاؤں پیچھے سے گیا، قریب جا کر گھٹنوں کے بل ہو گیا، پھر لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔ گیدڑ آہٹ پا کر چونکا اور بھاگ گیا۔ نیاز نے گالی دی۔ 'لالو کی گھوڑی پالے سے جڑ گئی ہے۔ اس کے لیے چاہیے تھا۔' ''گیدڑ؟' نعیم نے پوچھا۔ 'ہاں۔ اس کا گوشت گرم ہوتا ہے۔' بوری اتروا کر وہ فوراً کھیت میں گھس گیا۔ 'آؤ۔ میرے ساتھ چلو۔' دوسرے چکر پر گذرتے ہوئے وہ پکارا۔ 'دیکھو۔ یہ ہل پھیرنے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس میں تم ھتی پر بوجھ نہیں ڈالو گے۔ صرف نالی کو زمین میں ڈبوئے رکھنا ہے۔ ھوں؟ لو کرو۔ اور بیج نالی میں ڈالے جاؤ۔ اسے نل بیائی کہتے ہیں۔' اس نے نالی نعیم کے حوالے کی، بیج کی جھولی اس کی پشت پر کس کر باندھی اور ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ تیسرے چکر پر وہ کھیت سے باہر نکل آیا اور کیکر کے نیچے کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ 'ھوں ھوں ھوں۔ لکیر ٹیڑھی جا رہی ہے۔' وہ وہیں سے چیخا۔ نعیم الٹے سیدھے قدم رکھتا، نالی سے کشتی کرتا، زیر لب گالیاں دیتا ہوا بیلوں کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ 'ھواووں' ۔ اس کا باپ پھر چلایا۔ 'اندھے ہو؟ بیج باہر گر رہا ہے۔' 'تمھاری نظر بڑی تیز ہے۔' نعیم نے جل کر کہا۔ 'چاند کی روشنی میں دانے دیکھتے ہو۔' وہ بے حد احتیاط کے ساتھ بیائی کر رہا تھا، لیکن تھوڑے تھوڑے وقفے پر اسے برابر ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ لکیر سیدھی رکھنے کی کوشش میں بیج باہر گرنے لگتا، اور اس کی طرف دھیان دیتا تو نالی باہر نکل آتی۔ خنکی کے باوجود اس کے سارے جسم میں سے پسینہ نکل رہا تھا۔ 'نیلے کی دم مروڑ، اوپر والے کی۔ دبتا ہے کمین کا بیل۔ کھانے کو تو تین مرلے بھی کھا جائے۔' اس کا باپ چیخا۔ وہ بغیر سنے کام میں مصروف رہا۔ جب دوبارہ نیاز بیگ چلایا۔ 'نیلے کو چلاؤ نیلے کو۔' تو اس نے جھنجھلا کر بیل روک دیے اور خالی جھولی پشت پر سے اتار کر اس کے پاس لا پھینکی۔ 'جب میں نے پہلے دن بیائی کی تھی تو ایک سو چالیس کیکر کی چھڑیاں مجھے پڑی تھیں۔ اتنی بیلوں کو نہیں ماریں جتنی باپ نے مجھ کو ماریں۔' نیاز بیگ نے جھولی بھر کر نعیم کی کمر پر کستے ہوئے کہا۔'' (۵۸)

بیائی کے بعد کا منظر:

''کئی کسان ھل پکڑے ہوئے پاس سے گزرے۔سورج اونچا ہوگیا تھا اور دھوپ میں سفیدی اور سختی آ چلی تھی۔تازہ تازہ بچھائے ہوئے بیج پر کبوتروں کے غول کے غول آرہے تھے جنھیں نیاز بیگ گالیاں دیتا ہوا اڑاتا جارہا تھا۔''(۵۹)

کٹائی کا منظر یوں پیش کیا ہے:

''کٹائی شروع تھی۔روشن پور کا ہر فرد اور ہر جانور کام میں مصروف تھا،صرف پرندے اسی طرح آوارہ ،نکمے اڑ رہے تھے۔کڑکتی دھوپ اور لُو کی وجہ سے کسانوں کے جسم سیاہ ہو گئے تھے اور عورتوں کی مٹکیوں میں گھی ختم ہو چلا تھا کہ ہر کٹائی کرنے والے کو پاؤ سیر مکھن روٹی پر لگانے کو چاہیے تھا۔چوپایوں کی پسلیاں نکل آئی تھیں،عورتوں کے چہروں اور ہاتھوں پر خشکی کے سفید دھبے پڑ گئے تھے اوران کے بال کھردرے ہو چکے تھے۔بچوں کی ٹانگیں پتلی اور پیٹ بڑھ گئے تھے اور یہ حالت ہر جان دار کی مشقت اور زندگی کی سختی کی وجہ سے ہو جاتی ہے۔لیکن کسان اپنے گہرے شکن آلود چہروں اور دھنسی ہوئی آنکھوں اور گالوں کے باوجود ایک سوبیس درجے کی گرمی میں کام کرتے ہوئے خوش تھے کیونکہ سامنے ان کی بھاری، پکی ہوئی فصل کھڑی تھی۔وہ درانتیاں چلاتے ہوئے ،ادھرادھر کی باتیں کرتے ہوئے ،مذاق میں گالیاں دیتے ہوئے سنہری میٹھی گندم کاٹ کاٹ کر ڈھیر کرتے جاتے تھے۔''(۶۰)

کٹائی کے وقت ڈھول بجا کر نہ صرف خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے بلکہ اس کی آواز ان میں ایک نئی ولولہ بیدار کر دیتی ہے:

''اگلے کھیت میں ڈھول بج رہا تھا اور کٹائی کی دھن پر کسان درانتیاں چلا رہے تھے۔دو میراثی ننگے بدن پسینے سے شرابور کھیت کے وسط میں کھڑے ڈھول پیٹ رہے تھے۔یہ کٹائی کی مخصوص دھن تھی ۔اس سے بجانے والے اور سننے والے کا خون ابل کر بازوؤں میں آجاتا اور وہ دنیاو مافیہا سے بےخبر درانتی چلاتا جاتا تھا۔میراثی کیا آنکھیں میچے دودو گھنٹے تک ڈھول بجاتے رہتے اور کسان اس کی دھن پر مست بغیر سانس لیے ہاتھ چلاتے جاتے۔یہ ایک اور تین کی تال تھی اور درانتی کے چلاؤ کے لیے مخصوص تھی۔درانتی تین بار چھوٹے چھوٹے جھٹکے کھاتی اور چوتھی بار بڑا جھٹکا کررررر۔اور خشک تڑ تڑ کرتے پتلے نازک گندم کے پودوں کا گٹھا ہاتھ میں آجاتا اور پھر تال کا چکر شروع ہوتا۔دھم دھم دھم دھا دھم۔کررکررکرر کررررر۔کسان پاؤں پر بیٹھے بیٹھے چلتے جاتے اور چھوٹے چھوٹے گٹھے چھوڑتے جاتے۔پسینہ ان کے ماتھے سے،گردن سے،بغلوں سے ٹپکتا اور زمین میں جذب ہو جاتا۔بھوکی اور کمزور زمین پسینے سے سیراب ہوتی اور فصل ان کے حوالے کر دیتی۔چھ ماہ پہلے یہی زمین سیاہ، طاقتور اور گیلی تھی اور ننھے ننھے سبز پودوں کو مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھی۔پانچ ماہ بعد پھر یہ سیاہ اور طاقتور ہو

جائے گی۔لیکن اس وقت کسانوں کے بدن سیاہ تھے اور زمین سفید اور کمزور تھی اور اپنے بچوں کو پال کر مالک کے حوالے کر رہی تھی۔''(۶۱)

کٹائی کے وقت کسانوں آوازیں نکال کر نہ صرف اپنے آپ کو گرماتے بلکہ ان کے جوش سے دوسروں میں بھی ایک نیا ولولہ اور جوش بھر جاتا:

''در در در سؤر۔ست ہو گیاہ۔ہلا پوستی کا ہلا لالالا۔'وہ جانوروں کی بولی بول بول کر ایک دوسرے کو اکساتے اور دھم دھم دھم دھما دھم۔کرکرکررررر۔شریف،محنت کش ہاتھوں میں درانتیوں کی قطار ایک تال پر جھولتی فصل کی جڑوں پر ناچنے لگتی۔''(۶۲)

کٹائی کے وقت کھانے کا منظر:

''جب سورج سر پہ آیا تو گاؤں کی طرف سے رنگ برنگ کپڑوں کا سیلاب امڈ آیا۔بوڑھی جوان سبھی عورتیں سر پہ لسی کے مٹکے اور گھی میں تر بتر باجرے کی روٹیاں اٹھائے ہوئے گھروں سے نکل پڑیں۔وہ اکیلی دکیلی اور غولوں میں آئیں اور مختلف کھیتوں میں پھیل گئیں۔ان کے باریک کرتے پسینے سے کمر، پیٹ اور چھاتیوں پر چپٹے ہوئے تھے،بال اکٹھے کر کے انھوں نے جوڑے باندھ رکھے تھے اور بڑی جوان چال چلتی،لالچی نظروں سے اپنے مردوں کو دیکھتی چلی آرہی تھیں۔اپنے اپنے کھیتوں پر پہنچ کر انھوں نے کھانا رکھا اور جگہ جگہ سے چھوٹے چھوٹے گٹھے اٹھا کر جمع کرنے لگیں۔میراثیوں نے ڈھول بجانے والی سوٹیوں سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور درختوں کے ٹھنڈے سائے کی طرف لوٹے۔کٹائی کرنے والے دکھتے ہوئے گھٹنے اور دھنستے ہوئے پیٹ لے کر اٹھے اور بھوکے جبڑوں کے ساتھ روٹی پر پل پڑے۔''(۶۳)

کٹائی کے بعد کا منظر:

''کٹائی کے تیسرے دن زیادہ تر کھیت صاف کیے جا چکے تھے اور جگہ جگہ کاٹی ہوئی فصل کے انبار لگے تھے۔گاؤں کا ہر بشر کام کرنے کو کھیتوں میں نکل آیا تھا۔عورتوں کے رنگ برنگ کپڑوں اور مردوں کے کالے جسموں کا سیلاب ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور ایک اندرونی مسرت کا دھارا تھا جو کسانوں کی آنکھوں اور ہاتھوں سے پھوٹا پڑتا تھا،کہ یہ ان پڑھ لوگ قہقہے لگا کر ہنسنا نہیں جانتے۔ان کی خوشی حرکت اور عمل سے واضح ہوتی ہے۔''(۶۴)

کبھی بیل گاڑیوں کی دوڑ نہ صرف گاؤں کے ماحول کی عکاسی کرتی ہے بلکہ یہ کسانوں کی فطرت کی بھی غمازی کرتی ہے:

''الالالالالاہ'۔فقیر دین برابر پہنچ کر للکارا۔مہندر سنگھ نے بھی اسی آواز میں جواب دیا اور بیلوں کو ڈھیلا

چھوڑ دیا۔ کچی سڑک پر دونوں گاڑیاں بھاگنے لگیں۔ بغیر اعلان کے دوڑ شروع ہوگئی۔ دیہاتوں میں ایسے مقابلے روز مرہ کی بات تھی اور ان میں بہت کم باقاعدہ اعلانِ جنگ کی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ اب دونوں طرف سے 'الالالاہ' کی مخصوص رٹ اٹھ رہی تھی، یہ اونچی، کرخت بھیڑیوں کی سی آواز تھی جو دونوں فریق جوش اور غصے میں آ کر نکال رہے تھے، اور چھڑیاں اور رسیاں اور گیہوں کے ناڑ بیلوں کی پسلیوں پر مارتے جا رہے تھے۔ راستے میں جاتے ہوئے کسان انھیں دیکھتے اور رستہ چھوڑ دیتے۔ جوشیلے لڑکے ایسی ہی آوازیں نکال کر ان کی ہمت بڑھاتے۔ گاڑیاں کچی سڑک کے گڑھوں اور پتھروں پر اچھلتی بیٹھتی، چرچراتی، گرد و غبار کا طوفان اٹھاتی ہوئی بھاگ رہی تھیں، اور اوپر ہر دو فریق کے بہی خواہ گاڑی کے ڈنڈوں سے لپٹے ہنکارے مار رہے تھے۔ 'اوپر برکھا آ رہی ہے اور لونڈوں کو مستی سوجھی ہے۔' جلدی سے رستہ چھوڑتا ہوا ایک بڈھا کسان بھوؤں میں جھلایا۔ گاڑیاں کھڑکھڑاتی ہوئی اس کے پاس سے نکل گئیں، اور وہ سر سے پاؤں تک گرد میں اٹ گیا۔ جوہڑ کنارے پہنچ کر مہندر سنگھ نے گاڑی ٹھہرائی اور مڑ کر تہبند نکال دیا۔ 'الالالاہ۔ واھگرو فتح اور غرور کے نشے میں وہ فقیر دین کے رستے میں کھڑا ہو کر ناچنے لگا۔ فقیر دین نے گنجی آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور نفرت سے اس کی طرف تھوکتا ہوا نکل گیا۔ کلدیپ کور اندر سے نکلی اور شرم سے لال ہو کر واپس چلی گئی۔'' **(۶۵)**

گاؤں کا شام کا منظر بھی بڑا دل آویز ہوتا ہے، اداس نسلیں میں نہ صرف منظر نگاری کی گئی ہے بلکہ کسانوں کی نفسیات کو بھی سامنے رکھا گیا ہے:

''شام پڑ رہی تھی جب وہ واپس ہوئے۔ جوہڑ کے کنارے کتے بھونک رہے تھے اور اُپلوں کے دھوئیں نے گاؤں کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ مغرب میں ابھی تک گذرے ہوئے دن کی سفیدی رکی ہوئی تھی اور مشرقی آسمان پر ستارے ایک ایک کر کے ظاہر ہو رہے تھے۔ کھیتوں پر اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا اور بیچ بیچ نالیوں میں بہتے ہوئے پانی کا ہلکا شور اٹھ رہا تھا۔ نیچی چھتوں والے خاموش گھروں میں دیے تیزی سے بجھ رہے تھے کہ دن بھر بیلوں کے ساتھ کام کرنے والے کسان جلد سو جاتے ہیں۔'' **(۶۶)**

ناول میں ایک خاندان نیاز بیگ جو ایک چھوٹا زمیندار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ہنر سے عشق کرتا ہے اور اوزار ہتھیار بنانا اس کا عشق ہے۔ جن سے کبھی کوئی گولی نہیں چلائی گئی لیکن انگریز کے صرف شبہ ہونے پر اس کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کر کے جرم کے ثابت ہوئے بغیر قید کر دیا جاتا ہے اور اس کی تمام جائیداد ضبط کر لی جاتی ہے۔ بارہ برس کی طویل قید کاٹنے کے بعد جب وہ واپس آتا ہے تو نہ صرف جسمانی بلکہ نفسیاتی طور پر بھی کمزور ہو چکا ہے۔ ناکردہ گناہ کے جرم میں اتنی

لمبی اور طویل قید اس کو اعصابی مریض بنانے کے ساتھ ساتھ اس کو طرح طرح کے فوبیا (خوف) کا بھی شکار کر دیتی ہے۔ اور وہ ایک نارمل کردار رہنے کی بجائے ایک ایسے طبقے کا نمائندہ کردار بن جاتا ہے۔ جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے اثرات کو بذات خود بھگتا۔ انگریز سرکار کی طرف سے کسانوں کو زبردستی جنگ میں جھونکے جانے اور طرح طرح کے مظالم کی دردناک تصویر ناول میں یوں بیان کی گئی ہے:

''ان برسوں میں روشن پور کے بیسوں نوجوان اجنبی سرزمینوں میں ہلاک ہو گئے تھے۔ جنگ کے میدانوں میں بکھرے ہوئے ان کے محبوب، مضبوط جسم تیز دھوپ میں بخارات بن کر اڑ گئے اور نئے سیلابوں، نئی آندھیوں اور طوفانوں نے ان کی ہڈیاں زمین میں دبا دیں۔ بیسوں عورتیں بیوہ ہو گئیں، اور لڑکیاں محبت میں غریب ہو گئیں۔ روشن پور کی زمینوں میں سیلاب آئے اور فصلیں تباہ ہو گئیں۔ اور کسان قرضے اور بھوک کے نیچے جھک گئے۔'' (۶۷)

الغرض اداس نسلیں میں کئی کردار ہیں اور ان میں سے ہر کردار ایک خاص طبقہ کا نمائندہ ہے۔ جن میں روشن آغا جاگیر طبقے کے نمائندہ ہیں۔ وہ جاگیردار طبقہ جس کو انگریزوں نے اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے پیدا کیا تھا۔ ہمارے ہاں آج بھی ہر جاگیردار کے ہاں روشن محل کی طرح پارٹیاں ہوتی ہیں، اور وہاں پر کسانوں کی بھوک سے بے خبر ہو کر کھانے کھائے جاتے ہیں اور کئی روشن آغا آج بھی ہمارے معاشرے میں غریبوں پر مسلط ہیں۔ ناول میں عذرا اور نعیم کا کردار بھی اہم کردار ہیں۔ وہ بھی جاگیردار طبقہ ہی کی پیداوار ہے لیکن ایک باوفا اور باوقار عورت ہے۔ جو آخری دم تک نعیم سے محبت کرتی ہے۔ علی جو کہ نعیم کا سوتیلا بھائی ہے وہ مزدور طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ مدن جو کہ ناول میں دہشت پسندوں کے گروہ کا نمائندہ کردار ہے۔ جس کا عقیدہ تھا کہ آزادی صرف تشدد سے حاصل ہو سکتی ہے۔ نعیم جو کہ ناول کا ہیرو ہے۔ متوسط طبقہ کا نمائندہ ہے۔ ضدی ہے، جس کا کوئی پختہ نظریہ نہیں ہے لیکن جس بات پر اڑ جائے اسے ضرور پورا کر کے دم لیتا ہے۔ ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انوار الحسن نقوی لکھتے ہیں:

''آگ کا دریا'' کے بعد اردو کا سب سے اہم ناول ''اداس نسلیں'' ہے...... اس کی کہانی پہلی عالمی جنگ سے ذرا پہلے شروع ہو کر ملک کے بٹوارے پر ختم ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کا یہ دور کئی لحاظ سے بہت اہم ہے اور عہد آفرین تھا۔ ۳۵ سال کے مختصر عرصے میں ہندوستان نے بہت کچھ دیکھا۔ دو جنگیں اور ان کے بھیانک نتائج...... پرانی قدروں کا زوال، سرمایہ و محنت کی کشمکش، ملک کا بٹوارہ، بھیانک مساوات اور نامساعد حالات جنم لینے والی اداس نسل جو بالا آخر اپنے وطن میں بے وطن ہو جاتی ہے۔'' (۶۸)

مصنف نے ناول میں پوری معاشرت کی عکاسی بہترین انداز میں کی ہے۔ اس ماحول کی جس میں انسانیت کرب

وازیت کی زندگی کا شکار تھی، جہاں غریب غریب تر اور جاگیرداروں، سرمایہ داروں کی زندگیاں پرتعیش اور آرام وسکون کا نمونہ تھیں۔ نیاز بیگ، نعیم اور احمد دین اس محنت کش طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں جن کو سخت محنت اور مشقت کے بدلے میں جاگیرداری استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

> ''تم نے میرے باپ کو کھیتوں میں کام کرتے ہوئے دیکھا ہے؟ یا اپنے باپ کو؟ ان کی انگلیاں ٹیڑھی ہوگئی ہیں اور پیٹھ کی کھال دھوپ میں جل گئی ہے اور آنکھوں سے پسینہ بہہ بہہ کر وہ اندھے ہو گئے ہیں۔ ان پر اتنا قرض ہے کہ سات پشتیں ادا نہیں کر سکتیں۔ اور تم نے مالکوں کے مکان دیکھے ہیں اور زمین اور مویشی؟ اور جتنا دودھ روزانہ ان کے گھروں میں جاتا ہے اتنا تم نے ساری عمر بھی نہیں پیا ہے؟ تم کہاں کی بات کرتے ہو۔'' **(۶۹)**

غرض جاگیردارانہ نظام نے برصغیر میں جس طرح اپنی جڑیں مضبوط کیں اور غریب کسانوں، مزدوروں کا معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے استحصال کیا اس کی پاداش میں ایک واضح قسم کی طبقاتی تقسیم نے جنم لیا۔ جس کے باعث معاشرے میں اخلاقی ناآسودگیوں اور محرومیوں نے جنم لیا۔ ان محرومیوں کے نتیجہ میں اس جاگیرداری نظام کے ظلم وستم کے خلاف ایک ایسے طبقہ نے سر اٹھایا جس کے دل میں اس نظام کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ جس کا نمائندہ ناول میں ایک کردار مدن ہے۔ جس نے ان مظالم سے تنگ آ کر گاؤں چھوڑ کر در بدر بھٹکنے کو اہمیت دی۔ اور آخر کا اسی نظام کے خلاف بغاوت کرتے کرتے پولیس کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ ڈاکٹر خالد اشرف لکھتے ہیں:

> ''اچھوت طبقے سے متعلق ہونے کی بنا پر زمیندار کے مظالم سے تنگ آ کر گاؤں چھوڑ کر در بدر بھٹکنے پر مجبور ہوا تھا۔ اس کی عمر پچیس برس کی تھی۔ لیکن اس نے ایک دن بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس لیے اس کے نظام فکر میں احساس جرم جیسی کوئی چیز باقی نہیں بچی ہے۔ وہ جس بے رحم سماج کے استحصال کا شکار ہوا ہے اس سے انتقام لینے کا صرف ایک ہی طریقہ چاہتا ہے۔ تشدد کا طریقہ۔'' **(۷۰)**

ناول میں مصنف نے برصغیر کے ان پسماندہ انسانوں کی بے چارگی کو پیش کیا ہے۔ جن کے اعصاب کو جاگیردارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کی غلامی نے شل اور دماغوں کو منتحل کر دیا تھا اور ان غریبوں اور ان کی اداس نسلوں کے لیے ملکی تقسیم تباہی اور تاراجی کے سوا کچھ نہ لا سکی۔ جس نے ان کی محرومیوں میں اضافہ ہی کیا۔

ناول میں کسان کا اپنی زمین سے رشتہ اور تعلق اس کی اپنی زندگی کے ظاہر و باطن کی جیتی جاگتی تصویر بن کر ہمارے سامنے موجود ہے۔ جس میں ہمیں ان کی محنت و مشقت، محبت و نفرت، ظلم و ستم، مظلومیت، بھوک اور افلاس، صبر و تحمل کے مرقعے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ وہ کسان تھے جن کو حکومت کے کارندوں نے اتنا بے بس کر دیا تھا کہ وہ اپنی شناخت ہی کھو رہے

تھے اوران کو وہ مقام دیا جا چکا تھا جہاں سے وہ کبھی بھی اپنے حق کے لیے آواز بلند نہیں کر سکتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو کبھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہوا۔ اور نہ ہی کسی سماجی مرتبے کے اہل ٹھہرے تھے۔ غرض جب نعیم نے دہشت پسندوں کو اس راستے سے روکنے کی کوشش کی تو ان کے اندر دبی نفرت آگ کی چنگاریاں بن کر بھڑک اٹھی۔

''اچانک مادھو بول اٹھا: تو کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم سب یہ سب کچھ نہیں چاہتے۔ ہمیشہ سے جانوروں کی طرح رہتے آئے ہیں! ہم نے کبھی صاف ستھری جگہ پر بیٹھ کر، صاف ستھرے برتنوں میں الگ الگ برتنوں میں نہیں کھایا۔ یا کھانے کی خواہش نہیں کی۔ میں زمیندار کے کتوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا اور رہتا سہتا تھا۔''(۷۱)

اس ناول میں صرف جاگیردارانہ نظام اور اس کے زیر اثر کسانوں کے حالات کو ہی بیان نہیں کیا گیا بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کے بعد انہیں کسانوں کی بیداری اور شعوری آگاہی کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ جس کے تحت ناول میں صرف ماضی کی اولیت ہی نہیں بلکہ حال اور مستقبل کی پر امید جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔

اداس نسلیں میں پہلی جنگ عظیم سے قیام پاکستان کے زمانے تک کی سیاسی جدوجہد اور مشرقی پنجاب کی دیہی زندگی پر اس کے اثرات کی نشاندہی کافی وسیع پیمانے پر کی گئی ہے۔ ناول میں نعیم اور عذرا کے مرکزی کرداروں کے علاوہ علی اور عائشہ بھی ہیں۔ یہ دونوں گاؤں کی پرسکون فضا میں پل کر جوان ہوئے ہیں، چونکہ یہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں اس لیے ان کے مزاج میں گاؤں کے باشندوں کی روایتی سادگی، اکھڑ پن اور معصومیت ہے۔ نعیم کی سخت گیری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے علی گاؤں سے بھاگ کر شہر جا بستا ہے اور کافی ٹھکانے بدلنے کے بعد فیکٹری مزدور بن جاتا ہے۔ عائشہ اور علی ایک مزدور بستی میں تنگ و تاریک کوٹھری کرائے پر لے کر انتہائی عسرت اور تنگ دستی کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں کیونکہ فیکٹری میں مزدوروں کی اجرتیں اس قدر کم ہیں کہ دونوں بمشکل جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھ پاتے ہیں۔ فیکٹری کا ظالمانہ ڈسپلن اور کمر توڑ محنت علی کی زندہ و توانا شخصیت کو مسخ کر دیتے ہیں اور عائشہ مستقل مریض بن جاتی ہے۔ اس مشینی نظام کے بے حسی اور استحصال کا شکار ہو کر علی چڑچڑا ہو جاتا ہے:

''گھر پہنچ کر جب اس نے کھانا کھایا اور عائشہ کو ہر دم بک بک کرتے رہنے پر پیٹا تو اس کے دل پر موت کا سایہ گہرا ہو گیا۔ صبح سویرے کام پر جاتے ہوئے اُسے عجیب احساس ہوا۔ وہی گلیاں، مکان، نل، وہی فیکٹری، مشینیں، دیواریں، وہی جگہ، وہی منظر، لوگ جن سے روز ملتا تھا۔ ہر چیز، ہر شے اس قدر حوصلہ شکن طور پر یکساں اور ساکن اور غیر مبدل، دفعتاً اس جگہ کی تنگی اور خوفناک حد بندی کا احساس بوجھ بن کر اس کے دل پر بیٹھنے لگا۔''(۷۲)

فیکٹری کی کمر توڑ محنت،تفریح کے ذرائع کو فقدان اور معاشی تنگی علی کو اپنی زندگی اور معاشرے سے اس حد تک الگ تھلگ (Alienate) کر دیتے ہیں کہ وہ سب سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔فیکٹری کی ہڑتال کے دنوں میں اس کی زندگی میں ایک عارضی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔وہ ان مزدوروں میں سے ہے جو ہڑتال میں شامل نہیں ہوتے۔ چنانچہ مالکان کے ایجنٹ اور افسران علی ساتھ بظاہر دوستانہ اور ہمدردانہ سلوک کرتے ہیں کیونکہ انتظامیہ فیکٹری کو ہر قیمت پر چلا کر ہڑتالی مزدوروں کے حوصلے پست کرنا چاہتی ہے۔اس لیے انتظامیہ کا ساتھ دینے والے مزدوروں کو طرح طرح کے انعامات واحسانات سے نوازا جاتا ہے،دوسری طرف علی کو برادری کے بھوکے اور بیمار مزدور مالکان کے غنڈوں اور پولیس کے تشدد کا نشانہ بنتے ہیں۔علی کی یہ خوشی بھی چندروزہ ثابت ہوتی ہے اور پھر وہی بدحالی اور بدنصیبی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔عبداللہ حسین نے ناول کے اس حصے میں ہندوستان میں صنعتی نظام کی ابتدا اور ٹریڈ یونین تحریک کی شروعات کا ذکر نہایت حقیقی انداز میں کیا ہے کہ کس طرح نئے سرمایہ دار گاؤں سے آ کر بھرتی ہونے والے مزدوروں سے جانوروں کی طرح محنت لیتے اور اس کے بدلے میں انھیں انتہائی قلیل اجرت دیتے کہ وہ صرف زندہ رہ سکتے تھے۔ڈاکٹر خالد شریف اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''چنانچہ گاؤں کا کھلنڈرا،خوش مزاج اور زندہ کسان فیکٹریوں سے مریض،چڑچڑا اور سنگ دل بن کر نکلتا تھا۔دوسری طرف ان صنعت کاروں کی زندگی تھی جہاں ہر طرح کی سہولیات اور عیش موجود تھے۔بظاہر مہذب اور Sophisticated نظر آنے والے یہ سرمایہ دار مزدوروں کا خون چوس کر ان کو ملازمت سے نکال دیتے ہیں اور تازہ دم وتوانا بے روزگار بھرتی کر لیتے ہیں۔اسی طرح یہ فیکٹریاں اور ملیں انسان اور انسانیت کے مقتل بنے ہوئے ہیں،جہاں منافع کی ہوس طاقتور وصحت مند نوجوانوں کو موت کی طرف دھکیلتی رہتی ہے۔''(۷۳)

ذات پات کا نظام مشرقی تہذیب کا حصہ ہے۔ہندوستانی معاشرے میں خاص طور پر اچھوتوں کا مسئلہ۔اداس نسلیں میں اس دور کے ہندوستان میں اچھوتوں کے مسئلے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔نعیم ایک زمانے میں دہشت پسندوں کے گروہ سے وابستہ رہا تھا۔اس گروہ میں اس کی ملاقات مدن اور اس کی بہن شیلا ٹھاکر سے ہوتی ہے۔نعیم مدن کو انتہا پسندی کے راستے سے الگ ہٹ کر امن پسندانہ جہد وجہد کی تلقین کرتا ہے۔لیکن مدن اس کو بتاتا ہے کہ کس طرح وہ اچھوت طبقے سے متعلق ہونے کی بنا پر زمین دار کے مظالم سے تنگ آ کر گاؤں چھوڑ کر دربدر بھٹکنے پر مجبور ہوا تھا۔اس کی عمر پچیس برس کی تھی لیکن اس نے ایک دن بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا۔اس لیے اس کے نظام فکر میں احساسِ جرم جیسی کوئی شے باقی نہیں بچی ہے۔وہ جس بے رحم سماج کے استحصال کا شکار ہوا ہے اس سے انتقام لینے کا صرف ایک ہی طریقہ جانتا ہے۔تشدد کا

طریقہ۔اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کو اپنی جان بچائے رکھنا ہے۔کیونکہ اس کی گرفتاری کا نتیجہ اس کی بہن کی زندگی کے بے سہارا و بے یارومددگار ہونے کی شکل میں ظاہر ہونا طے تھا۔چنانچہ مدن دہشت پسندی کو ترک کرنے پر راضی نہیں ہے۔لیکن وہ پولیس کے ہاتھوں مارا جاتا ہے اور شیلا ٹھاکر اس کی موت کے بعد ایک ہندو کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔اس کے بعد ایک مسلمان فنٹر اُسے اپنا لیتا ہے اور وہ مسلمان ہو جاتی ہے۔تقسیم وطن کے بعد ایک قافلے میں بہتی ہوئی شیلا ٹھاکر جو اب بانو کہلاتی ہے اتفاقاً علی سے ٹکرا جاتی ہے، جس کی بیوی ہجرت کی تھکن اور بھوک کی تاب نہ لا کر دم توڑ چکی تھی۔چنانچہ علی اور بانو شوہر و بیوی کی حیثیت سے پاکستان میں نئی زندگی شروع کر دیتے ہیں۔

ایک طرف اس ناول میں دیہی زندگی کی تصویر کشی ہے تو دوسری طرف شہری معاشرت اور طبقہ اشرافیہ کی زوال آمادہ ٹوٹتی بکھرتی کھوکھلی وضعداری، تہذیبی اقدار اور جاگیردارانہ معاشرت کے نقوش بہ حسن و خوبی نمایاں ہیں۔صنعتی نظام کے وروداس نظام میں مزدوروں کے استحصال اور ان کے دیگر مسائل کی تصویر کشی بھی اس ناول کا خاصہ ہے۔

مجموعی طور پر عبداللہ حسین نے اداس نسلیں کے وسیع کینوس پر جاگیردارانہ نظام، شہری اور دیہاتی زندگی کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔اس میں ہندوستان کا سیاسی اور دیہی سماج بھرپور انداز سے دکھائی دیتے ہیں۔جہاں کسانوں اور مزدوروں کے روزمرہ کے دکھ درد تکالیف اور ان کے استحصال کی مختلف تصاویر جابجا دکھائی دیتی ہیں۔تقسیم ہند کے بعد بکھرا ہوا جاگیرداری نظام نئی مملکت پاکستان میں پھر سے مستحکم ہو کر اپنی حیثیت بنا لیتا ہے۔اور وہ مزدور اور کسان جو نئی امنگوں اور نئی صبح کے طلوع کی نوید لے کر نئی امنگوں کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے یہاں آ کر بھی ان کے خواب ادھورے کے ادھورے ہی رہے۔غرض ہجرت کے اس سفر کے بعد بھی اخلاقی اقدار اور انسانی اقدار جوں کی توں ہی تباہی کا شکار رہیں۔اس بارے میں ذکی آذر کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

> ''اداس نسلیں کی یہ کہانی اپنے اسلوب اور انداز بیاں کے اعتبار سے بھی ایک نئی چیز ہے۔عبداللہ حسین کا انداز بیاں ہر جگہ دلکش اور متوازن ہے۔ان کے سلوب میں فوٹو گرافی کا نہیں بلکہ مصوری کا حسن ہے۔وہ لمحوں کا عکاس نہیں بلکہ زندگی کا عکاس ہے۔''(۴۷)

بعض ناقدین نے ناول پر اعتراضات بھی کیے ہیں لیکن بعض نے اس کے اسلوبیاتی اور فکری انداز کو بہت سراہا ہے۔غرض اداس نسلیں کے اردو ادب میں خاص مقام سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مغربی تہذیب:

مغربی تہذیب کا سب سے اہم اِمتیازی نشان سائنسی ترقی اور مُسلسل جاری سائنسی تحقیق ہے۔دُوسری اہم اِمتیازی خُصوصیت سول قانون کا اِرتقا ہے جو فرد کے احترام اور اِنسانی عظمت کے احساس کا نتیجہ ہے۔آج شخصی آزادی

تہذیبِ مغرب کی اہم ترین کامیابیوں میں شمار ہوتی ہے۔مغرب نے سائنسی ترقی، ذہنی وشخصی اور سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ اِقتصادی آزادی کو بھی اپنی تہذیب کا اہم جُزو بنایا ہے۔ مادّی تموّل اور وسائل کی افراط اسی اِقتصادی آزادی کے نتیجے میں مغربی مُعاشروں کو حاصل ہوئی ہے۔ اِن شاندار اور باہم مربوط صِفات نے مغربی تہذیب کی مُنفرد صُورت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سماجی طبقات میں منقسم ہندوستان کی قدیم تہذیب کی موجودگی میں یہ دعویٰ قرینِ حقیقت نہیں اور اہلِ مغرب کی دِیگر تہذیبوں سے لاعلمی یا مغربی تہذیب ہی کو تہذیب کے خودساختہ پیمانوں پر مبنی قرار دیتے ہوئے واحد، برتر یا مُنفرد سمجھنے کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔

مغرب کی ترقی اور تہذیب کی اعلیٰ خُصوصیات کے روشن پہلو کے ساتھ ساتھ تصویر کا دُوسرا اور تاریک رُخ مغرب کی سامراجیت پسندی، ہوسِ مُلک گیری، جنگ وجدال اور اِقتصادی اور ماحولیاتی لُوٹ مار ہے۔ دوعالمی جنگیں اور اُن کے نتیجے میں ہونے والی بے پناہ تباہی مغرب کی Warmongering یا ہوسِ ملک گیری ہی کا شاخسانہ ہے۔ ایک طرف سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے بہا ترقی اِنسانیت کے لیے نجات دہندہ بن کر آئی اور دُوسری طرف اِسی سائنسی ترقی کا نتیجہ بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں بالخصوص جوہری اور کیمیائی و جراثیمی ہتھیاروں کے ذریعے امنِ عالم کو داؤ پر لگانے کی صُورت میں وقوع پذیر ہوا۔ دُوسری جنگِ عظیم میں جاپانی شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم سے حملے مغرب کی سائنسی برتری کی بدترین شکل میں ظاہر ہوئے۔ مغرب کی صنعتی ترقی نے ایک طرف اِنسانی زِندگیوں کو اِنقلابی تبدیلیوں سے رُوشناس کرایا، معیارِ زندگی کو بلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا، ترقی کی رفتار کو تیز کیا لیکن ساتھ ہی کرّۂ ارض کو بے پناہ ماحولیاتی خطرات سے دوچار کر دیا جس کا ایک بھیانک نتیجہ غیر معمولی موسمیاتی تبدیلیوں کی صُورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ مغرب اِنسان دوستی، آزادی، برداشت و رواداری، آزادیٔ اِظہار اور امن کا علم بردار بھی ہے اور دُنیا بھر میں اپنی اِنہی خُصوصیات کے برعکس عمل کرتا ہوا بھی پایا جاتا ہے۔ آج کی دُنیا مغربی تہذیب کے اِنہی دُہرے معیار کا شکار ہے۔ اداس نسلیں میں بھی مغربی تہذیب کے روشن اور تاریک دونوں پہلو سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر انیس ناگی کی رائے ہے:

> ''یہ تصوراس دور کی برطانوی حکمتِ عملی کا مظہر ہے کہ انگریز کی غایت اعلیٰ تمدُّن، علومِ جدیدہ اور انسانی اقدار کی ترویج ہے۔ انگریز انتظامیہ نے تعلیمی نصابوں سے لے کر عملی زندگی کے تمام شعبوں کو اس طرح منظّم کیا کہ اُن تک رسائی کے لیے اور معاشرتی تعزز کے لیے مغربی طرزِ زیست اور مخصوص آداب ایک شرط بن گئے۔''(۷۵)

یہاں انیس ناگی کی رائے سے جُزوی اِتفاق کیا جاسکتا ہے، اُن کا یہ کہنا کہ مُعاشرتی مقام ومرتبے میں بہتری کے لیے مغربی آداب اور طرزِ زِندگی نے ایک شرط کی حیثیت اِختیار کر لی تھی، بالکل دُرست ہے اور اِس کے لیے باقاعدہ فضا

تشکیل دِی گئی تھی۔ تعلیم سے لے کر اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے حُصول تک مغربی تہذیب کو اپنائے بغیر آگے بڑھنے کی صُورت مُمکن نہ تھی۔ لیکن یہ کہنا کہ ''انگریز کی غایت اعلیٰ تمدّن، علوم جدیدہ اور انسانی اقدار کی ترویج''، تھی کُلّی طور پر درست نہیں۔ انگریزوں کے پسِ پردہ عزائم اِس سے قطعاً مختلف تھے یعنی مغربی تہذیب کی ترقی اور ترویج اور اسے برتر ثابت کرنا ہی اُن کا اصل مقصد تھا۔ یہ عزائم آنے والے وقتوں میں واضح ہو گئے تھے اور آج کی دُنیا میں اِنہی مقاصد کو عملی شکل دینے کے لیے مغربی اقوام پورے شدّ ومدّ سے کوششوں میں مصروف ہیں تا کہ ایک آفاقی تہذیب کو مُمکن بنایا جا سکے جو دراصل مغربی تہذیب کا دُوسرا نام ہے۔ رڈیارڈ کپلنگ کی ۱۸۹۹ء میں لکھی گئی نظم سفید آدمی کا بوجھ *The Whiteman's Burden* اِستعماری طاقتوں کے اصل عزائم اور اپنے نو آبادیاتی غُلاموں کے بارے میں حقیقی خیالات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ سفید آدمی نے 'غیر مُہذب' اور کم ترقی یافتہ اقوام کو تہذیب سکھانے کی خود ساختہ ذِمے داری قبول کر کے اسے اپنے کندھوں کا بوجھ قرار دے دیا۔ یہ بوجھ سفید اقوام نے خود اپنی مرضی سے اپنی ذمے داری قرار دیا۔ 'مُہذب' بنانے کی اِس نام نہاد ذمے داری کی آڑ میں اصل مقصد سفید سامراج کے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل اور اپنی تہذیبی برتری کا اِظہار تھا۔ ہندوستانیوں کو 'مُہذب' بنانے کے پسِ پردہ بھی یہی غایت اور ذہنیت کارفرما تھی جس کے تحت صرف مغربی تہذیب (یورپی تہذیب) ہی تہذیب کہلائی جا سکتی تھی اور باقی اقوام خواہ وہ کتنے ہی قدیم اور بھرپور تہذیبی وِرثے کی مالک کیوں نہ ہوں، مُہذب کہلانے کی حق دار نہیں تھیں۔

مغربی تہذیب کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو دو طرح کے نتائج سامنے آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ہندوستانی مُعاشرے میں مغربی طرزِ مُعاشرت اپنا کر ترقی کی کوشش محض ظاہری سطح تک محدود رہ گئی اور زبان، لباس، رہن سہن وغیرہ میں تبدیلی سے فکری رویے کسی بنیادی یا اِنقلابی تبدیلی سے ہم کنار نہ ہو پائے۔

ثانیاً فکری سطح پر تبدیلی رُونما ہوئی اور وقت کی گردش کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ طبقوں میں مغربی عُلوم کے زیرِ اثر شعور کی بیداری اور سیاسی وسماجی بیداری ایک لازمی نتیجہ تھا۔ اُنیسویں صدی کے اواخر میں برِصغیر کے مُسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج نے اُن کے سیاسی شعور کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا اور آنے والے وقتوں میں برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کرنے میں یہی تعلیم یافتہ طبقہ نمایاں نظر آتا ہے جو ہندوستان ہی نہیں اِنگلستان سے بھی تحصیلِ علم کر چُکا تھا۔ مغربی تہذیب کی خوشہ چینی ظاہری سطح پر زبان، لباس یا مغربی آداب تک محدود رہ کر اِنقلاب نہ لا سکتی تھی تاہم تعلیم یافتہ طبقوں کے فکری رویوں اور رُجحانات میں تبدیلی نے حقیقی تبدیلی کی راہ ہموار کی۔ مغربی تہذیب کی اساس آزادی، جمہوریت اور وطن پرستی پہ تھی اور اِنہی تصوّرات نے بالآخر تعلیم یافتہ اذہان کو مُنوّر کر کے ایک واضح منزل کا تعیّن کیا۔

اُنیسویں صدی میں ایک طرف مغربی تعلیم کے اثرات اور دوسری طرف سائنس وصنعت کے میدانوں میں حیرت انگیز پیش رفت کے نتیجے میں یورپ کی بے پناہ مادّی ترقی ہندوستانی نوجوانوں کے اذہان کو گرفت میں لیتے ہوئے اُنہیں مذہب سے بیگانہ اور تشکیک کا شکار بنا رہی تھی۔ وہ مذہب پر کار بند رہنے کو ترقی کی راہ میں رُکاوٹ سمجھنے لگے تھے۔ اندازِ فکر میں اِس حد تک تبدیلی وقوع پذیر ہو رہی تھی کہ مذہب کی اخلاقی اقدار پاؤں میں پڑی بیڑیاں تصوّر کی جانے لگی تھیں جو آزادیٔ فکر وعمل کی راہ میں حائل تھیں۔ مذہب کو عقل اور سائنس سے مُتصادم تصوّر کیا جانے لگا اور اِس سے پیچھا چُھڑانے کی کوششیں ہونے لگیں۔ مذہب کو از کار رفتہ اور بوسیدہ شے سمجھ لیا گیا اور سائنس کو نسلِ انسانی کے تمام مسائل کے حل تلاش کر لینے کا اہل سمجھ لینے کی روش کا آغاز ہو گیا۔

مغرب کے ہاں مشرقی حیا کا بھی وہ تصور نہیں جو ہندوستان میں عام تھا۔ اپنے آپ کے سوا دوسروں سے لاتعلق رہنا مغربی تہذیب کا خاصہ ہے۔ مادیت پرستی نے اس لاتعلقی کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ احساس تفاخر بھی یعنی قومی برتری کا احساس بھی اس میں شامل ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیاں بھی ایک ایسی ہی حد فاصل موجود ہے۔ مہاراجہ پرتاب گڑھ اپنے پیرس کے سفر کا احوال یوں سناتے ہیں:

> ''پیرس میں میں نے دیکھا مسٹر ۔۔۔ کہ جس ہوٹل میں میں ٹھہرا وہاں عجیب رواج تھا۔ وہ پیرس کا سب سے بڑا ہوٹل تھا، اور ہر ایک 'سوئٹ' کے ساتھ دو دو غسل خانے تھے۔ کیا ہوا کہ صبح صبح جب میں نہانے کے لیے نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے والے 'سوئٹ' سے ایک صاحب ننگ دھڑنگ، کمر کو تولیے سے پونچھتے نکلے چلے آرہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر کہا: 'اوہ معاف کیجئے'، اور واپس چلا آیا۔ وہ صاحب جواب دیے بغیر نکل گئے'۔ 'انگریز خاتون سرخ ہو گئیں' 'انگریزی بہت کم سمجھتے ہیں وہاں پر'۔ وہ جلدی سے بولیں۔ 'جی ہاں' راج کمار نے بے حد اخلاق سے کہا 'بڑی دقت ہوتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ فرانس کا ساحل آپ سے صرف تیس میل دور ہے'۔ 'درست ہے۔ بالکل درست'۔ خاتون نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ 'حیرت کی بات تو ہے'۔ 'اچھا تو مسٹر ۔۔۔' مہاراج کمار نے بہر حال بات جاری رکھی، 'دوسرے دن پھر یہی حرکت ہوئی۔ اب کے کوئی دوسرے صاحب تھے۔ میں بھی ڈھٹائی سے سامنے دیکھتا ہوا پاس سے گزر گیا، لیکن آگے نکلنے پر میں ایک نظر پیچھے مڑ کر دیکھنے سے باز نہ رہ سکا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خاتون بڑی بے خبری اور لاتعلقی سے میرے پیچھے چلی آرہی ہیں۔ اس کے بعد میں پیرس کا عادی ہو گیا۔''(۷۶)

اداس نسلیں میں مغربی تہذیب کا اس طرح کے براہ راست مناظر کم ہیں، جیسے گریز اور لندن کی ایک رات میں ملتے ہیں، اداس نسلیں کا نعیم مغربی ممالک میں جاتا بھی ہے تو محض ایک سپاہی کی طرح، وہاں کی

معاشرت کا براہ راست اسے ویسا تجربہ نہیں ہوتا جیسا ہمیں گریز اور لندن کی ایک رات میں ملتا ہے۔ اداس نسلیں میں ہم جتنی مغربی اقدار سے واقف ہوتے ہیں، ان میں سے بیشتر کا بیان نو آبادیات کے ضمن میں ہے۔

نو آبادیاتی اثرات:

اُنیسویں صدی کے اواخر میں برِصغیر کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی میں رُونما ہونے والا تبدیلی کا عمل بیسویں صدی کے آغاز میں بھی جاری رہا۔ تہذیبی تبدیلیوں اور سیاسی اُتھل پُتھل نے رفتہ رفتہ سیاسی بیداری کی صُورت اختیار کر لی۔ نظامِ حکومت میں اِنقلابی تبدیلیاں آ گئی تھیں اور برطانوی سامراج نے حکومت سنبھالنے کے ساتھ ساتھ اپنے نظامِ تعلیم اور تہذیب کو مُتعارف کرانے بلکہ مُسلّط کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ لوگوں کے طرزِ زندگی میں بڑے پیمانے پر تبدیلی واقع ہوئی اور مغربی طرزِ مُعاشرت کو قبولیت حاصل ہونا شروع ہوئی۔ سماج میں آنے والی تبدیلیاں ہمہ جہت تھیں اور سیاسی، معاشی اور مُعاشرتی سطح پر تبدیلی کے علاوہ اذہان اور افکار بھی نئی روشنی سے مُنوّر ہونے لگے۔ تبدیلی کی یہ لہر اِبتداً سُست رفتار تھی اور مُعاشرے کی طرف سے اِسے قبول کرنے میں ایک نوع کی ہچکچاہٹ بھی حائل تھی، لیکن وقت گزرنے پر اِس عمل میں نہ صرف تیزی آئی بلکہ اِس کا دائرہ بھی وسیع ہونے لگا۔

عالمی سطح پر بیسویں صدی کے اِبتدائی عشرے ہنگامہ خیز واقعات اور تبدیلیوں سے عِبارت تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم اوّل کا آغاز ہوا، ۱۹۱۷ء میں اِنقلابِ رُوس وقوع پذیر ہوا، نتیجتاً مختلف عالمی طاقتوں کے مابین سیاسی، تہذیبی اور معاشی سطوح پر توازن بدلنے لگا۔

> ''بیسویں صدی اپنے ساتھ جتنے ہنگامے لے کر آئی، واقعات اور تحریکات میں جتنی برق رفتاری اس صدی کے شروع میں ہوئی اس کی مثال تاریخ کے اور کسی دور میں شاید مشکل سے ملے گی۔'' (۷۷)

بڑے پیمانے پر رُونما ہونے والی اِن تبدیلیوں نے اِجتماعی اور اِنفرادی ہر سطح پر زندگیوں میں ہلچل پیدا کی۔ ایک طرف مُعاشرہ نئے مسائل اور چیلنجز سے دوچار ہوا اور دُوسری جانب فرد ظاہری اور باطنی ہر دو سطوح پر کشمکش کا شکار ہوا۔ سماجی و سیاسی تبدیلیوں نے اِنتشار اور بے چینی کو جنم دیا اور اِس صورتِ حال سے عُہدہ برآ ہونے کے لیے مُختلف شعبہ ہائے زِندگی کی جانب سے مختلف طرح کا ردِعمل ظاہر ہوا۔

ہندوستان سیاسی و اِنتظامی طور پر تہہ در تہہ غُلامی کی زنجیروں میں اِس طرح جکڑا ہوا تھا کہ اگر غُلامی کی ایک صُورت سے نجات پا بھی لیتا تو دُوسری کو مُقابل پاتا۔ برطانوی سامراج ہی نہیں مقامی سطح پر نوابوں، راجاؤں، مہاراجاؤں کی غُلامی بھی ہندوستان کو گھیرے ہوئے تھی۔ یہی نہیں جاگیرداروں، تعلقہ داروں اور زمین داروں نے بھی اپنے اپنے درجے پر

حکمرانی سنبھالی ہوئی تھی۔ ایک طرف یہ سب مجموعی طور پر برطانوی سامراج کے تسلّط کی تقویت کا باعث تھے اور دُوسری طرف اپنے ہی مُلک اور لوگوں کے مصائب و تکالیف میں اِضافے کا سبب بنے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں ایک طرف جاگیرداری نظام کا تسلّط قائم تھا، دُوسری طرف بیسویں صدی کے آغاز میں نیا نیا اُبھرتا ہوا سرمایہ دارانہ اور صنعتی نظام بھی ایک نئی طرح کی غُلامی کو فروغ دے رہا تھا۔

''پہلی جنگ عظیم نے ہندوستانی زندگی کے خالص معاشرتی ڈھانچے کو بدل کر اسے معاشی بنیادوں پر کھڑا کرنا شروع کر دیا اور شہروں میں کارخانوں کی ابتدا اور رفتہ رفتہ ان کے اضافہ اور کثرت نے سرمایہ دار اور مزدور کے مسئلہ کو سامنے لاکر کھڑا کر دیا پھر شہروں کی زندگی کے اس صنعتی انداز نے دیہاتی زندگی کے معاشی نظام میں خاصی الٹ پلٹ کی اور شہر اور دیہات یکساں طور پر اس صنعتی انقلاب کے پیدا کیے ہوئے معاشی جال میں جکڑے گئے۔ سرمایہ دار اور مزدور کی کش مکش شروع ہوئی۔''(۷۸)

جنگِ عظیم اوّل نے دُنیا بھر کے سیاسی و اِقتصادی نظام کو بڑے پیمانے پر مُتاثر کیا۔ ہندوستان جنگ میں براہِ راست ملوّث نہ ہونے کے باوجود برطانوی نوآبادی ہونے کے باعث اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ پایا۔ سامراجی طاقت نے اپنے زیرِتسلّط ہندوستان میں جاگیرداری نظام کے بعد صنعتی نظام مُتعارف کروایا اور یوں سرمایہ داری نظام نے اِس علاقے میں قدم رکھا۔

''یہ غیر ملکی حکمرانوں کی حکمتِ عملی تھی کہ ملک میں بیک وقت جاگیرداری اور سرمایہ دارانہ نظام کی بُنیادوں کو اِس طرح سے مضبوط کیا گیا کہ اِس کا اقتصادی، سماجی اور اخلاقی ڈھانچا تباہ ہو کر رہ گیا۔''(۷۹)

اِس تباہ حال مُعاشرتی و سیاسی ڈھانچے کو از سرِ نو تعمیر اور تنظیم و ترتیب کی ضُرورت تھی۔ ماضی کے برعکس نئی سماجی و مذہبی اِصلاحی تحریکیں شروع کرنے کے بجائے سیاسی بیداری اور مُعاشرے کی تنظیمِ نو کے لیے پہلے سے موجود تحریکوں سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے کوششوں کا آغاز کیا گیا۔ مُعاشرے کے دِیگر طبقوں کے ہمراہ ادیبوں اور شاعروں نے بھی اپنی ذِمے داری محسوس کرتے ہوئے قلم سے تبدیلی کی جدوجہد کا آغاز کیا۔

انگریزوں نے جو ریل کی پٹری بچھائی، یہ نوآبادیاتی اثر ہمیں ان دور دراز علاقوں میں بھی نظر آتا ہے جہاں آمد و رفت کے ذرائع نہایت محدود تھے۔

''روشن پور جانے کے لیے آپ کو رانی کوٹ کے چھوٹے سے قصباتی اسٹیشن پر اتر کر ایسے ہی راستوں پر مغرب کی سمت دور تک چلنا پڑتا تھا۔''(۸۰)

روشن پور کی آبادکاری بھی نوآبادیات کا نتیجہ تھی۔ جب ۱۸۵۷ء میں انگریز افسروں کی جان بچانے پر مختلف لوگوں

کونوازا گیا تو ایسے میں کئی روشن پورو جود میں آئے۔ اس وقت مسلم خواتین کا انگریزوں کے ساتھ جو عمومی رویہ تھا وہ بھی روشن علی کی ماں کے کردار میں سامنے آتا ہے:

''جب سن ستاون کا غدر مچا تو نواب روشن علی خان ضلع روہتک کے کلکٹر کے دفتر میں معمولی اہلکار تھے۔ (ظاہر ہے کہ اس وقت وہ نواب نہیں رہے ہوں گے۔) مڈل تک تعلیم یافتہ تھے اور اپنی شرافت کی وجہ سے دوست احباب اور گلی کوچہ میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اس زمانے میں وہ اپنی والدہ اور نئی بیاہتا بیوی کے ساتھ شہر کے ایک پرانے حصے میں رہتے تھے۔ جس روز شہر میں بغاوت کی آگ بھڑکی اور ہندوستانی سپاہی انگریز افسروں کے خلاف ہتھیار لے کر اٹھ کھڑے ہوئے، اس روز شہر کی عوام میں بھی خوف و ہراس کے ساتھ ساتھ غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ کئی جگہ لوگ گلی محلوں میں اکٹھے ہو کر چھاؤنی سے آنے والی خبروں پر کان لگائے بیٹھے تھے، گو یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ وہ سب کے سب انگریزوں کے جانی دشمن تھے۔ رات پڑی تو سب شہری اپنے اپنے مکانوں میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ شام کے قریب روشن علی خان نے اپنے ایک علیل دوست سے، جس کی مزاج پرسی کی خاطر وہ اس کے ھاں تشریف لے گئے تھے، اجازت حاصل کی اور گھر لوٹے۔ اپنی گلی سے پچھلی گلی کے اندر داخل ہوتے تھے کہ چند قدم آگے ایک بھاگتے ہوئے شخص پر نظر پڑی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سایہ لڑکھڑا کر گرا اور ساکن ہو گیا۔ انھیں تشویش ہوئی، تیزی سے بڑھ کر اس پر جھکے لیکن اندھیرے کی وجہ سے کچھ پہچان نہ پائے۔ پھر آوازیں دیں، ٹٹولا، ناک کے آگے ہاتھ رکھ کر سانس کی روانی کو محسوس کیا اور صرف اتنا جان پائے کہ کوئی مصیبت کا مارا غش کھا گیا ہے۔ بغیر سوچے سمجھے اٹھا کر کندھے پر لاد ا اور چل پڑے۔ مضبوط آدمی تھے، ایک گلی آسانی سے چل کر پار کر لی۔ پر بے ہوش آدمی وزن دار ہوتا ہے، ایک جگہ جو کندھا بدلنے کو رکے تو کوئی سخت سے شئے محسوس ہوئی۔ ٹٹول کر دیکھا تو اس شخص کی کمر کے ساتھ بندھا ہوا طپنچہ تھا۔ ساتھ ہی ان کا ہاتھ خون میں لتھڑ گیا۔ وہ زخمی بھی تھا۔ ان کا ماتھا ٹھنکا لیکن اسے اٹھائے ہوئے چلتے رہے۔

گھر پہنچ کر جو چراغ کی روشنی میں دیکھا تو یکلخت سرد پڑ گئے۔ ان کے سامنے سنہری بالوں والا ایک انگریز پڑا تھا، جو ہندوستانی دکانداروں کے لباس میں تھا۔ اس کا چہرہ بے حد زرد اور سانس مدھم تھا۔ انھوں نے دوڑ کے دروازہ بند کیا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے۔ سب سے پہلے گھر کی عورتوں کو پردے میں کر کے اس کا لباس تبدیل کیا اور ٹانگ کے زخم پر، جو تیز دھار آلے سے لگایا گیا تھا، پٹی باندھی۔ پھر اپنی ماں کو بلایا۔ پہلے تو اس نیک بی بی نے مریض کے فرنگی ہونے کی رُو سے اس کے نزدیک آنے سے انکار کر دیا۔ مگر پھر روشن علی خاں کے، اور اس کی بیوی کے، جو اس خوبصورت جوان کو کس مپرسی کی حالت میں دیکھ کر کافی غمزدہ تھی، منت سماجت کرنے سے اس کی دیکھ بھال کرنے پر رضامند ہو گئی۔ اس

نیک بی بی کا مرحوم شوہر، یعنی روشن علی خان کا والد چھوٹا موٹا حکیم تھا اور گو اس کی وفات سے خاندان میں یہ پیشہ ختم ہو چکا تھا پر اس واسطے سے مرحوم کی بی بی کو، جو مرحوم سے زیادہ طویل العمر ثابت ہوئیں، کسی حد تک حکمت میں دخل تھا۔ بہر حال اس سفید فام مریض کے سلسلے میں ان لوگوں سے جو کچھ ہو سکا انھوں نے کیا۔ یکا یک گلی میں شور اٹھا اور چند لمحوں کے اندر شورِ قیامت معلوم ہونے لگا۔ پھر روشن علی خان کے گھر کا دروازہ دھڑ ادھڑ کوٹا جانے لگا۔ گھر کے مالک نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو ہندوستانی سپاہیوں کی ننگی تلواریں اور برچھیوں کے پھل مشعلوں کی روشنی میں چمکتے نظر آئے۔ گلی میں ہر طرف ھاھا کار مچی تھی اور سر ہی سر نظر آتے تھے۔ تھوڑی دیر تک اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو باغیوں نے دروازہ توڑنے کا فیصلہ کیا۔

اول اول تو محلے کے لوگ گھروں میں دبکے بیٹھے رہے کہ جانے کس کی موت آئی ہے۔ پھر جب بات کھل گئی کہ اس غیض وغضب کا رخ محض روشن علی خان کے گھر کی جانب ہے تو چند سربراہ دبکے دبکائے نکلے اور کسی نہ کسی طور اس دروازے تک پہنچے جس کے توڑے جانے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ وہاں پر انھیں جو بتایا گیا وہ یوں تھا: ''کرنل جانسن، چھاؤنی میں کمانڈنگ افسر، بھیس بدل کر گھیرے میں سے بچ نکلے ہیں اور دلی پہنچنا چاہتے ہیں۔ رستے میں چند سپاہیوں سے ان کی مٹھ بھیڑ بھی ہوئی لیکن وہ ان میں سے تین کو موت کی نیند سلا کر اور خود تلوار کا زخم کھا کر نکل آئے ہیں۔ اب ان کے خون کی لکیر اس دروازے میں داخل ہوئی ہے۔ انھیں ہمارے حوالے کیا جائے، ورنہ دروازہ توڑ کر گھر کے مکینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔'' محلے کے سربراہوں نے، کہ خود خوفزدہ تھے، ہر قسم کی مدد کرنے کا وعدہ کیا اور باغیوں کے غصے کو فی الوقت ٹھنڈا کر کے کسی نہ کسی راستے سے مکان میں داخل ہوئے۔ اب ہر ایک سربراہ اپنی اپنی پگڑی اتار کر روشن علی خان کے پیروں پہ رکھ رہا ہے، منتیں کر رہا ہے، دھمکیاں اور گھرکیاں دے رہا ہے پر ہمت کا دھنی روشن علی خان اپنے اٹل فیصلے پر قائم ہے کہ جان جاتی ہے تو چلی جائے، پر زخمی مہمان کو دشمنوں کے حوالے نہ کروں گا۔

اس کے بعد کے واقعات کے سلسلے میں داستان گو کے بیان میں بڑی گڑ بڑ ہے۔ کبھی کہتا کہ جب دروزہ توڑا گیا تو بہادر نوجوان نے ایک کندھے پر زخمی مہمان کو، دوسرے پر اپنی بیوی کو بٹھایا اور لڑتا بھڑتا ہوا صحیح سلامت نکال لے گیا۔ کچھ موقعوں پر اس نے یہ بھی بیان دیا تھا کہ چند مصلحتوں کی بنا پر باغی دروازہ توڑنے سے باز رہے مگر سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا اور رسد و رسائل کے تمام وسائل منقطع کر دیے گئے۔ یہ سلسلہ کئی ہفتوں تک جاری رہا، یہاں تک کہ اہلیان شہر پر فاقوں کی نوبت آ گئی۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ فرنگیوں کو فتح نصیب ہوئی اور محاصرین کو نجات ملی۔ ایک حکایت یہ بھی تھی کہ روشن علی خان نے جب کوئی راہ فرار نہ دیکھی تو گھر کے فرش میں سرنگ لگانی شروع کی جو چھاؤنی میں جا نکلی۔ اس راستے سے وہ کرنل جانسن اور اپنی بیوی کو نکال کر لے گیا، اور بالآخر محلے کے سربراہوں کی رائے سے جب گھر کا دروازہ ایک دن توڑا

گیا تو گھر میں صرف ایک بڈھی عورت کی لاش ملی۔ یہ گھر کے مالک کی ماں تھی جو پہلے روز ہی صدمے کی وجہ سے راہی ملکِ عدم ہوگئی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ سربراہوں اور باغیوں کو سخت پشیمانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان حکایات کی صحت کی طرف توجہ دینے کی کسی کو ضرورت یوں نہ محسوس ہوتی کہ اس کے بعد داستان گو کے خیالات کی لڑی پھر سلجھ جاتی اور وہ کمال یکسوئی سے یوں گویا ہوتا: ''جب غدر کا خاتمہ ہوا اور باغی کیفرِ کردار کو پہنچے تو کرنل جانسن نے، جو شاہِ انگلستان کے قریبی عزیزوں میں سے تھا، روشن علی خان کو دلی دربار میں بلا بھیجا اور اپنے دستِ خاص سے خلعت عطا کی۔ اور کہا جاؤ اور جا کر جتنی زمین، جہاں تک گھیر لو، تمھیں عنایت کی جائے گی۔ اس کے بعد اس فیاض انگریز حاکم نے، جسے اردو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی، ایک عجیب و غریب تقریب کے دوران۔۔۔۔نواب روشن علی خان کو آغا کا لقب عطا کیا۔'' (۸۱)

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء تک متوسط طبقہ بہت کم وجود میں آیا تھا۔ مغلوں کے جاگیرداری نظام نے ملک میں دو طبقات کو جنم دیا تھا۔ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والی اشرافیہ جس میں نواب، جاگیردار، زمیندار، تعلقدار اور سردار وغیرہ شامل تھے اور نچلا طبقہ جس میں امراء اور رؤسا سے متعلق متوسلین و ملازمین اور گاؤں کے چھوٹے کسان یا زرعی مزدور آتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی نظام و قوانین کے زیرِ اثر ملک میں ایک ترقی پذیر مڈل کلاس وجود میں نے لگی جس نے ایک طرف سرمایہ کاری اور تجارت کو فروغ دیا اور دوسری طرف جدید ٹیکنالوجی حاصل کر کے افسر شاہی اور سروس سیکٹر کی قوت میں اضافہ کیا۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں اپنے مددگاروں کو جاگیریں عطا کیں، جن کی بنا پر زمین داری کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے شہروں میں بھی اپنے مستقر بنائے۔ ایسا ہی ایک ٹھکانہ روشن محل ہے، جو روشن پور کی جاگیر کے نتیجے میں بنا ہے، روشن پور کی جاگیر اسی انگریزی عطا کا نمونہ ہے۔

ناول کے دوسرے حصے کا آغاز روشن محل کی اس تقریب سے ہوتا ہے جہاں روشن آغا کا بیٹا اب اس کی جگہ روشن آغا بننے جا رہا ہے۔ یہ محل دہلی میں ہے۔ اس لیے اس دور کے دہلی پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

دہلی کئی بار اجڑا اور کئی بار بسایا گیا۔ یہ مغلیہ شان و شوکت اور سطوت پارینہ کا نشان تھا۔ انگریز اگرچہ ہندوستان کے طول و عرض میں اپنا اقتدار مستحکم کرتے چلے گئے لیکن ۱۸۵۷ء تک انھوں نے دہلی کا منظر نامہ بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے کلکتہ کو حکومت اور بمبئی کو تجارت کا مرکز بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے کلکتہ اور بمبئی پر یورپی سوچ کی گہری چھاپ نظر آتی ہے جبکہ دہلی ۱۸۵۷ء تک مغلیہ اور روایتی طرزِ احساس کا اسیر محسوس ہوتا ہے۔ دہلی کی تاریخ میں انیسویں صدی کی بہت اہمیت ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا دہلی، ۱۸۵۷ء کے بعد کے دہلی سے یکسر مختلف ہے۔ نہ صرف باطن بلکہ ظاہر میں بھی۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے مرہٹوں سے دہلی کو واپس لے لیا لیکن یہاں اپنا اقتدار جمانے کی بجائے اسے مغل

شہزادوں کے حوالے کر دیا۔ بہادر شاہ ظفر کے دور حکومت تک دہلی، مغلیہ خاندان کے لیے پایہ تخت رہا اور کلکتہ اور بمبئی کے برعکس دہلی، شہر سے زیادہ "A Collection of many villages"(۸۲) محسوس ہوتا ہے۔ لیکن ۱۸۴۴ء تک یہ شہر اتنا بدل گیا کہ ایک یورپی فوجی نے جو کلکتہ سے دہلی آیا تھا اس شہر کے لیے "The Largest city of india" (۸۳) کا جملہ استعمال کیا گیا۔ ۱۸۳۳ء کی مردم شماری کے مطابق محل کے علاوہ دہلی کی آبادی ۱۱۹،۸۶۰ افراد پر مشتمل تھی۔ ۱۸۳۳ء، ۱۸۴۳ء اور ۱۸۴۵ء کی مردم شماری کے مطابق دہلی کی آبادی ۱۳۱،۰۰۰، ۱۳۷،۰۰۰ تک رہی جبکہ ۱۸۵۴ء میں یہ آبادی ۱۵۱۰۰۰ افراد تک پہنچ گئی۔

> "An indian chronicler, writing in the early nineteenth century, who remarked on the extent of Calcutta, the buldings of Jaipur, the abundance of goods in lakhnow, though that Dehli was chiefly remarkable for aadmiyat, its polished urbanity. And the culture of Dehli was contained within its walls. The culture.....was....narrow- midedly urban, seaking protection within the city walls against a surrounding barbarism."(۸۴)

یہ شہر پھول والوں کی سیر، بسنت اور مشاعروں کا شہر تھا۔ ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور روایتی طرز احساس میں رچا بسا تھا۔ اگرچہ جدید روشنی کی کرنیں یہاں تک پہنچنا شروع ہوگئی تھیں۔ دہلی میں چھاپہ خانوں کا قیام اس کی ایک مثال ہے۔ دہلی کی نشاۃ الثانیہ میں جن اداروں کا اہم کردار رہا ہے۔ ان میں دہلی کالج سرفہرست ہے۔ اس کالج نے کئی نامور ہستیوں کو اپنے دامن میں سمویا اور دہلی کے باشندوں کی ذہنی اور تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں دہلی پر حکمرانی کرنے کا برطانوی خواب پورا ہوا اور اسی کے ساتھ عظیم مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ انگریزوں نے دہلی پر بھی قبضہ جما لیا اور یہاں سے دہلی کا ایک نیا روپ ابھرنا شروع ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے چند برس اہل دہلی پر بہت بھاری گزرے۔ خصوصاً مسلمان نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے۔ ان کی حب الوطنی شدید شبہات کی زد میں آ گئی اور اگرچہ جنگِ آزادی میں ہندو بھی شامل تھے مگر انگریزوں کے عتاب کا نشانہ صرف مسلمان بنے۔ شہری اپنی ہی دیواروں میں محصور ہو کر رہ گیا۔ دہلی کے باشندے اپنے آبائی مسکن سے ہجرت پر مجبور ہو گئے اور تباہی و ویرانی ایک دفعہ پھر دہلی شہر کو مقدر ٹھہری۔ لیکن جس طرح ہر ''کمال را زوال'' کا مقولہ درست ہے اسی طرح ہر زوال کے بعد عروج کا مرحلہ بھی آتا ہے۔ دہلی شہر ایک دفعہ پھر آباد ہوا اگرچہ انگریزوں نے شہر کے پرانے طرزِ تعمیر اور طرزِ انتظام کو زیادہ تبدیل نہیں کیا پھر

بھی اس دفعہ یہ شہر ایک نیا شہر تھا۔ جس میں پرانی ثقافت اور روایات کی بو باس کے ساتھ ساتھ چپے چپے پر نئی تعمیر اور ترقی کے اثرات موجود تھے۔ ۱۸۹۰ء میں شہر کو تجارتی مرکز (Commercial Capital) کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ۱۸۷۷ء کے قحط کے باوجود دہلی شہر خوشحالی کی طرف گامزن رہا۔ تجارت، یہاں کے باشندوں کا مطمع نظر ٹھہری۔ شہریوں کا طرز حیات جدید تر ہوا۔ نکاسی آب اور بہم رسانی آب دونوں کے طریقے تبدیل ہوئے۔ پرانے کنوؤں کی جگہ مرکزی نہر نے لی اور پھر نہر سے بھی آگے گھر گھر پانی کی لائن بچھنی شروع ہوئی۔ ۱۸۵۷ء تک دہلی کی حکومت، اپنے شہر کی ترقی و خوشحالی پر لاہور اور امرتسر سے زیادہ خرچ کر رہی تھی۔ یہ تو دہلی کا بیرونی منظر نامہ تھا۔ شہر کے لوگ، نئی روشنی سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ نچلے طبقے کے لوگ بھی نہ صرف اپنے حقوق سے آگاہ تھے بلکہ ان کے تحفظ کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ اس حوالے سے ناریانی گپتا (Naryani Gupta) لکھتے ہیں:

> "The "mohulla" sweepers went on strike again in 1889....What gave the sweepers confidence this time was the fact that there were no bye-law under which they could be punished, and as education (was) becoming more general and lawyers were plentiful, they were aware of this."(۸۵)

صحت و صفائی کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ ویکسینیشن لازمی تھی۔ اگرچہ دہلی کے باشندے اس کو پوری طرح قبول کرنے میں شدید ہچکچاہٹ کا شکار نظر آتے تھے لیکن تبدیلی کے آثار بھی نمایاں تھے۔ دہلی کے لیے ایک اور اہم تبدیلی ریل کی آمد تھی۔ یوں تو انیسویں صدی کے نصف آخر (۱۸۶۰ء) ہی سے ریل اہلیان دہلی کے لیے عجوبہ نہیں رہی تھی لیکن بجلی کی آمد کے ساتھ ۱۹۰۵ء میں شہر میں ٹرام کا نظام رائج ہوا جس نے شہر کو بالکل نئی شکل دی۔ اسی دوران میں دہلی کی آبادی اس قدر بڑھ گئی کہ فصیل شہر کو اکثر و بیشتر گرا دیا گیا اور اگر کہیں اسے باقی رہنے بھی دیا گیا تو اس کی حیثیت آثار قدیمہ سے زیادہ نہ رہی۔ اب دہلی شہر تعلیم، صحت، فنون لطیفہ اور تجارت سمیت ہر پہلو میں دوسرے شہروں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ ناول کے دوسرے حصے کا آغاز روشن محل کے محل وقوع سے ہوتا ہے۔ جس میں سڑکوں کے ناموں سے ہی نو آبادیات اپنے نام چھوڑتی نظر آتی ہے۔

> ''کوئینز روڈ کے آخر میں روشن محل تھا۔ یہ ایک قدیم وضع کی وسیع، دومنزلہ کوٹھی تھی۔ آگے کرزن روڈ شروع ہوتا تھا۔''(۸۶)

روشن محل میں دستار بندی کی تقریب سے پہلے کئے جانے والے انتظامات میں مغربی رنگ کی آمیزش صاف نظر

آتی ہے:

''ان کو دور ہی سے آج کے دن کی چہل پہل دکھائی دے گئی۔ پھاٹک پر کاغذی جھنڈیاں اور رنگ برنگ بجلی کے قمقمے لٹک رہے تھے۔ بہلی سے اترے تو انھوں نے دیکھا کہ لمبی ڈرائیو پر، جو سامنے والے برآمدے تک جاتی تھی، تازہ سرخ بجری بچھائی گئی تھی اور دونوں اطراف چونے کی متوازی لکیریں لگی تھیں۔ برآمدے میں دو میزیں پڑی تھیں۔ایک پر میز پوش تہہ کیے رکھے تھے، دوسری کے گرد بہت سارے لڑکے لڑکیاں کھڑے نیپکن بنا رہے تھے۔ برآمدے کے سامنے وسیع لان میں میزیں اور کرسیاں لگائی جا رہی تھیں۔دن کی روشنی ابھی باقی تھی مگر برآمدے اور باغ میں قمقمے جل رہے تھے۔صرف برآمدے میں شور تھا جہاں میز کے گرد خوش پوش اور تندرست لڑکے لڑکیاں جمع کام کر رہے تھے۔سبز ے پر نوکر سفید وردیاں پہنے خاموشی سے ایک دوسرے کو ہدایات دے رہے تھے۔''(۸۷)

روشن محل میں نواب صاحب کے کمرے کی تزئین و آرائش میں بھی مغربی رنگ کی آمیزش ہے:

''کمرہ بڑے قرینے سے سجا تھا۔نعیم کے عین پیچھے ایک بھس بھرا شیر کھڑا تھا جو خطرناک حد تک زندہ دکھائی دے رہا تھا۔چاروں کونوں میں اونچے اونچے فرشی لیمپ روشن تھے۔کھڑکیوں پر بھاری پردے اور فرش پر دبیز بے آواز قالین پڑے تھے۔ برآمدے کے شور کے مقابلے میں اندر گہری خاموشی اور سکون تھا۔غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ دروازوں کھڑکیوں کی درزیں فلالین کی تہوں سے بند کی گئی تھیں۔''(۸۸)

ریل اور دیگر مغربی اشیا کی طرح کیمرہ بھی اب متوسط درجے کے لوگوں کی زندگی کا حصہ بننے لگا:

''ایاز بیگ نے کونے میں ایک کرسی گھسیٹی اور کیمرہ نکال کر رات کی تصویریں لینے کے لیے اسے تیار کرنے لگا۔''(۸۹)

متمول طبقے کی پارٹیوں میں انگریز بھی شرکت کرتے تھے۔روشن محل کی تقریب میں آنے والے غیر ملکی مہمانوں کا تذکرہ یوں ہے:

''ابھی تک جو لوگ آ چکے تھے ان میں زیادہ تر غیر ملکی تھی۔چند ایک نے اونچے سیاہ ہیٹ اور ٹیل کوٹ پہن رکھے تھے۔باقی نے، جو زیادہ تر نوجوان طبقہ تھا۔شام کا سیاہ چست لباس پہن رکھا تھا اور سر سے ننگے تھے۔تقریباً سبھی خاموش بیٹھے سگریٹ اور موٹے موٹے سگار پی رہے تھے۔عورتوں نے بند گلے کے چست فراک پہن رکھے تھے۔''(۹۰)

مقامی ہندوستانیوں کے طبقہ امراء کا احوال یوں ہے:

''اب ہندوستانی مہمان آ رہے تھے۔وہ مختلف قسم کے لباس میں تھے۔مسلمان پھندنے والی سرخ

ٹوپیوں اور لمبے لمبے چوغوں میں تھے۔ کچھ لوگ شیروانیوں میں بھی تھے جن سے ان کے قوم و مذہب کا پتہ چلانا دشوار تھا کہ ہندوستان میں اب ہندو مسلم عیسائی سب نے شیروانیاں پہننی شروع کر دی تھیں ۔البتہ ہندو اپنی ڈھیلی اڑنگ دھوتیوں اور بڑی بڑی سفید پگڑیوں سے پہچانے جا سکتے تھے۔'' (۹۱)

ہندستانی امراء اور انگریزوں میں سواری کا فرق بھی عام تھا۔ ہندستانی نواب مہاراجے تو نوآبادیاتی رنگ میں رنگے جا چکے تھے، اور انگریز انھیں قبول بھی کرتے تھے، عام امراء کو ابھی تک شاید وہ درجہ نہیں ملا تھا، جس کی وجہ سے ان کے رکھ رکھاؤ اور ادب آداب میں ابھی انگریزوں والا قرینہ نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی انگریز مقامی لوگوں سے ایک خاص قسم کا فاصلہ رکھتے تھے، جس میں اپنے تفاخر کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کو حقیر سمجھنا بھی شامل تھا:

''دو دو چار چار گھوڑوں والی بہلیوں میں آ رہے تھے۔ صرف انگریز مہمان اور چند ہندوستانی موٹروں پر آئے تھے۔ وہ پھاٹک پر نواب صاحب اور ان کی ساتھی عورت کے ساتھ اخلاق سے جھک کر ہاتھ ملاتے یا دور سے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے اور جا کر خاموشی سے بیٹھ جاتے۔ انگریز سب سے ایک طرف بیٹھے تھے، ہندوستانی دوسری طرف۔ غیر ملکیوں نے اپنی اپنی ٹوپیاں اور سکارف آتے ہی خادموں کے حوالے کر دیے تھے۔ ہندوستانی ٹوپیاں پہنے، چھڑیاں ہاتھوں میں تھامے بیٹھے تھے۔'' (۹۲)

پرتاب گڑھ کے مہاراجہ کا انداز انگریزوں والا تھا، جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ نوآبادیاتی حاکم صرف اسے قبول کرتے تھے جو ان کی مجبوری ہوتا تھا:

''ایک ہندوستانی زرق برق شیروانی اور پگڑی پہنے موٹر سے اترا۔ ساتھ ایک نوجوان انگریزی لباس میں تھا۔ نواب صاحب بہت نیچے جھک کر ملے۔ کسی نے کہا مہاراج کمار پرتاب گڑھ ہیں؛ ہمراہ غالباً سیکرٹری تھے۔ وہ واحد ہندوستانی تھے جو آ کر انگریزوں میں بیٹھے۔ انھوں نے اپنی چھڑی بھی خادم کے حوالے کر دی۔'' (۹۳)

چیف کمشنر گوکھلے کی آمد اور سراپا ملاحظہ ہو:

''پھر گوکھلے آئے جس پر تمام ہندوستانی اور چند انگریز اٹھ کھڑے ہوئے اور جھک جھک کر ملے۔ ایاز بیگ نے جب ان کا نام لیا تو نعیم چونک اٹھا اور قریب جا کر کھڑا ہوا۔ گوکھلے کا نام اس نے بہت سن رکھا تھا مگر دیکھنے کا آج پہلی بار موقع ملا تھا۔ انھوں نے پتلون کے اوپر بند گلے کا بڑے بڑے کالروں والا ھاف کوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر ٹوپی لیے ہوئے تھے (اس قسم کی ٹوپی نعیم نے کلکتے میں تلک کو بھی پہنے دیکھا تھا)، گلے میں لمبا سا مفلر بھی تھا۔ سنہرے فریم کا چشمہ لگائے اکہرے جسم کا یہ آدمی خوبصورت کہلایا جا سکتا تھا، اگرچہ بہت کمزور تھا۔'' (۹۴)

انگریز حاکموں سے اپنا تعلق ظاہر کرنے کا کوئی موقع مقامی حاکم جانے نہیں دیتے۔ عام انگریز انتہائی ریلیکس انداز میں باتیں کر رہے ہیں، ھیٹ اگر گھاس پر پڑا ہے تو کوئی بات نہیں، لیکن ایسے میں مہاراجہ کا انداز ملاحظہ ہو جو انگریز حاکم کو یہ جتانے کی کوشش کر رہا ہے کہ میں بھی آپ جیسا ہی ہوں اور ہندوستانیوں کو بھی اس بات کا احساس دلانا مقصود ہے کہ انگریزوں سے میرے بے تکلفی مجھے تم سب سے برتر بنا رہی ہے:

''مہمانوں کی ٹولیوں میں گفتگو بڑے زور شور سے شروع ہو چکی تھی۔ سامنے تین انگریز بیٹھے چوتھے کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ یہ چوتھا، جس کا سیاہ ھیٹ نیچے گھاس پر پڑا تھا، ادھیڑ عمر کا بڑے سے سر والا شخص تھا، اور بڑی محویت سے ڈرامائی انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر کوئی قصہ بیان کر رہا تھا۔ نعیم آگے بڑھا۔ ایک لمبے صوفے پر مہاراجکمار پرتاب گڑھ چیف کمشنر کے ساتھ بیٹھے تاش کے پتے بانٹ رہے تھے۔ ''تاش کے لیے یہ موزوں وقت تو نہیں مسٹر۔۔۔، پر میں آپ کو سکھانے کے لیے بہت بے تاب ہوں۔ ایسا عجیب و غریب کھیل ہے جو یہاں پر کسی کو نہ آتا ہوگا۔ گزشتہ ماہ میں نے پیرس میں ایک خاتون سے سیکھا تھا۔'' انھوں نے پتوں کی تقسیم سے غیر مطمئن ہو کر تاش اپنے سیکرٹری کو پکڑائے اور خود چیف کمشنر کو کھیل کے ابتدائی اصول سمجھانے لگے۔ ساتھ بیٹھی ایک انگریز خاتون بھی دلچسپی لینے لگی۔ سیکرٹری ماہرِ فن کی طرح تاش لگا رہا تھا۔''(۹۵)

عام آدمی کے ساتھ اس دور میں کیا سلوک ہوتا تھا، نوآبادیات کیسے طبقاتی فرق کی خلیج کو اور گہرا کر رہی تھی۔ اس کا اندازہ روشن محل کے پارٹی کے دوران گیٹ پر کھڑے نچلے طبقے کے لوگ اور ان کے ساتھ محافظوں کے سلوک سے ہوتا ہے:

''پھاٹک کے اندر جو کاریں کھڑی تھیں ان کا نظارہ کرنے کے لیے چند بچے اور نچلے طبقے کے لوگ سڑک پر جمع ہو گئے تھے۔ چیف کمشنر کے ہمراہ آئے ہوئے سپاہی انھیں بید مار مار کر بھگا رہے تھے۔ لیکن وہ ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ جا کھڑے ہوتے۔''(۹۶)

مقامی امراء نہ صرف انگریزوں سے تعلق کو تفاخر کا ذریعہ سمجھتے تھے بلکہ بدیسی چیزوں کے استعمال بھی ان کے احساس برتری کو ظاہر کرتا تھا، روشن محل کی تقریب کے ایک دو مناظر ملاحظہ ہوں:

''نواب صاحب کے خاص ملازم نے ایک رائفل اور ایک بڑی سی پستول، جس کے پیچھے لکڑی کا دستہ لگا تھا، لا کر اسے پکڑائی اور وہ تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا کچھ کہنے لگا۔۔۔۔۔افوہ یہ جرمن۔ کمبخت ایسی مشین بناتے ہیں! اب دیکھیے اس ساری پستول میں آپ کو ایک بھی کیل (rivet) نظر نہ آئے گی۔ سارا ویلڈنگ کا کام ہے۔ یہ اصل مرد کا کھیل ہے۔ پارسال شیر کے شکار کو چیف کمشنر کے ساتھ جو میں بنگال گیا۔''(۹۷)

متحدہ ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارہویں صدی کا وسطی زمانہ تہذیبی اور سیاسی تبدیلیوں کے اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تبدیلیاں دوررس اور اثر انگیز تھیں۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ کے نتیجے میں انگریز حکومت بہار، بنگال اور اڑیسہ کے علاقوں میں باضابطہ طور پر حکمرانی کے اختیارات حاصل کر چکی تھی۔ اگرچہ جنوب میں انگریزوں کو حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی صورت میں شدید مزاحمت کا سامنا تھا لیکن اس مزاحمت کے باوجود ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اثر رسوخ بڑھتا چلا گیا۔ حکومت کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ انتظامی امور سنبھالنے کے لیے افرادی قوت کی ضرورت بڑھتی چلی گئی۔ قبل ازیں مغلیہ دور کی شہنشاہیت کے اثرات کے تحت ہندوستان کے طول و عرض میں فارسی زبان کا دور دورہ تھا۔ تقریباً تمام ریاستوں میں دفتری معاملات اور انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے فارسی زبان ہی استعمال ہوتی تھی۔ سرکاری اور دفتری زبان ہونے کی حیثیت سے اس دور میں فارسی زبان کی اہمیت مسلمہ تھی۔ چنانچہ حصول تعلیم کے لیے بنیادی میڈیم بھی فارسی زبان ہی قرار پائی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ فارسی شعر و ادب اس دور کی مجلسی زندگی کا اہم حصہ تھا چنانچہ ابتدا میں حکومتی معاملات چلانے کے لیے جو افرادی قوت دستیاب تھی وہ اسی فارسی دان طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس مجبوری کے پیش نظر انگریز حکمرانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود فارسی اور مقامی زبانوں میں مناسب استعداد پیدا کریں تاکہ دفتری معاملات کی دیکھ بھال کے لیے یہ زبان افسر اور ماتحت میں رابطے کا کام دے سکے۔ اس بنیادی ضرورت کے پیش نظر انگریز حکمران فارسی سیکھنے کی طرف مائل ہوئے۔

عمومی تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ نوآبادیاتی دور میں لسانی حکمتِ عملی کی چار سمتیں تھیں۔ پہلی سمت یہ ہے کہ اس جاگیردارانہ نظام میں ایک کالونی کی حیثیت کی تھی؟۔ یعنی لسانی حکمتِ عملی کا تعین کالونی کی حیثیت سے ہم آہنگ ہے۔ اس دور کی لسانی حکمتِ عملی کی دوسری سمت یہ ہے کہ اس دور میں یہ تصور عام تھا کہ یورپ کا فرض ہے کہ وہ انگریزی کی تعلیم عام کر کے دنیا کو ''مہذب'' بنائے۔ اس تصور نے اس دور میں ایک بیانیے کی شکل اختیار کر لی تھی اور اس کے اثرات آج بھی نظر آتے ہیں۔ تیسرا اہم عنصر جس نے اس دور کی لسانی حکمتِ علمی پر گہرے اور دوررس اثرات مرتب کیے، مقامی آبادی میں طبقات کا وہ نظام تھا جو صدیوں سے موجود تھا اور جس سے غیر ملکی حکمرانوں اور نوآبادکاروں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا۔ ان طبقات میں معاشی، معاشرتی، نسلی اور علاقائی اعتبار سے منقسم طبقات نظر آتے ہیں۔ اور چوتھی سمت وہ تھی جو تاریخی تصورات کے تحت استشراقی نقطہ نظر کے حامی مسلسل بیان کر رہے تھے جس میں اقوام کی روایات اور اقوام کے انحطاط پر زور دیا جاتا تھا۔(۹۸)

اس تناظر میں اداس نسلیں کو دیکھا جائے تو مقامی لوگوں کو معلوم تھا کہ انگریزی ان پر مسلط کی جا رہی ہے

،نعیم جوخود انگریزی تعلیم حاصل کر رہا ہے، اس ماحول کا حصہ ہونے کے باوجود اسے اپنی زبان اور اپنے ملک پر ہونے والی ناانصافی کا شعور ہے، اور یہ شعور اب اس عوامی شعور میں بدل رہا ہے جو بدیسی حاکموں سے رہائی چاہتا ہے۔لیکن شاید انگریز حکمران اگر اس کی اہمیت جانتے بھی تھے تو ابھی عام لوگوں کو یہ باور نہیں کرانا چاہتے تھے، کہ ان کی گرفت کمزور بھی پڑسکتی ہے۔روشن محل کی تقریب میں بانکی پور میں کانگرس کے اجلاس کی بابت گفتگو ملاحظہ ہو:

''آپ جنوبی افریقہ سے آرہے ہیں، میں جانتا ہوں۔مگر وہاں کا مقابلہ آپ ہندوستان سے نہیں کر سکتے۔یہاں تو سیاست، یعنی پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھ میں ہے''۔''پڑھے لکھے لوگوں سے آپ کی مراد؟''۔''یہی کہ تعلیم یافتہ ہیں۔تاریخ سے واقف ہیں، اور۔۔۔''۔دفعتاً نعیم آگے بڑھا، جس سے اس کا چہرہ، جو سرخ ہو رہا تھا، روشنی میں آ گیا۔ذرا سا جھک کر نوعمری کے جوشیلے لہجے میں وہ بولا :''اور یہ بھی کہ ساری کارروائی انگریزی زبان میں ہوئی''۔سب نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا۔نعیم کے ماتھے پر پسینہ تھا۔اس نے ٹوپی کے پھندنے کو اس زور سے کھینچا کہ وہ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ایاز بیگ کا رنگ سفید پڑ گیا۔''یہ کوئی بری بات نہیں، اس کے علاوہ کوئی بھی زبان سیکھنا معیوب نہیں، بلکہ اچھی تعلیم ہے''۔اخبار نویس اپنے آپ کو سنبھال کو بولا۔''اس لیے کم پڑھے لوگ قید کر دیے جاتے ہیں۔اور آپ کیا توقع رکھتے ہیں۔تلک جیل میں ہے کیا؟''۔اخبار نویس انگریز کا چہرہ ایک دم غصے سے سرخ ہو گیا۔''(۹۹)

اداس نسلیں میں برطانوی سامراج کی سازشوں، تحریکِ آزادی کے مختلف مراحل اور اس تحریک میں پنجاب کے دیہاتوں کے کسانوں نے حصہ لے کر جو قیمت ادا کی، وہ اس نوآبادیات کا ردِعمل تھا، ناول میں اس کے اثرات کی نشاندہی وسیع پیمانے پر کی گئی ہے۔ناول کا مرکزی کردار نعیم جو ایک کسان کا بیٹا ہے، جب عذرا سے منسلک ہو کر شہر میں بسے جاگیرداروں کے سماج میں شامل ہو جاتا ہے تو اس کا رشتہ کسانوں کی روایات سے کٹنے لگتا ہے۔کسان ذہن اور جاگیردارانہ اقدار کے درمیان کش مکش ہوتی رہتی ہے کیونکہ نعیم نہ مکمل طور پر گاؤں کی روایات کو ترک کر سکا اور نہ اعلیٰ طبقے کی روایات کو اپنا سکا۔'لندن کی ایک رات' کے کرداروں میں بھی یہی کش مکش ملتی ہے جہاں وہ نہ مشرقیت سے کنارہ کش ہو سکے اور نہ مغربیت میں پورے کے پورے ڈھل سکے۔یہ کش مکش دراصل نوآبادیات کا شاخسانہ ہے۔

اداس نسلیں میں نہ صرف برصغیر کی تاریخ کے کئی ادوار کو تہہ بہ تہہ کھولا گیا ہے بلکہ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ہر لمحہ بدلتی ہوئی زندگی شہر اور دیہات کے باسیوں کی سائیکی پر کس طرح اپنے نقوش چھوڑ جاتی ہے۔ناول کا مقامِ عمل مشرقی پنجاب کا ایک گاؤں روشن پور ہے۔جاگیردارانہ جبر واستحصال کے سائے میں پلتے ہوئے کسانوں کو جبراً بھرتی کر کے جنگِ

عظیم میں لڑنے کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔روشن پور کا مہندر سنگھ اور نعیم اپنے ہی جیسے لاکھوں کسان نوجوانوں کی طرح زبردستی سپاہی بنائے گئے تھے۔جو یورپ اور افریقہ کے محاذوں پر جرمنوں اور فاشسٹوں سے لڑتے ہوئے مارے جاتے تھے یا اپاہج ہونے پر وطن واپس بھیج دیئے جاتے تھے۔اس جنگ میں نعیم نے انسانی جان کی اتنی تباہی اور بے قدری دیکھی تھی کہ ایک تھکا دینے والی بے حسی اور جان لیوا بے خوفی اس کے ذہن پر دھند کی طرح چھا گئی تھی،اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے عزیز ساتھی ٹھاکر داس کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔محاذ سے واپسی پر جب اس کی ملاقات مہندر سنگھ سے ہوتی ہے تو نعیم اور مہندر کے درمیان جو مکالمہ ہوتا ہے،وہ نوآبادیاتی استبداد کا عمدہ نمونہ ہے۔

''تمھیں پتہ ہے ہم کیوں لڑ رہے ہیں؟ اچانک مہندر سنگھ نے پوچھا' جرمنوں نے حملہ کیا ہے'۔' کہاں روشن پور پر؟'۔'یہاں'۔'اور ہم یہاں کیوں ہیں۔کس لیے آئے ہیں؟'۔'جرمن انگریزوں کے دشمن ہیں اور انگریز ہمارے مالک ہیں۔بس'۔'ہمارے مالک روشن آغا ہیں۔بس میں اتنا جانتا ہوں،انگریز روشن آغا کے مالک ہیں۔چناں چہ کل کتنے مالک ہیں ایک دفعہ بتاؤ'۔وہ ایک دم چڑ کر بولا۔۔۔مالکوں کی بحث بے کار ہے۔ہماری اصل جنگ ان سے ہے جنھوں نے مالکوں کو بنایا جو کاریگروں کے ہاتھ کاٹ دیتے ہیں اور سوچنے والوں کے دماغ شل کر دیتے ہیں۔وہ غیر ملکی جو ہمارے ملک کو غریب کر رہے ہیں۔تم ان سے لڑنے کے طور نہیں جانتے۔۔۔میں جانتا ہوں کہ ہندوستان انگریزوں کی سلطنت ہے اور ایسے کئی ہندوستانی انگریزوں کی ملکیت ہیں۔مجھے پتہ ہے کہ وہ کیا حاصل کر رہے ہیں اور کس طریقے سے حاصل کر رہے ہیں۔''(۱۰۰)

نعیم نے مہندر سنگھ کے لڑنے سے انکار پر اس کو انگریز کمانڈر کے ہاتھوں شوٹ ہوتے دیکھا تھا،اس نے کسانوں کے جھونپڑے اور پکی فصلیں تباہ ہوتے دیکھی تھیں اور بڑے بڑے بانکے اور چھبیلے سورماؤں کو مٹی کی دیوار کی طرح گرتے ہوئے دیکھا تھا۔اس نے مورچوں میں کیچڑ میں لت پت سپاہیوں کو بموں سے مرتے دیکھا تھا،اس نے دشمن کہلائے جانے والے اپنے ہی جیسے انسانوں کو حیرت وحسرت سے سنگینوں کا شکار ہوتے دیکھا تھا۔اداس نسلیں میں ہندوستان کے کسان کی روح کی اداسی،زندگی کی یکسانیت اور بے مصرف محنت کو موضوع بنایا گیا ہے۔جنگ کی تباہ کاریوں،جاگیرداروں کے استحصال،مہاجنوں کی لوٹ کھسوٹ اور قدرتی آفات نے اس کسان کو اتنا بے حس و بے کس بنا دیا ہے کہ اس کی زندگی میں خوشی یا سکون،نام کی کوئی شے نہیں ہے۔وہ محنت کے ماحول میں آنکھیں کھولتا ہے اور محنت کرتے کرتے ختم ہو جاتا ہے۔یہ محنت نہ اس کے معیارِ زندگی کو بلند کرتی ہے اور نہ اس کے سماجی رتبے میں کوئی اضافہ کرتی ہے کیونکہ اس کی محنت کے پھل برطانوی جبر واستبداد کے زیر سایہ پلتی ہوئی روشن آغا جیسی جونکیں چوس لیتی ہیں۔

نعیم اورعذرا کے مرکزی کرداروں کے متوازی نعیم کے چھوٹے بھائی علی اوراس کی بیوی عائشہ کے کردار بھی ہیں۔ علی اور عائشہ گاؤں کی پرسکون فضا میں کھیتوں کی پگ ڈنڈیوں اور باغوں کی گھنیری چھاؤں میں پل کر جوان ہوئے ہیں ،چونکہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں اس لیے ان کے مزاج میں ایک طرح کی سادگی اور معصومیت ہے۔نعیم کی سخت گیری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے علی شہر بھاگ جاتا ہے اورٹھوکریں کھانے کے بعدمل مزدور بن جاتا ہے۔ عائشہ اورعلی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں عسرت اور بے چارگی کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگتے ہیں لیکن مل کا سخت ڈسپلن ،کمرتوڑمحنت اورقلیل اجرت علی کی شخصیت کومسخ کردیتے ہیں اور عائشہ مستقل مریض بن جاتی ہے۔شہری زندگی کی سردمہری،سرمایہ دارانہ صنعتی نظام کے ذریعے گاؤں سے ہجرت کر کے شہر میں بسےمل مزدوروں کا استحصال اورتن دستی مل کرعلی کواپنی ذات اورمعاشرے سے کاٹ دیتے ہیں۔وہ شہر کی بے کیف اورخودغرض سوسائٹی میں کسی طور بس نہیں پاتا اور گاؤں کی کھلی فضا،کسانوں کے روایتی بھائی چارےاورمشترکہ زندگی کو یادکر کےاداسی اورخودترحمی کےاحساس میں مبتلا رہتاہے:

''درختوں سے محروم بدرنگ فضا میں دھوپ چلچلاتی اور صاف ستھرے مکان اجاڑ معلوم ہوتے ہیں ،جن کی اپنی چھتیں تھیں اپنے صحن تھے،اپنی اپنی زندگیاں تھیں،جب وہ راستہ میں ملتے تو کسانوں کے اکھڑ دوستانہ لہجے میں ایک دوسرے کا حال پوچھتے پردلوں کی ھمسائگی ختم ہو چکی تھی۔وہ خاموشی سے اپنے اپنے خول نما گھروں میں واپس آجاتے۔اپنی اپنی منفرددنیا میں مستقل بدلتی ہوئی زندگی کے زیر اثر رہنے کے لیے۔۔۔گاؤں کی وہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتی ہوئی چھتیں اورحدیں،جہاں ہرکسی کو اپنی اپنی جائداد پرفخر ہوتا تھا پر جولامحدودتھی ۔جس میں لاتعلقی نہ تھی ۔ساجھے کےصحن اور ساجھے کی دیواریں،منڈیریں،جن پر ہرکوئی بیٹھ سکتا تھااورجن کی ہرکوئی مرمت کرسکتا تھا۔ٹیڑھے میڑھے گھر جن کا پتہ نہ چلتا تھا کہ کہاں سے شروع ہوتے تھےاور کہاں پرختم۔مڑتی ہوئی بے ترتیب گلیاں کہیں سے چوڑی کہیں سے پتلی اور بیچ میں گندے پانی کی نالی، چلتے چلتے جس میں پاؤں پھسل کر جاپڑے اور چھینٹے اڑکرٹانگوں کوخراب کردیں!چلتے چلتے پھرایک گلی اچانک ختم ہوجائے اورآگے راستہ بنداور وہاں ایک چھپر ہواورایک کنبہ۔۔ارے یہ گلی ہے یا گھر؟'السلام علیکم مائی۔اللہ کرم کرے'۔دنوں کی ہمسائگی ختم ہوچکی تھی۔اب وقتِ مقررہ پرلوہے کےاوزاروں اورسیمنٹ مسالےاور تپے ہوئے سرخ لوہے کےساتھ مل کرکام کرتے رہو۔ایک تال۔ایک تال۔''(۱۰۱)

نوآبادیات کےاثرات میں سے ایک سیاست بھی ہے،یہ سیاسی شعورزمانے کے بدلتے ہوئے حالات،علم اور ٹیکنالوجی کی ترقی اوردیگرکئی اسباب کی دین تھا۔اداس نسلیں میں بھی اس سیاسی شعورکواس تاریخی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہےجس میں سےاس دورکا ہندوستان گذررہاتھا۔دیکھا جائےتواداس نسلیں تقسیم ملک سے پہلے کی ربع

صدی کے پنجاب کی دیہی زندگی کے حوالے سے تمام سیاسی اتھل پتھل اور عوامی بے چینی کا مرقع ہے۔ اس میں اس دھرتی کی بو باس، ایک کسان کے ظاہر ہو باطن کی جیتی جاگتی تصویریں، اس کی محبت اور نفرت، جفاکشی اور ظلم سہنے کی قوت اور انگریزوں کے جبر واستحصال اس مکمل پیمانہ پر نظر آتے ہیں کہ یہ ناول ایک رزمیہ کی سی بلند آہنگی اور وسعت کا حامل بن جاتا ہے۔

اداس نسلیں کا کینوس نہایت وسیع ہے اس میں نہ صرف ہندوستان کے غریب و مفلس عوام کی زندگی کو تاریخ کے تناظر میں دکھایا گیا ہے بلکہ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ہر لحظہ بدلتی ہوئی زندگی شہروں اور دیہاتوں پر ان کے مادی حالات کے مطابق اپنے نقوش چھوڑ جاتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ تحریک آزادی کے دوران سب سے زیادہ تباہی اور ہلاکت ان محنت کشوں کی ہوئی جو نہ کسی سیاسی پارٹی کے رکن تھے اور نہ ہی سامراجی میکنزم (Mechanism) کی پیچیدگیوں کو سمجھتے تھے۔ ایک طرف روشن آغا اور ان کے عزیز واقربا تھے جو ان بے شناخت کسان مزدوروں کی محنت کے بل پر شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ظاہر ہے کہ اس کے لیے انھیں سامراج کو جبریہ بھرتی کیے گئے سپاہی اور نذرانے دینے پڑتے تھے، دوسری طرف وہ مظلوم مزارعین اور مزدور تھے جن کی زندگی روشن پیلس اور اس کے مکینوں کو دنیا کی ہر بہترین چیز فراہم کرنے کے لیے وقف تھی۔

ناول کا مرکزی کردار نعیم زندگی کے ہر مرحلے سے گزرتا ہوا تمام تاریخ اور سیاست کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ وہ پہلے دہشت پسندوں کے گروہ میں شریک ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کا مزاج اعتدال پسند ہے اس لیے وہ ان کے نظریاتی جنون سے اکتا کر ان کو زیادہ وسیع پیمانے پر جدوجہد کرنے کا مشورہ دیتا ہے:

> ''تم لڑائی کا ڈھنگ نہیں جانتے۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ اس کے لیے اتنا ہی بڑا دماغ بھی چاہیے۔ چند لوگوں کی دہشت پسندی سے کیا ہوگا؟ اس جنگ میں ہم اتنے ہی شریک ہیں جتنے تم۔' اس نے رک کر پسینہ پونچھا جو اس سردرات میں اس کے ماتھے پر نمودار ہو گیا تھا۔' ہماری تحریک عوام میں ہے، کسانوں اور مزدوروں میں لاکھوں اور کروڑوں میں، جس کے ہاتھ میں بے پناہ طاقت ہے۔ تم نے تاریخ اور معاشیات کا مطالعہ کیا ہے مگر عقلِ سلیم بھی ایک شے ہے۔ ایک ریل گاڑی اڑانے سے تم کیا کرلوگے؟ ہندوستان میں ہزاروں ریل گاڑیاں چل رہی ہیں۔ آزادی کے لیے ریل گاڑیوں سے نہیں، ان میں سفر کرنے والے لاکھوں لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔'' (۱۰۲)

لیکن تشدد پسند اس کی میانہ روسیاست کو قابلِ قبول نہیں سمجھتے کیونکہ وہ زیادہ تر ان طبقات سے تعلق رکھتے ہیں جو زمین داروں اور جاگیرداروں کے مظالم کا نشانہ بنتے رہے ہیں، جنھوں نے زندگی بھر پیٹ بھر کر روٹی نہیں کھائی ہے، دنیا کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی خوشی نہیں دیکھی ہے، ہر مسرت ان سے چھین لی گئی ہے، ان کی عورتیں دوسروں کے استعمال میں رہی ہیں، ان کو بے زمین و بے گھر کر دیا گیا ہے جب کہ نعیم کے ساتھ اس طرح کے مظالم یا ستم کبھی نہیں ہوئے ہیں کیونکہ وہ ان

دہشت پسندوں کے بہ نسبت سماجی رتبہ کے اعتبار سے ایک سیڑھی اوپر ہے، روشن آغا کا داماد بننے اور جنگِ عظیم میں وکٹوریا کراس جیتنے پر نعیم کے سماجی رتبے میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

دہشت پسندوں کے گروہ کو چھوڑ کر نعیم کانگریس کے پروگراموں میں حصہ لینے لگتا ہے۔ وہ رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہرے کراتا ہے، جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام کی انکوائری کمیٹی میں حصہ لیتا ہے، کلکتہ میں پرنس آف ویلز کے استقبالیہ جلوس میں مظاہرہ کراتا ہے اور گاؤں گاؤں انگریزوں کے خلاف تقریریں کرنے اور عوام کو متحد کرنے کے لیے مارا مارا پھرتا ہے اور جیل کاٹتا ہے۔ حکومت اس کا کراس ضبط کر لیتی ہے لیکن آزادی کی تحریک زور پکڑتی جاتی ہے اور بالآخر ملک آزاد ہوتا ہے۔ نعیم جواب بوڑھا ہو چکا تھا آزادی ملتے ہی اپنے جسم میں ایک نئی توانائی محسوس کرتا ہے:

> ''پارلیمنٹ کی عمارت کی بیرانی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اس نے آزادی اور مسرت کا لمبا سانس لیا۔ پھر وہ مظاہرین کے ہجوم میں گھس گیا۔ اسے ہر طرف سے دھکے پڑ رہے تھے۔ اور سیاہ غلیظ بدنوں سے پسینوں کی تیز بو آ رہی تھی۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتا گیا۔ کافی دیر کے بعد وہ ہجوم کے دوسرے کنارے پر نکل آیا۔ 'انقلاب زندہ باد' کئی ہزار لوگ چلائے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ مختلف قسم کے نعروں کا شور اس کے کانوں میں آ رہا تھا۔ 'انقلاب زندہ باد۔ اکھنڈ بھارت زندہ باد۔ حکومتِ برطانیہ مردہ باد۔ پاکستان زندہ باد۔ سول نافرمانی۔ آزادی۔ زندہ باد۔''(۱۰۳)

آزادی کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت کے مناظر کے ساتھ ناول تو ختم ہو جاتا ہے، لیکن تہذیبوں کے تقابلی مطالعے اور نوآبادیاتی اثرات کے متعلق بہت سا مواد محققین کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔

حوالہ جات/حواشی

۱۔ زیب النساء سعید، ڈاکٹر، عبداللہ حسین شخصیت و فن، ماہنامہ اردو دنیا، دہلی، ستمبر ۲۰۱۵، ص ۳۴

۲۔ ایضاً، ص ۳۴

۳۔ ایضاً، ص ۳۵

۴۔ ایضاً، ص ۳۴

۵۔ ایضاً، ص ۳۵

۶۔ ایضاً، ص ۳۴

۷۔ http://ur.wikipedia.org/wiki/%D8%B9%D8%A8%D8%Af_%D8%A7%D9%84%D9%84%DB%81_%D8%AD%D8%B3%DB%%8C%D9%86#cite_note-ReferenceA-1 ۳۰ ستمبر ۲۰۱۶ء رات گیارہ بج کر پینتالیس منٹ

۸۔ زیب النساء سعید، ڈاکٹر، عبداللہ حسین شخصیت و فن، ماہنامہ اردو دنیا، دہلی، ستمبر ۲۰۱۵، ص ۳۵

۹۔ ایضاً، ص ۳۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۶۔۳۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۴۔ انور پاشا، ڈاکٹر، ہندو پاک میں اردو ناول (تقابلی مطالعہ)، نئی دہلی: پیش رو پبلی کیشنز، بی۔ای ۲/۲ ڈی ڈی اے فلیٹس، منیرکا، ۱۹۹۲ء، ص ۴۹

۱۵۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: قوسین، بار چہارم ۱۹۸۴ء، ص ۵۸۶

۱۶۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، تلاش و توزن، دہلی: ادارہ خرم پبلی کیشنز، حوض قاضی، بار اول، ۱۹۶۸ء، ص ۵۵

۱۷۔ فرزانہ سید، نقوش ادب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۸ء، ص ۴۸۶

۱۸۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: قوسین، بار چہارم، ۱۹۸۴ء، ص ۴۴

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۸۔۵۹

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۶۰

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۰۵

۲۳۔ محمد عارف، ڈاکٹر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، طبع اول، ۲۰۰۶ء، ص ۲۴۷

۲۴۔ سجاد حارث، ادب اور جدلیات، مشمولہ فنون، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۶۸

۲۵۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: قوسین، بار چہارم ۱۹۸۴ء، ص ۱۷۶

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۵۳

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۵۷

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۵۹

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۶۵-۳۶۷

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۶۹

۳۱۔ ایضاً، ص ۳۹۴

۳۲۔ فاروق عثمان، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۲ء، ص ۲۹۹، ۳۰۰

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۳۰

۳۴۔ محمد عاصم بٹ، اداس نسلیں: تاریخی شعور کا ناول، مشمولہ ''عبداللہ حسین: شخصیت اور فن''، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۳۸

۳۵۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: قوسین، بار چہارم، ۱۹۸۴ء، ص ۲۹۹

۳۶۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۷ء، ص ۲۵۴، ۲۵۵

۳۷۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: قوسین، بار چہارم، ۱۹۸۴ء، ص ۹۔۱۰

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۰

۳۹۔ حمیرا اشفاق، ۱۸۵۷ء کے تناظر میں: اداس نسلیں، مشمولہ: جدید اردو فکشن عصر ف تقاضے اور بدلتے رجحانات، لاہور: سانجھ پبلیکیشنز، شرکت پریس لاہور، ۲۰۱۰ء، ص:۱۱۶

۴۰۔ خالد شریف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، دہلی: اردو مجلس، ۱۹۹۴ء، ص:۲۶۵

۴۱۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: قوسین، بار چہارم، ۱۹۸۴ء، ص:۷۸

۴۲۔ ایضاً، ص:۲۹

۴۳۔ ایضاً، ص۱۷۸

۴۴۔ ایضاً، ص۵۷۵

۴۵۔ ایضاً، ص:۵۶۱

۴۶۔ ایضاً، ص:۹

۴۷۔ ایضاً، ص:۴۸

۴۸۔ ایضاً، ص۷۴۔۷۵

۴۹۔ ایضاً، ص:۷۲

۵۰۔ ایضاً، ص:۴۷۴۔۴۷۵

۵۱۔ ایضاً، ص۵۶

۵۲۔ ایضاً، ص۵۹

۵۳۔ ایضاً، ص۶۰

۵۴۔ ایضاً، ص۶۰۔۶۱

۵۵۔ ایضاً، ص۶۱۔۶۲

۵۶۔ ایضاً، ص۵۶

۵۷۔ ایضاً، ص۵۷

۵۸۔ ایضاً، ص۶۹۔۷۰

۵۹۔ ایضاً، ص۷۱

۶۰۔ ایضاً، ص۸۷

۶۱۔ ایضاً،ص۸۸

۶۲۔ ایضاً،ص۸۹

۶۳۔ ایضاً،ص۸۹

۶۴۔ ایضاً،ص۸۷

۶۵۔ ایضاً،ص۹۰

۶۶۔ ایضاً،ص۱۷۷

۶۷۔ ایضاً،ص۱۴۷

۶۸۔ انوارالحسن نقوی،ڈاکٹر، آگ کا دریا سے لہو کے پھول تک،مشمولہ:اردوفکشن کی تنقید،مرتبہ:آل احمدسرور،علی گڑھ:یونیورسٹی پبلی کیشنز،۱۹۷۳ء،ص۱۱۶

۶۹۔ عبداللہ حسین،اداس نسلیں،لاہور:قوسین،بارچہارم،۱۹۸۴ء،ص۱۹۹

۷۰۔ خالدشریف،ڈاکٹر،برصغیر میں اردو ناول،دہلی:اردومجلس،۱۹۹۴ء،ص۱۰۳

۷۱۔ عبداللہ حسین،اداس نسلیں،لاہور:قوسین،بارچہارم۱۹۸۴ء،ص۲۵۶

۷۲۔ ایضاً،ص۶۱۷

۷۳۔ خالدشریف،ڈاکٹر،برصغیر میں اردو ناول،دہلی:اردومجلس،۱۹۹۴ء،ص۷۷

۷۴۔ ذکی آذر،اداس نسلیں،ازذکی آذر، ماہنامہ نفرات،کراچی،مارچ،۱۹۶۴ء،ص۲۴

۷۵۔ انیس ناگی، ڈپٹی نذیراحمد کی ناول نگاری،لاہور:فیروزسنز،طبع اوّل،۱۹۸۸ء،ص۴۴

۷۶۔ عبداللہ حسین،اداس نسلیں،لاہور:قوسین،بارچہارم،۱۹۸۴ء،ص۲۴۔۲۵

۷۷۔ وقارعظیم،سیّد،نیا افسانہ،دہلی:ساقی بک ڈپو،سنہ ندارد،ص۳۱

۷۸۔ وقارعظیم،سید،داستان سے افسانے تک،کراچی:اُردواکیڈمی سندھ،۱۹۹۰ء،ص۱۹۰

۷۹۔ صغیرافراہیم، نثری داستانوں کا اِرتقا،علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۹۴ء،ص۹۳

۸۰۔ عبداللہ حسین،اداس نسلیں،لاہور:قوسین،بارچہارم،۱۹۸۴ء،ص۹

۸۱۔ ایضاً،ص۱۰۔تا۔۱۳

۸۲۔ Narayani Gupta:"*Dehli (Between two Empires 1803-1931*", Second edition: Oxford University Press, 1999, P-3

۸۳۔ Narayani Gupta:" *Dehli (Between two Empires 1803-1931*", Second edition: Oxford University Press, 1999, P-4

۸۴۔ Narayani Gupta:"*Dehli (Between two Empires 1803-1931*", Second edition: Oxford University Press, 1999, P-5

۸۵۔ Narayani Gupta:"*Dehli (Between two Empires 1803-1931*", Second edition: Oxford University Press, 1999, P-13

۸۶۔ عبداللہ حسین،اداس نسلیں،لاہور:قوسین،بار چہارم۱۹۸۴ء،ص۱۷

۸۷۔ ایضاً،ص۱۷

۸۸۔ ایضاً،ص۲۰

۸۹۔ ایضاً،ص۲۰

۹۰۔ ایضاً،ص۲۲

۹۱۔ ایضاً،ص۲۲

۹۲۔ ایضاً،ص۲۲

۹۳۔ ایضاً،ص۲۲۔۲۳

۹۴۔ ایضاً،ص۲۳

۹۵۔ ایضاً،ص۲۴

۹۶۔ ایضاً،ص۲۵۔۲۶

۹۷۔ ایضاً،ص۲۷

۹۸۔ Pennycook, Alastair, *English and the Discourses of Colonialism.* London and New York: Routledge, 1998, P-86.

۹۹۔ عبداللہ حسین،اداس نسلیں،لاہور:قوسین،بار چہارم،۱۹۸۴ء،ص۲۹۔۳۰

۱۰۰۔ ایضاً،ص۱۹۹

۱۰۱۔ ایضاً،ص۵۶۱

۱۰۲۔ ایضاً،ص۲۱۵

۱۰۳۔ ایضاً،ص۵۷۲۔۵۷۳

باب پنجم

لندن کی ایک رات، گریز اور اداس نسلیں کا تہذیبی و نوآبادیاتی تناظر میں تقابلی مطالعہ

فصل اول

پس منظر:

انگریزوں نے ہندوستان پر سیاسی طور پر ہی قبضہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنے ساتھ ایک متعین نظام فکر اور تہذیبی قدروں کا ایک مکمل ضابطہ بھی لایا لیکن یہ قطعی ناممکن تھا کہ وہ اس نظام فکر اور تہذیبی قدروں کو یہاں ایک دم مسلط کر دیتا چنانچہ اس نے اپنی حکمت عملی سے ہندوستان میں مغربی تہذیب کی ایک بگڑی ہوئی شکل کو اس طرح رائج کیا کہ ہندوستان میں بسنے والی دونوں بڑی قومیں اندرونی تضادات کا شکار ہو کر اپنی بقیہ صلاحیتیں اور قومی کردار کا رہا سہا رنگ جو انگریزوں کے اقدار کے لیے کسی وقت بھی خطرے کا باعث بن سکتا تھا کھو بیٹھیں۔ چنانچہ انگریزوں نے ہندوستان پر سیاسی حیثیت سے اپنے قدم جماتے ہی فکری اور سماجی سطح پر پوری مستعدی کے ساتھ اس مہم کا آغاز کر دیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں ہندوؤں کو ہر طرح کی مذہبی آزادی حاصل تھی اور سماجی حیثیت سے ہندو اور مسلمان عوام ایک دوسرے کے بہت قریب تھے لیکن ہندو سیاسی طور پر غلام تھے اور مسلمان حکمران۔ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ جمایا تو ہندوؤں میں اس کا کوئی گہرا ردعمل نہیں ہوا۔ اقتدار سے محرومی کے اثرات پیدا ہوتے بھی کیسے وہ اس سے پہلے مسلمانوں کے غلام رہ چکے تھے اس وقت ہندوؤں میں سیاسی شعور کی بے حد کمی بھی تھی ان کی ایک ہزار سال سے کوئی تاریخ ہی نہیں تھی چنانچہ ان کے ذہنوں میں آزادی اور غلامی کا کوئی واضح تصور بھی نہیں تھا۔ اگر انھوں نے کوئی جدوجہد کی بھی تو اس کے ذہن وقلب کی ساخت یا شعور واحساس کی اس طرح مدافعت کی جس طرح ہر قوم، قبیلے یا علاقے کے عوام اپنے حکمرانوں کی اطاعت کرتے ہوئے ہر بیرونی حملہ آور کا مقابلہ کرتے آئے ہیں۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کی حیثیت اس سے بالکل مختلف تھی۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے اقتدار گیا تھا وہ انگریزوں کو سیاسی طور پر ہی نہیں دینوی نقطہ نظر سے بھی برداشت کرنا ننگ و عار سمجھتے تھے اس لیے بھی کہ مسلمانوں نے ابھی تک کسی غیر مسلم کی غلامی قبول نہیں کی تھی۔ ہندوستان جیسی سلطنت کا تہہ وبالا ہو جانا اور مسلمانوں پر انگریزوں کا مسلط ہو جانا ایک زبردست المیہ تھا اور مسلمانوں کی ملی غیرت اور

دینی حمیت کے لیے ایک کھلا ہوا چیلنج تھا۔انگریز بھی مسلمانوں کی اس دینی حس،ان کے خلاف شدید نفرت اور سیاسی شعور کی بیداری سے واقف تھے اور وہ خوب سمجھتے تھے اگر ہندوستان میں حکومت کرنا ہے تو جب تک مسلمانوں کے سیاسی حوصلے بالکل پست اور دینی حمیت بالکل مردہ نہ کردی جائے،حکومت کرنا ممکن ہی نہیں۔انھیں ہندوؤں کی طرف سے قطعی فکر نہیں تھی اس لیے کہ انھوں نے میدان جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد نئے حالات سے سازگاری کر لینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی اور جس طرح انھوں نے مسلمانوں کو برداشت کیا اس طرح انھوں نے انگریزوں کو برداشت کرلیا۔

انگریز قوم اپنی مخصوص فطرت کے تحت بے حد عیار اور چالاک ہے انھوں نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد ایک خاص زاویہ نگاہ سے ہندوستان کی تاریخ مرتب کی اور ہماری قومی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر چھانے کی سعی کی تھی۔ حالانکہ اس وقت مسلمانوں میں ایک مخصوص تعلیم یافتہ طبقہ موجود تھا اور معاشرے پر اسی کا اثر بھی زیادہ تھا پورے ملک میں چھوٹے بڑے پیمانے پر اسلامی درس گاہوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا اور بے شمار علما دن رات درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔انگریزوں کو ان درس گاہوں اور مسلمانوں کے مذہبی جذبے کو مٹانے کے لیے ڈیڑھ صدی تک ظلم وستم اور عیاری وتفرقہ کے تمام ہتھیار استعمال کرنے پڑے۔انگریزوں نے دونوں بڑی قوموں کے سلسلے میں الگ الگ پالیسی اختیار کی۔ ہندوؤں نے اپنی ایک ہزار سالہ غلامی کی روایات کو زندہ رکھتے ہوئے پہلے معیشت اور پھر سیاست کے میدان میں انگریزوں کا ساتھ دیا اور پھر اٹھارھویں صدی کے آخر میں انگریزی تعلیم کو اپنانے کا آغاز کردیا اور انیسویں صدی کے نصف اول میں بہت سے ہندوؤں کے کالجوں کا قیام عمل میں آچکا تھا۔مسلمان شروع سے ہی انگریزوں سے نہ صرف بدظن تھے بلکہ شدید ترین نفرت کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ بھی نکلا مسلمان تعلیم و معاشرت، سیاست، معیشت اور تجارت وصنعت کے لحاظ سے ایک پس ماندہ قوم کی حیثیت اختیار کرگئی اور پھر ظلم یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں کی درس گاہوں سے جو اوقاف وابستہ تھے وہ ضبط کر لیے گئے۔انھیں فوج، سول سروس اور تجارت کے میدان میں بتدریج بے دخل کردیا گیا اور عربی وفارسی کی جگہ ہندی اور سنسکرت کو رواج دینے کی کوشش کی گئی۔مسلمان نئے نظام تعلیم سے دور ہوتے چلے گئے۔عدلیہ کی ملازمتوں کے دروازے بھی مسلمانوں پر بند کردیئے گئے۔قاضیوں کو جو کہ قانون شریعت کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے ان کے مناصب سے علیحدہ کردیا گیا اور ان کی جگہ بڑی آسامیوں پر انگریزوں اور ماتحت مناصب پر ہندوؤں کو مقرر کیا گیا۔انگریزوں کی یہ نمایاں پالیسی تھی کہ ہندوؤں کو عروج دیا جائے اور مسلمانوں کی طاقت کو کمزور کیا جائے۔اس سے ان کے دو مقاصد حل ہوئے۔ مسلمانوں کی پستی اور ذلت سے ان کا یہ خوف کم ہوگیا کہ مسلمان ان کے اقتدار کے لیے کوئی خطرہ بن سکتے ہیں، دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ وہ ہندو اور مسلمانوں میں منافرت پھیلانے میں کامیاب ہوگیا اور یہ دونوں بڑی قومیں ایک دوسرے سے برسرپیکار

رہنے لگیں اور ذہنی طور پر ایک دوسرے کی دشمن جانی بن گئیں۔اور اس طرح انگریزوں نے ہندوستان کی قوت کو تقسیم کر دیا۔

سیاسی وسماجی صورت حال:

ہندوستان میں انگریزوں آمد کے سلسلے میں ہندوستانی اخبار نویسی میں اہم معلومات ملتی ہیں:''پندرھویں صدی کے آخری دن،۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو ہندوستان اور انگلستان کی تاریخ کا اگر اہم ترین دن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔یہی وہ دن تھا جب۔۔۔الزبتھ اول فرماں روائے انگلستان نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو مشرقی ملکوں میں تجارت کرنے کا پروانہ (چارٹر) عطا کیا۔تا کہ' ملکی دولت اور قومی وقار میں اضافہ ہو'اس واقعے سے تقریباً ۲۱ سال پہلے ایک یورپین جہاز نے ۱۵۷۹ء میں گوا کے ساحل پر لنگر ڈالے۔اس جہاز میں فادر تھامس اسٹیونس نامی ایک انگریز اترا۔یہ پہلا انگریز تھا جس نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھے۔۔۔۔وہ نہ تو تاجر تھا اور نہ ہی سپاہی یا سیاست دان۔وہ صرف عیسائی مبلغ تھا،جس نے اکسفورڈ کے نیو کالج میں تعلیم پائی تھی۔ہندوستان آنے کے بعد یہاں کی خاک دامن گیر نے ایسے دامن پکڑے کہ پھر لوٹ کر وطن جانا نصیب نہ ہوا۔تیس چالیس سال وہ ہندوستان زندہ رہا اور اس عرصے میں متعدد کتابیں بھی اس نے دیسی زبانوں میں لکھیں۔فادر اسٹونس ہی کی ذات ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کی محرک بنی۔اس نے ہندوستان سے جو چٹھیاں اپنے باپ کو لکھیں ان میں اس ملک کے ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کی دولت اور سامان تجارت کا کثرت مبالغہ آمیزی کے ساتھ ذکر کیا۔یہ چٹھیاں لندن کے بیوپاریوں کی نظروں سے بھی گزریں۔یہ باتیں انھوں نے خواب وخیال میں بھی نہ سنی تھیں۔فادر اسٹونس کے بعد اور اور انگریز جان نیو بیری (John Newberry) نامی بھی خشکی کی راہ سے ہندوستان آیا۔وہ جب لوٹا تو اس نے فادر اسٹونس کی لکھی ہوئی باتوں کی تصدیق کی۔اب لندن کے بیوپاریوں نے طے کیا کہ ایک تجارتی وفد ہندوستان بھیجا جائے۔۔۔۔فروری ۱۵۸۳ء کو ایک جہاز نے انگلستان کے ساحل سے لنگر اٹھائے اور یورپ کی طرف چل پڑا۔اس جہاز پر انگریز بیوپاریوں کا ایک وفد بھی تھا،جو ہندوستان جا رہا تھا۔اس وفد کا لیڈر وہی جان نیو بیری تھا جو ایک بار ہندوستان کا سفر کر چکا تھا۔اس وفد کے پاس ملکہ الزبتھ کی ایک سفارشی چٹھی بھی تھی جو' نا قابل تسخیر جلیل القدر بادشاہ جلال الدین اکبر' کے نام تھی۔انگلستان کے سمندری کناروں سے چل کر انگریزی جہاز نے شام کی گودی میں لنگر ڈالے اور وہاں سے انگریزی تجارتی وفد حلب چلا گیا۔پھر یہ لوگ فرات کے راستے سے بصرے پہنچے۔اس زمانے میں انگریزوں اور پرتگالیوں کی لڑائی تھی۔اسی وجہ سے یہ تجارتی وفد سمندر کی راہ سے ہندوستان جاتے ہوئے ڈرتا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ ایران کے نچلے حصے سے ہوتے ہوئے خشکی کی راہ سے ہندوستان جائیں۔لیکن بدقسمتی سے اس وفد کو کوئی ایسا آدمی نہ مل سکا جو ہندوستان تک اس کی رہبری کرتا۔اس لیے مجبوراً فارس کی کھاڑی میں ان کو اپنی کشتیاں ڈالنی پڑیں اور

وہی ہوا جس کا ان کو ڈر تھا۔ یعنی پرتگالی جنگی کشتیاں فارس کی کھاڑی میں ڈیرے ڈالے تھیں۔ پرتگالیوں نے انگریزوں کا سامان تو اپنے ڈب میں رکھا اور ان کو جزیرہ آرموز میں قید کر دیا۔ ہندوستان میں فادر اسٹونس کو جب اس کی خبر ملی تو اس نے دوڑ دھوپ کر کے ان کی جان چھڑائی اور یہ لوگ گوا لائے گئے۔ گوا سے بھاگ کر وہ بیجاپور گئے جہاں انھوں نے 'پرانے پانی' کے (آب دار) جواہرات دیکھے جو اس سے پہلے انھوں نے نہیں دیکھے تھے۔ پھر یہ لوگ گھومتے گھامتے فتح پور سیکری پہنچے جہاں اکبر نے ان کے ساتھ شریفانہ اور فیاضانہ سلوک کیا۔ اکبر کے برتاؤ سے یہ لوگ اس درجہ خوش ہوئے کہ ان میں سے ایک نے اکبر کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس بیوپاری انگریزی وفد کا صرف ایک فرد رالف فچ (Ralph Fitch) ۱۵۹۱ء میں انگلستان واپس لوٹا۔ جس نے ہندوستان کے صنعتی و تجارتی حالات لندن کے بیوپاریوں کو سنائے، جو بہت ہمت افزا تھے۔ اس کے بعد ہی ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۶۰۸ء میں شہنشاہ جہانگیر کی اجازت سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے سورت میں راپتی کے کنارے اپنے گودام اور دفتر کے لیے مکان کرائے پر لیے۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی جو آگے چل کر اس ملک کی فرماں روا بن گئی سب سے پہلے ۱۶۰۸ء میں ہندوستان کو جہاز روانہ کئے اور یہ کچھ ایسی مبارک گھڑی تھی کہ ہر سفر میں منافع بڑھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ بارھویں سفر میں ہر حصے دار کو ۲۳۴ روپے فی صدی منافع ہوا۔ انگلستان کی آمدنی بھی دن دونی رات چوگنی ہوتی گئی۔ (چناں چہ کمپنی نے) سنہ ۱۶۱۳ء میں برطانیہ سرکار کو ۱۳ ہزار پونڈ منافع ادا کیا اور ۱۶۶۲ء میں یہ رقم چالیس ہزار پونڈ تک پہنچ گئی۔ ہندوستان میں پہلے بیس سال کے اندر یہ لوگ تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ پونڈ سونا چاندی لائے جس کے بدلے ہندوستان کی مصنوعات خرید کر لے گئے۔''(۱)

انگریزوں اور یورپ کی دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی فرانسیسیوں نے بھی فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی کمپنی بنائی۔ فرانسیسیوں کو بھی اس ملک میں کافی عروج حاصل ہوا، لیکن وہ اقتدار حاصل نہ ہو سکا جو انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حصے میں آیا تھا۔ سترھویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے کلکتے میں قدم رکھے اور یہ صدی ختم ہوتے ہوتے ان کے قدم مضبوطی سے وہاں جم گئے۔ ۱۶۹۹ء میں انگریزوں نے بنگالہ کے نواب کو جھانسا دیا اور انھوں نے انتہائی سادہ لوحی سے کام لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی کو کلکتے میں قلعہ بندی کی اجازت دے دی۔ یہی قلعہ ہندوستان کی تاریخ میں فورٹ ولیم کے نام سے مشہور ہوا۔ کلکتے کی قلعہ بندی کے پورے آٹھ سال بعد اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی مغلیہ خاندان کی شمع اقبال بھی لو دینے لگی اور ان کی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ یورپ کی تجارتی کمپنیوں نے اس انتشار کا فائدہ اٹھایا جو اورنگ زیب کی وفات کے بعد زیادہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کی زوال آمادہ منتشر ریاستیں یورپین تاجروں کی ریشہ دوانیوں کا مرکز بن گئیں۔ اس وقت ہندستان کی حالت اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ جیسی تھی۔ اس کے برعکس

انگریز تاجر منظم تھے۔ ہندوستان کے صوبے داروں اور انگلستان کی کمپنی میں فرق یہ تھا کہ ہندوستانی حکمران کسی مرکزی طاقت کے تحت نہ تھے۔ برخلاف اس کے کمپنی کے ملازم ڈائریکٹروں اور پارلیمنٹ کے حکام کے ماتحت تھے۔ انھیں کی ہدایات کے مطابق حکمرانی اور ملک گیری کرتے تھے۔ اور انھیں کے حکم سے تبدیل، معطل یا برخاست کئے جاتے تھے اور ہزاروں میل سے آئے ہوئے احکام کی بے چون و چرا تعمیل کرتے تھے۔ یہی انگریزی مرکزی قوت کی برتری تھی جو ہندوستانیوں کی زبردست مگر منتشر اور متضاد قوتوں پر غالب آئی۔

دنیا کی تاریخ میں یہ ایک عجیب وغریب مثال ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں ڈیڑھ سو برس تک تجارت کرتے کرتے اس قابل ہوگئی کہ ۱۷۵۷ء میں بنگالہ کے نواب سراج الدولہ کو اس کے مقابلے میں میدان چھوڑنا پڑا اور جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ پلاسی کی جنگ سے کم وبیش چالیس سال پہلے ہی ہملٹن نامی ایک انگریز ڈاکٹر نے فرخ سیر کے لڑکے کا کامیاب علاج کرنے کے انعام میں صرف تین ہزار روپے کے عوض اس مال کو چنگی سے مستثنیٰ کرلیا تھا، جو ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانی بازاروں میں خریدتی تھی۔ یوں مغل شہنشاہ فرخ سیر (۱۷۱۶-۱۷ء) کا فرمان، جس کی رُو سے انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں مال گزاری اور محصول دیے بغیر آزادانہ کاروبار کرنے کا حق اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں تجارتی مراعات حاصل ہوئیں۔ یہ تاریخ ہند کا وہ واقعہ تھا جس سے صحیح معنوں میں ہندوستان کی غلامی کے دور کے آثار و قرائن پیدا ہوئے۔ اسی زمانے میں انگریزوں کے ساتھ فرانسیسی اور ڈچ قومیں بھی تجارت کا سہارا لے کر ہندوستان میں اپنا قدم جما چکی تھیں اور ان کی نگاہیں یہاں کے حکمرانوں کی بے کسی، جاگیرداروں اور زمین داروں کی خودغرضی اور مختلف گروہوں کے آپسی جھگڑوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ یہ تینوں قومیں اگرچہ تجارت کی غرض سے ہی وارد ہوچکی تھیں لیکن ہندوستان پر حکمرانی کے خواب تینوں کی آنکھوں میں موجود تھے۔ چنانچہ تجارت کے سلسلے میں مغلوں کی نظرِ عنایت انگریزوں کے حصے میں زیادہ رہی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ ہندوستان کی بساط سیاست پر اگرچہ مکمل طور پر چھا جانے اور قبضہ کرلینے کا زمانہ تھا۔ اورنگ زیب کی وفات سے لے کر ۱۸۵۷ء تک مغل سلطنت دہلی پر تقریباً اٹھارہ بادشاہ مختلف اوقات وسن میں حکمران ہوئے بعض تو چند ماہ یا زیادہ سے زیادہ چند سال سے زیادہ حکمرانی نہ کرسکے اور ۱۸۵۷ء میں ہندوستان مکمل طور پر برطانوی تاج کا نگینہ بن گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جو تجارتی غرض سے یہاں قائم ہوئی تھی۔ بہت جلد تجارتی حدوں کو پھلانگ کر سیاسی سرحدوں پر چھا گئی۔ یہ وہ دور تھا کہ ہندوستان صوبوں میں بٹا ہوا تھا اور انگریزوں کے لیے یہ آسان تھا کہ وہ اپنے پیر جمائیں۔ موجمدار ایسٹ انڈیا کمپنی کے اولین دور کی بات کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"There was no India in the political sense. It was a mere geographical expression, and was therfore easily conquered by a

foreigner just as Italy and Germany were conquered by Napoleon. There was no national feeling in at least the greater part of India, as there was none in germany and Italy. Nor had India any jealousy of the foreigners, because she had no sense whatever of national unity ; because there was no India and, therefore, properly speaking, no foreigner."(۲)

اسی طرح ایک انگریز مورخ نے ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کو یوں بیان کیا ہے:

"India can hardly be said to have been conquered at all by foreigners, she has rather conquered herself."(۳)

لیکن ۱۸۵۷ء تک آتے آتے ہندوستان میں سماجی بیداری اور سیاسی شعور کی زیریں لہر پیدا ہو چکی تھی۔ ہندوستانی انگریزوں کی مکروہ چالوں سے واقف ہو چکے تھے اس لیے انھوں نے انگریزوں کے خلاف آواز اٹھانے اور انھیں ملک بدر کرنے کی تیاریاں کیں ان ہی حالات میں ۱۸۵۷ء کا واقعہ پیش آیا جو آزادی کے لیے پہلی جنگ تھی اور جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا۔ ہندوستان کی اس جنگ میں شکست کے پیش نظر انگریزوں نے پوری طرح اپنا تسلط جمایا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعے کے پیچھے جہاں ہندوستانیوں کا ملکی اور سیاسی شعور کارفرما تھا وہاں اس کے اور بھی کئی اسباب تھے۔ سید غلام حسین خاں نے سیر متاخرین میں اس سلسلے میں بارہ نکات کی فہرست دی ہے جس میں سے کچھ اہم نکات کا ذکر موجمدار نے یوں کیا ہے:

"i.The English officials are not accessible, and so people cannot place their grievances before them. (The author refers to the humiliating treatment of even respectable persons by the head Harkara of the English officials who must be satisfied before anybody is allowed to see his master).

ii.The difference in language and customs between the English and the Indians.

iii.The system of impersonal administration with which theIndians were not familiar. The lack of personal elementinadministration is held responsible for many evils such

as slowness of proceedings, delay in taking action, frequent changes of policy, etc.

iv.The English have deprived the inhabitants of India of the'various branches of commerce and benefit which they had ever enjoyed before. ' They are, for example, no longer enlisted in the army to the same extent as before, and that causes a great hardship to many.

v.Partiality of the English to their own countrymen, and even to their dependents.

vi.The strange character of their own laws and judicial procedure."(۴)

۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی میں ہندوستانیوں کی ناکامی کا تاہم ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہندستانی قوم میں پہلی بار غیر ملکی تسلط کے خلاف منظّم ہونے کا احساس ہوا۔ اور انگریزوں کو اس اتحاد اور اس احساس میں اپنی تباہی کا سامان صاف نظر آتا تھا۔ اس لیے انگریزوں نے 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی پر عمل کیا۔ انھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں میں ہمیشہ متنازعہ فیہ مسائل کو ابھارا۔ اداس نسلیں میں اس پہلو کو بھی سامنے لایا گیا ہے:

> "گئو کشی کی بات تھی چودھری۔ مدت سے تمھیں پتہ ہے سائیں کے ڈیرے پر پندرھویں کے پندرھویں گائے ذبح ہوتی آئی ہے۔ آج ہندو ضد پر آ گئے۔ ضد پر کیا آ گئے، یہ سب ان سؤروں کی شرارت ہے جو باہر سے آئے ہیں۔ بس جھگڑا بڑھ گیا۔ ماسٹر، جو بچارہ ادھر کا نہ اُدھر کا سمجھانے گیا اور سؤروں نے اسے ختم کر دیا۔"(۵)

دوسری جانب تاریخ کے فیصلے بھی کچھ انگریزوں ہی کی مدد کر رہے تھے۔ مسلمان حاکم رہے اور ہندو محکوم، انگریز راج میں ہندو منظورِ نظر قوم تھی اور ان کے اندر حاکم بننے کی نسل در نسل چلی آئی تمنا کروٹیں لینے لگی اور مسلمانوں کو محکوم بننا اپنی انا کے خلاف لگا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان انگریزوں سے ایک دور تک متنفر رہے۔ جو کوئی انگریزی تعلیم کی طرف راغب کرتا اُسے 'ملحد' اور 'کافر' کہا گیا۔ پھر مسلمانوں نے اپنی تنظیم نو شروع کی اور اصلاحی تنظیمیں قائم کیں۔ ہندوؤں میں ایسی تنظیمیں پہلے سے موجود تھیں اور آخر ان مختلف تنظیموں کی تان مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس پر ٹوٹتی ہے۔ مسلم لیگ خالص مسلمانوں کی جماعت تھی جب کہ کانگریس میں مسلمان بھی شامل تھے۔ یہاں تک کا ماحول تینوں ناولوں میں یکساں ہے۔

لیکن اداس نسلیں کا کینوس اس لیے بڑا ہے کہ اس میں تقسیم ہند بھی شامل ہو جاتی ہے۔

اداس نسلیں کا کینوس پہلی جنگ عظیم کے کچھ عرصہ قبل سے لے کر تقسیم ہند کی پُر آشوب اور ہنگامہ خیز صورت حال تک پھیلا ہوا ہے۔ ناول کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ شروع کے حصے کے بعد ایک حصہ 'ہندوستان' کے عنوان کے تحت ہے اور میر کے اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ   افسرگی سوختہ جاناں ہے قہر میر

اگلا باب 'بٹوارہ' کے عنوان کے تحت ہے جو قرآن پاک کی اس آیت مبارکہ سے شروع ہوتا ہے:

وَ اِذا قیل لَھُم لا تُفسِدُو فِی الارضِ قالُو اِنّمَا نَحنُ مُصلِحُون (القرآن:۲:۱۲)

[جب ان سے کہا گیا کہ زمین پر فساد مت پھیلاؤ تو وہ کہنے لگے ہم تو اصلاح کرتے ہیں]

ناول کا آخری حصہ اختتامیہ ہے جس میں ہجرت کے بعد کے واقعات کو سمیٹا گیا ہے۔ اس طرح اس ناول میں کئی نسلیں سامنے آتی ہیں اور کئی ادوار پیش ہوئے ہیں۔ یہ ادوار بھی تین خانوں میں منقسم ہو سکتے ہیں۔ اول برطانوی سامراج کا زمانہ۔ دوم آزادی کی جدوجہد کا زمانہ اور سوم تقسیم ہند اور بعد کا دور۔ یہ تینوں ادوار برصغیر میں کئی نسلوں کے لیے پریشانیوں اور ستم ظریفیوں کے ادوار تھے اس لحاظ سے صحیح معنوں میں یہ ناول اداس نسلوں کی ہی کہانی ہے۔

اس ناول میں یوں تو بہت سارے کردار ہیں تاہم نعیم اور عذرا کو بنیادی اہمیت حاصل ہے باقی کردار فنی ہیں اور ان ہی دو کرداروں کے گرد گھومتے ہیں۔ نعیم ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ نیاز بیگ اس کا باپ اور ایاز بیگ اس کا چچا ہے۔ نیاز بیگ کو جب انگریز گرفتار کر کے جیل بھیج دیتے ہیں اور نعیم اپنے چچا کے ہاں پرورش پاتا ہے۔ اس دوران ناول میں انگریزوں کے ظلم و ستم اور ہندوستانیوں کے تئیں ان کے بہیمانہ رویے کو ابھارا ہے۔ جہاں بھی ان کو ہندوستانیوں سے ہم کلام ہوتے دکھایا گیا ہے ان کا لہجہ تحکمانہ اور طرز تکلم نو آبادیاتی استعمار کی نشاندہی کرتا ہے:

''نیچے جاؤ مانگتا۔ آں؟ پاؤں سے وہ اسے نیچے دھکیلنے لگا۔ گاڑی بھاگ رہی ہے صاب۔ کہاں جاؤں؟ آں فائیں جاؤ؟ آں؟ اس نے پیر کی ٹھوکر سے کسان کی گٹھری باہر اچھال دی جو اڑتی ہوئی زمین پر گری اور لوگوں نے اس میں سے باجرہ اور گڑ بکھرتے ہوئے دیکھا۔ جاؤ۔ ہا میرا باجرہ بڈھے کا منہ کھل گیا پھر دفعتاً غصے سے بھنا کر وہ اٹھا اور لاٹھی گورے کی ٹانگوں پر مارنے لگا، مجھے مار دو پھینک دو۔ باجرہ میرا گڑ میں تمھارے باپ سے لوں گا۔ گورے سوراب میں اپنی لڑکی کے لیے کیا لے جاؤں گا؟ میں؟ چیخنے سے رال اس کی داڑھی پر بہنے لگی۔ انگریز نے اس کی لاٹھی چھین کر نیچے پھینک دی اور بڑے بڑے جوتوں والے پاؤں اندھا دھند اس کے چہرے اور چھاتی پر مارنے لگا۔ اپنی لڑکی کے لیے ایک

سور لے جاؤ، اس نے انگریزی میں کہا پھر وہ گالیاں بکنے اور بے تحاشا ٹانگیں چلانے لگا اس کا ایک بوٹ ایڑی تک اکھڑ گیا کسان کا سر لٹک گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں لیکن اس کا بازو ابھی تک ہینڈل کے گرد کسا ہوا تھا۔ جھلسے ہوئے چہرے پر خون کی دھاریاں بہہ رہی تھیں اور اس کی داڑھی خون، پسینے اور رال سے لتھڑ گئی تھی۔ جب رانی کوٹ کے اسٹیشن پر گورے سارجنٹ نے آ کر ہینڈل سے علاحدہ کیا تو وہ گندم کی بوری کی طرح زمین پر گرا اور مر گیا۔''(۶)

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانیوں کو انگریزوں پر سے اعتماد پوری طرح اٹھ چکا تھا۔ اور انھیں احساس ہو چکا تھا کہ انگریز سپاہی ظلم کی کسی بھی حد کو چھو سکتا ہے، وہ قانون کی تمام حد بندیوں سے آزاد ہے اور قانون اور سزا صرف ہندوستانیوں کے لیے ہے۔

ناول کے شروع کے حصے میں ہی انگریزوں کے ظلم و ستم کے ساتھ ساتھ جرمنی کے ساتھ جنگ کی جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں۔ اس جنگ میں ہندوستانیوں نے بھی انگریز فوجیوں کی حیثیت سے شرکت کی تھی اور ان سے کہا گیا تھا کہ جنگ کے بعد ہی ان کی آزادی کی بات کی جائے گی۔ اس جنگ میں نعیم بھی شامل ہوتا ہے اور اپنا ایک بازو کھو دیتا ہے۔ ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد سمیت لاکھوں لوگ اس جنگ میں کام آ گئے جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کی تصویر ناول میں یوں پیش ہوئی ہے:

''کسی کی جیب میں راشن اور چند گولیاں ہوتیں، کسی کے پاس بچوں اور لڑکیوں کی تصویریں اور ان کے سیاہ بالوں کے گچھے بطور نشانی کے ہوتے اور ڈائریاں! وہ سب پتھروں پر خندقوں میں خشک جھوپڑوں میں، برف پر، کیچڑ میں پڑے ہوتے۔ وقت ہوتا تو نعیم کسی نوجوان، پرسکون چہرے کے پاس رکتا، جیبیں ٹٹول کر تصویریں اور خط نکالتا۔ اُن عورتوں کا خیال کرتا جو گاؤں کے باہر جوہڑ کے کنارے کھڑی کھڑی اپنے محبوب چہروں کے لیے ترس گئی تھیں اور نہیں جانتیں کہ ان کے عزیز خوبصورت ہونٹ سرد کر دیئے گئے ہیں اور جسم جنھوں نے بے پناہ خوشی کی راتیں انھیں بخشیں ہزاروں میلوں دور خاک میں بکھرے پڑے ہیں اور وہ بے کار انتظار کرتی ہیں اُن کھیتوں کے بارے میں سوچتا جو نوجوان ہاتھوں کے بغیر ویران ہو گئے۔''(۷)

جنگِ عظیم کے اثرات کی لپیٹ میں ہندوستان کچھ زیادہ ہی آ گیا۔ ہندوستان تاریخ کے اس حصے میں عدم توجہی کا شکار رہا۔ مسائل بڑھتے گئے اور تمام ملک رنگ رنگ کی وباؤں کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس ہندوستان کی ترجمانی ناول میں روشن پور نامی ایک گاؤں کرتا ہے جو دوسرے لفظوں میں پورے ملک کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔

''گاؤں کی سوئی ہوئی گرد آلود فضا اُسی طرح قائم تھی۔ ان برسوں میں روشن پور کے بیسیوں نوجوان

اجنبی سرزمینوں میں ہلاک ہو گئے تھے۔ جنگ کے میدانوں میں بکھرے ہوئے ان کے محبوب، مضبوط جسم تیز دھوپ میں بخارات بن کر اڑ گئے، اور نئے سیلابوں نے، نئی آندھیوں اور طوفانوں نے ان کی ہڈیاں زمین میں دبا دیں۔ بیسیوں عورتیں بیوہ ہو گئیں، اور لڑکیاں محبت میں غریب ہو گئیں۔ روشن پور کی زمینوں میں سیلاب آئے اور فصلیں تباہ ہو گئیں اور کسان قرضے اور بھوک کے نیچے جھک گئے۔ جانور بیماری سے مر گئے یا بھوکے کسانوں نے کاٹ کر کھا لیے اور عورتوں اور بھینسوں کے دودھ سوکھ گئے، اور ایک وقت آیا جب پاگل آنکھوں والے کسانوں کے ڈھانچے گلیوں میں آوارہ پھرتے تھے اور چھتوں پر بڑھے ہوئے پیٹوں والے زردرو بچے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھتے تھے، تو اس سے گاؤں پر جلے ہوئے جنگل یا بمباری سے تباہ شدہ قلعے کا شبہ ہوتا تھا۔''(۸)

اجنبی ملکوں کی جنگ کے نتیجے میں ہندوستان ایک دردناک تصویر بن گیا۔ دوسروں کی جنگ لڑ کر نعیم کئی دوسرے لوگوں کے ساتھ انگریزوں کے خلاف کمر بستہ ہو جاتا ہے اور یہ لوگ چوری چھپے ریلوے اسٹیشنوں، بس اڈوں اور دیگر سرکاری املاک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ نعیم کو احساس ہو چکا تھا کہ وہ روشن پور کی سیاسی سطح کے طور طریقوں سے مدد نہیں کر سکتا اور نہ ہی وہاں کی زندگی اس طرح سنورنے والی ہے۔ اہنسا یا عدم تشدد اور اخلاقیات سب اس سلسلے میں بے سود ہیں لیکن بہت جلد وہ اس گروہ سے الگ ہو جاتا ہے اسے معلوم ہے کہ سرکار مخالف رویے کی وجہ سے ہی ان کا خاندان تباہ ہو چکا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ ساری جہد و جہد لا حاصل ہے اسے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ مقصد اور ذرائع کے درمیان ہم آہنگی نہیں ہے اور ناحق خون بہانا ٹھیک نہیں۔ دہشت گردوں میں شامل ایک لڑکی شیلا سے کہتا ہے:

''آج میں نہیں گیا ٹھیک ہے کل دردِ سر کا بہانہ بھی نہ بناؤں گا صاف انکار کر دوں گا۔ پہلے ہی کافی بے گناہ خون بہا لیا ہے لیکن اس کا فائدہ میں سب کچھ کہہ کیوں نہیں چکتا۔ ایں لاحول ولا قوۃ۔ مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''(۹)

حصول آزادی کی تحریک کے اولیں دور میں دو طرح کے نظریات کارفرما تھے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ تشدد اور خون خرابے کے بغیر آزادی کا حصول ناممکن ہے جب کہ کچھ لوگ اس بات پر مُصر تھے کہ عدم تشدد ہی حصولِ آزادی کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ گاندھی جی کے عدم تشدد کی تحریک کے حامی تھے۔ اداس نسلیں میں نعیم عدم تشدد کا حامی اور پرستار ہے جب کہ مدن، مادھو اور ان کے دوسرے دوست تشدد کو ہی حصولِ آزادی کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ نعیم کا نظریہ یہ ہے کہ لوگوں میں بیداری پیدا کی جائے انھیں آزادی کا احساس دلا کر حصولِ آزادی کے لیے تیار کیا جائے وہ چھپ چھپ کر تشدد کے عمل کو درندوں کی جنگ قرار دیتا ہے جب کہ مدن کے خیال میں 'بیلوں' سے درندہ بننا بہتر ہے جو ہر ظلم سہہ لیتے ہیں اور اونہہ تک

نہیں کرتے۔مدن اپنی جنگ کوان لوگوں کے خلاف جنگ قرار دیتا ہے کہ جنھوں نے مالکوں کو بنایا جو کاریگروں کے ہاتھ کاٹ دیتے ہیں اور سوچنے والوں کے دماغ شل کر دیتے ہیں جو غیر ہوتے ہوئے بھی ملک کو غریب کر رہے ہیں لیکن نعیم عدم تشدد پر زور دیتا رہا اُس کے مطابق ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اِس کے لیے بڑے دماغ کی ضرورت ہے اور تشدد اسے آزادی نہیں دلاسکتا۔

جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہوتا ہے کہ جس میں نہتے ننگے ہندوستانیوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیئے گئے تو اس واقعے کے خلاف پورے ہندوستان میں غم وغصہ کی لہر دوڑ جاتی ہے اس کے بعد سائمن کمیشن کا واقعہ ہوتا ہے مختلف سیاسی پارٹیاں ابھر کر سامنے آتی ہیں اور بہرحال ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ آزادی کی صبح کے آثار نمودار ہوتے ہیں:

''پارلیمنٹ ہاؤس میں گہما گہمی تھی۔ ہند کی مکمل آزادی کے لیے آخری گفت وشنید ہو رہی تھی۔ لارڈ مونٹ بیٹن اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے پارلیمنٹ میں گورنر جنرل ہاؤس میں کانفرنسیں بلاتے رہتے تھے اور ملک بھر سے سول نافرمانی کی تحریک کی وحشت ناک خبریں وصول ہوتی رہتی تھیں ملک کی دونوں بڑی بڑی پارٹیوں، کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈر دلی میں جمع تھے اور واسرائے مونٹ بیٹن سے ملنے میں مصروف تھے۔''(۱۰)

آزادی کے اعلان کے ساتھ ہی تقسیم وطن کا واقعہ بھی رونما ہو جاتا ہے دو مملکتیں وجود میں آتی ہیں۔تبادلہ آبادی شروع ہوئی اور فسادات کی بھیانک آگ چاروں اور پھیل جاتی ہے جو لوگ ہجرت کا ارادہ رکھتے بھی نہ تھے فسادات کی ہولناکیوں کی وجہ سے گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اب ریل گاڑیوں کا انتظار کرنے کی بجائے قافلوں کے قافلے پیدل چل پڑے راستے میں لوٹ گھسوٹ کے مناظر ان کے استقبال میں ہیں اور موت ان کی زندگی کے آخری لمحوں کو گننے کے عمل میں مصروف ہے۔ پنجاب میں سے مہاجرین کے گذرنے کی ایک تصویر ملاحظہ ہو:

''حملوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا پچھلے پانچ روز سے دن میں کئی کئی بار حملے ہو رہے تھے اور وہ ایک پل کے لیے بھی بےخبر ہو کر نہ چل سکتے۔ یہ حملے مسلح اور نیم مسلح دستوں کی طرف سے ہو رہے تھے جو کہ زیادہ تر دیہات میں سے آئے تھے۔ پہلے پہل تو قافلے والے کچھ نہ کچھ ان کا مقابلہ کرتے رہے اب وہ اس قدر تھک چکے تھے کہ حملہ آوروں کے ہتھیاروں کے سامنے خاموشی سے مر جاتے یا بھاگنے لگتے ہر حملے کے بعد مُردوں اور زخمیوں کو پھلانگتے ہوئے، روندتے ہوئے، قافلے والے آگے نکل جاتے۔کئی ایک سمت کا احساس کھو کر قافلے سے بچھڑ جاتے اور نوجوان عورتیں اغوا کر لی جاتیں۔اس طرح گو ہر پڑاؤ پر مہاجرین کی تازہ جماعت اس سے آملتی، مگر کم ہونے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ ہوتی اور قافلہ گھٹتا جاتا۔''(۱۱)

غرض ان مہاجر قافلوں کے لیے ہر سو موت کھڑی تھی۔اب کس کے حصے میں آئے کسی کو معلوم نہیں ہے۔راستے پر خون میں لت پت لاشوں کے مناظر میں ہر فرد کو اپنی شبیہ کا گماں ہوتا۔لیکن اب لوٹنے والے گروہ بھی تھک چکے ہوتے ہیں۔گاہے گاہے قافلے والوں کو بن مارے چھوڑ دیتے ہیں اور انھیں ڈرتے سہمتے دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔ہر طرف جلتی لاشوں کی بو ہے اور ہر سو حساب غلط ہو رہا ہے۔دفن کئے جانے والوں کو جلایا جاتا اور جلائے جانے والوں کو دفن کیا جاتا:

''وہ مار مار کر اس قدر اُکتا چکے تھے کہ محض سڑک کے کنارے بیٹھے نئے قافلے کے خاموش، خوف زدہ کوچ سے ہی محظوظ ہوتے رہتے کبھی کبھی وہ مُردوں اور زخمیوں کو اکٹھا کر کے آگ لگا دیتے اور نیا قافلہ چپ سادھے بھاگتا ہوا ان کے قریب سے گذر جاتا۔''(۱۲)

منٹو کے سیاہ حاشیے میں ایک منی افسانہ اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے:

''مرا نہیں، دیکھو ابھی جان باقی ہے۔

رہنے دو یار۔ میں تھک گیا ہوں۔(افسانہ 'آرام کی ضرورت')''(۱۳)

فسادات میں مہاجرین نے دوسرے مظالم کے ساتھ ساتھ اپنے لخت جگروں کو اغوا ہوتے دیکھا، اپنے معصوم بچوں کو قتل ہوتے دیکھا یا اپنی زندگی بھر کی رفیقوں کو کسی اور کا پہلو گرماتے دیکھا اور سب سے بڑھ کر شکم سیری کے لیے اپنی بہو بیٹیوں کی عزت نیلام کرنے پر خود کو مجبور ہوتے دیکھا۔کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ہجرت کرنا نہیں چاہتے لیکن انھیں ہجرت کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، وہ اپنی زمین سے رشتہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

''یہ میرا گھر ہے اس کی بنیاد میرے بزرگوں نے رکھی تھی اور یہیں ہم سب پیدا ہوئے کوئی کیا کہے گا۔''(۱۴)

روشن آغا کے تمام گھر والے ہجرت کرتے ہیں۔روشن آغا کو ہندوستان کی مٹی سے محبت ہے اور یہاں کی مٹی میں اُس کی جڑیں پیوست ہیں۔ایک شام بلوائی، ان کے گھر پر دھاوا بول دیتے ہیں:

''لمبے تگڑے کسان اور چھوٹی ذاتوں کے کالے کالے لوگ تھے جو اُن کا سامان نکال نکال کر لان میں جمع کر رہے تھے اور اِسے آگ بھتنوں کی طرح شور مچا رہے تھے۔''(۱۵)

یہ بلوائی بہت بڑی جاگیر کے مالک روشن آغا پر ہی حملہ نہیں کرتے بلکہ اُس کی حیثیت، عزت و ناموس، شہرت و وقار پر بھی حملہ کرتے لیکن روشن آغا اپنے نوکر کے ساتھ بچ نکلتا ہے۔شہر کی سنسان گلیوں میں سے بھاگتے ہوئے وہ اپنے ملازم سے پوچھتا ہے:

''تم کبھی ایسی راتوں میں باہر سے گذرے ہو جب کہ اندر لوگ اپنے پردوں کے پیچھے اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہوں؟

'ہاں سرکار'

'۔۔۔۔پر کیسا عجیب لگتا ہے۔'' (۱۶)

روشن آغا کو اب جاگیرداری، دبدبہ، شہرت وعزت سب ایک خواب معلوم ہوتا ہے ایک ایسی یاد کہ جو احساس کو چرکے لگا دیتی ہے۔ ناول میں کئی اداس نسلیں سامنے آتی ہیں لیکن تیسری نسل اداس ترین نسل ہے یہ وہ نسل ہے جو ہجرت کرتی ہے اور ہجرت کے کھٹے میٹھے پھل کھاتی ہے۔ یہ نسل اپنی ذات میں تقسیم ہو چکی ہے اور اپنی شخصیت کو سمیٹنے کی کوشش میں نظر آتی ہے۔ مجموعی طور پر اداس نسلیں میں عبداللہ حسین نے کئی نسلوں کی تاریخ پیش کی ہے زمانی لحاظ سے ان نسلوں کے درمیان فاصلہ کچھ زیادہ نہیں۔ اولین نسل انگریزوں کے ظلم وستم سہتی ہے دوسری نسل تحریک آزادی میں وطن کے لیے خون بہاتی ہے اور تیسری وہ نسل ہے جو ہجرت کرتی ہے۔ ناول میں تاریخی واقعات کو پیش کیا گیا ہے، تاریخی شخصیات کا ذکر ہے۔ تاہم ناول نگار نے اس دور کی مختلف جہتوں کو فنی طور پر سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ان نسلوں کے مختلف مسائل کو پیش کیا گیا ہے یہ مسائل خارجی بھی ہیں اور داخلی بھی۔ یہاں کرداروں کی ذہنی کیفیت بھی سامنے آتی ہے۔ کرداروں کے جسمانی ارتقا کے ساتھ ساتھ ان کے داخلی ارتقا اور تغیرات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ عام طور پر تاریخی ناولوں میں دیکھا گیا ہے یہ ناول واقعات کا پلندہ ہو کر رہ جاتے ہیں اور ناول نگار یا تو محض تاریخی واقعات درج کرتا ہے یا پھر جذباتیت کا شکار ہو کر نظریاتی بنیادوں پر تبصرے کرتا ہے لیکن عبداللہ حسین نے تاریخی حادثات و واقعات کو موضوع کی ایک خاص سمت دی ہے اور اسے بڑی چابک دستی کے ساتھ برتا ہے۔ اس میں تجربات کی وسعت ہے فن کی گہرائی اور تنوع اور تخلیقی عمل کا بھرپور مظاہرہ بھی۔

لندن کی ایک رات اور گریز میں تو مارکسی خیالات اور کرداروں کے درمیان طویل مکالمے اور بحث مباحثہ کے نمونے ملتے ہیں، اداس نسلیں میں بھی مارکسی خیالات اور ملک کی مختلف سیاسی تحریکات کے بنیادی اختلافات کی طرف واضح اشارے مل جاتے ہیں۔ مثلاً مہندر سنگھ اور نعیم کا ایک مکالمہ ملاحظہ ہو:

> ''تمھیں پتہ ہے ہم کیوں لڑ رہے ہیں؟ اچانک مہندر سنگھ نے پوچھا' جرمنوں نے حملہ کیا ہے'۔' کہاں روشن پور پر؟'۔'یہاں'۔'اور ہم یہاں کیوں ہیں۔ کس لیے آئے ہیں؟'۔'جرمن انگریزوں کے دشمن ہیں اور انگریز ہمارے مالک ہیں۔ بس'۔'ہمارے مالک روشن آغا ہیں۔ بس میں اتنا جانتا ہوں، انگریز روشن آغا کے مالک ہیں۔ چناں چہ کل کتنے مالک ہیں ایک دفعہ بتاؤ'۔ وہ ایک دم چڑ کر بولا۔'مالکوں کی بحث بے کار ہے۔ ہماری اصل جنگ ان سے ہے جنھوں نے مالکوں کو بنایا جو کاریگروں کے ہاتھ کاٹ دیتے ہیں اور سوچنے والوں کے دماغ شل کر دیتے ہیں۔ وہ غیر ملکی جو ہمارے ملک کو غریب کر رہے

ہیں۔تم ان سے لڑنے کے طور نہیں جانتے'۔'میں جانتا ہوں کہ ہندوستان انگریزوں کی سلطنت ہے اور ایسے کئی ہندوستانی انگریزوں کی ملکیت ہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ کیا حاصل کر رہے ہیں اور کس طریقے سے حاصل کر رہے ہیں۔''(۱۷)

تہذیب:

ہندوستان سالہا سال سے مختلف تہذیبوں کا سنگم رہا ہے۔آریوں کی آمد کے بعد حملہ آوروں کی یورش برابر جاری رہی ان میں کش، ترک، تاتاری اور تورانی ہیں ان سب کے اپنے اعتقادات تھے۔اپنے رسم ورواج اور مذہبی عقیدے تھے جنھوں نے ہندوستان کے قدیم تہذیبی مرقع میں اپنے نقش ونگار چھوڑے۔چنانچہ ہندوستانی تہذیب میں جہاں دراوڑوں کے جسم کی سختی اور مضبوطی ہے وہاں آریوں کی نازک خیالی اور تحریک بھی شامل ہے۔اس میں جہاں مسلمانوں کے دلوں کا گداز، جگر کا لہو اور فکروفن کی پاکیزگی شامل ہے وہاں انگریزوں کی سوچ کی بدمستی اور صنعت وحرفت بھی اس کا حصہ ہے۔آج جسے ہم ہندوستانی تہذیب کہتے ہیں وہ نہ تو ہندوؤں کی تہذیب ہے نہ آریوں یا ڈراوڑوں کی اور نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ اِن سب کے افادات اس میں شامل ہیں۔یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مختلف قوموں اور تہذیبوں کا اتصال وانضمام اور جذب وانجذاب کا سلسلہ صدیوں پر محیط ہے۔مختلف قومیں، مختلف گوشہ ھائے ارض سے یہاں پناہ لینے یا تجارت کی غرض سے آتی رہیں۔یہ انسانی کارواں جو مختلف اوقات میں ہمالیہ کی گود میں خیمہ زن ہوتے رہے اپنے ساتھ صرف جسموں کا جلوس لے کر ہی نہیں آئے بلکہ اپنی اپنی زبان، ادب، عقائد، تصورات، ذہن وشعور بھی ساتھ لائے تھے۔انھوں نے یہاں کی تہذیبی زندگی میں یقیناً گراں قدر اضافے کیے، بعض روایتیں بدل دیں، بعض تصورات کو منقلب کیا۔غرض باہر سے آئے ہوئے تہذیبی سرمائے اور یہاں کے تہذیبی ذخیرے میں جذب وانجذاب کا نہ ٹوٹنے والا اور نہ رکنے والا سلسلہ جاری رہا۔یہی وجہ ہے کہ اس ملک کے تہذیبی مطالعہ میں قدم قدم پر نئے موڑ آتے ہیں۔اور ہر مقام اپنی خاص امتیازی شان رکھتا ہے اور ہر موڑ اور ہر مقام پر کوئی نہ کوئی بیرونی تہذیب اپنا اثر ڈالتی نظر آتی ہے۔اسی لیے ہندوستانی تہذیب کے مختلف ادوار دوسرے قدیم ملکوں کی تہذیبوں سے ملتے جلتے ہیں۔یہاں زمانہ قدیم سے پتھروں کے اوزار سے لے کر بہترین سنگ تراش اور آرٹ کے نمونے پائے جاتے ہیں۔فکروفن کی مشعلیں زمانہ قدیم میں بھی روشن دکھائی دیتی ہیں اسی لیے پھیلاؤ اور وسعت ہندوستانی تہذیب کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔اس پھیلاؤ اور وسعت کی باہیں اطراف و اکناف میں دور تک پھیلی نظر آتی ہیں۔

ہندوستان کسی ایک تہذیب کا کلچر کا نام نہیں۔یہ تو وہ ملک ہے جس میں ان گنت تہذیبوں کے نشان ملتے ہیں بہت سارے مذاہب کی پہچان ملتی ہے۔ڈھیر ساری زبانوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ڈاکٹر تنویر احمد علوی ارتقائے تہذیب کے

بارے میں لکھتے ہیں:

''قدیم قبائلی کلچر آگے بڑھ کر شہری تہذیبوں میں بدل گیا۔ یہ شہری تہذیبیں بڑے دریاؤں کی وادیوں سے متعلق تھیں۔ مغربی ایشیا مشرقی افریقہ اور جنوب مغربی ایشیا میں ہم ایسی تین تہذیبوں سے آشنا ہوتے ہیں جنھوں نے بعد کی تہذیبوں پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان کو شہری تہذیب اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ یہ بہ حیثیت مجموعی (Ürban) بھی ہیں اور اس شہری یا سٹی کلچر کی نشانی یا علامات کے طور پر سامنے آتی ہیں جو وادیوں اور بالخصوص شہروں میں ارتقا پذیر ہوا تھا۔'' (۱۸)

مشرقی تہذیب اور مغربی تہذیب دونوں میں بعد المشر قین ہے، اس سے قبل جتنی تہذیبیں بیرونی حملہ آوروں کی آمد سے مقامی تہذیب میں شامل ہوئی تھیں، وہ اس تہذیب میں جذب ہو گئیں۔ لیکن مغربی تہذیب اور مشرقی تہذیب کا ملاپ ریت اور پانی جیسا تھا، یہ ریت پانی میں کبھی پورے طور پر جذب نہ ہوسکا۔

لندن کی ایک رات بغرضِ تعلیم یورپ جانے والے نو جوانوں کے مغربی تہذیب کے اثرات قبول کرنے اور پُوری طرح مغربی طرزِ زندگی میں ڈھل جانے کی اہم مثال ہے۔ اِس حوالے سے یہ ناول آج کی صُورتِ حال سے بھی پُوری طرح مُتعلّق نظر آتا ہے۔ ناول کے ہندوستانی کردار نو جوان طلبہ ہیں جو مغرب کے آزاد رہن سہن، ناؤ نوش، رقص کی محفلوں اور صنفِ نازُک میں بے پناہ دِلچسپی لیتے اور لڑکیوں کے تعاقب میں اپنے وقت کا بیشتر حصہ صرف کرتے دِکھائی دیتے ہیں۔ بالکل یہی ماحول عزیز احمد کے ناول گُریز میں بھی موجود ہے اور سجاد ظہیر کی طرح عزیز احمد بھی یورپ میں قیام اور حُصولِ تعلیم کا ذاتی تجربہ رکھتے تھے۔ دونوں ناولوں میں ہندوستانی طلبہ کے شب و روز ایک سے دِکھائی دیتے ہیں جن میں نہ صرف ذاتی تجربات و مشاہدات کی مُماثلت کا عمل دخل نظر آتا ہے بلکہ اُس عہد کے حالات اور ہندوستان سے یورپ جانے والوں کی سوچ کا یکساں رُخ بھی کارفرما ہے۔ دُوسری جانب عزیز احمد پر سجاد ظہیر کے فکری اثرات بھی نُمایاں ہیں، مذکورہ بالا دونوں ناولوں کا تقابل اِس حقیقت کو عیاں کر دیتا ہے۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر آصف فرّخی کی رائے بہت اہم ہے جنہوں نے ''افسانوی بُنت میں عصری شعور کی کارفرمائی اور یوروپ و ہندوستان کے مابین طالب علموں کی مجلسی زندگی میں نمودار ہونے والی کشمکش جیسے معاملات میں'' سجاد ظہیر کے ناول لندن کی ایک رات کو عزیز احمد کے ناول گُریز کا پیش رو قرار دیا ہے۔ (۱۹)

دونوں ناولوں کا تقابلی جائزہ اِس رائے کو درست ثابت کرتا ہے اور گُریز کئی اعتبار سے لندن کی ایک رات کی تمدید نظر آتا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے گریز اور لندن کی ایک رات میں ایک مماثلت یہ ہے کہ دونوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات موجود ہیں۔ لندن کی ایک رات اور گریز میں ایک مماثلت انگریزی اخبارات کا جانب

دارانہ رویہ ہے۔لندن کی ایک رات کی طرح گریز میں بھی ہندوستانیوں کے تئیں انگریزوں اور انگریزی اخباروں کے رویہ پر روشنی پڑتی ہے۔فرق یہ ہے کہ یہاں ہندوستانی عوام کو بالکل غیر مہذب اور پسماندہ تصور کیا جاتا ہے:

> ''نعیم نے ٹائمز کے ایک کونے میں گوشے میں ہندوستان کے معلق ایک چھوٹی سی خبر پڑھی۔پھر سوچنے لگا کہ برطانوی پبلک ہندوستانی معاملات کے متعلق کس قدر تاریکی میں رکھی جاتی ہے یکا یک ہندوستان کے معلق خبریں پڑھنے کو اس کا جی چاہنے لگا اور پھر یہ خیال آیا کہ ہندوستان میں اسے ہندوستان کی سیاسیات اور ہندوستانی خبریں پڑھنے میں کیسی الجھن ہوتی تھی۔جہاں صبح کی امید ہی نہ ہو وہاں رات کو بار بار گھڑی دیکھنے سے کیا حاصل۔''(۴۰)

گریز میں عزیز احمد نے مشرق اور مغرب کی تہذیبی کش مکش، متوسط طبقے کی نفسیاتی الجھنوں اور جنسی مسائل کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔لندن کی ایک رات کی طرح گریز بھی لندن کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔گریز کے کردار بھی زیادہ تر نوجوان ہندوستانی طالب علم ہیں۔لندن کی ایک رات کا ہیرو نعیم ہے گریز میں بھی مرکزی کردار ''نعیم'' ہی ہے۔''گریز'' میں پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ کی تباہ حال صورت حال کو پیش کیا گیا ہے۔جیسے عزیز احمد نے اپنے ہیرو نعیم کی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اسی کی زبان سے بیان بھی کیا ہے۔نعیم آئی۔سی۔ایس کے لیے منتخب ہوتا ہے اور تربیت کے لیے برطانیہ اور یورپ کے کئی دیگر مما لک کی سیر کرتا ہے۔دراصل عزیز احمد نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ تیسری چوتھی دہائی میں ایک ہندوستانی آئی۔سی۔ایس افسر کی ذہنیت کیا ہوتی ہے۔وہ مغربی طرز زندگی کو کس زاویے سے دیکھتا ہے اور کس طرح شعوری یا لاشعوری طور پر، مغربی ماحول کے زیر اثر اس کی زندگی میں بھی لذت پرستی اور عیش کوشی داخل ہو جاتی ہے۔گریز کا نعیم، لندن کی ایک رات کے عارف کی طرح ہر لذت کو کشید کرنا چاہتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لندن کی ایک رات اور گریز میں مغربی تہذیب اور اداس نسلیں میں مشرقی تہذیب کے مرقعے غالب ہیں، چونکہ پچھلے ابواب میں ان کی کثیر مثالیں دی جا چکی ہیں، اس لیے تکرار سے بچنے کے لیے مثالیں حذف کی جاتی ہیں، انھیں متعلقہ ابواب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

نوآبادیات:

یورپ کے ملکوں سے ہندوستان کا رابطہ ۱۴۹۸ء سے شروع ہوتا ہے۔جبکہ واسکوڈی گاما نے راس امید کے پاس سے گذرنے والا بحری راستہ دریافت کیا۔اس سے پہلے ہندوستان اور یورپ کے ملکوں میں عرب اور شام کے ذریعہ تجارت ہوتی تھی۔مگر براہ راست کسی قسم کے تعلقات نہیں تھے۔صرف یونانیوں سے عہد قدیم میں ہندوستان کا دوبار واسطہ پڑا۔ ایک دارائے اعظم کے زمانے میں جب ہندوستان کا شمال مغربی حصہ اور یونانیوں کے ایشیائے کوچک کی نوآبادیاں دونوں

ایرانی سلطنت میں شامل تھیں، دوسرے سکندر اعظم کے حملے کے بعد جب کہ یونانی سردار کچھ عرصے تک ہندوستان کے ایک حصہ پر حکومت کرتے رہے۔ مگر یہ رابطہ اتنے کم عرصے تک رہا اور اس نے دونوں ملکوں کی تہذیبی زندگی پر اتنا کم اثر ڈالا کہ ہم اسے نظر انداز کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان اور یورپ کے تعلقات کا باضابطہ آغاز پندرھویں صدی عیسوی سے ہوا۔ اس وقت سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک پرتگال، ڈنمارک، ہالینڈ، فرانس اور انگلستان کے تاجروں کی سیاسی اور تجارتی جدوجہد ہندوستان میں جاری رہی۔ مگر اس کے بعد رفتہ رفتہ باقی قومیں ایک ایک کر کے سامنے سے ہٹ گئیں اور انگریزوں کے لیے میدان صاف ہو گیا۔ انھوں نے نہ صرف ہندوستان کی بحری تجارت پر قبضہ کر لیا بلکہ ہندوستان کے سماجی حالات سے فائدہ اٹھا کر ایک بڑے علاقے میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ مگر جہاں تک تہذیبی زندگی کا تعلق ہے اٹھارہویں صدی کے آخر تک وہ خود ہندوستان سے متاثر ہوتے رہے۔ اپنا کوئی اثر ہندوستان پر ڈالنے کی نہ ان میں کوئی اہلیت تھی اور نہ انھیں کوئی فکر تھی۔ ۱۷۷۳ء کے بعد یعنی جب برطانوی پارلیمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی نگرانی اپنے ہاتھوں میں لے لی اور بہتر دل و دماغ کے انگریز کمپنی کی سول سروس میں آنے لگے۔ تب مغربی تہذیب کے ذہنی اور مادی پہلوؤں کے اثرات ہندوستان پر پڑنے لگے۔ لیکن ایک تو ان کا دائرہ محدود تھا اور پھر اس محدود دائرے میں وہ عام ہندوستانی زندگی میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ کر سکے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی کے بعد البتہ مختلف وجوہ سے ہندوستانی معاشرے کے مختلف شعبوں میں تبدیلیاں واقع ہونا شروع ہوئیں۔

انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب سارے ملک پر چھا گئی اور اس نے ہندوستانیوں کی ساری تہذیبی زندگی کو درہم برہم کر دیا۔ فکر و احساس کا وہ امتزاج، فطرت سے ہم آہنگ ہونے کا وہ شعور جس سے قدیم ہند کا مذہبی فلسفہ وجود میں آیا تھا اہل یورپ میں موجود نہیں تھا۔ ان کے یہاں جذبات و خیالات دونوں کو عمل اور ارادے کا تابع ہونا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ یونان اور روم دونوں کی حیات اجتماعی کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ ریاست پر قائم ہوئی جو جماعت کی قوت ارادی کا مظہر ہے۔ مگر جغرافیائی اور تاریخی وجوہ سے ریاست کی شکلیں جدا جدا ہو گئیں جس کی وجہ سے ان کی تہذیبوں میں بھی بہت فرق پیدا ہو گیا۔

گرچہ انیسویں صدی کے نصف اول میں ہی انگریزوں کا سیاسی اقتدار ہندوستان پر تقریباً مسلم ہو چکا تھا مگر ان کا تہذیبی اقتدار ہنوز قائم نہیں ہوا تھا۔ مغرب کے مادی وسائل ریل، تار وغیرہ تو ملک کے بڑے حصے میں پھیل گئے تھے اور عموماً ہندوستانیوں کے دل میں حیرت اور تعریف کے جذبات پیدا کر رہے تھے۔ لیکن ان کا اثر ذہنی سطح پر بہت خفیف تھا اور وہ بھی کلکتے یا معدودے چند مقامات میں ایک چھوٹے سے حلقے تک محدود تھا اس کی کئی وجہیں تھیں۔ اول تو یہ کہ ابھی تک

ہندوستانی اپنی پرانی تہذیب سے مطمئن تھے اور اس میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے تھے ان کو یہ احساس ہوا نہیں ہوا تھا کہ ان کا سیاسی انحطاط دراصل ذہنی اور اخلاقی انحطاط کا نتیجہ ہے ان کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں، ان کے ادب اور فنون لطیفہ میں حقیقت کی روح کم اور تصنع کا رنگ زیادہ ہو گیا ہے۔ اور مجموعی طور پر ان کی تہذیب اس قدر جامد ہو گئی ہے کہ اس میں نشو ونما اور اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی طاقت نہیں رہی۔ دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب کے ساتھ نئے زمانے اور نئی زندگی کے جو فرحت بخش جھونکے آئے تھے ان میں اہل ہند کو سیاسی اور معاشی غلامی کی زہریلی گیس کی بو آتی تھی۔ اس لیے وہ اس سے دور بھاگتے تھے۔ مغربی تہذیب کے نمائندے یا تو نفع کمانے والے تھے جو ان کی آزادی اور دولت کو چھیننا چاہتے تھے یا عیسائی مبلغ جو ان کے عزیز ترین عقیدے اور مذہب کے درپے تھے اس لیے اس تہذیب کو بے تعصبی کی نظر سے دیکھنا اور اس کی خوبیوں کی قدر کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ تیسرے یہ کہ لارڈ میکالے جیسے افراد کو چھوڑ کر بحیثیت مجموعی ان انگریزوں پر جو ہندوستان میں رہتے تھے انیسویں صدی کی نئی انگریزی ذہنیت کا اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ دولت اور قوت کا لالچ ضرور رکھتے تھے مگر نسلی اور قومی غرور سے پاک تھے۔ انھیں ''گوری قوم کے بار امانت'' کا احساس نہیں تھا۔ وہ ایشیائی قوموں کو غیر مہذب یا نیم مہذب اور اپنے آپ کو ان کے مہذب بنانے کا ذمہ دار نہیں سمجھتے تھے۔ مثلاً سلیمن جیسا انگریز جس نے قوت کے نشے میں سرشار ہو کر اودھ کے تاجدار سے انتہائی حقارت اور ذلت کا برتاؤ کیا تھا قدیم طرز کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمان امراء کی تہذیب و شائستگی کا قائل تھا۔ اور ان کی ذہنی برتری کا اعتراف کرتا تھا۔ غرض حکومت کی تہذیبی پالیسی کچھ بھی ہو مگر عام انگریز اس وقت تک اپنی تہذیب کو ہندوستانیوں پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ ایک حد تک خود اس سے متاثر تھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد دفعتاً نقشہ بدل گیا۔ ہندوستانیوں کو اپنی بے بسی کے احساس سے ایسا صدمہ پہنچا کہ اس نے ان کے راسخ عقیدے کو جو وہ اپنی تہذیب سے رکھتے تھے متزلزل کر دیا۔ ادھر انگریز اپنی قومی سیرت کے مطابق اس لوگوں کو جنھوں نے بحیثیت جماعت اس شدید بحران کے زمانے میں اپنے ارادے کو معطل کر دیا تھا اور سیلاب وحوادث کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس کے ساتھ بہہ گئے۔ حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے اور قدرتی طور پر ہندوستانی تہذیب بھی ان کی نظر سے گر گئی۔ خصوصاً جب انگریزوں کی تنی تانی نسل اور تہذیبی برتری کا تصور اور سامراجی مشن کے نشے سے سرشار ہندوستان پہنچی تو اس نے سارے ملک کو خوف سے سہا ہوا دیکھا۔ اور عام طور پر لوگوں کو عاجزی سے سر جھکائے ہوئے پایا تو اسے اور زیادہ یقین ہو گیا کہ اس کا سابقہ ایک پست قوم سے ہے۔ جسے مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کے ذریعے ابھارنا اس کا مقدس فرض ہے۔ خود ہندوستانیوں میں کچھ ایسے ضمیر فروش بھی تھے جنھوں نے اپنے آپ کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا اور ان کی

ہر بات کی تائید کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ انگریزی حکومت اور انگریزی تہذیب کے مخلص حامیوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی تھی یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے حالات کا بہت غور سے مطالعہ کر کے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس وقت انگریز ہی ہندوستان کی سیاسی ابتری کو دور کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں یقین تھا کہ ان کی عہدِ وسطیٰ کی تہذیب اب فرسودہ ہو چکی ہے اور نئے زمانے کے معاشی، سیاسی اور ذہنی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ اس لیے ان کو انگریزوں کے سامنے زانوے ادب تہہ کر کے ان سے وہ جدید تہذیب سیکھنی چاہیے جس کی بدولت انھوں نے یہ ترقی اور کامیابی حاصل کی ہے۔ انگریزوں کے ذہنی اور سیاسی اقتدار کے مخالف اب بھی موجود تھے۔ لیکن وہ میدان میں آنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ انھیں حکومت کے پنجۂ غضب سے صرف مذہب کے ظلِ حمایت ہی میں جگہ مل سکتی تھی۔ اس لیے وہ مذہبی مدرسوں اور خانقاہوں میں کم و بیش عزت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان لوگوں کو چھوڑ کر عموماً وہ امراء اور شرفاء جو سیاسی طوفان کی دست برد سے بچ رہے تھے اور نئے اونچے متوسط طبقے جنھیں سیلابِ زمانہ نے ابھارا تھا خوشی سے انگریزی حکومت کے سامنے سر جھکانے کو تیار تھے۔ ہندوؤں نے جو زمانے کے ساتھ بدلنے کی زیادہ صلاحیت رکھتے تھے، انگریزی مدارس کی طرف دوڑنا شروع کر دیا تا کہ انگریزی تعلیم اور تہذیب کی برکتوں سے فیض یاب ہو کر ایک طرف اپنی روزی کا ٹھکانا کریں اور دوسری طرف حاکم قوم کی نظر میں عزت پائیں۔ مسلمان ایک مدت تک الگ رہے۔ لیکن سرسید کی حکمتِ عملی نے رفتہ رفتہ انھیں بھی زمانے کے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا۔ غرض انگریزی حکومت نے اپنی تہذیبی پالیسی کو جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے فرو ہونے کے بعد بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ اسے خود ہندوستانیوں کے ایک بڑے طبقے کی مدد سے مکمل اور منظم طور پر چلانے کی کوشش کی اور بظاہر اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ یعنی انگریزی تہذیب کا ایک دیسی چربہ تیار ہو گیا جس نے رفتہ رفتہ ہندوستانی تہذیب کو پیچھے ہٹا کر اس کی جگہ لینی شروع کر دی۔

نئی تعلیمی اور تہذیبی تحریک ہندوستانی تہذیب کی تحریک جسے اکبر اعظم نے شروع کیا تھا۔ اس امر میں مشابہت رکھتی تھی کہ اس کی تہہ میں بھی سیاسی مقصد تھا اور اس کا مرکز بھی ریاست کو قرار دیا گیا تھا۔ اکبر کی طرح انگریز بھی یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں سیاسی وحدت پیدا کریں یعنی ہر فرقے اور طبقے کے لوگوں کو ایک ریاست کی وفادار رعایا بنا کر اتحاد کے رشتے میں مربوط کریں۔ انھوں نے بھی اس کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ مشترک تعلیم کے ذریعے ملک کے اونچے اور متوسط طبقوں کو ایک مشترک تہذیب کے رنگ میں رنگ دیں۔ (۲۱)

انگریزی حکومت کی معاشی پالیسی کو جس سے اس کی سیاسی پالیسی متاثر ہوئی سمجھنے کے لیے اس بات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ یہ حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کی وارث تھی۔ اور اس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ انگریزی سرمایے کے لیے ہندوستان میں معاشی استحصال کے مواقع فراہم کرے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں انگلستان کی رائے عامہ نے

ایسٹ انڈیا کمپنی کی شدید مخالفت زیادہ تر اس لیے شروع کی تھی کہ معدودے چند اشخاص نے ہندوستان کی تجارت پر بلا شرکت غیرے قبضہ کرلیا تھا۔اور دوسروں کو اس فائدے سے محروم رکھتے تھے۔حکومت برطانیہ کمپنی کے معاملات میں روز بروز مداخلت کرتی رہی اس کے تجارتی اجارے کو روز بروز محدود کرتی رہی۔یہاں تک کہ جب صنعتی انقلاب کے بعد انگلستان کے کارخانے بہت زیادہ مال پیدا کرنے لگے اور اس کی کھپت کے لیے بازاروں کی ضرورت ہوئی تو کمپنی کو توڑ دیا گیا تا کہ بلاتفریق سبھی سرمایہ دار اور بالواسطہ ساری برطانوی قوم ہندوستان کی معاشی استحصال کرسکے۔ایسٹ انڈیا کمپنی اگرچہ شروع میں ایک تجارتی کمپنی تھی،لیکن جب اسے ملکی اقتدار حاصل ہوا تو برطانوی پارلیمنٹ نے اسے اپنے ماتحت کرلیا ،اس ضمن میں مفتی شوکت علی فہمی لکھتے ہیں:

> ''لندن پارلیمنٹ اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے عہدہ داروں کے معاملات میں بار بار مداخلت کرتی رہی تھی۔مگر اس وقت تک اسے قانونی مداخلت کا کوئی حق نہ تھا۔چنانچہ انگلستان کے اُمرا اور پارلیمنٹ کے ممبروں کی طرف سے کئی سال سے برابر یہ مطالبہ ہورہا تھا کہ چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی اب تجارتی کمپنی نہیں رہی بلکہ وہ حکمراں طاقت بن گئی ہے،اس لیے اس کا انتظام کمپنی کے ڈائریکٹروں کے ہاتھ سے نکال کرخود برطانوی پارلیمنٹ کو اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے۔پارلیمنٹ کے ممبر اس لیے بھی کمپنی کے ڈائریکٹروں اور عہدہ داروں کے مخالف ہو گئے تھے کیونکہ کمپنی کے عہدہ داروں اور ڈائریکٹروں نے ہندوستان کی لوٹ کے مال کے ذریعہ الیکشن اور دیگر معاملات میں لندن پارلیمنٹ کے ممبروں کا مقابلہ کرنا شروع کردیا تھا۔لندن کے اُمرا اور پارلیمنٹ کی اس مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ لندن پارلیمنٹ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے ۱۷۷۳ء میں ریگولیٹنگ ایکٹ کے نام سے ایک قانون پاس کرنا پڑا جس کی رُو سے کمپنی کا ملکی انتظام بورڈ آف ڈائریکٹرز کے قبضہ سے نکال کر پارلیمنٹ نے پانے ہاتھ میں لے لیا۔اسی قانون کی رُو سے کلکتہ میں چار انگریز ممبروں کی ایک کونسل بنادی گئی۔''(۴۲)

اس طرح ظاہر ہے کہ ہندوستان کی انگریزی حکومت جس نے سیاسی حیثیت سے کمپنی کی جگہ لے لی یہ پالیسی اختیار کرنے پر مجبور تھی کہ ہندوستان کو صنعتی نظام سے اس طرح غیر وابسطہ کردے کہ وہ بدستور زرعی ملک رہے بلکہ اور زیادہ زرعی ہوجائے۔یعنی اپنی دست کاریوں کو ختم کرکے تمام انگریزی کارخانوں کے لیے کچا مال پیدا کرنے والا اور ان کی بنائی ہوئی چیزوں کا صرف کرنے والا بن جائے۔حکومت کو اپنا مقصد پورا کرنے لے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھدّے اور وحشیانہ طریقے استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔آزاد تجارت (Free Trade) اور تامین کے ترقی یافتہ طریقوں کو ہوشیاری سے ملا جلا کر استعمال کرنا اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کافی تھا کہ انگلستان کی مشینی صنعت ہندوستان کے بازاروں میں دوسرے ملکوں کے مقابلے سے محفوظ رہے۔اور دیسی دست کاریوں کو کھلے مقابلے میں شکست دے کر ختم

کردے۔

اس میں شک نہیں کہ خود ہندوستان میں صنعتی کارخانے قائم ہوئے۔ بینک کھولے گئے، ریلیں چلیں، غرض عہد جدید کے وہ سب سامان نظر آنے لگے جو ملکوں کی معاشی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ لیکن ایک تو یہ چیزیں ملک کے وسیع رقبے اور آبادی کے لحاظ سے بہت محدود پیمانے پر تھیں اور دوسرے ان میں سرمایہ اور انتظام تقریباً پورا انگریزوں کا تھا۔ ہندوستانی یا تو ان سے گاہکوں کی حیثیت سے تعلق رکھتے تھے یا مزدوروں اور کلرکوں کی حیثیت سے۔ گاہکوں کی حیثیت سے انھیں اور فائدے تو پہنچے لیکن روپیہ ان کی جیبوں سے کھنچ کر باہر جاتا رہا۔ مزدور کی حیثیت سے وہ مدتوں تک بغیر قانون کی حفاظت کے بدیسی سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر رہے۔ اور یورپ کے مزدوروں کے مقابلے میں جنھوں نے اپنے آپ کو منظّم کر لیا تھا کہیں زیادہ استحصال کا شکار ہوئے۔ غرض کچھ تو حکومت کی بالقصد پالیسی، کچھ اس کی بے پرواہی اور اس سے بھی زیادہ خود ہندوستانیوں کی جہالت اور بے حسی کی وجہ جدید معاشی نظام ملک میں اس طرح آیا کہ اس کی کل بدیسی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں تھی اور اس کے ساتھ وہ تحفظات نہ تھے جو یورپ میں اس کے مضر اثرات کو ایک حد تک روکنے کے لیے وضع کئے گئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً اس کا سارا فائدہ انگریزوں کو پہنچا۔ اور ہندوستان کو بجائے فائدے کے نقصان ہوا۔ وہ مجموعی طور پر بدستور عہد وسطیٰ کے زراعتی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرتا رہا۔ بلکہ جب دیسی صنعتیں غیر ملکی مشینی صنعتوں کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے مٹنے لگیں تو ان لوگوں کو چھوڑ کر جو معدودے چند بڑے کارخانوں میں مزدوری کرتے تھے۔ دستکار بھی کاشتکاری کی طرف بڑھنے لگے اور اس ہجوم نے زراعتی زمین پر اتنا بوجھ ڈالا جو اس کی برداشت سے باہر تھا۔

تیسری دنیا کے اکثر ممالک کی طرح ہم بھی دنیا کی بڑی طاقتوں کی نوآبادیات کا ایک حصہ رہے ہیں۔ تہذیبی سطح پر نوآبادیات کا حصہ رہنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ قوم کی اجتماعی نفسیات میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ اس نے اپنے حکمرانوں کے مفادات کے لیے کام کرنا ہے۔ حکمران ہمیشہ محکوم کا خام مال اور سستی مزدوری زبردستی وصول کرتے ہیں۔ نوآبادیاتی دور میں ہمارے معاشرے کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔

ہندوستان پر برطانوی تسلط کا اثر صرف سیاسی اور معاشی پہلو پر ہی نہیں پڑا بلکہ اس نے معاشرتی زندگی پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ معاشی ابتری بھی انسانی اخلاق پر برے اثرات مرتب کرتی ہے۔ نیز انگریزوں کے قبل کے حکمرانوں نے مقامی لوگوں کو کبھی حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ نسلی برتری صرف طبقاتی طور پر موجود تھی۔ اور یہ طبقاتی تفریق بھی بنیادی طور پر معاشی تفریق تھی۔ نوآبایاتی حاکموں نے نہ صرف مقامی آبادی کو حقارت سے دیکھا بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی دوریاں پیدا کرنے کی شعوری کوششیں شروع کر دیں۔ نوآبادیاتی حاکموں سے پہلے کسی حاکم نے ملکی

تجارت کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نوآبادیاتی حاکموں نے نہ صرف تمام ملکی وسائل پر قبضہ کرلیا، بلکہ اس نے متوسط اور نچلے طبقے کے روزگار کو بھی اپنے تابع کرلیا۔ جس کا اثر مختلف شعبوں پر پڑا۔ ذیل میں اس کا ایک اجمالی جائزہ لیا جاتا ہے۔

سیاسی انقلابات کے بعد اقتصادی انقلابات نہایت ہی ہولناک واقع ہوئے۔ بنگال جو سلطنت مغلیہ کا سب سے زرخیز اور خوشحال صوبہ تھا اور جسے سلطنت ہند کی پیداوار کا ذخیرہ کہا جاتا تھا اس کا اب یہ حال ہوگیا کہ چند ہی دنوں میں غیر آباد ہو کر رہ گیا۔ کاشتکار زمینیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گئے۔ زمینداروں کو کاشت کے لیے کاشتکاروں کی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ جدید نظام مالگزاری جس کی رو سے نہایت سخت لگان عائد کیا گیا تھا اور اس پر عمل بھی نہایت سختی سے ہونے لگا تھا جو اکثر زمینداروں کی تباہی کا باعث ہوا۔ ذاتی تعلقات کا لحاظ جو پرانے دستور العمل کی کامیابی کا راز تھا نئے نظام میں بالکل مفقود تھا۔ کمپنی کے کاغذات میں جابجا یہ لکھا ملتا ہے کہ تمام خرابیاں صرف اس پرانے دستور العمل کا نتیجہ تھیں جو انھیں مغلوں سے ملا تھا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود اس نظام کو سمجھ ہی نہیں سکے جو اکبر بادشاہ کے زمانے سے نہایت احتیاط سے بنائے ہوئے دستور العملوں کی صورت میں چلا آتا تھا۔ بقایا وصول کرتے وقت خاص حالات کا خیال رکھا جاتا تھا اور کاشتکاروں کی حالت بھی ہمیشہ پیش نظر رکھی جاتی تھی۔ لیکن اب تو بقایا بہت سختی کے ساتھ وصول کیا جاتا تھا اور اس میں کسی طرح کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی تھی۔ جہاں قبل ازیں نادہند لوگوں سے نرمی یا سختی سے عارضی دباؤ ڈال کر کام لیا جاتا تھا وہاں اب پابندی وقت کے زعم میں زمینیں نیلام کردی جاتیں اور کاشتکاروں کو مارے مارے پھرنے کے لیے نکال دیا جاتا اور اس زمانے کے لحاظ سے گویا انھیں ذریعۂ معاش سے محروم کردیا جاتا تھا، اگرچہ مار دھاڑ اور سختی سے جبراً روپیہ وصول کرنے کا طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا، مگر اب تو اس میں دوگنی بلکہ چوگنی سختی ہونے لگی۔ کمپنی کے ادنیٰ ملازم اپنی من مانی کرتے کیونکہ انھیں بخوبی معلوم تھا کہ ان کے غیر ملکی آقا ان کی چالاکیوں کے متعلق شبہ تو کرسکتے ہیں لیکن ان سے واقف ہونا محال تھا۔ درآں حالیکہ غیر ملکی آقا خود اس اصول پر کاربند تھے کہ جہاں تک جلدی ممکن ہو ملک سے روپیہ اکٹھا کر کے وطن کی راہ لو۔ اعلا حکام اپنے ماتحتوں سے کہیں زیادہ حریص تھے۔ اس لیے اپنی حرص پوری کرنے کے لیے انھیں ایسے ذرائع سے بھی دریغ نہ ہوتا جن سے ان کے ماتحت ظلم وجبر سے روپیہ وصول کرسکتے۔ رسم ورواج جو زمینداری کے مختلف مفاد کے تعلقات میں توازن قائم رکھتے تھے دیہات میں بخوبی سمجھے جاتے تھے۔ مگر نئے نظام میں صرف روپیہ وصول کرنے کی غرض تھی اور ان رسوم کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔ نئی عدالتوں کی کارروائیوں میں بہت تاخیر ہوتی تھی اور کامیابی یا ناکامی کا لوگوں کو کوئی یقین نہ تھا۔ نیز ضابطۂ کارروائی بھی سخت اور دقیق تھا اس لیے بددیانت اکثر بمقابلہ دیانت دار کے فائدہ اٹھا لیتے تھے اور جو لوگ قاعدہ کی پابندی کرنا چاہتے تھے وہ مفسد اور

چالاک لوگوں کے پھندے میں پھنس جاتے تھے۔(۴۳)

اگرچہ سوداگری اور تجارت کی حالات زراعت کی پستی کے پورے پورے آئینہ دار تھے مگر ان کے علاوہ کئی ایک اور خرابیاں تھیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حیثیت اور تاریخ ہی کا نتیجہ تھیں۔کل غیر ملکی تجارت کمپنی کے ہاتھ میں تھی۔کمپنی کی حیثیت ایک خاص پہلو رکھتی تھی۔اسے دوگونہ اجارہ حاصل تھا۔ایک طرف تو اسے اپنے وطن (انگلستان) میں ہندوستانی تجارت کا مکمل حق فروخت حاصل تھا جو کسی اور کمپنی یا شخص کو نہ تھا۔اس وقت ہندوستان کی تجارت نفیس پارچہ کی تھی جو انگلستان کی روئی کے جدید کارخانوں کا مقابلہ کرتی تھی۔ڈھاکہ کی ململیں اور ساحل مدراس کے سفید لٹھے اپنی نفاست کی وجہ سے مشہور تھے۔ان پر انگلستان میں (۴۳) تینتالیس فی صدی محصول لگا دیا گیا۔اور دوسری طرف انگریزی کمپنی نے فرخ سیر کے فرمان سے ہندوستان کے اندر بھی قطعی حق فروخت حاصل کرلیا تھا جس کی وجہ سے وہ نہ صرف یورپین تاجروں میں سبقت لے گئی بلکہ ہندوستانیوں کے مقابلے میں بھی اسے ایک غیر معمولی امتیاز حاصل ہوگیا۔کلکتہ کے انگریزی صدر کا دستخط شدہ ''دستک'' تمام ان اشیاء کو جن کا اس میں ذکر ہوتا تھا چنگی کے متعلق ہر قسم کی روک تھام بلکہ معائنے سے بھی بری کر دیا تھا۔اس کا جائز استعمال ہی ملک کے لیے کافی مضرت رساں تھا مگر یہاں تو اس کا نہایت ہی بے حیائی سے ناجائز استعمال کیا جاتا تھا۔اور یہی ناجائز استعمال کمپنی اور نوابان بنگال کے درمیان مناقشات کی وجوہ میں سے ایک وجہ بنتا رہا۔بلکہ کمپنی نے نواب بنگال کی حکومت کے اس مشورہ کی بھی مخالفت کی کہ نواب کی رعیت کو بھی محصول وغیرہ سے اسی طرح معافی دی جائے۔جب کمپنی آقا ہی بن بیٹھی تو یہ خرابی اور رنگ لائی۔ لیکن کمپنی کے اس اجارے کے اندر ایک اور اجارہ پیدا ہوگیا۔نمک، چھالیا، تمباکو اور چاول کی ملکی تجارت میں بہت نفع ہوتا تھا کیونکہ یہ عام استعمال اشیاء تھیں۔کمپنی کے ملازموں نے اس تجارت پر پورا قبضہ حاصل کرلیا تھا اور نفع سے اپنی جیبیں بھرنے لگے۔تیل، مچھلی، بھوسا اور بانس وغیرہ روزانہ استعمال کی اشیاء کی فہرست میں شامل کر لیے گئے اور قیمت بڑھانے کے لیے ان کی کل منڈی اپنے ہاتھ میں لے لی گئی۔کمپنی کے ملازموں کی مقرر کردہ قیمتوں پر جبری خرید و فروخت کی شکایت اس قدر بڑھ گئی کہ کمپنی کے ڈائریکٹروں کو دخل دینا پڑا اور انھوں نے ملازموں کو ذاتی تجارت کی ممانعت کردی۔مگر ملازمان کمپنی بالکل بے پروائی سے ان احکام کی خلاف ورزی کرتے رہے۔کمپنی کے اعلا ملازموں نے جن میں کلائیو بھی شامل تھا ''مجلس تجارت'' کے نام سے ایک جماعت قائم کرلی جس کے کاروبار کے لیے نمک، چھالیہ، اور تمباکو ایسی نفع بخش اشیاء چنی گئیں۔یہ اجارہ اس قدر سودمند ثابت ہوا کہ کلائیو نے اپنے پانچ حصے (۳۲) بتیس ہزار پونڈ (تقریباً ۳ لاکھ-۲ ہزار روپیہ) کے عوض فروخت کر دیئے۔یہ حصے کلائیو کو اس بنا پر ملے تھے کہ وہ اس مجلس کا بانی تھا۔اسے گورنر ہونے کے باعث پانچ حصے بحیثیت عہدہ دیئے گئے تھے حالانکہ اس نے فی الواقعہ سرمایہ میں کوئی روپیہ ادا

نہیں کیا تھا۔اس سے پیشتر نمک کے اجارہ میں صرف نو ماہ کے قلیل عرصے میں (۴۵) پینتالیس فیصدی نفع ہو چکا تھا۔یہ تجارت نہ تھی محض ایک لوٹ تھی جو ان ذرائع کی مدد سے جاری تھی جو مسلح قوت اور سیاسی غلبے نے ان کے ہاتھ میں دے رکھے تھے۔ہندوستان کی تمام اندرونی تجارت جس صورت میں جاری تھی وہ ایک طویل تشدد کا کارزار بن رہی تھی،اور یہ صورت خاص طور پر کمپنی کی اس تجارت پر حاوی تھی جس میں نقد سرمائے سے مال خرید کر ہندوستان سے غیر ملکوں کو بھیجا جاتا تھا۔اس کے مضرت رساں اثرات ملک کے ہر پارچہ باف،جولاہا اور کاریگر بڑی سختی سے محسوس کر رہا تھا،کیونکہ ہر ایک شے پر کمپنی کو اجارہ حاصل تھا جس میں انگریز اپنے بنیوں اور ہندوستانی گماشتوں کے ساتھ اپنے حسب خواہش فیصلہ کر لیتے تھے کہ کاریگر کس قدر مال ان کے حوالے کرے گا اور اسے کیا قیمت ملے گی۔علامہ عبداللہ یوسف علی لفظ بنیا کی تشریح میں یوں رقمطراز ہیں:

''لفظ بنیا اصطلاحی طور پر اس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے (ایسے بنیے خواہ اپنے طور پر خواہ کسی بڑے ہندوستانی تاجر کے گماشتہ کی حیثیت سے کام کرتے ہوں) جس کے ذریعے سے انگریز اپنے تمام تجارتی معاملات سرانجام دیتے ہیں۔یہی شخص ان کا ترجمان،ان کا منیم،ان کا معتمد اور دلال ہوتا ہے۔یہی انھیں نقدی بہم پہنچاتا ہے اور ان کا خزانہ تحویل میں رکھتا ہے اور عموماً رازدار بھی ہوتا ہے۔ادنیٰ درجہ محرر،چوکیدار،خانساماں،چوبدار،قاصد،پیادہ،مشعلچی،قندیل بردار،ڈولی بردار اور دیگر ادنیٰ ملازموں کے گروہ کثیر کا تقرر بھی اس کے سپرد ہے۔وہ ان سب کی دیانتداری کے لیے ذمہ دار اور جوابدہ قرار دیا جاتا ہے اور اپنے آقا کی تمام تجارت چلاتا ہے۔اس کے آقا تک کسی ہندوستانی کو رسائی نہیں ہو سکتی سوائے اس صورت کے آقا دیسی زبانوں سے اچھی طرح واقف ہو۔غرضیکہ آقا پر اس کا اثر بذات خود اس اثر سے کلی درجہ زیادہ ہے جو یورپ کے کسی فضول خرچ شریف زادے پر اس کے خانساماں،قرض خواہ اور اس کی محبوبہ سب کو مل کر حاصل ہوتا ہے۔اس کے علاوہ وہ عوام میں بحث و مباحثہ کے موقع پر بعض ایسے اعمال وافعال کے ارتکاب کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتا ہے جن کے متعلق ان کا آقا خود اقبال نہیں کرنا چاہتا۔ایسے تمام بنیے جو بنگال کی بستیوں میں سرکاری دفتروں اور خانگی معاملات میں انگریزوں کی خدمت کرتے ہیں ایک باہمی رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں۔''(۴۴)

جب ہندوستان میں انگریزوں کا اقتدار بڑھنا شروع ہوا معزز گھرانوں میں سے اکثر لوگ اس فرض اور خدمت گزاری کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانے لگے،بلکہ بعض اوقات تو وہ کسی انگریزی نوکری حاصل کرنے کے لیے روپیہ بھی صرف کر دیتے تھے۔مگر عموماً یہ باتیں زیادہ تر اثر ورسوخ حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہیں جو وہ ان ذرائع سے حاصل کر لیتے ہیں یا اور دیگر فوائد کے لیے۔مثلاً بغیر محصول ادا کیے تجارت کرنے کے وسائل پیدا کر لینا وغیرہ۔کیونکہ انگریز آقا کی

''دستک'' کی آڑ میں یہ سب باتیں ممکن ہیں۔ اگر چہ بنگالی زبان میں بول چال اور لکھنا پڑھنا ایک تاجر کے لیے ضروری ہے مگر اہل یورپ میں کوئی ایسی مثال نظر نہیں آتی جہاں کسی نے زبان میں ایسی مہارت حاصل کی ہو کہ وہ اس قسم کے بنیئے کی امداد کے بغیر اپنا کام چلا سکے۔

ملکی ہنر مندی، صنعت و حرفت اور اقتصادی حالت کی تباہی کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا تھا کہ کاریگر اور دستکار ایک فوق الادراک ظلم و ستم کا شکار تھے۔ درحقیقت کمپنی نے انھیں اپنا زرخرید غلام سمجھ رکھا تھا۔ غریب جولاہوں پر طرح طرح کے بے شمار طریقوں سے ظلم کیا جاتا تھا اور اس ظلم کے آلہ کار کمپنی کے نمائندے اور گماشتے تھے۔ ان بے کسوں پر جرمانے کئے جاتے تھے، انھیں قید کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ انھیں کوڑے لگوائے جاتے تھے اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کی جاتی تھی بلکہ اس سے جبراً تمسک بھی لکھوا لیے جاتے تھے۔ الغرض ایسے ہی ظلموں سے ملک میں جولاہوں کی تعداد میں سخت کمی واقع ہوئی تھی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا تھا کہ پارچہ کی تجارت میں مال کی کمی، گرانی اور ابتری واقع ہوگئی تھی مزید برآں یہی بات مالگزاری میں ایک زبردست کمی کا باعث ہوگئی تھی۔

انگریزوں کے علاوہ مل مالکان بھی اس لوٹ کھسوٹ میں شامل ہوگئے۔ اداس نسلیں میں علی جس مل میں کام کرتا تھا جب وہاں ہڑتال ہوئی تو ایک مزدور کی تقریر اس صورت حال کی سچی عکاسی کرتی ہے:

> ''وہ لوگ خوب صورت گھروں میں رہتے ہیں اور خوب صورت تصویریں دیواروں پر لٹکاتے ہیں ، ہمارے سیاہ بدنما جسموں کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پچھلے سال میں ہم نے ساٹھ ہزار ٹن سیمنٹ بنایا ہے جس سے کمپنی کو دس لاکھ روپے کا فائدہ ہوا ہے، کیا ہماری مزدوری آٹھ آنے روز کے حساب سے بھی نہیں بڑھائی جا سکتی؟ ہم لاکھوں میں دیتے اور صرف سینکڑوں میں اپنا حق مانگتے ہیں۔ ہمیں رہنے کے لیے مکان چاہئیں، ہمارے مکانوں میں پانی ہونا چاہیے کیوں کہ پانی کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔''(۲۵)

مغلیہ دور میں ہماری تہذیب کا تعلیمی کلچر یہ تھا کہ انفرادی محنت اور لیاقت سے اگر کوئی فرد علم حاصل کر لیتا تھا تو بادشاہ اس کے علم اور کمالات کی قدر کرتے ہوئے اسے انعام و کرام اور خلعتِ فاخرہ عطا کر دیتے تھے۔ لیکن یہ انعام اس کا ناگزیر حق نہیں ہوتا تھا۔ یہی روش بادشاہ کے دربار سے نکل کر پورے معاشرے میں رائج ہوتی تھی۔ مدرسوں اور خانقاہوں سے نکلے ہوئے فارغ التحصیل طلبا کا مستقبل معاشرے کی خیرات و زکوٰۃ پر منحصر ہوتا تھا۔ یعنی اس دور میں ہماری تہذیبی نفسیات کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ علم حاصل کرنا کسی فرد کا ذاتی فعل ہے۔ دینی علوم کا حصول اس لیے ضروری تھا کہ انسان اپنی عاقبت اور آخرت سنوار سکے۔ جہاں تک معاشرے اور حکومت کا تعلق ہے تو ان صاحب علم اور صاحب کمال افراد کے روز

گار کی ذمہ داری ان پر عاید نہیں ہوتی۔ یہ درست ہے کہ بادشاہ اور نواب مدرسوں کی سرپرستی کرتے ہوئے ان کے لیے بڑی بڑی جاگیریں وقف کر دیا کرتے تھے لیکن یہ ان کی ذاتی مرضی اور صاحب مدرسہ سے ان کے تعلقات پر منحصر ہوتا تھا۔ وہ ایسا کرنے کے لیے کسی قانون یا ضابطے کے پابند نہیں تھے۔

جب انگریز ہندوستان پر قابض ہوئے تو ہماری تہذیب میں تعلیم کا یہی تصور رائج تھا۔ یہ مقامی افراد حصول تعلیم کے بعد معاشرے کے دست نگر بن جاتے تھے۔ اس تعلیمی تہذیب کا تلخ ترین پہلو یہ تھا کہ شام ڈھلتے ہی مدرسوں کے طلبا برتن اٹھا کر ہر گھر کے دروازے پر جاتے تھے اور کھانا اکٹھا کر کے لے آتے تھے۔ جو سب مل کر کھا لیتے تھے۔ ایک اعتبار سے یہ مشق انھیں مستقبل میں روزگار کے حصول کے لیے تیار کرتی تھی۔

انگریزوں کی آمد کے بعد تہذیبی سطح پر ہمارے معاشرے کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ علم اور ہنر کی بنیاد پر ان کو یہ حق بھی مل سکتا ہے کہ حکومتِ وقت ان کے روزگار کے لیے انھیں تنخواہ دے۔ یہی وہ دور تھا جب ہماری تہذیب زرعی دور سے نکل کر صنعتی دور کی طرف مائل ہو رہی تھی۔ تعلیمی پالیسی کا تعین اگرچہ انگریزوں کا کارنامہ تھا لیکن مقامی زبان کو نظر انداز کر کے انگریزی کو مسلط کر دینے سے مشرقی علوم کے عالم ایک لمحے میں جاہل بن گئے۔ اس ضمن میں سرسید کا یہ اقتباس نہایت دلچسپ ہے:

> ''زمانے میں کچھ خفیف تبدل نہیں آیا، بلکہ ایسا تبدل آیا جو آنکھ سے دکھائی دیتا ہے۔ تربیت یافتہ لوگوں نے ہی نہیں بلکہ عام لوگوں نے بھی اس کو بخوبی دیکھا ہے۔ ہم مثالاً اپنے ملک کی بڑی عدالت کا ذکر کرتے ہیں جب کہ صدر عدالت ہائی کورٹ نہیں ہوتی تھی، مشرقی علوم اور مشرقی زبان کے نہایت ذی علم و لائق شخص وکالت کرتے تھے اور ایسے کامیاب وکیل تھے کہ زمانہ ان پر رشک کرتا تھا۔ وہ نام کے مولوی عالم اور مولوی فاضل نہ تھے بلکہ حقیقتاً مشرقی علوم اور مشرقی زبان کے ایسے عالم تھے کہ پنجاب یونی ورسٹی کو ان سے آدھا پیدا کرنا نہایت مشکل ہے۔ دفعتاً سن ۱۸۶۶ء میں صدر عدالت ہائی کورٹ ہو گئی اور یورپین علوم اور یورپین زبان نے اپنا راج کیا۔ وہ بار آور درخت مشرقی علوم اور مشرقی زبان کے جن کی پھننگ آسمان تک پہنچی تھی، اس طرح کملا کر زمین پر گر پڑے جیسے کوئی نیا نازک پودا پالے کے صدمے سے جھلس جائے۔ اب ہائی کورٹ میں جا کر علمائے علوم مشرقی کا حال دیکھو کہ ان پر مکھیاں بھنکتی ہیں۔ نہ وہ اپنی ذات کا کچھ فائدہ کر سکتے ہیں نہ ملک و قوم کا۔''(۲۶)

نوآبادیاتی تعلیمی پالیسی نے فرد کی معاشی اور معاشرتی زندگی دونوں کو متاثر کیا۔ ثقافتی سرگرمیوں میں بھی تبدیلی آئی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''نوآبادیاتی عہد میں کوئی ثقافتی سرگرمی اس جمالیاتی عمل میں تبدیل نہیں ہوتی جو 'بے غرض، بے لوث

اور مقصود بالذات' ہوتا ہے۔لہٰذا استعماری تناظر میں تعلیم ' بے غرض ، بے لوث' نہیں ہوتی ۔۔۔۔استعمار کار کی مٹھی میں بن نوآبادیاتی ثقافت کی روح اس خیال سے کانپتی ہے کہ وہ محکوم، نیٹوز کی تعلیم کو ایک آزاد فکر انسان کی نشو ونما کا ذریعہ بنائے ۔نوآبادیاتی نظام تعلیم کے مقاصد میں دور دور تک یہ مقصد شامل نہیں ہوتا کہ وہ ایک آزاد فکر، اپنی تقدیر کا فیصلہ خود اپنے ثقافتی وسائل اور نفسی آزادی سے کرنے والے انسان کی ذہنی نشو ونما کو ممکن بنائے ۔''(۲۷)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ زبان اردو کی بدولت ہندوستانی تہذیب کو ایک ایسی زمین مل گئی جس پر قدم جما کر وہ ملک کو دساوری انگریزی تہذیب کے کامل تسلط سے بچانے کی آخری کوشش کرتی رہی ۔اس نے انگریزی تہذیب سے بہت کچھ لیا لیکن غلامانہ تقلید کے ذریعے نہیں بلکہ آزادانہ انتخاب کے ذریعے یعنی صرف ان چیزوں کو اخذ کیا جو اس کی طبیعت اور مذاق کے ساتھ کھپ سکتی تھی ۔ ہندوستانی تہذیب کے حامل ہندوؤں اور مسلمانوں نے انگریزی زبان اور جدید علوم کی تحصیل نہ صرف ضرورت کے جبر سے بلکہ دلی شوق سے شروع کی ۔لیکن اپنے ذوق ادب کی تربیت اور اظہار خیال کا ذریعہ اردو کو بنایا۔انھوں نے اپنے اس احساس جمال کی تہذیب کا کام خود اپنے ادب کے سرمایے سے لیا۔

نوآبادیاتی حکمران ہمارے ادارات، ہمارے اخلاق، ہمارے رسم ورواج اور خود ہماری سیرت کے متعلق یا تو بے خبر تھے یا انھیں اس کی پرواہ نہیں تھی ۔ انھوں نے سرکاری عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کے وقت اہلیت اور قابلیت کا کوئی لحاظ نہ کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ یہی لوگ انگریزوں کے نظام حکومت کی بدنامی کا باعث ہوئے ۔مثلاً انگریزوں کی حکومت سے پہلے شریعت اسلامی کی رو سے یہ ضروری تھا کہ جو مسلمان عہدہ قضا پر مامور کیے جائیں وہ علم وفضل اور وقار کے اعتبار سے ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہوں ۔ہیسٹنگز کے زمانے میں عہدے اجارے پر دیئے جاتے تھے اور اس طرح اجارہ دراجارہ کا سلسلہ جاری تھا۔غرض کہ عہدے محض روپیہ سمیٹنے اور مالدار بننے کا ذریعہ بن گئے ۔پہلے عہدے داروں کو ان کی خدمت کا معاوضہ تنخواہ اور جاگیر کی صورت میں دیا جاتا تھا مگر اب اہل مقدمہ سے جنس لی جاتی تھی ۔ پہلے عدالت کا ایک افسر ہوتا تھا جسے داروغہ عدالت کہتے تھے جو ان غریب اور بے سروساماں لوگوں کی دست گیری کرتا تھا جو شہنشاہ اور اس کے وزرا تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے تھے ۔داروغہ عدالت طلوع آفتاب سے لے کر تین بجے سہ پہر تک اپنے فرائض منصبی انجام دیتا تھا۔اگر کسی مقدمہ کا فیصلہ فریقین کی باہمی رضامندی سے نہیں ہوتا تھا تو وہ شہنشاہ یا اس کے وزرا کے لیے جن کے دربار ہفتہ میں دوبار ہوتے تھے 'صورت حال' مرتب کرتا تھا۔جدید حالات میں جو آدمی داروغہ اور فوجدار کے عہدوں پر مقرر کئے جاتے تھے وہ نالائق اور لالچی ہوتے تھے ۔نوآبادیاتی حکمرانوں کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا جاتا تھا، خواہ وہ کسی بھی جرم میں ملوث ہوں، اس سلسلہ میں جانب داری کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔

غرض نوآبادیاتی حاکموں کو صرف اپنے مال بنانے سے غرض تھی، انھوں نے ایسا کوئی نظام یہاں رائج نہ کیا جو ان کے اپنے ملک میں رائج تھا۔ اس سلسلے میں علامہ عبداللہ یوسف علی نے ایسے عنوانات کی ایک فہرست مرتب کی ہے جس سے ان حاکموں کی ناانصافی اور جانب داری ظاہر ہوتی ہے:

''(۱) جو عہدے اعتبار اور ذمہ داری کے تھے ان میں حد سے زیادہ تبدیلیاں ہوتی تھیں۔

(۲) گورنر جنرل کونسل کی کارروائی بہت سست اور طویل ہوتی تھی۔

(۳) نئے حکمرانوں نے لوگوں کو باریابی کا موقع دینے اور ان کی شکایات سننے کے لیے باقاعدہ طور پر اوقات مقرر نہیں کیے۔

(۴) انھوں نے ملک کی تجارت پر قبضہ کر لیا اور ملک کے باشندوں کی معاش کے لئے کوئی وسیلہ نہ باقی رکھا۔

(۵) زمینداروں کو حد سے زیادہ اختیار دیئے جائیں جنھیں وہ اپنی رعایا اور کاشتکاروں پر سختی کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

(۶) گورنر جنرل اور اس کی کونسل اپنے دیگر مشاغل کی کثرت کے باعث اس قدر مصروف رہتے تھے کہ وہ لوگوں کی اپیلوں یا شکائتوں کا جلدی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔

(۷) عہدوں پر ترقی پانے کے لیے ملازمت کی قدامت کے اصول پر عمل کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے قابلیت اور استعداد کا درجہ گھٹ جاتا تھا۔ یہ اشارہ بظاہر کمپنی کے اعلیٰ برطانوی افسروں کی طرف تھا۔

(۸) انگریز نہ صرف اپنے ہم قوموں بلکہ اپنے ادنیٰ ترین متوسلوں کی رعایت کرتے تھے۔

(۹) کلکتہ کی عدالت عالیہ کے ضابطے کے قواعد سے غریبوں اور ناواقف لوگوں کے مفاد کو نقصان پہنچتا تھا۔

(۱۰) جن امور کا تمام لوگوں کے سامنے کھلے دربار میں فیصلہ ہونا چاہیے ان کے متعلق انگریز خانگی طور پر فیصلہ کر دیتے تھے۔'' (۲۸)

نوآبادیاتی حکمران انصاف بھی اپنی پسند کا دیتے تھے، لندن کی ایک رات اور گریز میں اس دور کے سیاسی حالات تو ملتے ہیں لیکن نوآبادیاتی ماحول کی جامع عکاسی اداس نسلیں میں ہوئی ہے، اس ضمن میں عبداللہ حسین ایک گورے کا جو ٹرین میں سفر کر رہا تھا کا واقعہ بیان کیا ہے، جس نے ایک بوڑھے ہندوستانی کو جو اس کے ڈبے میں سوار ہوا تو اسے زبردستی بوٹوں سے مار کر ٹرین کے نیچے گرا دیا، اس گورے کے متعلق مقامی لوگوں کی یہ رائے تھی:

''وہ عدالت میں پیش ہوگا، نعیم نے خفگی سے کہا۔ ضرور ہوگا ضرور ہوگا وہی آدمی بولا! یہ لوگ بڑے

قانون دان ہوتے ہیں لیکن جیوری میں کون ہوگا۔ تمھارا کوئی چچا جیوری میں ہے؟ وہ جانے کے لیے مڑا پھر پلٹ کر نعیم کے پاس آ کھڑا ہوا، یہ سور ہیں تمھیں بتاتا ہوں برخوردار، آج رات کو اپنی بیوی کے پاس سوئے گا میں نے اپنی عمر میں ایسے پچاس سے اوپر واقعات دیکھے ہیں۔ ایسے مقدمات کے لیے سفید جیوری ہوتی ہے، بالکل سفید۔'' (۲۹)

ہندوستانی تہذیب نے مغربی اثرات صرف اس حد تک لیے جہاں تک وہ ہندوستانی فنونِ لطیفہ کو نئی زندگی بخشنے کے لیے ضروری تھے۔ جیسے فن تعمیر میں کفایت مکانی کا اصول۔ خصوصاً خط مستقیم کا زیادہ استعمال اور حفظان صحت کے نظریوں کا لحاظ۔ موسیقی میں روانی کے ساتھ ہم آہنگی کا میل، مصوری میں پرسپیکٹ اور تناسب پر زور۔ اس کے علاوہ گھر کے ساز و سامان روزمرہ کے برتنے کی بے شمار چیزوں، وضع لباس اور ایک حد تک غذا میں بھی ہندوستانی تہذیب نے مغرب کے اثر سے بہت سی تبدیلیاں کیں کو مجموعی طور پر مفید اور صحت بخش تھیں۔ جن سے زندگی کے حسن و لطافت میں نہ سہی مگر نظم وضبط اور مستعدی و کارکردگی میں ضرور اضافہ ہوا۔ البتہ ان تبدیلیوں سے دو بہت بڑے نقصان پہنچے۔ ایک یہ کہ مفلس ہندوستانی خوشحال انگریز کے معیار زندگی کو اختیار کر کے مالی مشکلات میں مبتلا ہو گئے اور دوسرا یہ کہ نئے فیشن کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یورپ کے ملکوں اور انگلستان سے اشیا کی برآمد روز بروز بڑھنے لگی اور ملک کی دولت کھنچ کر باہر جانے لگی۔

مختصراً یہ کہ ہندوستانی تہذیب نوآبادیاتی نظام کے تحت حکومت کی سرپرستی سے محروم اور اونچے طبقوں کی نظر میں حقیر ہو گئی تھی۔ اور اس کے لیے ترقی و توسیع کی راہیں بند ہو گئی تھیں۔ پھر بھی اس کے اندر اتنی قوت حیات موجود تھی کہ اس نے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق بنالیا اور اچھے خاصے بڑے حلقے میں مقبول رہی۔ مگر یکا یک زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ خود اس کے اندر سے انتشار کی قوتیں ابھر آئیں اور ایسا نظر آنے لگا کہ کہ وہ کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر مشترک تہذیب کی حیثیت سے فنا ہو جائے گی۔ جس کا اظہار ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے وقت کے تنازعات، تہذیبی تصادم اور تقسیم ملک کی صورت میں ہوا۔

فصل دوم

متذکرہ ناولوں کے اسالیب پر تہذیبی و نو آبادیاتی اثرات

تکنیک:

تینوں ناولوں میں تکنیک کے لحاظ سے الگ الگ خوبیاں ہیں، کسی مصنف نے کسی ایک پہلو کو نمایاں کیا ہے تو کسی نے دورے کو، تینوں ناولوں کے تکنیکی تجربات کا محاکمہ کریں تو کچھ اس طرح کی صورت حال سامنے آتی ہے۔

لندن کی ایک رات:

ان تینوں ناولوں میں لندن کی ایک رات تکنیک کے لحاظ سے دلچسپ ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ گریز اور اداس نسلیں ناول کی فنی تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ ان کی ضخامت ناول نگاری کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ لیکن لندن کی ایک رات سجاد ظہیر کی ایسی تحریر ہے جس کے لیے وہ خود فیصلہ نہ کر سکے کہ اسے ناول کہیں یا افسانہ۔ لہٰذا انھوں نے مندرجہ ذیل نوٹ لکھ کر یہ کام نقاد اور قاری پر چھوڑ دیا کہ وہ اسے جو چاہے سمجھیں:

> ''اس کتاب کو ناول یا افسانہ کہنا مشکل ہے۔ یورپ میں ہندوستانی طالب علموں کا ایک رخ اگر دیکھنا ہو تو سے پڑھیے۔ اس کا بیشتر حصہ لندن، پیرس اور ہندوستان واپس آتے ہوئے جہاز پر لکھا گیا۔ آج اسے دو سال سے زیادہ ہو گئے۔ اب میں اس مسوّدہ کو پڑھتا ہوں تو اسے چھاپتے ہوئے رکاوٹ ہوتی ہے۔ یورپ میں کئی برس طالب علم کی حیثیت سے رہ چکنے کے بعد، اور تعلیم ختم کرنے کے بعد، چلتے وقت پیرس میں بیٹھ کر چند مخصوص جذباتی کش مکش سے موثر ہو کر سو ڈیڑھ سو صفحے لکھ دینا اور بات ہے اور ہندوستان میں ڈھائی سال مزدوروں، کسانوں کی انقلابی تحریک میں شریک ہو کر کروڑوں انسانوں کے ساتھ سانس لینا اور ان کے دل کی دھڑکن سننا دوسری چیز ہے۔ میں اس قسم کی کتاب اب نہیں لکھ سکتا اور نہ اس کا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔''
>
> سجاد ظہیر
>
> وزیر منزل، لکھنؤ
>
> ۱۵/دسمبر۔ ۱۹۳۸ء'' (۳۰)

چنانچہ بعض نقادوں نے اسے ناول کہا، بعض نے طویل افسانہ اور کچھ نے 'ناولٹ' کہہ کر اس تحریر کی صنف متعین کر دی۔ لندن کی ایک رات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ابتدائی چند صفحات سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم مختصر

افسانے کے بجائے ناول پڑھ رہے ہیں۔لیکن ناول کے خاتمے پر ایک جھٹکا لگتا ہے کہ یہ ناول نہیں بلکہ طویل مختصر افسانہ اور ناول کے بیچ کی کوئی شے ہے۔لیکن سجاد ظہیر نے اپنے رپوتاژ 'یادیں (۱۹۴۰ء) میں لکھا ہے کہ پیرس میں اپنے قیام کے دوران ان کا زیادہ تر وقت لندن کی ایک رات لکھنے میں صرف ہوتا اور وہ چاہتے تھے کہ اس ناول کو ختم کر لیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سجاد ظہیر ناول ہی لکھنا چاہتے تھے لیکن لندن کی ایک رات کی تکمیل پر انھیں احساس ہوا کہ یہ تحریر ناول کی تعریف پر پوری نہیں اترتی۔سجاد ظہیر یقیناً ناول کے فن سے واقف ہوں گے خورشید الاسلام نے ناول کی تعریف یوں کی ہے:

''ناول میں زندگی کے مسائل افراد کے ذریعے سے پیش کئے جاتے ہیں۔اور وہ ایک خاص نقطے پر پہنچ کر حل ہو جاتے ہیں اور اس طرح ہمیں اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ زندگی محض طوائف الملو کی نہیں ہے،اس میں ایک ڈھیلا ڈھالا نظم بھی ہے۔ناول میں تسلسل اور ربط،یعنی وقیع ہیئت کا ہونا ضروری ہے۔ناول،داستانوں کے برعکس افراد کی اندرونی زندگی میں تبدیلیوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ناول میں مافوق الفطرت عناصر کی گنجائش نہیں ہے اگر چہ کبھی کبھی ناول نگار ایسے کردار بھی پیش کر دیتے ہیں جو انتہائی طور پر پُر اسرار ہونے کے باعث آسمانی معلوم ہوتے ہیں۔لیکن اگر ان میں زندگی کی گہری صداقت نہیں تو وہ ناول میں نقص پیدا کر دیتے ہیں۔ناول میں ایک کہانی سے دوسری اور دوسری سے تیسری کہانی پیدا نہیں ہوتی۔ناول کا منشا زندگی کو اس کے اجزا کے باہمی تعلق کے ساتھ،اس طرح پیش کرنا ہوتا ہے کہ اس میں کرداروں کی شخصیت زندہ ہو جائے اور ان کرداروں میں کسی ایسے کردار کا ہونا ضروری ہے جو زندگی کے داخلی ربط اور مفہوم کی نمائندگی کرتا ہو۔''(۳۱)

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ناول کی ضخامت کا تعین نہیں کیا جا سکتا اور دیگر وہ تمام خوبیاں لندن کی ایک رات میں موجود ہیں،جو ناول کی تعریف پر پوری اترتی ہیں۔دوسری بات یہ کہ اس دور میں ناول یا افسانہ کی اصطلاح رائج تھیں،ناولٹ کی اصطلاح بہت بعد میں رائج ہوئی۔اس لیے اسے بعض نقادوں نے متنازع بنا دیا۔

لندن کی ایک رات پہلا ناول ہے جس میں شعور کی رو کے بعض عناصر ملتے ہیں اور یہ کہ قرۃ العین حیدر سے پہلے سجاد ظہیر نے شعور کی رو کا تجربہ کیا۔ناول نگاری کے بہت سے طریقے اور انداز ہیں۔ان میں سے ایک طریقہ یا تکنیک کو 'شعور کی رو' کی تکنیک کہا جاتا ہے۔جس طرح ناول کا آغاز اور ارتقا مغرب میں ہوا اسی طرح سے اس تکنیک کی ابتدا بھی مغرب ہی میں ہوئی اور اردو ناول اور افسانہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

افسانوی ادب کے نقاد اس سے متفق ہیں کہ اس تکنیک کو آگے بڑھانے کا باعث پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم ہے اور ان سے پیدا ہونے والی تباہی و بربادی ہے۔کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے ڈورتھی رچرڈسن (Dorothy

(Miriam مریم ہینڈرسن معلّمہ ایک انگریز میں (Pilgrimage) نے اپنے ناول پِلگریمیج Richardson) Henderson) کے کردار کو پیش کیا۔(۳۲)

یہ پہلی خاتون ناول نگار تھی جس نے اپنے کردار کے ذہن کو پہلی بار انتہائی تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔ یہ ناول بہت مقبول تو نہ ہوسکا لیکن اس نے دوررس اثرات ضرور ڈالے۔ کچھ ہی عرصے بعد جیمز جوائس نے اپنا شہرہ آفاق ناول یولیسس (*Ulysses*) لکھا۔(۳۳)

اس نے ناول نگاری کا رخ موڑ دیا۔ اس ضمن میں بہت سے نام لیے جاسکتے ہیں لیکن سب سے اہم نام ورجینا وولف کا ہے۔ اس قبیل کے ناول نگاروں نے جہاں زبان کا تجربہ کیا وہاں کردار کی نئی پیش کش کا بھی تجربہ کیا۔ یہ ناول نگار کردار کے ذہن کو تمام افعال، اعمال، واقعات، سانحات اور ماضی، حال اور مستقبل سب کا منبع سمجھتے ہیں اس لیے ان میں سے بعض سیدھے کردار کے ذہن میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ ان فن کاروں کا ذہنی پس منظر یورپ کا نشاۃ الثانیہ، صنعتی انقلاب، امریکی انقلاب، فرانسیسی انقلاب، روسی انقلاب اور جمہوریت ہیں۔ ڈارون کے مسئلہ ارتقا، فرائیڈ کے نظریات اور جدید نفسیات کے ماہر یونگ اور ایڈلر سے یہ زیادہ متاثر ہیں۔ جب کہ کارل مارکس سے کم سے کم متاثر ہیں۔ مختصر طور ان کی ذہنی فضا ایک ایسے انسان کی ہے جو اپنا شمار جانوروں میں کرتا ہے۔ جو یہ سمجھتا کہ انسان خلاصہ کائنات بالکل نہیں بلکہ ایک اندھی مشیت کا تابع ہے۔ وہ بغیر کسی مقصد کے پورا ہوتا ہے اور بغیر کسی بڑے مقصد کے عمر طبعی کو پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ افراد اور معاشرہ ایک 'بے حس ہجوم' سے زیادہ اس کے لیے کچھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال سے یاس، ناامیدی، تنہائی اور درد و کرب ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ انسانی زندگی کا خلاصہ ان فن کاروں کے نزدیک ان فن کاروں کے نزدیک یہی ہے۔ جب کہ آس، تمنا، معاشرت اور خواہش مسرت کو انسان کی سرشت میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اگر آپ مذہب اسلام پر نظر رکھیں تو خیر پسندی اور خیر جوئی اور اس کی استقامت ہی خدمت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں انسانی جسم میں ذہن کی سب سے بڑی اہمیت ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ انسانی ذہن شعور، تحت الشعور اور لاشعور میں بٹا ہوا ہے۔ یقیناً ذہن کے یہ تینوں طبقے انسان کی شخصیت کو متاثر کرتے ہیں لیکن زیر بحث فن کار لاشعور پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ شعور کا عمل بھی ان کے نزدیک ہمہ وقت لاشعور سے متاثر ہوتا ہے اور یہی نظریہ انسان کو کشاں کشاں شعور کے اس ظہور کی طرف لے گیا جو بظاہر منتشر و پراگندہ اور بے ترتیب ہے۔ جدید نفسیات کا کہنا ہے کہ انسانی ذہن کسی وقت بھی جامد نہیں ہوتا۔ سوتے جاگتے اس کا عمل جاری رہتا ہے۔ ان فن کاروں نے انسانی ذہن کی بیداری اور خفتگی دونوں کی عکاسی کی ہے۔ خفتگی کی صورت میں خواب، فن کار کی سب سے زیادہ مدد

کرتا ہے۔اور بیداری کی حالت میں شعور کی رو، ان فن کاروں کو اپنی عکاسی پر سب سے زیادہ آمادہ کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے پیش کردہ کردار بالعموم عدم رتسلسل خیال کی تصویر پیش کرتے ہیں جو کہیں قاری کی سمجھ میں آتی ہے اور کہیں سمجھ میں نہیں آتی اور کبھی کبھی تو بالکل لایعنی ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی ذہن میں ایک خیال آتا ہے اور ابھی اس کی تکمیل نہیں ہو پاتی کہ دوسرا خیال اس کی جگہ لے لیتا ہے اور اس طرح سے یہ سلسلہ لامتناہی ہو جاتا ہے۔یہاں یہ بات قابل تعریف ہے کہ زیر بحث فن کاروں نے انسانی ذہن کی انتہائی پُر پیچ تصویر پیش کی ہے۔بعض نقادوں کے مطابق انھوں نے تلوار کی دھار پر چلنے کی کوشش کی ہے۔لیکن آخری تجزیے میں کہنا پڑتا ہے کہ اس میں وہی فن کار کامیاب ہوتا ہے جو بے ترتیبی میں ایک ترتیب پیش کر سکتا ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 'شعور کی رو' یقیناً اسی طرح کام کرتی ہے تاہم انسان کا تعقل ہمیشہ اس کی مدد کرتا ہے۔اگر تعقل مدد نہ کرے تو پھر انسانی ذہن اور حیوانی ذہن میں کوئی فرق نہ رہے۔چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ کامیاب فن کار شعور کی رو پر بندش، تعقل ہی کے ذریعے لگاتا ہے۔جہاں جہاں یہ ممکن ہو سکا ہے وہاں وہاں افسانوی ادب کے انتہائی کامیاب فن پارے ظہور میں آئے ہیں۔لیکن جہاں جہاں شعور کی رو ہر چیز کو اپنے سیلاب میں بہا کر لے جاتی ہے وہاں انتشار کے علاوہ کچھ نہیں رہتا۔یہاں تک کہ کہانی، پلاٹ، کردار اور فضا بھی باقی نہیں رہتے اور ہمیں یہ کہنے میں تامل ہوتا ہے کہ ناول یا افسانہ، ناول یا افسانہ ہے بھی یا نہیں۔ناول یا افسانے کی پیش کش کے لیے مختلف طریقے آزمائے ہیں۔ان میں چار طریقے زیادہ اہم ہیں۔

۱۔بلاواسطہ داخلی کلام (Direct interior monologue)

۲۔بالواسطہ داخلی کلام (Indirect interior monologue)

۳۔ہمہ بین و ہمہ دان مصنف کا بیان (Ominiscient Author's description)

۴۔خود کلامی (Soliloquy)

شعور کی رو پیش کرنے کا اہم ترین ترقی یافتہ طریقہ بلاواسطہ داخلی کلام ہے۔بلاواسطہ داخلی کلام ہمیشہ واحد متکلم میں ہوتا ہے۔کردار اپنا ذہن خود پیش کرتا ہے۔مصنف اس میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔نہ کوئی تشریح پیش کرتا ہے نہ وضاحت۔بعض اوقات یہ خیالات انتہائی نجی ہوتے ہیں اور ان کی حدیں لاشعور سے ملی ہوتی ہیں۔ایسی حالت میں مصنف کو بعض اوقات ایسے اشارے استعمال کرنے پڑتے ہیں جن سے یہ خیالات سمجھ میں آسکیں۔(۳۳)

سجاد ظہیر نے لندن کی ایک رات میں شعور کی رو کا سب سے موثر اور فن کارانہ طریقہ 'بلاواسطہ داخلی کلام' اپنایا ہے۔پہلے باب کے دوسرے ہی صفحے سے 'بلاواسطہ خود کلامی' شروع ہو جاتی ہے۔

''چھ بج کے دس منٹ ہو گئے۔ رسل اسکوائر کے 'انڈر گراؤنڈ اسٹیشن' کی گھڑی پر بار بار اعظم کی نظر جاتی ہے۔' کم بخت آج پھر وعدہ کر کے معلوم ہوتا ہے نہیں آئے گی۔ یہ پہلی بار نہیں ہے۔ مجھے اپنی حالت پر خود شرم آتی ہے۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ ذرہ برابر بھی میرا خیال نہیں کرتی، مگر میں ہوں کہ اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ آخر لندن میں اور بہت سی لڑکیاں ہیں اور میں کچھ ایسا بدصورت بھی نہیں، مگر میں اس قدر کمزور ہوں۔ مجھے اپنے اوپر ذرا بھی قابو نہیں۔ کتنی دفعہ ارادہ کر چکا ہوں کہ اس سے ملنا چھوڑ دوں، اس سے بات تک نہ کروں، سڑک پر ملے تو دوسری طرف منہ پھیر لوں اور اگر وہ خود میرے پاس اپنی مرضی سے آئے تو صاف کہہ دوں 'چلی جا میرے پاس سے اگر مجھ سے تجھے محبت نہیں تو کیوں میرے پاس آتی ہے۔ کوئی اور عاشق ڈھونڈ۔۔۔۔ اس طرح میں اس سے بدلہ لوں۔''(۳۵)

اسی کیفیت میں اعظم گذشتہ دنوں کی باتیں دہرانے لگتا ہے (حال سے ماضی میں پہنچ جاتا ہے) اور یہ سلسلہ ساتویں صفحے تک چلتا رہتا ہے۔ تبھی مصنف کو خیال آتا ہے کہ یہ خود کلامی خاصی طویل ہوگئی ہے، ایسا نہ ہو کہ قاری اُکتا جائے۔ اس احساس کے ساتھ مصنف ماضی یا فلیش بیک سے ہٹ کر حال میں آ جاتا ہے۔

''ہلو اعظم! تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ انڈر گراؤنڈ اسٹیشن سے راؤ نکلا اور اس نے اعظم کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ راؤ کے اس طرح یک بارگی آ جانے سے اعظم کے دل کو فوراً سکون ہو گیا۔ جس طرح رنج و اذیت کے وقت رونے سے جی ہلکا ہو جاتا ہے اسی طرح اس وقت اعظم کا خیال، جو صرف ایک نقطے پر جم کر اس کے دل میں ناسور کی طرح چبھنے لگا تھا، اب دوسری طرف بٹ گیا۔ راؤ اس کا دوست تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ راؤ کو کیا جواب دے۔''(۳۶)

مصنف جانتا ہے کہ اعظم ریلوے اسٹیشن پر موجود ہے لیکن اس کا ذہن کہیں اور ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جب فن کار یا مصنف شعور کی رو پر تعقل کے ذریعے بندش لگاتا ہے۔ سجاد ظہیر نے ایسا ہی کیا۔ اعظم جو اسٹیشن پر انگریز لڑکی جین کا انتظار کر رہا ہے اور انتظار کرتے کرتے اس کے شعور میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے، گزرے ہوئے دنوں کی باتیں اس کے ذہن میں گردش کرنے لگتی ہیں، اِدھر اُدھر کی باتیں یکے بعد دیگرے آتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی خارجی دنیا کی طرف بھی اس کا ذہن منتقل ہو تا ہے۔ کبھی گھڑی پر نظر جاتی ہے اور کبھی اخبار کی دکان پر۔ اسٹیشن کے باہر اخبار بیچنے والوں کی آوازیں اس کے خیال کو منقطع کر کے ذہن کو کبھی ماضی اور کبھی حال میں لانے کا کام انجام دیتی ہیں اور اس کیفیت کو پڑھنے والا بھی پنڈولم کی طرح اِدھر سے اُدھر آتا جاتا رہتا ہے۔ حال سے ماضی، ماضی سے حال اور پھر اچانک 'چابی یا بیٹری' ختم ہو جانے سے پنڈولم جس طرح رک جاتا ہے اسی طرح شعور کی رو بھی تھم جاتی ہے۔ یہ تھمنا رو کی حرکت ختم ہونے کے باعث نہیں بلکہ رکاوٹ (تعقل کا پاسبان) کے سبب ہوتا ہے۔ کیونکہ سمجھ دار مصنف نہیں چاہتا کہ قاری ان غیر مربوط خیالات میں الجھے اور دب کر رہ جائے۔

لندن کی ایک رات میں 'تعقل کا پاسبان' شعور کی رو کے ساتھ ساتھ ہے یہی وجہ ہے کہ اردو میں شعور کی رو کی نمائندگی کرنے والی دوسری تحریروں کے مقابلے میں یہاں محشر خیالی نسبتاً کم ہے۔ محض اس لیے کہ کرداروں کے لاشعور کے ساتھ مصنف یا فن کار کا شعور بھی ہمراہ ہے۔ محض اس لیے کہ کرداروں کے لاشعور کے ساتھ مصنف یا فن کار کا شعور بھی ہمراہ ہے۔ کرداروں کا خالق جانتا ہے کہ انھیں کب، کیا اور کتنا کہنا ہے۔ لندن کی ایک رات میں ایسے ان گنت مواقع آئے ہیں جب غیر مربوط خیالات یا انتشار ذہنی کا سلسلہ صفحہ درصفحہ پھیلتا نظر آتا ہے مگر خود کلامی دراز ہوئی، ایسا معلوم ہوا کہ قلم کی روشنائی خشک ہوگئی نتیجۃً بات آگے نہ بڑھ سکی۔

ایک عرصے سے یہ بات کہی جارہی ہے کہ لندن کی ایک رات سے اردو ناول نگاری میں 'شعور کی روٗ' کی تکنیک سب سے پہلے متعارف ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سجاد ظہیر ایسے پہلے فن کار ہیں جنھوں نے لندن کی ایک رات (سال تصنیف ۱۹۳۶ء) سے پہلے بھی اپنے افسانوں (انگارے، سال تصنیف ۱۹۳۲ء) کو پیش کیا۔ اس طرح انھوں نے ابتدا ہی سے مروجہ روایتی کہانی سے بغاوت کی، انگارے میں سجاد ظہیر کے پانچ افسانے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے انگلستان میں ایک ڈرامہ بیمار (سال تصنیف ۱۹۳۶ء) لکھا۔ ڈرامہ کے بعد لندن کی ایک رات تحریر کیا۔ ظاہر ہے لندن کی ایک رات میں 'شعور کی روٗ' کی تکنیک سجاد ظہیر کا پہلا تجربہ نہ تھی بلکہ اس سے چار سال پہلے وہ اپنے افسانوں میں اس تکنیک کو برت چکے تھے۔ اور انگارے کی مقبولیت نے یہ بتا دیا تھا کہ اردو شعر و ادب کا قاری کسی گنبد میں بند نہیں ہے۔ وہ تازہ ہوا میں سانس لیتا ہے۔

سجاد ظہیر لندن کی ایک رات میں ایسے کئی مشکل مقامات سے گزرے ہیں۔ ان میں سے ایک مثال اعظم کے خیالات کی رو اور خود کلامی کی ناول کے باب چہارم میں ہے۔ یہ خاصی طویل رو ہے اس لیے اس کو پورا تو پیش نہیں کیا جاسکتا البتہ چند اہم موڑوں کی صرف نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اصل سچوایشن یہ ہے کہ راؤ اور اعظم، نعیم کی پارٹی سے واپس باتیں کرتے ہوئے آرہے ہیں پھر وہ ایک مقام پر پہنچ کر جدا ہوتے ہیں اور اپنے اپنے گھروں کو چل دیتے ہیں۔ اعظم اپنے کمرے میں پہنچ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور ہندوستان کے شہر حیدرآباد کی تاریک گلیوں کے بارے میں سوچتا ہے۔ اسے اپنے دوستوں کے ساتھ گزارا ہوا وقت یاد آتا ہے اور وہ خوشی محسوس کرتا ہے۔ پھر اسے اپنے دوست بشمبھر کا خیال آتا ہے کہ اس کا اور میرا انجام کیا ہوگا۔ پھر اپنی چھوٹی بہن کے بارے میں سوچتا ہے:

> ''جس کا سن کوئی بارہ برس کا ہوگا۔ اس ہفتے گھر سے اس کا خط آیا تھا۔ جس میں لکھا تھا ہم سب کو آپ کے آنے کا بڑا انتظار ہے۔ امی بھی ہر وقت آپ کی کامیابی کی دعا کیا کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ انھوں نے آپ کے لیے بڑی اچھی دلہن چنی ہے۔ اس کا خیال پھر آج شام کے واقعات کی طرف لے گیا۔ اور

پھر سے اپنی محبت کی ابتدا یاد آئی۔'' (۳۷)

دیکھا جائے تو ان چند منٹوں کے دورانیہ کے اس خیال کی رو میں کتنے منظر بدلے ہیں۔ کیسے ایک سچوایشن سے ذہن دوسری طرف رخ کر لیتا ہے۔ حال سے ماضی، ماضی سے ایک دم مستقبل، پھر ماضی اور پھر لمحہ موجود، کیسے کیسے اچانک موڑ آتے ہیں۔ اور پھر آخر میں تو یہ حالت ہے:

''جین تم یہاں کہاں؟ تم اور پیرس؟ آج تمھیں میرے پاس آنے کی چھٹی کیسے مل گئی؟ کیا میری امی جان کے ڈر کی وجہ سے تم میرے پاس نہیں آتی تھیں؟ بے وقوف لڑکی! میرے پاس بہت روپے ہیں۔ میں اپنے والدین کا محتاج نہیں۔ تم نے کپڑے کیوں اتار ڈالے؟ تمھیں سردی نہیں لگتی؟ آؤ شطرنج کھیلو گی میرے ساتھ۔ یہ باجہ کتنے زوروں میں بج رہا ہے۔ مجھے پسند نہیں۔ اب تم واپس تو نہ جاؤ گی۔ یہیں رک جاؤ۔ اب کبھی میرے پاس سے نہ جانا۔ یہ میری چھوٹی بہن ہے۔ اس سے تو مل لو۔'' (۳۸)

دیکھئے کہاں لندن، کہاں ایک دم پیرس۔ ہندوستان میں رہنے والی ماں اور بہن سب ایک دم پیرس میں۔ پیرس کے ریڈ لائٹ ایریا میں عریاں عورتوں کا خیال جین کے کپڑے اترنے میں ڈھل جاتا ہے۔ پھر پیرس کی روشن رات سے لکھنؤ کی تاریک گلی میں رات کو کھیلی جانے والی شطرنج، نعیم کی پارٹی میں بجنے والا باجہ (یعنی پھر لندن واپسی) اور پھر یکا یک ہندوستان جہاں اعظم کی بہن رہتی ہے۔ جین کو اس سے مل لینے کی تاکید کرتا ہے۔ سب کچھ واضح طور پر سامنے ہے۔ حقیقتاً نہ اس صورت حال کی وضاحت ضروری ہے اور نہ حاشیہ آرائی۔ البتہ اس عمل کی سائنسی توضیح کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے۔ وقت اور جگہوں کے اس تیز رفتار ادغام کو انسانی ذہن میں ماہرین نفسیات نے آزاد مانا ہے اور اسے (Free Transformation) آزادانہ ادغام کہا ہے۔ اس آزادانہ ادغام کی بنیاد دراصل انسانی ذہن کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ وقت اور جگہ کی قید سے بے نیازانہ کبھی وقت کے حوالے سے جگہ اور کبھی جگہ کے حوالے سے وقت کے درمیان آزاد تعلق (Free Association) قائم کرتا رہتا ہے چنانچہ اس آزاد تلازمۂ ذہن (Mental Free Association) کے عمل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لکھنے والوں نے شعور کے سفر اور اس کی خلوت (Movement and Privacy) کو اس طور پر قلم بند کرنے میں کامیابی حاصل کر لی کہ لمحۂ موجود کا آزاد تلازمہ اور ماضی کے تجربات میں ایک ربط کی کیفیت ممکن ہو گئی۔

سجاد ظہیر نے لندن کی ایک رات میں ان تمام عناصر سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ بہت سے نقادانِ فن نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی کہ لندن کی ایک رات کا اختصار، جسے کبھی طویل افسانہ کہا گیا اور کبھی ناولچہ، شعور کی رو کی تکنیک کے ساتھ دوسری (Devices) یعنی تلازمہ خیال، خاموش خود کلامی، بلند خود کلامی کے استعمال کے سبب اپنے اختصار میں کتنی وسعتیں اور پنہائیاں رکھتی ہے۔ اس پہلو پر خاص طور پر توجہ دینے کے لیے وقت اور جگہ کے آزادانہ ادغام کو سجاد

ظہیر نے کافی برتا ہے۔یوں بھی کردار کے ذہن یا شعور کی رو میں اشاروں، کنایوں اور جھلکیوں کے سبب اختصار میں جو پھیلاؤ ہوتا ہے وہ بیانیہ میں ناولوں اور کہانیوں میں منظر کشی، کردار نگاری اور واقعات کی تفصیل وغیرہ کی طوالت کی کمی کو پورا کرتا ہے۔اس لیے یہ لازمی نہیں ہے کہ شعور کی رو میں لکھے جانے والے ناول بھی بیانیہ کی طرح طویل اور دبیز ہوں۔

لندن کی ایک رات میں لمحۂ موجود کی معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی اور سیاسی فضا سے لے کر ماضی کے طویل عرصوں بلکہ مدتوں تک کی ان ہی کیفیات اور حالات کو سامنے لایا گیا ہے۔لندن ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی تاریخ کے حوالے سے بیک وقت برطانوی سامراج کی چیرہ دستیوں اور ان کی تعلیم وتہذیب کے پھیلاؤ کے اچھے اور برے یعنی مثبت اور منفی اشارہ بنتا ہے۔اگر صفحات کی محدود تعداد کے باوجود ہم یہ سب کچھ جان کر اٹھتے ہیں تو پھر سجاد ظہیر کے اس ناول کی اور خود ان کی اپنی کامیابی میں شک وشبہ کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔

گریز:

عزیز احمد تکنیک کے سلسلے میں کس قدر الڈس ہکسلے (Aldos Huxley) سے متاثر ہیں۔ہکسلے کی طرح ان کے بھی ناولوں میں وقت اور مقام کی ان حدود کر ختم کر کے وہ ایک دل فریب اور جاذب تکنیک پیش کرتے ہیں اس تکنیک کی خوبی یہ ہے کہ وقت اور مقام کا تسلسل بالکل ٹوٹ جاتا ہے کوئی واقعہ پیش کرتے ہوئے یا کسی کردار کا ذکر کرتے ہوئے منظر کو یوں بدل دیتے ہیں کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔محمد حسن عسکری نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ماضی اور وقت کے احساس کے معاملے میں بھی عزیز احمد اردو افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔کشن پرشاد کول نے بھی ان کی حقیقت نگاری کو سراہا ہے۔

> ''مصنف کو حقیقت نگاری کا سلیقہ اچھا ہے۔ناول کا ہیرو مسٹر نعیم کے کردار کی نقشہ کشی بھی خوب ہے، کردار فرضی یا مصنوعی نہیں بلکہ جیتا جاگتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ وہ آدمی نکما ہے مگر جہاں تک تصویر کا تعلق ہے وہ سچی ہے اور یہی فن کاری ہے۔''(۳۹)

جو فلسفہ ای ایم فاسٹر (E.M.Foster) نے (*A passage to India*) میں پیش کیا ہے وہی ہمیں گریز میں ملتا ہے۔فاسٹر نے ہندوستان اور انگلستان کی دونوں قوموں کا مطالعہ کیا تھا اس کا خیال تھا کہ دونوں کے افراد رنگ ونسل کی قیود سے آزاد ہو کر انسان دوستی کا سہارا لے کر ایک دوسرے کے قریب آجائیں اور دونوں مل کر اس نسلی امتیاز کے خلاف احتجاج بلند کریں۔عزیز احمد نے بھی گریز میں نعیم، ہروشا، جمیز کراکسلے اور میری پاول کے تعلقات سے اس فلسفے کی تصدیق کی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جب تک نسلی امتیاز قائم رہے گا نفرت کا وجود قائم رہے گا اور ایسی حالت میں جو لوگ انسان دوستی کا نعرہ لگاتے ہیں اس میں صداقت نہیں ہو سکتی لیکن عزیز احمد کا ہیرو چونکہ ایک غلام ملک کا باشندہ تھا۔انگلستان کے مختلف

لوگوں سے مل کر جب اسے نسلی امتیاز کے تجربے ہوتے ہیں تو نفرت کے ساتھ وہ احساس کمتری میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس کا یہ شدید احساس کہ وہ ایک غلام ملک کا باشندہ ہے اسے بے حد مایوس کرتا ہے۔ پھر بھی عزیز احمد نے تمام مشرق اور مغرب کی اور مختلف نسلوں کی دوستی پر زیادہ زور دیا ہے۔ اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ خارجی داخلی معاملات کو پوری وسعت اور پورے توازن کے ساتھ مل کر سیاہ اور سفید کے نسل فرق کو جب تک بالکل ختم نہیں کر دیا جائے گا اس وقت تک نہ تو وہ مکمل ہے اور نہ انسان دوستی ہی قائم رہ سکتی ہے۔ مجموعی طور پر گریز ایک کرداری ناول ہے جس میں ایک مخصوص کردار بدلتے ہوئے ماحول سے گذرتا ہے۔

عزیز احمد نے گریز میں شعور کی رو کو باضابطہ نہیں برتا۔ تاہم قاری کو بعض مواقع پر اس کا احساس ہوتا ہے۔ بلقیس کی یاد نعیم کے ذہن پر بار بار دستک دیتی ہے۔ اس کی ذہنی اور نفسیاتی غمازی کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''موٹر کا سفر، حادثہ، مسافر بنگلے میں رات، بند کمرہ، دروازے بند، باہر حفاظت کے لیے آدمی، حادثہ کا پہلا تصور کہ میں زخمی ہوں اور بلقیس تیمارداری کر رہی ہے پھر بلقیس زخمی ہوگئی اور میں تیمار داری کر رہا ہوں۔'' (۴۰)

شعور کی رو کے علاوہ ڈائری اور مکتوبات کی ہیئت (Form) کو بھی عزیز احمد نے گریز میں اپنایا ہے۔ جس کے باعث ناول کے تاثر میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے۔ کیونکہ موضوعات کے پیش نظر ہیئت کی تبدیلی بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔

''نعیم کا خط:

''محترمہ چچی صاحبہ!

تسلیم عرض۔ آپ کی شکایت بالکل بجا کہ میں نے آپ کو ایک عرصے سے خط نہیں لکھا۔ لیکن اس درمیان میں آپ کا بھی تو کوئی شفقت نامہ نہیں آیا۔ میں ان دنوں کام میں زیادہ مصروف رہا۔ یہ ابتدائی زمانہ ہے اور ہر چیز نئی ہے۔ اب اگر پ کا حکم ہو تو میں اور زیادہ پابندی سے خط لکھا کروں۔

مجھے آپ اور آپ کی سب عنایتیں بہت یاد آتی ہیں اور آپ کے خط سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ آپ سب کی وجہ سے مجھے اپنے وطن سے کتنی گہری محبت ہے۔

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ بلقیس اب جونیر کیمبرج کی تیاری کر رہی ہے اور اس کے بڑے اچھے پیام آرہے ہیں۔

پھر بھی مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر میری واپسی تک بلقیس کی شادی ملتوی رہے۔ آخر مجھے بھی تو بلقیس کی شادی میں شرکت کا حق ہے۔

اس سلسلے میں آپ بلقیس کی رائے بھی لے لیجئے گا۔عاقل چچا کو بہت بہت سلام۔

آپ کا خادم، نعیم۔"(۴۱)

عاقل خاں کا جواب:

"عزیز و نورچشم، پارۂ جگر نعیم سلمہٗ اللہ تعالیٰ

خدا تمھیں عمر دراز اور مرتبہ بلندی عطا فرمائے اور اس کفرستان میں نیک ہدایت سے۔ تمھیں دختِ رز اور لحمِ خنزیر اور رزنا و ریا سے محفوظ رکھے۔ کفر کی بستی میں تمھارے ایمان اور اسلام کو توانا اور برقرار رکھے۔ آمین۔

تمھارا نوشتہ مکتوب بنام تمھاری چچی کے موصول ہوا جو انھوں نے میری نظر سے بھی گزرانا۔ جس کو دیکھ کر مجھے تمھاری ہوشیاری اور فراست کا یقین ہوا اور بڑی مسرت ہوئی۔

تم نے بلقیس کے متعلق جو کچھ لکھا اگر اس کا مطلب وہی ہے جو تمھاری چچی سمجھیں تو انھوں نے مجھے سمجھایا تو تم اطمینان رکھو اور مطالعۂ کتب اور اپنے کام میں دل لگاؤ۔ خدا تمھیں ہر طرح کے شر اور لالچ سے محفوظ رکھے۔ خصوصاً میموں کے جال سے۔ ان کا جادو ایسا ظالم ہوتا ہے جیسے بنگالہ جس کا ذکر کتابوں میں موجود ہے۔ خدا تمھیں خوش رکھے۔

تمھارا چچا، عاقل عفی عنہٗ"(۴۲)

یہ خط و کتابت ایک طرح کی نسبت طے ہونے والی بات ہے، پھر نعیم جب ان سے غافل ہو جاتا ہے اور خط لکھنا بند کر دیتا ہے تو خانم ایک تادیبی خط لکھتی ہے جس میں کئی آنے والے رشتوں کا ذکر کرتی ہے، نعیم کی انا کو ٹھیس لگتی ہے تو وہ انھیں جلانے کے لیے ایلس کے ساتھ اپنی تصاویر بھیج دیتا ہے۔

عزیز احمد نے گریز میں جنسی حقیقت نگاری کو پیش کرنا اپنا شعار بنایا ہے۔ نفسیاتی حوالے سے دیکھا جائے تو گریز کے خاص کرداروں کے اعمال و افکار پر جنس کی مضبوط گرفت موجود ہے۔ اور جہاں عزیز احمد نے ان کے لاشعور کو پیش کیا ہے وہاں بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ اُن کے لاشعور میں ناآسودہ جنسی خواہشات کے سوا اور کچھ نہیں کیونکہ یہی وہ خواہش ہے کہ جس پر سماجی اجتناب کی قدغن لگتی ہے اور نتیجہ کے طور پر یہ ردِعمل کے دوسرے طریقوں کا پیش خیمہ بن کر انسانی وجود پارہ پارہ کر دیتی ہیں اور ذہنی و جذباتی سطح کے امراض پیدا کرتی ہے۔ گریز میں اس میلان کی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو آئی اے ایس کے لیے منتخب ہوتا ہے اور امتحان دینے کے سلسلے میں انگلستان اور یورپ کی سیر کرتا ہے یورپ کے نئے ماحول میں رہ کر اُس کی زندگی میں عیش کوشی اور لذت پرستی داخل ہو جاتی ہے وہ زندگی کے تلخ حقائق سے گریز کرتا ہے وہ اخلاقی قدروں کی پاسداری نہیں کرتا ہے اور نہ ہی مذہبی بندشیں اُسے لذت کوشی سے روکنے میں

کامیاب ہوتی ہیں۔ناول میں شروع سے آخر تک مرکزی کردار نعیم کی داخلی اور نفسیاتی حالت کو پیش کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی خارجی زندگی کی وہ تمام باتیں جو نفسیاتی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں وہ بھی بڑی عمدگی سے پیش کوئی ہیں۔نعیم اور بلقیس کی محبت پیش کرتے ہوئے عزیز احمد نے یہ ظاہر کیا ہے کہ بلقیس کی محبت نعیم کی نفسیاتی زندگی کا ایک جز بن کر رہ جاتی ہے بلقیس کی یاد نعیم کو طرح طرح سے ستاتی ہے اور یوں نعیم کا لاشعور سامنے آتا ہے:

''رات کو سونے سے پہلے طرح طرح کے رومان انگیز خواب، عاشقانہ تخیلات، عشرت منزل ایک ڈاک بنگلہ بن گئی، موٹر کا سفر، حادثہ، مسافر بنگلے میں رات، بند کمرہ، دروازے بند، باہر حفاظت کے لیے آدمی، حادثہ کا پہلا تصور کہ مَیں زخمی ہوں اور بلقیس تیمارداری کر رہی ہے پھر بلقیس زخمی ہوگئی اور میں تیمارداری کر رہا ہوں۔عین دمِ واپسیں بلقیس کا اقرارِ محبت۔'' (۴۳)

مختلف نقادوں نے عزیز احمد کی اس عریاں نگاری کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ڈاکٹر احسن فاروقی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''گریز میں عریاں نگاری پر مچل گئے ہیں اور یورپ کے عظیم قحبہ خانے کا نقشہ اس لذت کے ساتھ کھینچا ہے کہ جنسیاتی زندگی میں بے راہ روی بہت بڑا وصف نظر آتا ہے اور ان کا نمائندہ یعنی ان کا ہیرو نعیم ہر جگہ بندر کی اولاد دکھائی دیتا ہے۔''(۴۴)

علی عباس حسینی نے گریز کی بعض خوبیاں بیان کرنے کے بعد عزیز احمد کے بارے میں لکھا ہے:

''جنسیات کے بیان میں وہ نامناسب افراط سے کام لیتے ہیں۔''(۴۵)

علی عباس حسینی نے گریز کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ جدید بھی ہے اور لذیذ بھی۔

سہیل بخاری نے ذرا نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''عزیز احمد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جنسی حقائق بڑی تفصیل اور بے باکی سے بیان کرتے ہیں اور اس میں کبھی کبھی وہ حد اعتدال سے بڑھ بھی جاتے ہیں۔''(۴۶)

فرائیڈ کے مطابق خواب یا حالت بیداری کے خواب ہماری زندگی کا ایک لازمی جزو ہیں کیونکہ خواب چاہے وہ دن کے ہوں یا رات کے، انسان کی غیر آسودہ خواہشوں کی آسودگی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔نعیم بھی خوابوں میں بلقیس کے قریب آتا ہے:

''دماغ نے ذرا سی کوشش کی تو بلقیس سامنے کھڑی تھی۔مذاق اُڑا تھی کہ سمندر کے اس ذرا سے تلاطم میں آپ کا یہ حال ہوگیا۔واہ نعیم واہ۔پھر مذاق اُڑاتے اُڑاتے مجھے بیمار اور پریشان دیکھ کر وہ خود بھی پریشان ہوگئی اور تسلی دینے لگی۔جہاز نے دائیں جانب حرکت کی تو اُس نے میرے بائیں کان میں جھک کر اقرار محبت کیا، پھر وہ مسکرائی، پھر میں نے مذاق اڑایا، پھر ہنسی۔پھر میری ہنسی اڑائی، پھر فرشتوں کی طرح میری پریشانی سے پریشان ہوئی۔مجھے تسلی دی اور نیند کے ساتھ مل کر غائب ہوگئی۔''(۴۷)

ناول میں شروع سے آخر تک نعیم کی جذباتی اور ذہنی کیفیت قاری کے سامنے رہتی ہے اور اس کی پیش کش میں عزیز احمد کو کمال حاصل ہے انھیں اردو کا لارنس بھی کہا جاتا ہے۔انھوں نے ہمیشہ انسانی تعلقات کی پیش کش کو مدنظر رکھا۔ محبت، دوستی، شادی وغیرہ پر وہ غور کرتے ہیں اور ان تعلقات کا فقدان یا کمی کس طرح فرد کی زندگی کو اداس یا پیچیدہ بنا دیتی ہے اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔نعیم کی ناآسودہ زندگی میں ان ہی تعلقات کی کمی رہتی ہے نعیم اپنے جنسی جذبات کی آسودگی ہمیشہ چاہتا ہے اور ہمیشہ بے چین رہتا ہے۔صبح سے سہ پہر تک ایلس کے انتظار میں بے قرار رہتا ہے اور ایلس اس کی زندگی کے لیے لازمی بن جاتی ہے اور اسے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید ایلس کو پانا ہی اُس کی زندگی کا مقصد ہے۔عزیز احمد، فرائیڈ سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔انھوں نے اس گریز میں جنس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔اور یہ بھی دکھایا ہے کہ انسان کے لاشعور پر جنس کا کس قدر غلبہ ہے۔جنس کا پہلو ہی سب سے زیادہ دبا ہوا پہلو ہوتا ہے اور انسان ان ہی کے بارے میں زیادہ سوچتا ہے۔جنس ہر فرد کے ذہن پر سوار ہے اور انسانی لاشعور ان خواہشات کی تشفی کے لیے فرد کو اکساتا رہتا ہے۔کشن پرشاد کول نے ''عزیز احمد'' کا ن۔م۔راشد سے موازنہ کیا ہے:

> ''عزیز احمد صاحب نے ن۔م۔راشد کی پیروی میں نئے ادب کی نثر میں وہ جدت پیدا کی جو راشد صاحب نئی شاعری میں کر چکے ہیں یعنی جذبہ انتقام کے زیر اثر عیاشی کے طرز نو کو رواج دیا۔''(۴۸)

کشن پرشاد کے مطابق ن۔م۔راشد نے اپنی نظم انتقام میں جس طرح انگریز عورت سے رات کی تاریکی میں انتقام لیا ہے وہی چیز عزیز احمد نے دہرائی ہے۔نعیم کی منگنی ایلس کے ساتھ محض اس لیے ختم کر دی جاتی ہے کہ اس کے باپ کو یہ رشتہ پسند نہ تھا، دوسرے نعیم ایک غلام ملک کی پیداوار تھا۔نعیم کو اپنی نسل اور اپنی سیاسی غلامی کا شدت سے احساس ہوتا ہے اور اس شدت احساس کا مداوا شراب وسفر اور جنسیات کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔اس سلسلے میں چک ہروشا اور انگریز کارکسلے سے تعلقات بڑھتے ہیں اور ہندوستانیوں کو ذلیل سمجھنے کا انتقام کرا کسلے کی بہن سے ایک خاص انداز میں لیا جاتا ہے۔بقول کشن پرشاد کول:

> ''مسٹر نعیم خلصۂ جنسی بھوک کے ایسے روگی ہیں۔غلاظت اور کیچڑ میں لوٹنے کی ان کو ایسی لت پڑ گئی ہے کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر گندی گلیوں میں جاتے ہیں اور جب تک غلاظت کی دلدل میں پھنستے نہیں سیری نہیں ہوتی۔''(۴۹)

جذبات نگاری میں عزیز احمد کو ید طولیٰ حاصل ہے۔چونکہ انھوں نے انسانی نفسیات کا بڑا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے۔لہٰذا کرداروں کے جذبات واحساسات کی پیشکش میں بڑی ژرف بینی اور فنی بصیرت کا ثبوت ملتا ہے۔ان کی جذبات نگاری بڑی فطری اور حقیقت پسندانہ ہوتی ہے۔لہٰذا کہیں کہیں عریاں صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ناول کے مطالعہ کے

دوران محسوس ہوتا ہے کہ عزیز احمد ایسے مواقع پر بے حجابانہ اور بے تکلفانہ بس کچھ کر دینا چاہتے ہیں جو انھوں نے دیکھا اور محسوس کیا ہے:

''بیتابی سے اس نے مارگریٹ کا بوسہ لیا۔ مارگریٹ کے پستان چھوٹی چھوٹی ناشپاتیوں اور فولاد کے سے سخت تھے۔ اس کا ہاتھ ادھر ادھر پھرتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے جسم پر مارگریٹ کی انگلیوں اور نوکدار ناخنوں کی سرسراہٹ محسوس کی۔''(۵۰)

نعیم جب بیئر کے نشے میں ہوتا ہے تو فریڈا گارٹ کو چھوڑنے اس کے گھر جاتا ہے تو اس کی طرف یوں مائل ہوتا ہے:

''نعیم نے اس کا منہ اپنی طرف پھیر کے اور آہستہ سے اسے اپنی طرف کھینچ کے اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا جن پر بارش کے قطروں کا مزہ بے نمک سا معلوم ہوا۔ فریڈا نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا 'شرارت مت کرو۔ سڑک کی روشنی میں نہیں'۔ چند قدم پیچھے ہٹ کے ایک اندھیری سی گلی میں نعیم نے فریڈا گارٹ کی چھاتیوں پر ہاتھ ڈالا، انھیں سہلایا۔ پھر بوسے لیے اور اسے گوئٹے اشتر سا اپنی پاں سیاں کو چلنے کو کہا۔ فریڈا نے کہا 'بہت دیر ہوگئی ہے' ایک دو اور بوسوں کے بعد اس نے کہا 'اب جاؤ نہیں تو پانی میں زکام ہو جائے گا۔''(۵۱)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جنس کے جن لطیف اور نازک پہلوؤں کو عزیز احمد نے بیان کیا ہے اور جذبات نگاری جتنے مؤثر اور دلکش انداز میں کی گئی ہے، عام فنکار کے بس کی بات نہیں۔ بادی النظر میں یہاں عریاں نگاری کا احساس ہوتا ہے اور قاری جنسی تلذذ میں مبتلا ہو سکتا ہے لیکن ماحول اور فضا کے پیش نظر یہ منظر ناگزیر تھا۔ یہاں ناول نگار نے جذباتی مدوجزر کو بڑی خوب صورتی اور فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم آزاد اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''جنس اور ہوس کا ترفع محبت کے لطیف ترین جذبے میں کب اور کن حالات میں متشکل ہوتا ہے، عزیز احمد نے ''گریز'' میں بڑی فن کاری سے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جنس اور محبت کے اس گہرے ربط اور بے نام رشتے کو اردو ناول میں اس سے قبل کسی نے پیش نہیں کیا تھا۔ جنسی طلب اور خواہش کو محبت کا ترفع اور تقدس کیسے حاصل ہوتا ہے۔ جنسی اختلاط اور جسمانی اتصال سے محبت میں جو توانائی اور استحکام پیدا ہوتا ہے ان کیفیتوں کے اظہار میں عزیز احمد نے۔ نفسیاتی ژرف بینی کا ثبوت پیش کیا ہے۔''(۵۲)

جن نقادوں نے عزیز احمد پر جنس پرستی کا الزام دھرا ہے، شاید ان کے پیش نظر مشرقی یا افلاطونی تصورِ محبت تھا۔ جنس کے زاویے کو اگر یورپی محبت کے تصور سے جوڑیں تو پوری تصویر سامنے آتی ہے۔ میرل پاول کے خط سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے:

''تمھاری دوسری رائے۔ یورپی محبت کے تصور۔ سے مجھے بنیادی اختلاف ہے۔ یورپی محبت کا تصور

تمھارے نزدیک خود بینی ،خودغرضی اور حیاتی کشش پر مشتمل ہے ۔میں یہ ضرور مانتی ہوں کہ حیاتی کشش یاتم چاہوتو اسے حیوانی کشش کہہ لو،ضرور اس میں شامل ہے لیکن محبت اگر حیاتی یا حیوانی نہیں تو اور ہے کیا؟ کیا مرد عورتیں حیاتی ہستیاں ،حیوان نہیں؟ممکن ہے کہ سچی محبت روحانی بھی ہوسکتی ہو۔اس کا مجھے تجربہ نہیں ،لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سچی محبت حیاتی اور حیوانی اور جنسی سیری کے بغیر ممکن ہے ۔یور پی محبت کو تم خودغرضی کی محبت بھی نہیں کہہ سکتے ۔کیونکہ عورت ہو یا مرد، جوفریق ہو ،جتنا اسے دوسرے سے ملتا ہے اتنا وہ خود بھی دیتا ہے ۔اس کے ساتھ اگر روحانی کشش ۔ذہنی کشش ،جذباتی مفاہمت، ہمدردی ہو۔تو محبت مکمل ہوسکتی ہے ۔'' (۵۳)

''گریز'' میں عزیز احمد نعیم کے توسط سے ہندوستانی منظر نامہ کی یورپ تک توسیع کرتے ہیں ۔ان سے پانچ سال قبل یہی وصف سجاد ظہیر کے ناولٹ لندن کی ایک رات میں نظر آتا ہے ۔ناول کے جغرافیائی افق کا پھیلاؤ میں دونوں تحریریں مثال کی حیثیت رکھتی ہیں ۔'' (۵۴)

بحری جہاز میں مسز چند کا مختصر لباس نعیم کی توجہ اپنی جانب کھینچتا ہے:

''دوسرے درجے کے عرشے پر راجہ ہمت نواز ونت بہادر مسز چند سے باتیں کر رہے تھے ۔ مجھے دیکھ کر بلایا اور مسز چند سے ملایا۔ہاتھ ملاتے وقت میں نے اپنے سر میں خون کی گرمی اور تیز محسوس کی ۔مسز چند وہی نہانے کا لباس پہنے ہوئے تھیں جس سے ان کی پیٹھ اور سڈول کاندھے اپنی پوری شانِ عریانی کے ساتھ باہر تھے ۔اس سے پہلے میں نے ایسے منظر صرف فلموں میں دیکھے تھے ۔اپنے دل میں کہا کہ یورپ میں ایسے ہزاروں منظر دیکھنے میں آئیں گے ۔'' (۵۵)

مغربی معاشرت کے رنگ میں ہندوستان کا دولت مند طبقہ پوری طرح رنگا گیا تھا۔اس کا اندازہ بحری جہاز میں راجہ صاحب سے نعیم کی ایک ملاقات میں ہوتا ہے جہاں مسز چند کے کردار کے بارے میں اسے آگہی ہوتی ہے ۔جب وہ راجہ صاحب کے کیبن میں مدہوش پڑی ہوتی ہے ۔

''انصاری نے کہا راجہ صاحب بلا رہے ہیں ۔ پہلے درجے میں ہم لوگ ان کے پاس پہنچے تو بیر کا شغل فرما رہے تھے ۔ضیافت کرنا چاہی تو میں نے معافی چاہی ۔میرے لیے لیمونیڈ منگوایا اور کہا یہ تو عورتوں کے پینے کی چیز ہے ۔ان کے درجے میں ایک امریکن لڑکی سفر کر رہی تھی ۔راجہ صاحب اس کے حسنِ جسمانی سے آج سہ پہر سرخرو ہوئے تھے ۔اس لیے بہت خوش تھے اور مجھ سے اور انصاری سے اپنے کارنامے کی تفصیلات بیان کر رہے تھے ۔'' (۵۶)

ناول کا ایک کردار مسٹر چند کلکتہ کے ایک مشہور سیٹھ ہیرا چند کے صاحبزادے ہیں ،انھوں نے اپنی والد کی ٹائپسٹ جو بہت معمولی طبقے کی انگریز لڑکی ہے سے شادی کی ۔گویا انگریز لڑکی سے شادی کرنا ہی تفاخر کی نشانی تھی خواہ اس کا کردار

کیسا ہی ہو۔نعیم کسی بھی جگہ جنس کی دائرے سے نہیں نکل سکتا، یہ شاید اس کی نفسیات کا حصہ ہے، مزدوروں کے اجتماع میں تقریر سنتے ہوئے جب اس کی دائیں ٹانگ ایک چوبیس پچیس سال کی ایک گداز جسم کی عورت سے برابر مس کر رہی تھی، اور جب اس عورت نے اسے سینڈوچ پیش کیا تو سینڈوچ سے نفرت ہونے کے باوجود اس کی کیا کیفیت تھی:

''اس نے اپنا نفسیاتی تجزیہ شروع کیا۔ غالباً سانڈوچ لے لینے کی نامحسوس خواہش اس لیے پیدا ہوئی کہ اس طرح اس عورت سے بات چیت کرنے کا موقع ملے گا یا کم از کم اس سے نامحسوس ربط اور تعلق بڑھ جائے گا۔ اس کی ران تو نعیم کی ران سے مس کر رہی تھی اور اگر وہ سانڈوچ لینے سے انکار کر دیتا تو اس عورت سے ایک طرح کا نفسیاتی بُعد پیدا ہو جاتا۔''(۵۷)

اسی جلسے کا ایک اور منظر ملاحظہ ہو:

''آخر میں اشتراکی انجمن کی عورتیں سنگت میں ناچیں۔ ان کی برہنہ ٹانگیں اور رانیں اشتمالیت کی تبلیغ کرنے والوں اور اسٹالن کے پیروؤں کے اس جلسے میں بھی اس طرح بلند ہو رہی تھیں جیسے ان کی بہنوں کی ٹانگیں پیرس یا نیویارک کے کسی ایسے نائٹ کلب میں جہاں وہ لکھ پتیوں کا شکار کھیلتی ہیں۔ ان کی ٹانگیں سر کے قریب بلند ہوتیں اور پھر روشنی میں جگمگاتی ہوئی فرش تک واپس آتیں۔ ہلکے سفید کپڑوں کے نیچے ان کی چھاتیاں تھرک رہی تھیں اور ان کے جسم کی اچھل کود سے ان کے بال ہوا میں بلند ہوتے اور پھر سر اور شانوں پر گرتے تھے۔''(۵۸)

ایلس کلاڈل اور نعیم اکٹھے فرانسیسی سیکھتے ہیں، پہلے دن کی ملاقات میں صاحب سلامت ہو گئی اور بہت جلد اچھی خاصی دوستی شروع ہو گئی۔ لیکن یہ دوستی ابھی سطحی تھی۔ دونوں ایسے ملکوں سے آئے تھے جو ایک دوسرے کے لیے ضدین کی دلچسپی رکھتے ہیں۔ دونوں کے مذاق ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ پیرس کی تنہائی انھیں دوست بنا دیتی ہے۔ تیسرے چوتھے روز ہی بوس و کنار شروع ہو گیا تھا۔ ایلس کا والد سنسناٹی میں ایک بڑی جوہری فرم کا ڈائریکٹر تھا۔ ایلس کا سراپا کچھ اس طرح کا تھا:

''جب وہ ہنستی ہے تو اس کے سرخ سرخ ہونٹوں میں اس کے دانت کتنے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ چمکتے ہوئے ہموار سفید دانت، اور اس کے ہونٹ کتنے پیارے ہیں اور اس کا گول گول چہرہ، اور اس کے پیلے پیلے بال اور اس کی سخت چھاتیاں۔''(۵۹)

نعیم کی اس میں دلچسپی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ ایلس کا تعاقب عرصے سے کر رہا ہے اور اسے امید ہوتی ہے کہ وہ اس سے جنسی رسائی حاصل کر لے گا۔ دوستی کے بعد ایلس ایک حد سے زیادہ نعیم کو تجاوز نہیں کرنے دیتی، نعیم جب ہروشا سے گل سرخ کے نہ آنے کا ذکر کرتا ہے تو پھر ایلس کی کہانی سناتا ہے:

''کل رات ایلس نے۔۔۔زیادہ۔۔۔اجازت نہیں دی۔ابتدائی کارروائیوں کوشروع ہوئے ہفتے ہوگئےمگرقلعہ کسی طرح سر ہی نہیں ہونے پاتا۔کل پھر وہ ضد کرکے،اپنے بورڈنگ ہاؤس چلی گئی،آج کامیڈی فرنسیز چل رہی تھی،مگرآج بھی کامیابی کی امید کم ہی تھی۔''(۶۰)

اس کے جواب میں ہروشا اسے سمجھاتا ہے کہ:

''متوسط طبقے کی لڑکیوں کی تابِ مقارمت توڑنے کوصبر چاہیے۔غریب اور مزدور طبقوں کی لڑکیوں میں عصمت کی استطاعت ہی نہیں ہوتی۔متوسط طبقے میں لڑکیوں میں عصمت کی استطاعت ہوتی ہے اورامیر طبقے کی لڑکیوں میں بے علامتی کی استطاعت ہوتی ہے۔''(۶۱)

پھر جب وہ ایلس سے ملتا ہے تو:

''زمین دوز ریلوے کے اسٹیشن کی سرنگ میں نعیم نے ایلس کا ایک طویل بوسہ لیا۔اس کے ہونٹ خشک اورگرم تھے۔نعیم نے خیال کیا کہ اسے بھوک لگ رہی ہوگی۔ایلس نے اس کے بازو میں اپنا ہاتھ حمائل کیااوراس کے سہارے چلنے لگی۔تھوڑی دورآگے بڑھ کردونوں پھر رکے پھرایک طویل بوسہ لیا۔''(۶۲)

دونوں کی دوستی میں ابھی ایک مقام پر رکی ہوئی تھی:''دوستوں کی طرح ان کا شعوراوران کی محسوس اور غیر محسوس نفسیاتی کیفیتیں ایک دوسرے کی سمجھ میں آگئی تھیں۔اوردونوں کی دوستی میں خلوص تھا،لیکن اس دوستی کا جنسی پہلوابھی بہت تشنہ تھا۔ایلس سینکڑوں بار کہہ چکی تھی۔'میں تمھیں بہت پسند کرتی ہوں۔مگر مجھے تم سے محبت نہیں'۔اسے کسی طرح بھی اس سے عشق نہ تھا۔اس کی رفتار گفتار،وضع تراش،اس کی ہنسی،اس کے دانت،سب نعیم کواچھے معلوم ہوتے مگر دل ویسا کا ویسا سرد رہتا۔جنسی تعلقات بھی تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔بوس وکنار میں اسے شروع سے انکار نہ تھا۔لیکن نعیم کی دست درازی دیکھ بھال سے آگے بڑھنے نہ پاتی۔دوایک بار جب نعیم نے حد سے تجاوز کرنا چاہا تو وہ اس قدر بگڑ گئی کہ نعیم کو ہٹ جانا پڑا۔''(۶۳)

پھر یہ دوستی اتنی آگے بڑھتی ہے کہ نعیم کوایلس کی عادت ہوجاتی ہے:

''اب وہ ایلس کا بوسہ لیتا تو معلوم ہوتا کہ اس کا دل اس کے ہونٹوں میں آگیا ہے۔معلوم ہوتا کہ جتنی لذت اس ایک بوسے میں ہے اتنی لذت اور کسی چیز میں نہیں اورایلس کی انگلیوں کے ناخن تک اسے عزیز معلوم ہوتے۔''(۶۴)

ایلس کونعیم کی رنگین مزاجی کا اندازہ ہےاسی لیے جب وہ جنیوامیں اپنے چچاسے ملنے جاتی ہےتو نعیم سے کہتی ہے:

''مگر کہیں میرے فراق میں میرے آنے سے پہلے مر نہ جانا۔کسی اور سے دل بہلا لینا،جیسے میری۔''(۶۵)

نعیم آخر کار ایلس کے وصل میں کامیاب ہو جاتا ہے، اس منظر کو ''گریز'' میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''اسی شام کو نعیم ایلس کو فولی برژیر لے گیا۔ محض اپنے حملے کے لیے نفسیاتی ماحول کو ٹھیک بنانے۔ وہاں ایک نائٹ کلب کو جہاں تقریباً برہنہ لڑکیاں ناچ رہی تھیں اور ایک شخص بڑی جاندار آواز میں شہوت انگیز فرانسیسی گیت گا رہا تھا۔ ایلس کو اس نظارے سے ذرا گھبراہٹ معلوم ہونے لگی۔ اور نعیم ڈرا کہ کہیں نفسیاتی ثر الٹا نہ ہو۔ وہ ایلس کو اپنے کمرے میں لایا۔ اس وقت رات کے دو بج چکے تھے لیکن نسبت کے بعد سے ایلس کبھی کبھی بہت رات گئے تک نعیم کے یہاں رہتی۔ ایلس نے گھر جانے پر اصرار کیا تو نعیم نے کہا 'بہت دیر ہو چکی ہے۔ کوئی ٹیکسی ملے گی نہیں اور پیدل چلیں تو دیر لگے گی۔ تم یہیں میرے پلنگ پر سو جاؤ۔ میں فرش پر سو جاتا ہوں'۔ یہ وہ نسخہ تھا جسے یورپ بھر میں لاکھوں بار دہرایا جا چکا تھا اور جو ہزاروں بار کامیاب ہو چکا تھا'۔ فرش پر سونے کا تو محض بہانہ تھا۔ جب پلنگ پر اس کا منگیتر اس سے لپٹ رہا تھا تو نیند اور شامپین کے اثر میں وہ اسے ہٹاتی کیسے؟ اس نے شروع شروع میں نعیم کے بوسوں کا جواب بوسوں میں دیا۔ پھر جب نعیم کے ہاتھ اسے بہت بے قابو کرنے لگے تو اس نے اسے ہٹانا چاہا۔ اس سے کہا بھی کہ 'جاؤ۔ اب سو جاؤ'۔ جب اس نے دیکھا کہ نعیم اس پر بھی نہیں مانتا اور ہاتھوں کی جگہ اس کا جسم زیادتی کرنے پر تلا ہوا ہے تو اس نے بڑی منت سے کہا 'پیارے۔ شادی سے پہلے نہیں۔ میں تمھاری خوشامد کرتی ہوں، ابھی نہیں، شادی سے پہلے نہیں؟' لیکن خود اس کا جسم اور اس کے خون کی حدت، نعیم سے اور شامپین کے اثر سے سازش کرنے لگے۔ وہ سسکیاں لے کے رونے لگی۔ وہ ساری رات اس نے ایلس کے ساتھ گذاری۔ ایلس کے آنسو جو جسمانی اور ذہنی تکلیف سے نکلے تھے رک گئے۔ وہ بے خیالی میں نعیم کے بوسے لیتی رہی اور لپٹتی رہی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ صبح کو جب وہ جانے لگی تو نعیم نے اس سے کہا 'جو کچھ ہوا اس کا تمھیں افسوس ہے؟' اس نے پیار سے نعیم کی طرف دیکھ کے کہا 'نعیم پیارے میں ڈر رہی تھی'۔ نعیم نے اس کا ہاتھ چوم کے کہا 'اس خیال سے کہ کہیں بچہ نہ ہو؟ ایسا معلوم ہوا تو ہم فوراً شادی کر لیں گے'۔ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا 'شکریہ۔ ڈارلنگ'۔ نعیم نے کہا 'اور آئندہ سے میں بڑی احتیاط کروں گا'۔ ایلس نے آہستہ سے 'ہاں' کہا۔ اس کا ہاتھ اسی طرح نعیم کے ہاتھ میں تھا۔ پھر وہ یک لخت اس کی طرف مخاطب ہوئی۔ اس کے پیلے بالوں نے ریشمی نور کا ایک نیم دائرہ سا ہوا میں بنایا اور پھر اپنی اپنی جگہ جم گئے۔ اس نے کہا 'مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بڑی قدامت پسندی کی بات ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اب مجھ میں وہ پاکی باقی نہیں رہی'۔ پاکدامنی کا تصور محض مشرق کی میراث نہیں۔'' (۶۶)

نعیم کا نفسیاتی مسئلہ صرف جنسی بھوک نہیں ہے، دیارِ غیر کی تنہائی بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے۔ اور نعیم کے گذشتہ حالات دیکھے جائیں تو اس کی زندگی میں ایک اکیلا پن تھا، اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا، اس لیے وہ ایک بار ایلس سے کہتا ہے:

''پیاری میں دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔'اور گویا اس لفظ تنہا کے ساتھ اس کی خوداعتمادی، اس کی اردیت میں نئے سرے سے جان پڑ گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔'ہندوستان میں میرا کوئی قریبی عزیز یعنی ماں، باپ بھائی بہن زندہ نہیں۔ میں تمھارے لیے اپنا وطن چھوڑ سکتا ہوں۔ ہندوستان میں میرا کوئی دوست نہیں۔'' (۶۷)

اس اکیلے پن کی شدت اس وقت پھر بھی کم تھی جب وہ اپنے ملک میں تھا، دیارِ غیر میں اس اکیلے پن میں تنہائی بھی شامل ہو جاتی ہے، جب ایلس اس کے ساتھ نہیں آتی تو اسے فرسٹریشن ہوتی ہے اور اس کو مٹانے کا جب کوئی ذریعہ نہیں ملتا تو وہ قحبہ خانے کا رخ کرتا ہے:

''اس رات اس نے اپنی زندگی میں خلا محسوس کیا۔ خلا اور بڑی ہی سخت تنہائی۔ ایسی تنہائی جو کبھی کبھی برسات کی راتوں میں حیدرآباد میں محسوس کیا کرتا تھا۔ یہاں کی تنہائی کی شدت زیادہ تھی۔ پیرس کے جگمگاتے ہوئے انسانی جنگل میں وہ اکیلا تھا۔ اکیلا اور بالکل اکیلا۔ اگر ایلس آجاتی تو اس کا کیا بگڑ جاتا۔ مگر یہ متوسط طبقے کی تربیت، خدا اس سے بچائے۔ اور طرہ یہ کہ امریکن لڑکیاں بڑی روشن خیال سمجھی جاتی ہیں۔ تنہائی، تنہائی، تنہائی۔۔۔۔ جب وہ قحبہ خانے سے واپس ہوا تو اسے نیند آرہی تھی اور بلقیس یاد آرہی تھی۔'' (۶۸)

ایلس کا والد جب ایلس کو امریکہ واپس لے کر چلا جاتا ہے تو نعیم پھر شدید تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے:

''دوسرے دن جب ایک طیارہ ایلس کو مغرب کی طرف اڑائے لئے جارہا تھا اور نظر سے غائب ہو رہا تھا، نعیم نے محسوس کیا کہ گویا وہ خود اس طیارے سے ریشمی چھتری کے ذریعے ابھی ابھی اترا ہے۔ ایلس اس پر کیسی چھا گئی۔ وہ زندگی کو بھول سا گیا تھا اور اب جو وہ ناامیدی اور مایوسی سے اس غائب ہوتے ہوئے طیارے کو دیکھ رہا تھا تو اسے معلوم ہوا کہ۔۔۔۔ لندن اور ہندوستان اور حیدرآباد اور حیدرآباد کی سیمنٹ کی سڑکیں، اور سیندھی پینے والے امراء، اور فرانس میں شامپین پینے والے سیاح اور ہزاروں لاکھوں طالب علم۔ ان سب کے درمیان اب وہ پھر تنہا رہ گیا۔ بالکل تنہا۔'' (۶۹)

ناول گریز میں شعور کی رو کی تکنیک جابجا ملتی ہے۔ اس حوالے سے اعظم راہی لکھتے ہیں:

''ہر چند یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ عزیز احمد نے شعور کی رو کی تکنیک کو باضابطہ انداز میں اور شعوری طور پر برتا ہے تاہم واحد متکلم، خود کلامی اور ڈرامائیت کے باعث ان کے ہاں شعور کی رو کا احساس کیا جاسکتا ہے۔ نعیم کو جب تک بلقیس کی اور آخر میں ایلس کی یاد برابر آتی رہتی ہے۔'' (۷۰)

ایلس کے بعد میری پاول سے بھی عشق منطقی انجام تک نہیں پہنچتا۔ گل سرخ جس کا اصل نام میری پاول تھا، پچیس برس کی تھی۔ نعیم کی حسن پرست طبیعت اس سے بھی متاثر تھی۔ نعیم کی دلچسپی تب تک کسی لڑکی میں باقی رہتی ہے جب تک اس

میں شانِ نارسائی ہو۔ میری پاول بھی اپنی اشترا کی سرگرمیوں کی وجہ سے کئی بار وعدہ کر کے نہیں آئی۔ تو نعیم کا اشتیاق بڑھنے لگا۔ پھر اس کی میری پاول سے دوستی ہوگئی۔ لیکن جب اس نے اخبار میں کرا کسلے اور میری پاول کی منگنی کی خبر ہوئی تو اس نے ذہنی طور پر بلقیس، ایلس اور میری پاول کا تقابل کیا۔ یہ شاید محبت کی ایک اور ناکامی تھی۔

جب ایلس اور میری اس کی زندگی سے چلی جاتی ہیں تو مارگرٹ جو جیمز کرا کسلے کی بہن ہے، جس کا والد ہندوستان میں چیف جسٹس رہ چکا تھا۔ اس میں انگریزوں والا روایتی تعصب نہیں ہے۔ مارگرٹ کی عمر سترہ سال ہے۔ ایک رات جو وہ نعیم کے فلیٹ پر گزارتی ہے تو اس سے بھی اپنی جنسی آسودگی حاصل کرتا ہے۔

مارگرٹ کے بعد پھر آوارہ گردی بلکہ جہاں گردی، وہ مختلف ممالک کی سیر کرتا ہے، ایسے میں برتھا کے دیس اشتوک ہولم بھی جاتا ہے، وہاں کا ایک منظر ملاحظہ ہو:

> ''پھر اشتوک ہولم میں آدھی رات کو ایک ایکٹرس کے چھوٹے چھوٹے پستان اور بے طلف بوسے۔''(۷۱)

پھر میری پاول سے ایک اتفاقی ملاقات اور بوسہ:

> ''نعیم نے میری کا ہاتھ اٹھا کر چوما اور کہا' خدا حافظ۔ خدا تمھیں خوش رکھے۔' اور ایک ثانیہ کے اندر ایک ہی خیال دونوں کے ذہن میں پیدا ہوا۔ دونوں کے لب ایک دوسرے کے قریب آگئے اور نعیم نے میری کا بوسہ لیا تو محسوس کیا کہ اس کے لب بھی سچائی سے جواب دے رہے ہیں۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ نے محسوس کیا کہ میری کا سینہ ڈھلک رہا ہے۔''(۷۲)

ہندوستان واپس آکر بھی اگرچہ نعیم شادی نہیں کرتا لیکن اس کی حسن پرستی میں کمی نہیں آتی۔ بیگم شہزور خاں جب سے شادی کے لیے لڑکیاں دکھانے ایک مقامی کالج کے جلسہ تقسیم انعامات میں لے جاتی ہے تو نعیم کی نظریں کیا کیا دیکھتی ہیں اور ذہن کیا کیا سوچتا ہے۔

> ''جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ مرد مہمان کم تھے۔ لڑکیوں کے اقارب اور سب ہی طرح کی لڑکیاں تھیں۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی۔ رنگ کے اعتبار سے کئی گوری لڑکیاں بھی تھیں۔ کالی بھی، سانولی بھی۔ ہندوستان کے ہر صوبے کی لڑکیاں۔ جلسے کے دوران میں نعیم اردو افسانہ نگاروں کی ان ہیروئنوں کو دیکھتا رہا۔ بالآخر اس کا ذہن ایک ناقابل حل گتھی کے سلجھانے میں مصروف ہو گیا۔ شلوار میں اتنی نسوانیت نہیں جتنی ساڑھی میں ہے۔ خصوصاً رفتار کا لطف تو ساڑھی میں ہی آتا ہے۔ ذوق اور آسائش میں بھی ساڑھی بڑھ کے ہے۔ لیکن شلوار کی خوبیاں بھی کچھ کم نہیں۔ کوئی لڑکی دراز قد ہو اور اس کا سینہ ابھرا ہو تو شلوار اس پر ساڑھی سے ہزار درجے زیادہ اچھی معلوم

ہوگی۔۔۔نعیم سوچنے لگا کہ جولڑکیاں قمیص اور شلوار پہنتی ہیں۔ان کے دوپٹے عموماً ان کی گردنوں کا ہار بن کے رہ جاتے ہیں۔سینے پر نہیں رہتے۔اوران کے سینے بڑے خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔''(۷۳)

گریز کی جس جنس پرستی کو نقادوں نے تنقید کا نشانہ بنایا ہے، وہ دراصل نفسیاتی کیفیت ہے، وہ نعیم جسے جنس کا رسیا سمجھا جاتا ہے، ایلس کے جانے کے بعد کس طرح جنس سے متنفر دکھائی دیتا ہے، اس کا اندازہ اس منظر سے ہوتا ہے جب وہ روزا کے ساتھ ہائیڈل برگ کے پرانے قلعے کی سیر کو جاتا ہے:

''ہائیڈل برگ کے پرانے قلعے کا رہبر مسافروں کی جمگھٹ میں ہر کمرے اور کمرے کی ہر دلچسپ چیز کے متعلق تقریر کر رہا تھا۔کبھی کبھی روزا بھی نعیم کو کچھ سمجھاتی۔معلوم نہیں اس وقت نعیم کو دنیا کی ہر عورت کیوں بدشکل معلوم ہورہی تھی۔گھنگنی سی جانور، عورت، جس کی خاطر مرد اس قدر بھٹکتا ہے۔یہ اس کا سینہ، اس کے سینے کا ابھار، سخت ہو یا نرم، خوشنما ہو یا گراہوا اور بدنما۔اور سب چوپاؤں کے بھی تو تھن ہوتے ہیں۔بچوں کو دودھ پلانے کے لیے۔ہروشا کی شوپن اور یت اس پر بڑی بدمزگی سے طاری ہورہی تھی اور اس وقت جنسِ لطیف سے اسے بڑی نفرت معلوم ہورہی تھی۔شرمیلی اور حسین روزا بھی اس وقت اسے چوپایہ معلوم ہورہی تھی۔دو تھنوں والا چوپایہ کپڑے پہنے پچھلی ٹانگوں کے بل کھڑا ہے۔''(۷۴)

لندن کی ایک رات کے بیش تر کردار بھی اس نفسیاتی کش مکش کا شکار ہیں۔اعظم، عارف، وغیرہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔

اداس نسلیں:

اداس نسلیں میں بھی شعور کی رو کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی جزئیات نگاری ہے۔اداس نسلیں کی ایک اور خوبی ماضی کی یادیں ہیں۔یادآوری (Reminiscing) کے اس عنصر کو 'اداس نسلیں' میں ایک تکنیک کے طور پر برتا گیا ہے۔نعیم جگہ جگہ اس معمول کا کام کرتا ہے جن سے ماضی سے وابستہ یادیں گذرتی ہیں۔وہ ماضی کے پردوں کو بار بار اٹھا کر دیکھتا ہے، اس کے دھندلکوں میں اسے وہ نقوش نظر آتے ہیں جو کبھی جیتی جاگتی حقیقت تھے، مگر اب وہ گرد آلود ہو گئے ہیں۔اس سے ملحق ایک مسئلہ ایک طرح کی واہمہ کی تصویروں کا ہے۔یہ بھی دراصل ماضی کو زندہ رکھنے اوران کا رشتہ حال سے جوڑنے ہی کا ایک وسیلہ ہے۔یہ عنصر ہمیں ناول کے تخئیلی ڈھانچے سے رابطہ قائم کرنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے، اور یہ تصویریں ہمیں برابر Haunt بھی کرتی رہتی ہیں۔جنگ کے دنوں میں جب نعیم کی مہندر سنگھ سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ دونوں بیتے ہوئے پرحلاوت دنوں کی یاد اس طرح تازہ کرتے ہیں:

''گاؤں کی باتیں ختم ہوگئیں۔تو وہ خاموش ہوگئے۔قبرستان میں تاریکی تھی اور سکون۔وہ دونوں چپ

چاپ ہاتھ پیچھے باندھے سر جھکائے سیدھے تاریک راستوں پر آتے اور جاتے رہے۔کبھی کبھی چند خشک پتے اور پھول ہوا کے زور سے ٹوٹ کر اینٹوں پر آ گرتے اور ان کے پاؤں تلے چر چرا کر ٹوٹ جاتے ،کبھی وہ واپس آتے ہوئے پکا راستہ چھوڑ کر درختوں کے نیچے نیچے چلنے لگتے اور وہ پراسرار آواز بڑھ جاتی ۔سیاہ تنوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے خوبانی کی جھکی ہوئی شاخیں ان کے چہروں سے ٹکراتیں اور سفید ہلکے پھول آدھی رات کی برف کی طرح اندھیرے میں آہستگی سے ان کے بالوں اور آنکھوں پر گرتے ۔اندھیرے سایہ دار راستوں قبروں کے درمیان چپ چاپ چلتے ہوئے وہ پرانے زمانے کے دو بھوت معلوم ہو رہے تھے ۔جنھوں نے رات کے مقررہ وقت پر اپنی اپنی قبروں سے نکل کر خاموشی سے ایک دوسرے کو خوش آمدید کہا تھا۔اور اب اپنے دوست درختوں ،خشک پتوں ،کتبوں اور سفید پھولوں کے درمیان چہل قدمی کر رہے تھے اور اپنے دلوں میں دوستی اور رفاقت کا وہ جذبہ محسوس کر رہے تھے جو سالہا سال کی ہمسائیگی کے بعد خود بخود پیدا ہو جاتا ہے ۔نعیم نے رات کے اس سمے قبرستان کے سفید پھولوں کے اور اپنے وجود کے اس اسرار کو بے حد واضح اور شدید طور پر محسوس کیا۔''(۷۵)

اسی طرح عذرا اپنے ماضی کا جائزہ اس طرح لیتی نظر آتی ہے:

''بالآخر یہ میرا کمرہ ہے۔اس جگہ میں بچپن سے رہتی آئی ہوں ۔یہاں میں نے کیسے کیسے خواب دیکھے ہیں ۔مجھے اس کمرے سے نفرت ہے ۔اس کے دریچوں کے شیشوں پر یوکلپٹس کے پتوں کا عکس پڑتا ہے ۔جو مجھے ناپسند ہے ۔بارش جب تیز ہو جاتی ہے تو بے پناہ شور اندر آتا ہے ۔کیونکہ یہ گلیری کے اختتام پر ہے ۔یہ بھی مجھے ناپسند ہے۔اس کمرے میں میں نے کیا کیا سوچا ہے؟ کیسے کیسے پروگرام بنائے ہیں۔ان تیس سالوں میں جو مجھے یاد ہیں کتنے ہی مسرت کے ،کتنے ہی دکھ کے لمحے گزرے ہیں ۔ان لمحوں کے بہاؤ کو میں کبھی بھول سکتی ہوں؟ اور اس کمرے کو جس میں کارنس پر کتنے ہی پھول سوکھ گئے ،اور کتنے ہی تازہ پھول ان کی جگہ رکھے گئے ۔ارے یہ خاموشی کیوں ایک دم سارے میں !میرا ساز ،میرے سازوں پر مٹی جم رہی ہے اور برآمدوں میں اتنی ویرانی سمٹ آئی ہے ۔میں ان کو یہاں لا رکھوں گی ،تا کہ ڈھل جائیں اور یہ خاموشی ٹوٹ جائے ۔''(۷۶)

اور نعیم ایک طویل بیماری کے دوران جب اپنے گذشتہ شب و روز کا جائزہ لیتا ہے تو اس کے بے چین اور مضطرب ذہن کی سطح پر جو نقوش ابھرتے ہیں ،وہ انھیں اس طرح مشخص کرتا ہے:

''اس کے باوجود دھیلی شکلیں تھیں جو اس کھڑکی کے اندھیرے اجالے میں دور دور تک ابھری ہوئی تھیں ۔کبھی کبھی وہ خوفناک حد تک قریب آ جاتیں ،ایک وہ ڈھلکا ہوا مونچھوں والا غلیظ ،ستا ہوا مردہ چہرہ تھا جس پر مدھم چاندنی پھیلی ہوئی تھی ۔ایک وہ بوڑھے بیل کی طرح چلتا ہوا ہیولی تھا۔جو تاریک

قبرستان میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ جبکہ خوبانی کے سفید شگوفے ان کے سروں پر گر رہے تھے اوراسے عجیب سا احساس ہوا۔۔۔اورایک عذرا تھی، جس کے لیے محبت کا جذبہ قریب قریب ناپید تھا۔ لیکن جس نے اسے احساس شکست بخشا تھا۔ یہ عذرا کا نیا روپ تھا۔''(۷۷)

تخیلی طور پر یادوں کے نقوش کو تازہ کرنے کے مماثل ایک متوازی عمل ایک طرح کے واہمے یاPhantasy کو سامنے لاتا ہے۔اس ناول میں یہ اس نقطے پر نظر آتا ہے جہاں بوڑھا مچھیرا اپنا خواب بیان کرتا ہے، اور یہ اس کے عقب میں نمودار ہوتا ہے، جہاں زمانی طور پر ابھی ابھی جلیانوالہ باغ میں بے گناہ انسانوں کے نیست ونابود کیے جانے کا حال بیان کیا گیا تھا۔فینٹسی بھی خواب ہی کی ایک شکل ہے۔خواب کے خواص میں سب سے اہم عنصر یہ ہے کہ یہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب حواسِ ظاہرہ وقتی طور پر معطل ہو جاتے ہیں اور فینٹسی میں جو کچھ روبرو ہوتا ہے، اس پر علت ومعلول یا قانونِ ہیئت کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ایک طرف حواسِ ظاہرہ کا تعطل اور دوسری جانب زمان ومکاں میں وارد ہونے یا وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی منطق کی نفی یا اس سے صرفِ نظر کرنا۔اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ فینٹسی کی کائنات میں حقائق اور آدرشوں کے مابین تصادم کی بھی ایک جھلک نظر پڑتی ہے یعنی اس میں ڈھکے چھپے جذبات اور ارادوں کی بھی تشہیر یا کم از کم عکاسی نظر آتی ہے، جو لاشعوری کائنات کا خزینہ ہوتے ہیں اور ہمیں اس وسیلے سے حقائق کی کائنات پر ایک طرح کی تنقید یا اس کا احتساب بھی ملتا ہے۔ناول میں اس مقام پر خوب صورت مچھلیوں کی دریافت پر بوڑھا مچھیرا جس طرح خوشی کا اظہار کرتا ہے، اسے اس طرح ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے:

''یہاں پر ہم نے ہزاروں کی تعداد میں مچھلیاں دیکھیں۔رنگ برنگ کی، چھوٹی بڑی، قسم قسم کی مچھلیاں پانی میں کھیل رہی تھیں۔اور دھوپ چھن چھن کر ان کے جسموں پر پڑ رہی تھی۔میرے باپ نے جال پھینکا، مچھلیوں میں افراتفری مچ گئی۔۔۔میرے باپ نے جال میں ہاتھ ڈال کر کلبلاتے ہوئے ڈھیر میں سے ایک مچھلی نکالی، اور اسے ہاتھ میں پکڑے کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔وہ بڑی خوب صورت مچھلی تھی۔اس کا رنگ گہرا نیلا اور اس پر بڑے بڑے سنہری رنگ کے چانے تھے۔وہ گردن کے پر پھلا پھلا کر سانس لے رہی تھی۔اور کھلی ہوئی آنکھوں سے جانے کدھر کو دیکھ رہی تھی۔۔۔۔پھر میرے باپ نے ایک اور مچھلی اٹھائی، جس کی جلد سفید ریشم کی طرح تھی اور جس پر دنیا کے ہر رنگ کے نقطے اور لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔اس کا سر اور آنکھیں اور ہونٹ بھی سفید تھے۔''(۷۸)

یہاں رنگ برنگ خوب صورت مچھلیاں دراصل زندگی کا استعارہ ہیں اور ان کا جال میں پھنسنا اور بالآخر اس رنگینی ورعنائی سے محروم ہو جانا اس بات کا اشارہ ہے کہ موت زندگی کے تعاقب میں رہتی ہے۔

اداس نسلیں کا اہم پہلو یادوں کی یہی کائنات ہے جو بعض کرداروں کے لیے ایک وقیع سرمائے کی حیثیت

رکھتی ہے۔اس میں ماضی سے وابستگی اوراس کے لیے وہ کشش ہے جسے Nostelgia کا نام دیا گیا ہے شامل ہے۔حال کا وجود ایک سراب کی مانند ہے، جولمحہ لمحہ ہماری گرفت سے نکلتا رہتا ہے۔روزمرہ کی زندگی ایک بے معنی تعطل اور میکانکی تسلسل سے عبارت ہے۔ذہن میں محفوظ چھوٹے چھوٹے واقعات سے متعلق غیر اہم معروض، تجربات اور وابستگیاں عمل اور ردِ عمل کے مختلف النواع پیٹرن انفرادی برتاؤ کے مختلف اوضاع اور تلخ وشیریں محسوسات کے شیرازے اور ضابطے،ان سب سے وابستہ تابناکی اور اداسی بھی،حال کی بے معنی گردش سے پیدا شدہ بے کیفی اور بدحظی میں اجلاپن لے آتی ہے،اوران یادوں کے محافظ کو Sustain کرتی ہے۔یادوں کی برانگیختگی ان جانے طریقے پر ہمیں دوبارہ زندہ رہنے کا حوصلہ دلاتی ہے اور ہم اپنی ذات کی دریافتِ نو کے عمل میں مصروف ہوجاتے ہیں۔یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ عمل کے موجودہ محرکات غیر شعوری طور پر ان محرکات اور ہیجانات سے وابستہ ہوتے ہیں،جو ماضی میں ایک زندہ حقیقت یا واقعے کے طور پر موجود تھے۔گوموضوع کے اعتبار سے اداس نسلیں میں عبداللہ حسین بھی ماضی کی تاریخی وتہذیبی فضا میں ہی سانس لیتے ہیں۔انھوں نے بھی تقسیم سے قبل کی مشترکہ معاشرت اور تہذیب وثقافت کی ہی تصویر کشی اپنے ناول میں کی ہے،لیکن ماضی کی جانب ان کا رویہ ناسٹلجیاتی مراجعت کا نہیں بلکہ احتساب کا ہے اوراس احتسابی عمل میں انھوں نے تنگ نظری،تعصب ،جذباتیت اور پاسداری سے بلند ہونے کی کوشش کی ہے۔

لندن کی ایک رات میں جنس کے مناظر نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن گریز میں شاید تکنیک کی وجہ سے اسے زیادہ استعمال کیا گیا ہے،اداس نسلیں میں بھی کچھ مناظر مل جاتے ہیں۔اداس نسلیں کے نعیم میں بھی حسن پرستی اور بوالہوسی ہر جگہ موجود ہے۔نعیم کا ادھیڑ عمر میں یہ حال ہے کہ وہ نجمی (عذرا کی چھوٹی بہن) سے محبت کرنے لگتا ہے۔نجمی جو عذرا سے پورے بیس سال چھوٹی ہے۔وہ نجمی سے کہتا ہے کہ عذرا تو بے وقوف لڑکی ہے وہ اس سے اکتا گیا ہے اور یہ کہ وہ نجمی سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔وہ نجمی سے کہتا ہے:

> ''تمھیں پتہ ہے میری کیسی کوفت کی زندگی ہے۔اس سے بچنے کے لیے میں ہر جگہ مارا مارا پھرتا ہوں ،میری بیوی ۔اس کے ساتھ تو ایک مدت گذر گئی مجھے کچھ نہ دے سکی اور تم۔اتنی ذہین ہو تمھارا دماغ۔میں اس کے ساتھ حیوانوں کی طرح رہتا ہوں اور تم۔اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹھوڑی اور گال اور ہونٹوں کو چھوا،تمھارا ذہن۔میں نے ہمیشہ تمھارے جیسی لڑکی کی تمنا۔''(۷۹)

بانو جو نعیم کے ساتھ شیلا کے طور پر تشدد پسندوں کے درمیان جسمانی روابط رکھ چکی تھی،علی کو اپنی کہانی سناتی ہے، اس کہانی میں بھی جہاں ہندوستانی تہذیب میں ذات پات کے ساتھ کئی چیزوں کی نشاندہی ہوئی ہے وہاں جنسی زندگی بھی سامنے آتی ہے:

''میری سیدھی سادی کہانی ہے۔ تمھیں کیا ملے گا۔ ناگپور کے پاس ایک گاؤں میں جس کا نام کلیان پور تھا، میں پیدا ہوئی۔ اس نام کا پنجاب میں ایک شہر بھی ہے۔ میرا نام شیلا تھا۔ ہم گاؤں کے اچھوت تھے۔ مذہب عیسائی۔ انگریز جو سب کے حاکم تھے وہ بھی عیسائی تھے، پتا نہیں اہم اچھوت کیوں تھے۔ یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن ہم ان کے نزدیک بھی نہ جا سکتے تھے۔ انگریزوں کے بھی نہیں، گاؤں والوں کے چھوٹے بڑے سب کے نزدیک، بس ہم جا ہی نہ سکتے تھے۔ اگر ہم غلطی سے کسی کے ساتھ چھو جاتے تو ہمیں اس کی سزا ملتی۔ لیکن اسے بھی سزا ملتی، یہ کہ جب تک وہ نہا دھو نہ لیتا گھر نہ جا سکتا تھا اور جس کو چھو لیتا وہ بھرشٹ ہو جاتا۔ چنانچہ ہماری ناپاکی متعدی بیماری کی طرح تھی۔ مزا اس وقت آتا جب ہم سردیوں کی صبحوں کو لالو کے انتظار میں چھپ کر بیٹھ جاتے اور دبے پاؤں نکل کر اسے چھو لیتے اور شور مچاتے ہوئے بھاگ جاتے۔ وہ گاؤں کا مسلمان دکاندار تھا اور نرا احمق تھا اور لنگڑا ہونے کی وجہ سے بھاگ بھی نہ سکتا تھا۔ اب سارے گاؤں کا پتا چل جاتا کہ لالو بھرشٹ ہو گیا۔ پھر کیا تھا جناب، اب کوئی ہندو گاہک اس کی دکان کے پاس بھی نہ پھٹکے گا۔ وہ ہمیں گالیاں دیتا ہوا ندی کی طرف چلا جاتا اور کانپتا ہوا واپس آتا۔ ہم دور کھڑے ہو کر دیکھتے اور خوشی سے تالیاں بجاتے۔ ہمیں پتا تھا کہ یہ بات مستقل مذاق بن چکی تھی چنانچہ ہمیں اس کی سزا نہ ملے گی۔ کبھی کبھی بھرشٹ ہو جانے پر لالو خاموشی سے ہاتھ باندھ کر گلی کے درمیان کھڑا ہو جاتا: 'خدا کے لیے شور نہ کرو، کتو۔ آج بڑی سردی ہے، میں مر جاؤں گا۔' وہ کہتا، پھر دکان کھول کر ہمیں تھوڑا تھوڑا گڑ دیتا۔ 'اب اچھے لوگوں کی طرح چپ چاپ چلے جاؤ کتے کے بچو، شاباش۔' وہ کہتا، ہم خاموشی سے چلے آتے۔ اس طرح سے وہ ہماری اوپر کی آمدنی کا مستقل ذریعہ بن گیا۔ ہم گلیوں کی صفائی کا کام کرتے تھے اور گاؤں والوں کی مشترکہ جائداد تھے۔ گھروں کے اندر ہم بس مویشیوں کے احاطے تک جا سکتے تھے، گوبر اٹھانے کے لیے۔ دودھ دینے والے جانوروں کو چھونے کی اجازت نہ تھی۔ ہمارے برتن الگ تھے جن میں ہمیں اناج اور دوسری اجناس دی جاتیں اور ہمارا گھر گاؤں کے باہر جوہڑ کے کنارے تھا۔ آس پاس کوئی گھر نہ تھا، کھیتی باڑی کرنے کی ہمیں اجازت نہ تھی۔ جونہی ہم لوگ ہوش سنبھالتے گلیوں کی صفائی کے کام پر لگا دیے جاتے۔ میں ہوش سنبھالنے سے کچھ پہلے ہی کام پر لگ گئی۔ یہ بڑا عجیب واقعہ ہے۔ میرا ایک ابھائی تھا جو ماں باپ کے ساتھ کام پر جایا کرتا تھا۔ میں بہت چھوٹی تھی۔ مگر میرا یہ بھائی بڑا عجیب تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی بات پر باپ کے ساتھ لڑتا رہتا تھا۔ شاید وہ کام چور تھا۔ ہر روز میرا باپ گھسیٹ کر اسے گھر سے باہر نکالتا اور جھاڑو سے مارتا ہوا کام پر لے جاتا۔ لیکن وہ بڑا ذہین تھا۔ اسے سو تک گنتی فر فر یاد تھی جو میرے ماں باپ میں سے کسی کو نہ آتی تھی اور کھیتی باڑی ہمارا کام نہ تھا پر اسے ہر فصل کے بیجنے کاٹنے کے طریقے اور ان کے موسم یاد تھے، اور صرف سات دن کی بوئی ہوئی فصل کو دور سے دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ کون سی فصل کا کھیت

ہے اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں تھیں جن میں وہ گاؤں کے لڑکوں میں سب سے ہوشیار تھا۔ خیر ایک دن کیا ہوا کہ میرے باپ نے اسے خوب پیٹا اور وہ روتا روتا اور گالیاں دیتا ہوا سو گیا۔ رات کا جانے کیا وقت جب اس نے اٹھ کر مجھے کمر پر لادا اور باہر نکل آیا۔ میں بہت نیند میں تھی، جب میری آنکھ کھلی میں نے اپنے آپ کو اس کی پشت پر پایا۔ وہ جوہڑ کے کنارے کنارے چپ چاپ چلا جا رہا تھا۔ رات بڑی سنسان تھی اور جوہڑ کے پانی میں ستاروں کا عکس پڑ رہا تھا۔ ایک جگہ رک کر اس نے مجھے اتار دیا۔ 'اب میں نہاؤں گا' ۔ اس نے کہا اور کپڑے اتار کر پانی میں کود پڑا۔ دیر تک ڈبکیاں لگانے کے بعد وہ باہر نکل آیا اور ننگ دھڑنگ میرے سامنے ہو کر بولا۔ 'اب میں پاک ہوں، بتا؟' میری بالکل ناسمجھی کی عمر تھی، جو میری سمجھ میں آیا کہہ دیا اور میں نے کہا 'نہیں'۔ وہ خشمگیں نظروں سے مجھے گھورتا ہوا دوبارہ خاموشی سے پانی میں اتر گیا اور خوب مٹی مل مل کر نہایا، پھر باہر نکل کر اپنا سوال دہرایا۔ 'اب میں پاک ہوں؟ بتا' مجھے پتا تھا وہ پاک نہیں ہے۔ میرے دوبارہ نہیں کہنے پر اس نے زور کا چانٹا میرے گال پر رسید کیا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا۔ یہاں تک کہ میرے گال سنسنانے لگے اور مجھے لگا جیسے اب میں عمر بھر کے لیے بہری ہو گئی۔ مگر اس وقت خوف کے مارے چیخ بھی میرے حلق سے نکلی۔ اس نے خاموشی سے کپڑے پہنے اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر کے نزدیک پہنچ کر اس نے بڑے آدمیوں کی طرح پر ہاتھ باندھے اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ 'اب میں گنگا میں جا کر نہاؤں گا اور پڑھوں گا۔ مگر ایک نہ ایک دن میں ضرور واپس آؤں گا۔' یہ کہہ کر وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں بہت چھوٹی تھی لیکن اس رات اس نے جو کچھ کہا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں موجود ہے۔ اس رات بڑی سردی اور سناٹا تھا۔ اب میں اس کی جگہ پر کام کرنے لگی۔ کئی سال اس طرح گزر گئے اور کوئی خاص واقعہ نہ ہوا۔ صرف میری ماں ایک سال ہیضے میں مر گئی۔ اب میں اور میرا باپ دونوں رہتے تھے اور میں سیانی ہو چلی تھی۔ ایک روز گاؤں کے زمیندار نے مجھے اپنے مہمان خانے میں بلایا اور باقی سب لوگوں کو باہر نکال دیا۔ میں نے سوچا ہو نہ ہو کوئی گائے بھرشٹ ہو گئی ہے اور اب یہ مجھے جان سے مارنے والا ہے۔ لیکن اس نے مجھے اپنے پاس بٹھلا لیا اور بولا: 'اری پگلی، عورتوں کے ساتھ سونے سے بھی کوئی بھرشٹ ہوتا ہے؟' میں اس وقت بارہ برس کی تھی۔ شام کو خوش خوش وہاں سے لوٹ آئی۔ اب میں اس کے ساتھ رہنے لگی۔ مجھے پتا چلا کہ یہ ایک عام فہم، بلکہ بڑے قاعدے کی بات تھی۔ اور وہ شخص برا آدمی نہ تھ، موٹے جسم کا تندرست بڈھا تھا اور خوش مزاج تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مزدوری کیے بغیر مجھے اچھا کھانے کو اور پہننے کو ملا جاتا تھا اور میں آرام میں تھی۔ صرف کبھی کبھی جب وہ میرے اوپر سوار ہو کر پاگلوں کی طرح کودنے لگتا تو مجھے خطرہ ہوتا کہ اب میں کچل کر مر جاؤں گی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ اس نے مجھے ایک اور شخص کے سپرد کر دیا۔ یہ شخص بھی زمیندار تھا اور عمر میں ذرا کم تھا پر اسے بڑا گندہ پسینہ آتا تھا۔ بھئی کیا بدبودار شخص تھا۔ اس کے ساتھ لگنے

سے میرا بدن بھی خراب ہو جاتا اور مجھے کئی کئی بار نہانا پڑتا۔ اس کے بعد جس آدمی کے پاس میں رہی وہ بڑھا اور بالکل نکما آدمی تھا اور کسی کام کے لائق نہ تھا۔ میں نے تیسرے ہی دن اس کی داڑھی نوچ ڈالی جس پر اس نے مجھے پکڑ کا خوب مارا۔ کافی دنوں تک ایسے ہی چلتا رہا۔ اسی اثنا میں میرا باپ بڑھاپے سے مر گیا۔ اس کے چند روز بعد مدن کہیں سے آن وارد ہوا۔ یہ میرا بھائی تھا۔ اسے دیکھ کر میں بہت خوش ہوئی۔ ایک تو میں اکیلی تھی، دوسرے گاؤں کے لوگوں سے بالکل اکتا چکی تھی، اور پھر وہ میرا بھائی تھا۔ جب اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا تو میں خوشی خوشی اس کے ہمراہ جانے کو تیار ہو گئی۔ ایک روز شام کے وقت چپکے سے ہم نے گاؤں چھوڑ دیا۔ اس وقت جب ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے پرے جا رہے تھے اور پیچھے گاؤں کی دیواریں اندھیرے میں غائب ہوتی جا رہی تھیں تو ایک بار بھی میرے دل میں خیال نہ آیا کہ اب میں کبھی لوٹ کر یہاں نہ آؤں گی۔ کیسی عجیب بات ہے۔ اس گاؤں میں میں پیدا ہوئی تھی اور وہاں میرا گھر تھا۔ راستے میں مدن نے بتایا کہ وہ چھ برس تک سکول میں پڑھتا رہا تھا اور اس کے علاوہ بھی اس نے کئی کتابیں پڑھی تھیں جو سکول میں نہیں پڑھائی جاتیں اور یہ کہ اب وہ ایک بے حد اہم کام میں مصروف تھا اور اس کے ساتھ جو لوگ کام کرتے تھے جانتے تھے کہ وہ اچھوت ہے مگر کوئی اعتراض نہ کرتے تھے۔ میں یہ سن کو بہت خوش ہوئی۔ دو روز تک ہم جنوب کی طرف سفر کرتے رہے، اس کے بعد ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔ وہاں میں نے اس کے ساتھیوں کو دیکھا۔ وہ عجیب و غریب قسم کے لوگ تھے۔ نوجوان اور خطرناک۔ کافی دنوں بعد مجھے پتا چلا کہ یہ دہشت پسندوں کا گروہ تھا جو زیادہ تر گاڑیوں کو بارود سے اڑانے اور ڈاکخانوں کے تار کاٹنے کا کام کرتا تھا۔ یہ معلوم کر کے مجھے بہت افسوس ہوا کیونکہ مدن میرے لیے چھوٹے موٹے دیوتا کا درجہ رکھتا تھا، پر اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ یہ جگہ بہر حال گاؤں سے زیادہ دلچسپ تھی۔ اب ہماری زندگی خانہ بدوشوں کی طرح تھی۔ چند روز یہاں چند روز وہاں۔ ہم مستقل گاؤں گاؤں گھومتے تھے اور رات کے اندھیرے میں سفر کرتے تھے۔ وہ لوگ دن بھر اپنے ہتھیار صاف کرتے رہتے، رات کے لیے سکیمیں بناتے یا سوئے رہتے۔ وہ بڑے خطرناک طریقے پر بات کرتے اور کبھی کبھی بحث کے دوران ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے۔ اکثر وہ رات رات بھر باہر رہتے اور سحری کے وقت بھوکے اور بدحال ہو کر لوٹتے۔ پولیس ہر وقت ہمارے پیچھے لگی رہتی اور کبھی کبھی ہمیں نہایت عجلت میں کسی جگہ سے بھاگنا پڑتا۔ مجھ کو وہ کسی بات سے آگاہ نہ کرتے، صرف حکم دیتے۔ میں دل میں ان سے حسد کرنے لگی تھی اور میرا جی کرتا تھا کہ کسی روز میں بھی ان کے ساتھ جا کر وہ سب کچھ کر کے دکھاؤں جو وہ کرتے تھے اور مجھے علم تھا کہ میں وہ سب کر سکتی تھی مگر مجھے کبھی موقع نہ ملا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ رات کی مہم کے بعد جب وہ لوٹتے تو ایک آدھ آدمی ان میں سے کم ہوتا۔ مجھ کو وہ کچھ نہ بتاتے مگر مجھے پتا چل جاتا کہ وہ پکڑا گیا ہے یا مارا جا چکا ہے۔ یہ کاروبار ایسا ہی تھا، تم جانتے ہو، زندگی، موت، خطرہ، ان

وقتوں میں یہ چیزیں معمول بن گئی تھیں۔ مجھے کبھی پتا نہ چل سکا کہ کن لوگوں کی خاطر یہ گروہ کام کررہا تھا لیکن ایسا ہوتا کہ چندروز کے بعد کم ہونے والے کی جگہ کوئی اور آ کر لے لیتا اور کوئی محسوس نہ کرتا۔ مجھے مدن کا بڑا خطرہ رہتا۔اسی زمانے میں ایک شخص ہمارے ساتھ آ کر رہا۔وہ بڑا عجیب شخص تھا۔بہت کم وہ ان لوگوں کے ساتھ باہر کام پر جاتا،صرف بیٹھا ہوا بحث کیا کرتا۔میری اس کی دوستی ہوگئی۔وہ ان سب میں دلکش اور پرامن تھا۔وہ پہلا ہی شخص تھا گاؤں چھوڑنے کے بعد میں جس کے ساتھ سوئی اور وہ پہلا ہی شخص تھا جس کے ساتھ مجھے دل سے محبت ہوئی تھی۔گو چندروز بعد وہ ہمیں چھوڑ کر بھاگ گیا لیکن مجھے اب تک یاد ہے۔پہلا شخص جسے ہم دل سے پیار کرتے ہیں ہم کبھی نہیں بھولتے ،بعد میں آنے والے سب لوگوں میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔تم بالکل اس کی طرح چلتے ہو۔اس کے جانے کے چند مہینے بعد ایک روز جب میں اکیلی اندھیرے میں بیٹھی تھی اور سب لوگ باہر جا چکے تھے تو اچانک مجھے ایک بڑا خوفناک خیال آیا،کہ اب میں ہمیشہ کے لیے بچہ جننے کے قابل نہیں رہی۔اس رات بڑے زور سے،بڑے دکھ کے ساتھ روتی رہی اور پہلی بار گاؤں کے ان سب لوگوں کو کوسا جن کے ساتھ میں رہ چکی تھی۔اس وقت میں پندرہ برس کی تھی۔یوں سوچو تو ہنسی آتی ہے۔پھر وہ ہوا جس کا مجھے ہمیشہ سے اندیشہ تھا۔ایک روز مدن واپس نہ آیا۔وہ کبھی واپس نہ آیا۔میں تھوڑا سا روئی پھر ٹھیک ہوگئی۔کیا ہوسکتا تھا۔اس حادثے کے لیے میں بڑے عرصے سے تیار تھی۔چند مہینے اسی طرح گزر گئے۔میں نے زیادہ مضبوطی سے اپنے آپ کو گروہ کے ساتھ وابستہ کر دیا۔پھر ایک شخص ٹھاکر ہمارے ساتھ آ کر رہا۔اس نے ایک روز مجھ سے کہا:'تم ہندو ہو جاؤ میں تمھارے ساتھ شادی کرلوں۔''کیا فرق پڑتا ہے؟'میں نے کہا۔پھر انھوں نے خود ہی کسی طریقے سے،جواب مجھے یاد نہیں رہا،مجھے ہندو کیا اور میری شادی کردی۔مجھے اس سے دلچسپی نہ تھی،مگر اس بات سے مجھے بڑی عجیب سی خوشی ہوئی کہ عمر میں پہلی بار باقاعدہ میری شادی ہورہی تھی۔کچھ عرصے بعد وہ بھی مارا گیا۔اب گروہ ٹوٹنا شروع ہوا۔یہ لوگ اپنی جانوں پر کھیل رہے تھے۔میری کون پروا کرتا تھا۔کچھ مارے گئے،کچھ پکڑ لیے گئے حتیٰ کہ ایک روز میں اکیلی رہ گئی۔شیلا ٹھاکر میرا نام تھا۔''(۸۰)

بعد میں شیلا نے ایک مسلمان لال سے شادی کی جو ایک مل میں ٹائم کیپر کا کام کرتا تھا،شیلا کا نیا نام بانو رکھا گیا۔لال سے اس کا ایک بیٹا ہوا جس کا نام کمال رکھا گیا،کمال فسادات میں بانو سے بچھڑ گیا اور علی نے بانو سے شادی کرلی،اور وہ کمال کا انتظار کرنے لگے۔

اس طویل اقتباس میں صرف بانو کی کہانی نہیں بلکہ ہندوستانی سماج میں ذات پات کے نظام پر ایک گہرا طنز ہے جس میں دلت،اچھوت اور شودروں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔معاشرے میں انھیں زندہ رہنے کا حق نہیں دیا جاتا۔انھیں انسان نہیں بلکہ ذاتی استعمال کی چیز سمجھا جاتا ہے۔گریز میں اس غیر انسانی سلوک کو بڑی وضاحت

کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

مہندر سنگھ کا سامنے آتی ہوئی لڑکی کے ساتھ اندازِ بیاں ملاحظہ ہو:

''کہاں سے آ رہی ہو؟'۔

'بھاپے کو روٹی دے کے۔'

'مجھے بھی بھوک لگی ہے۔'

'تمھاری ماں مرگئی ہے؟' لڑکی نے مصنوعی غصے سے کہا۔

'تم اپنے بھاپے کی ماں ہو؟' وہ ہنسا۔

'دانت مت دکھاؤ۔ مجھے جانے دو۔'

مہندر سنگھ نے چھاچھ کا مٹکا اس کے سر سے اچک لیا۔ وہ خالی تھا۔ 'تیرا باپ بڑا پیٹو ہے۔ ساری لسی پی گیا' وہ مٹکا لڑکی کے پیٹ میں مار کر بولا۔ وہ ذرا سا جھکی اور مٹکے کو اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

'چنگیر نہیں دکھاؤ گی۔' وہ پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔

'تیری ماں بھی دکھائے گی۔' اس نے گالی دی اور کندھا لڑکی کے سینے میں چبھویا۔ وہ چھاتی اور ہاتھوں کے زور سے دھکیلتی ہوئی اسے دور تک لے گئی۔ اس پر مہندر سنگھ نے کچکچا کر زور لگایا اور الٹے پاؤں اسے واپس لے آیا۔ دونوں کے چہرے سے پسینہ نکل رہا تھا۔ ہوا سے لڑکی کی دھوتی کا ایک پلو اڑ رہا تھا اور اس کی مضبوط، گندمی ران دکھائی دے رہی تھی۔

'چلو' مہندر سنگھ نے ٹھوڑی سے کھڑی ہوئی فصل کی طرف اشارہ کیا۔

'نہیں۔ سؤر۔' لڑکی نے ناخن اس کے کندھوں میں گاڑ دیے۔

'مجھے جانے دو۔'

لیکن وہ اسے دھکیلتا ہوا فصل کے اندر لے گیا اور بے شرمی سے ہنستے ہوئے دو دفعہ 'چلو۔ چلو' کہا۔

'تمھارا بھاپا بیٹھا ہے۔ اسے بلاؤں؟' لڑکی نے رک کر کہا۔

'وہ کیا کرے گا؟'

'تمھاری ہڈیاں توڑے گا۔'

'وہ ہمیں نہیں ڈھونڈ سکتا۔'' (۸۱)

مہندر سنگھ جب اپنی بھابی کے ساتھ قتل کے واردات سے واپس آ کر ایک کھیت سے چارہ چوری کر رہا ہوتا ہے تو وہ منظر ملاحظہ ہو:

''تو کہاں جا رہی ہے؟ مہندر سنگھ بلم کا چوبی دستہ کلدیپ کور کے پیٹ میں گاڑ کر بولا۔ خاوند کے ساتھ سونے

کے لیے اب کوئی وقت نہیں۔ چل، چارہ کٹوا' جوگندر سنگھ کھیت کے کونے پر جا کر رکا، چند منٹ تک اندھیرے میں اپنی بیوی اور بھائی کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا، پھر زیرِ لب گالیاں دیتا ہوا چلا گیا۔ پگڑی میں اڑسی ہوئی درانتی نکال کر مہندر سنگھ نے کھیت کے درمیان سے چارہ کاٹنا شروع کیا اور مشین کی سی تیزی سے جگہ خالی کر دی۔ کلدیپ کور گٹھے باندھ باندھ کر ٹوکری میں بھرتی گئی۔ سبز، نمدار چارے کی بو اُن کے کے ارد گرد منڈلا رہی تھی۔ رات تاریک اور سرد تھی۔ بادلوں نے ہوا تقریباً بند کر رکھی تھی۔ دریا کا ہلکا شور دور سے ان کے کانوں میں آ رہا تھا۔ ایک سایہ کھیت کے کونے پر نمودار ہوا اور مہندر سنگھ لیٹ گیا۔ 'لیٹ جا'۔ اس نے سرگوشی کی۔ کلدیپ کور لیٹ گئی۔ نیم تاریکی میں اس کا ابھرا ہوا سینہ مہندر سنگھ کو نظر آ رہا تھا۔ سایہ، جو کوئی پانی لگانے کو جاتا ہوا کسان تھا، ہاتھ میں کدال پکڑے خاموشی سے گزر گیا۔ 'تیرا سینہ چارے کے اوپر دکھائی دے رہا تھا۔ اوندھے لیٹا کر' مہندر سنگھ نے کہا۔ 'اگر دیکھ لیتا ماں کا یار تو' 'تو ایک اور سہی'۔ کلدیپ کور نے کہا 'تمھارا بلم تو ابھی ثابت ہے۔'' 'بک بک مت کر، ادھر آ'۔ وہ آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ 'چلو چلیں۔ سویر ہونے والی ہے۔' مہندر سنھگ نے اس کے سخت سینے پر ہاتھ رگڑا۔ 'جانور'۔ وہ اندھیرے میں چیخی۔ 'تھک گیا ہو'۔ اس نے باہیں پھیلا کر سرد چارے پر لوٹ لگائی۔ 'مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' 'ادھر آ'۔ وہ اس کے برابر لیٹ گئی۔ 'اب بھی سردی لگتی ہے؟' مہندر سنگھ نے اسے کس کر اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا' بتا۔ اب بھی لگتی ہے؟'۔ 'نہاتے نہیں ہو'۔ 'نہیں'۔ 'تمھارے سر سے بو آ رہی ہے۔'' 'حرام زادی'۔ 'مت دبا' وہ دانتوں کے درمیان چیخی 'میری سانس رک رہی ہے۔' وہ ہنسا' میں اور بھی زور سے دبا سکتا ہوں۔'' 'سوّر۔ تم مجھ سے زیادہ زور آور نہیں ہو۔'' 'میں سب سے زیادہ زور آور ہوں۔' وہ ہنسا اور ٹانگیں اس کی ٹانگوں میں پھنسا کر لوٹنے لگا۔ ایک دوسرے سے جڑے دونوں دیر تک لوٹتے ہوئے چلے گئے۔ نرم سبز چارہ ان کے نیچے دبتا اور سر اٹھاتا رہا۔ 'جانور۔ بیل کی اولاد۔ چھوڑ مجھے'۔ وہ رک رک کی بولی۔ 'میں سب سے زیادہ طاقت ور ہوں۔'' 'جوگندر تم سے زیادہ زور آور ہے۔'' 'تیری ماں کا یار وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے؟'' 'اس نے آج سب کاٹے ہیں۔'' 'حرام زادی۔' اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ 'غلط ہے یہ؟'۔ 'سوّرنی، تیرے باپ تھے جوان کا رونا روتی ہے؟' تھوک اس کے نرخرے میں اٹک گیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ 'رات حرام کردی'۔۔۔۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو صبح کا ستارہ منڈیر کے پاس چمک رہا تھا اور اس کی ساس لکڑی کی بالٹی اٹھائے گائے دوہنے کے لیے جا رہی تھی۔ 'اتنی دیر لگا دی۔'' 'اپنے بیٹوں کو تھوڑا دیا کر نا کھانے کو۔ کتے کی طرح ہر وقت تنگ کرتے ہیں۔' اس نے کہا اور سیدھی کھاٹ پر چلی گئی۔'' (۸۲)

نعیم کی سوتیلی ماں نعیم کے سامنے بچے کو دودھ پلا رہی ہے:

''لڑکا ہلا اور آنکھیں بند کیے کیے رونے لگا۔ ماں نے گریبان کھول کر بڑی سی، گندمی، دودھ سے بھری ہوئی چھاتی اس کے منہ میں دے دی۔ 'تم بھی میرے بیٹے ہو۔ ایلی بھی۔ تم دونوں کا خون ایک ہے۔''(۸۳)

شیلا دہشت پسند مدن کی بہن ہے، جب نعیم دہشت پسند گروہ میں شامل ہوتا ہے تو شیلا اس سے محبت کرنے لگ جاتی ہے۔اس کے ساتھ نعیم کی ہم بستری کا ایک منظر:

''دیر تک وہ دونوں برابر لیٹے رہے۔ان کی سانسوں کی ہلکی پھنکار کمرے میں بلند ہو رہی تھی۔انھوں نے ایک دوسرے کے جوان، صحت مند جسموں کی حرارت ہونٹوں سے لے کر پاؤں کی انگلیوں تک رینگتی اور سارے کمرے میں پھیلتی ہوئی محسوس کی۔''(۸۴)

ان اقتباسات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مغربی تہذیب میں جس طرح ہمیں جسم کا استعمال کھلم کھلا ملتا ہے، مشرقی تہذیب میں اس کو چھپا کر کیا جاتا ہے۔شیلا کی اپنے بھائی کی موجودگی میں غیر مرد کے ساتھ جسمانی تعلقات استوار کرنا جنسی بے باکی کا ایک نمونہ ہے۔

اسلوب

لندن کی ایک رات میں نہ صرف انگریزی الفاظ کا استعمال ہے بلکہ اس کے کردار بھی انگریزی زبان کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔گریز کے اسلوب میں انگریزی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی الفاظ کا بھی استعمال ملتا ہے، نہ صرف ناول نگار نے اس زبان کو استعمال کیا ہے بلکہ کرداروں کے مکالموں میں بھی اسے استعمال کیا گیا ہے۔ان دونوں ناولوں کے برعکس اداس نسلیں میں تو انگریزی الفاظ کا استعمال ملتا ہے لیکن اس کے کرداروں کی زبان میں انگریزی الفاظ کا استعمال کم ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ لندن کی ایک رات تو لکھا ہی لندن کے پس منظر میں گیا ہے جب کہ گریز میں کردار جس مقام پر رہتے ہیں وہ ہندوستان بھی ہے اور ہندوستان سے باہر بھی۔لندن کی ایک رات اور گریز میں زیادہ تر کردار پڑھے لکھے ہیں لیکن اداس نسلیں میں پڑھے لکھے کرداروں کے ساتھ ساتھ ان پڑھ کردار بھی ہیں اور یہ ناول روشن پور نامی گاؤں کے پس منظر میں لکھ گیا ہے، اس لیے اس میں ہندوستان کی شہری زندگی کے ساتھ ساتھ زیادہ تر دیہات کی زندگی کی تفصیلات ملتی ہیں۔

مذکورہ تینوں ناولوں میں نہ صرف اس اس دور کی زبان میں بولے جانے والے بدیسی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے بلکہ ان کے کردار بھی جدید تعلیم کے زیر اثر بدیسی زبانیں بولتے یا استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔

لندن کی ایک رات:

''رسل اسکوائر کے 'انڈر گراؤنڈ اسٹیشن' کی گھڑی پر بار بار اعظم کی نظر جاتی ہے''۔(۸۵)

''مسٹر اعظم آپ سے کوئی ٹیلی فون پر بات کرنا چاہتا ہے۔''(۸۶)

''میں نے جواب دیا 'تھینک یو میری' اور یہ کہہ کر ٹیلی فون سننے گیا۔'کون ہے؟' میں نے کہا، گو کہ مجھے معلوم تھا۔''(۸۷)

''میں ہوں ڈارلنگ۔''(۸۸)

''ٹیلی فون رسیور کو اس کے خانہ میں رکھ دوں اور اس گفتگو کا خاتمہ کر دوں۔''(۸۹)

''لیکن ٹیلی فون کی آواز سن کر جھوٹ اور سچ کی تمیز کرنا بہت دشوار ہے۔''(۹۰)

''اچھی بات ہے، جین، کل بارہ بجے تمھارے ٹیلی فون کا میں انتظار کروں گا۔ گڈ نائٹ۔''(۹۱)

''منہ پر پوڈر لگا ہو۔''ا(۹۲)

''اعظم نے اپنے کمرے میں پہنچ کر گیس جلائی، ٹوپی اتار کر پلنگ پر پھینکی اور بغیر اوورکوٹ اتارے آتش دان کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔''(۹۳)

''جہاں انگلستان کے ذہنی انقلابی، آرٹسٹ، غریب، مصنف، وہ سب لوگ جو ایک روحانی خلا میں معلق ہیں۔''(۹۴)

''چلو 'پب' میں چلتے ہیں، ایک ایک گلاس 'بیر' پئیں۔ پھر نعیم کے ہاں چلتے ہیں۔''(۹۵)

''اس میز میں اندر کی طرف نل لگے ہوتے ہیں جن میں سے گلاس بھر بھر کر بیئر ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو بوتل میں بھری ہوئی شرابیں نہیں پینا چاہتے۔''(۹۶)

''لندن میں چاند کتنا برا معلوم ہوتا ہے۔''(۹۷)

''رات کو میں ایک قہوہ خانے میں گئی، اس گاؤں کا قہوہ خانہ، رسٹوران، ناچ گھر سب کچھ وہی تھا۔''(۹۸)

''ان کے گرد تین تین، چار چار کرسیاں اور ایک طرف ذرا سے اونچے حصہ پر ایک پیانو، اور ایک ڈھول اور ایک وایلن بجانے والا باجہ بجا رہا تھا۔''(۹۹)

''سراج الدولہ اور 'بلیک ہول' کے ہولناک قصے پڑھ پڑھ کر اور ہندوستانیوں اور 'کالے آدمیوں' کی برائیاں سن سن کر میرے ''دل میں ہر سیاہ فام انسان کی طرف سے کچھ خوف سا بیٹھ گیا۔''(۱۰۰)

''جب میں کالج میں داخل ہوئی تو میں نے ہندوستانی طالب علموں سے ملنے کی خاص طور پر کوشش کی۔''(۱۰۱)

''گراموفون بجنے لگا۔''(۱۰۲)

''کوئی صرف لمنیڈ یا شربت پی رہا تھا، کسی نے صرف سگرٹ پر قناعت کی تھی۔ ہر تین چار منٹ کے بعد ایک ریکارڈ ختم ہو جانے پر باجہ بجنا رُک جاتا۔''(۱۰۳)

''پیرس، اگر اس وقت میں وہاں ہوتا تو اچھا ہوتا۔''(۱۰۴)

''فرانک بالکل مفت میں خرچ کر ڈالے۔''(۱۰۵)

''تاریک گلی تھی اور دروازے پر سرخ لیمپ لگا ہوا تھا۔'' (۱۰۶)

''وہ چلتے چلتے برٹش میوزیم کے پیچھے آ گئے۔ایک طرف لندن یونی ورسٹی کی نئی عمارتیں بن رہی تھیں۔آدھی بنی ہوئی دیواریں، سیڑھیاں، مچانیں اور پتھر اٹھانے والے 'کرین' لکڑی کی چار دیواری کے اندر سے اوراٹھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔'(۱۰۷)

''میوزیم کے اونچے اونچے کھمبے اور نیچے چبوترے پر بیچوں بیچ میں دو پتھر کے بڑے بڑے شیر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔'' (۱۰۸)

''جب امتحان کا وقت آئے تو اس کے قلم سے اور اس کی زبان سے ایک حرف بھی ایسا نہ نکلے جس سے امپیریلسٹ ممتحنوں کو کسی قسم کا اختلاف ہو سکے۔'' (۱۰۹)

''ول منشی! کیا آج تم لوگوں کا بڑا دن ہے؟'' (۱۱۰)

''اخبار کی دوکان کے سامنے بڑے بڑے اشتہار لگے ہوئے تھے۔'' (۱۱۱)

''ٹائمز، ڈیلی میل، مارننگ پوسٹ، ڈیلی ٹیلیگراف وغیرہ۔'' (۱۱۲)

''فٹ بال کے میچ کے نتیجے،' میچ کے آخری نتیجے' اخبار بیچنے والے پکار رہے تھے۔'' (۱۱۳)

''اس شراب کے گلاس کو تو ذرا دیکھو۔'' (۱۱۴)

''دس انگریزی سپاہیوں نے دس ہزار نیٹوز کو فساد کرنے روکا، ایک گورا زخمی ہوا اور پندرہ نیٹوز کی جان گئی۔'' (۱۱۵)

''یہ انگریز مزدور غالباً اتنے احمق نہیں جتنا انگلستان کے اخبار، ڈیلی میل وغیرہ۔'' (۱۱۶)

''ول جم، تمھارا کیا خیال ہے؟'۔'' (۱۱۷)

''وہ مہذب گورنمنٹ کہلانے کے لائق نہیں۔'' (۱۱۸)

''برٹش امپائر کا خیال کر کے میری رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگتا تھا۔'' (۱۱۹)

''میں ہندوستانیوں کو 'کالا لوگ'، 'نگر'، 'نیٹو' کہہ کر خطاب کرتا تھا۔'' (۱۲۰)

''انگریز دنیا بھر میں گولیاں چلا کر اور آسمان سے بم برسا کر تہذیب پھیلانا اور صلح اور امن قائم رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔'' (۱۲۱)

''لیکن اس درمیان میں یورپ کے معاشی نظام میں زبردست انقلاب ہو گیا جس کا اثر یہاں کے سماجی اور سیاسی نظام پر پڑا۔اس وجہ سے یورپین ذہنیت میں بھی انقلاب واقع ہوا۔'' (۱۲۲)

''تم سب کے سب رئیس بنئے، مہاجن، بیرسٹر، وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر، سرکاری نوکر، جونک کی طرح ہو اور ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں کا خون پی کر زندہ رہتے ہو۔'' (۱۲۳)

گریز:

''ایک موٹا لحیم شحیم جرمن رہتا تھا جو اڈالف ہٹلر کے پردادا کا رشتے کا بھائی تھا۔'' (۱۲۴)

''اور ظاہر ہے تمھاری محبوبہ کو اس موٹے بیئر پینے والے جرمن سے نفرت تھی؟'' (۱۲۵)

''جتنا چاہنا اتنا فیشن کرانا اس سے زیادہ نہ بڑھنے دینا۔'' (۱۲۶)

''یہ زندگی کا ڈرامہ تھا۔'' (۱۲۷)

''ایک منٹ کے اندر انسانی جسم کی شکست، چند لمحوں میں موت۔'' (۱۲۸)

''برتھا اکسل سن کی ہرجائی نگاہوں، ایلس کی وفا اور بے وفائی، بلقیس کے متعلق شاعرانہ تخیلات، میری پاول کے عشق، کرا کسلے اور ہروشا کی دوستی، خانم کی دنیاداری سب کھیل تھے۔'' (۱۲۹)

''وہاں دو الگ الگ کیمپ ہیں۔'' (۱۳۰)

''ایک اجنبی کئی گھنٹے ٹریفالگر اسکوائر میں نیلسن کے مجسمے کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ لندن کا ایک خاموش اور باوقار پولیس مین اسے دیکھتا رہا۔'' (۱۳۱)

''موں مارتر کی پہاڑی سے تینوں نے پیرس کو دیکھا۔'' (۱۳۲)

''اس نے بجائے میترو سے جانے کے ٹیکسی لی تاکہ جلد پہنچ سکے۔'' (۱۳۳)

''اوتل وپیری روشنیوں اور شراب کے گلاسوں سے جگمگا رہا تھا۔'' (۱۳۴)

''امیر فیشن ایبل بوڑھیاں، شانے ہلا ہلا کے باتیں کرنے والے فرانسیسی۔'' (۱۳۵)

''اعلیٰ ترین قسم اور قیمت کے ڈنر جیکٹ پہنے ہوئے انگریز جن کے ایک ہاتھ میں گلاس ہوتا۔'' (۱۳۶)

''اور دوسرا ہاتھ پتلون کی جیب میں اور ان کا اعلیٰ پبلک اسکول کا لہجہ۔'' (۱۳۷)

''ان سب کو دیکھتا ہوا نعیم ہوٹل کے کاؤنٹر کے قریب بڑھا۔'' (۱۳۸)

''اسی شہر میں لودر بھی ہے اور قومی کتب خانہ بھی۔ یورپ کی قدیم ترین یونی ورسٹی بھی ہے اور دنیا بھر سے چنے ہوئے آرٹ کے نادر نمونے بھی۔'' (۱۳۹)

''مسز سمپ سن دو بار طلاق لے چکی تھی۔'' (۱۴۰)

''نعیم نے بہت سے انگریز دوستوں کے ساتھ ایڈورڈ ہشتم کی دست برداری کی تقریر سنی۔'' (۱۴۱)

''لندن کے ہوٹل اور قہوہ خانے ہندوستانیوں سے بارونق ہو رہے تھے۔ ایک بہت بڑے ہوٹل نے ایک نیا سوپ (شوربہ)

ایجاد کیا۔'' (۱۴۲)

''تاج پوشی سے ایک شام پہلے یعنی ۱۱ مئی کی شام کو مغربی لندن میں عجب بہار تھی۔'' (۱۴۳)

''اس زمانے میں کئی اینگلو انڈین عورتوں نے بورڈنگ ہاؤس کھول رکھے تھے۔'' (۱۴۴)

''ان کے بچے ان کو پاپا اور اپنی ماؤں کا ماما یا ممی کہا کرتے۔'' (۱۴۵)

''انگریزی اتنی اچھی بولنے لگتے کہ یونی ورسٹی کے گریجوایٹ کو ان بچوں کے سامنے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ (۱۴۶)

سب سے اچھا بورڈنگ ہاؤس وہی ہے جس کی فیس سب سے زیادہ ہو۔'' (۱۴۷)

''انھی میں ایک بورڈنگ ہاؤس کا نام کارنش کلف Cornish Cliff تھا۔'' (۱۴۸)

''میڈم جب ٹوٹی پھوٹی اردو میں باتیں کرتیں تو عاقل خاں اس اعزاز سے پھولے نہ سماتے۔'' (۱۴۹)

''جب اسے دیکھنے کارنش کلف جاتیں تو چاکلیٹ لے جاتیں۔'' (۱۵۰)

''کئی دفعہ ڈانس میں لے گیا تھا۔'' (۱۵۱)

''اب سکندر آباد میں ایک اینگلو انڈین عورت کو گھر میں ڈال لیا ہے۔'' (۱۵۲)

''نعیم نے ٹائمز کے ایک کونے میں گوشے میں ہندوستان کے متعلق ایک چھوٹی سی خبر پڑھی۔ پھر سوچنے لگا کہ برطانوی پبلک ہندوستانی معاملات کے متعلق کس قدر تاریکی میں رکھی جاتی ہے۔'' (۱۵۳)

''برہم پتر کا سیلاب اور ڈپٹی کمشنر صاحب کا غصہ۔ دونوں کی اپیل نہ سرکار کے پاس تھی نہ خدا کے پاس۔'' (۱۵۴)

''کرسمس میں کلکتہ کا سفر، چورنگی کے ہوٹلوں میں ناچ۔'' (۱۵۵)

''اور سینکڑوں نوجوان جو آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں فیل ہوتے ہیں، عمر بھر اس کا ماتم کرتے رہتے ہیں۔'' (۱۵۶)

''ٹرام سے اتر کے جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچی تو راستے کے لیمپ کی دھندلی روشنی میں۔'' (۱۵۷)

''اور اسے گوئٹے اشتر سا اپنی پاں سیاں کو چلنے کو کہا۔ فریڈا نے کہا 'بہت دیر ہوگئی ہے۔'' (۱۵۸)

''بلقیس کچھ دیر بعد آئی۔ اس کی قمیص کا ایک بٹن کھل گیا تھا۔'' (۱۵۹)

''دوسرے درجے کے عرشے پر راجہ ہمت نواز ونت بہادر مسز چند سے باتیں کر رہے تھے۔'' (۱۶۰)

''اپنے دل میں کہا کہ یورپ میں ایسے ہزاروں منظر دیکھنے میں آئیں گے۔'' (۱۶۱)

''پہلے درجے میں ہم لوگ ان کے پاس پہنچے تو بیر کا شغل فرما رہے تھے۔ ضیافت کرنا چاہی تو میں نے معافی چاہی۔ میرے لیے لیمونیڈ منگوایا اور کہا یہ تو عورتوں کے پینے کی چیز ہے۔ ان کے درجے میں ایک امریکن لڑکی سفر کر رہی تھی۔'' (۱۶۲)

''میں درجہ اول میں سید ھا راجہ صاحب کے کیبن میں پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔'' (۱۶۳)

''اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی اور مسز چند کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔'' (۱۶۴)

''کل اسے پچاس پونڈ دئے تھے۔'' (۱۶۵)

''مسٹر چند اس وقت پورٹ سعید کی سیر فرمارہے تھے۔'' (۱۶۶)

''مسٹر چند کو اس کا ہلکا رنگ سانولا رنگ اور اس کی مسکراہٹ بہت اچھی معلوم ہوئی۔'' (۱۶۷)

''وہ اٹھ کر ان کی میز پر آئی اور ان سے پوچھا وُلے وہ فیرامواَوک موآ؟'' (۱۶۸)

''پھر انگریزی میں معاملہ طے ہوا اور وہ ایک پونڈ قرار پایا (پچاس پونڈ راجہ صاحب نے دیئے تھے)۔ اور پھر مسٹر چند لڑکی کو ہوٹل میں لے گئے اور کمرے کا کرایہ پانچ شلنگ ادا کیا۔'' (۱۶۹)

''اگر وہ سانڈوچ لینے سے انکار کر دیتا تو اس عورت سے ایک طرح کا نفسیاتی بُعد پیدا ہو جاتا۔'' (۱۷۰)

''جیسے ان کی بہنوں کی ٹانگیں پیرس یا نیویارک کے کسی ایسے نائٹ کلب میں جہاں وہ لکھ پتیوں کا شکار کھیلتی ہیں۔'' (۱۷۱)

''ٹیکسی میں خوب بوس و کنار ہوا۔'' (۱۷۲)

''کل پھر وہ ضد کر کے، اپنے بورڈنگ ہاؤس چلی گئی۔'' (۱۷۳)

''آج کامیڈی فرنسیز چل رہی تھی، مگر آج بھی کامیابی کی امید کم ہی تھی۔'' (۱۷۴)

''اسی شام کو نعیم ایلس کو فولی برژیر لے گیا۔ محض اپنے حملے کے لیے نفسیاتی ماحول کو ٹھیک بنانے۔ وہاں ایک نائٹ کلب کو جہاں تقریباً برہنہ لڑکیاں ناچ رہی تھیں اور ایک شخص بڑی جاندار آواز میں شہوت انگیز فرانسیسی گیت گا رہا تھا۔'' (۱۷۵)

''ایلس نے گھر جانے پر اصرار کیا تو نعیم نے کہا۔ 'بہت دیر ہو چکی ہے۔ کوئی ٹیکسی ملے گی نہیں اور پیدل چلیں تو دیر لگے گی۔'' (۱۷۶)

''یہ وہ نسخہ تھا جسے یورپ بھر میں لاکھوں بار دہرایا جا چکا تھا۔'' (۱۷۷)

''جب پلنگ پر اس کا منگیتر اس سے لپٹ رہا تھا تو نیند اور شامپین کے اثر میں وہ اسے ہٹاتی کیسے؟'' (۱۷۸)

''لیکن خود اس کا جسم اور اس کے خون کی حدت، نعیم سے اور شامپین کے اثر سے سازش کرنے لگے۔'' (۱۷۹)

''نعیم بلانکٹ کے اندر آ گیا۔'' (۱۸۰)

''شکریہ۔ ڈارلنگ'۔ نعیم نے کہا۔'' (۱۸۱)

''ٹیکسی کے اڈے پر پہنچ کے اس نے آہستہ سے کہا 'اسفانکس' کیونکہ پیرس کے قحبہ خانوں میں صرف اسی کے متعلق اس

کا خیال تھا کہ یہاں بیماریوں کا زیادہ اندیشہ نہیں اور یہاں کی چند لڑکیاں اسے پسند تھیں۔ سوفر نے کہا' دی۔ مسیو' اور انجن اسٹارٹ کیا۔'' (۱۸۲)

'' پیرس کے باغات، عجائب خانے، اور لندن اور ہندوستان اور حیدرآباد، اور حیدرآباد کی سیمنٹ کی سڑکیں، اور سیندھی پینے والے امراء، اور فرانس میں شامپین پینے والے سیاح اور ہزاروں لاکھوں طالب علم۔ ان سب کے درمیان اب وہ پھر تنہا رہ گیا۔ بالکل تنہا۔'' (۱۸۳)

'' پھر اشتوک ہولم میں آدھی رات کو ایک ایکٹرس کے چھوٹے چھوٹے پستان اور بے طلف بوسے۔'' (۱۸۴)

'' ہائیڈل برگ کے پرانے قلعے کا رہبر مسافروں کی جمگھٹ میں ہر کمرے اور کمرے کی ہر دلچسپ چیز کے متعلق تقریر کر رہا تھا۔'' (۱۸۵)

اداس نسلیں:

'' بگھی سے اترے تو انھوں نے دیکھا کہ لمبی ڈرائیو پر، جو سامنے والے برآمدے تک جاتی تھی، تازہ سرخ بجری بچھائی گئی تھی۔'' (۱۸۶)

'' بہت سارے لڑکے لڑکیاں کھڑے نیپکن بنا رہے تھے۔'' (۱۸۷)

'' برآمدے کے سامنے وسیع لان میں میزیں اور کرسیاں لگائی جا رہی تھیں۔'' (۱۸۸)

'' ایاز بیگ نے کونے میں ایک کرسی گھسیٹی اور کیمرہ نکال کر رات کی تصویریں لینے کے لیے اسے تیار کرنے لگا۔'' (۱۸۹)

'' ابھی تک جو لوگ آ چکے تھے ان میں زیادہ تر غیر ملکی تھی۔ چند ایک نے اونچے سیاہ ہیٹ اور ٹیل کوٹ پہن رکھے تھے۔ باقی نے، جو زیادہ تر نوجوان طبقہ تھا۔ شام کا سیاہ چست لباس پہن رکھا تھا اور سر سے ننگے تھے۔ تقریباً سبھی خاموش بیٹھے سگریٹ اور موٹے موٹے سگار پی رہے تھے۔ عورتوں نے بند گلے کے چست فراک پہن رکھے تھے۔'' (۱۹۰)

'' گزشتہ ماہ میں نے پیرس میں ایک خاتون سے سیکھا تھا۔'' انھوں نے پتوں کی تقسیم سے غیر مطمئن ہو کر تاش اپنے سیکرٹری کو پکڑائے اور خود چیف کمشنر کو کھیل کے ابتدائی اصول سمجھانے لگے۔ ساتھ بیٹھی ایک انگریز خاتون بھی دلچسپی لینے لگی۔ سیکرٹری ماہرِ فن کی طرح تاش لگا رہا تھا۔'' (۱۹۱)

'' نواب صاحب کے خاص ملازم نے ایک رائفل اور ایک بڑی سی پستول، جس کے پیچھے لکڑی کا دستہ لگا تھا، لا کر اسے پکڑائی اور وہ تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا کچھ کہنے لگا۔۔۔۔۔ افوہ یہ جرمن۔ کمبخت ایسی مشین بناتے ہیں! اب دیکھیے اس ساری پستول میں آپ کو ایک بھی کیل (rivet) نظر نہ آئے گی۔ سارا ویلڈنگ کا کام ہے۔ یہ اصل مرد کا کھیل ہے۔ یار

سال شیر کے شکار کو چیف کمشنر کے ساتھ جو میں بنگال گیا۔'' (۱۹۲)

''بس ایسی ہی ایک پارٹی تھی جیسی آج ہے۔ بڑے شاندار لوگ تھے۔ خوبصورت اور آپ ٹو ڈیٹ، خوبصورت باتیں تھیں، خوش گپیاں تھیں۔'' (۱۹۳)

''یہ تو زیادتی ہے، مسٹر گوکھلے۔ میں بھی پریس کی طرف سے وہیں تھا۔ اچھی خاصی کانفرنس تھی۔'' (۱۹۴)

''اُس کی سیاست کے متعلق تو چیف کمشنر آپ کو بہتر بتا سکتے ہیں۔ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے میں کہتا ہوں کہ وہ اچھا اخبار نویس بھی نہیں۔'' (۱۹۵)

''اتنے سال ہو گئے'' کینٹین والے نے مایوسی سے کہا۔'' (۱۹۶)

''الیکٹرک شاپ سے چند الیکٹریشن نکل کر آ کھڑے ہوئے اور سگریٹ پینے لگے۔'' (۱۹۷)

''واحد گورا سپاہی جو سٹین گن کندھے سے لٹکائے خاموش کھڑا تھا۔'' (۱۹۸)

''آج تک کوئی آلۂ جراحی یا کوئی دوا ایسی نہیں ایجاد کی گئی جس میں عبادت سے بڑھ کر Healing Power ہو۔'' (۱۹۹)

''توپ خانے نے ریپڈ فائر (Rapid Fire) شروع کر دیا۔ دشمن کا فائر چند منٹ کے لیے رک گیا۔ کیپٹن ڈل نے دوربین میں دیکھا اور حکم دیا 'کمپنی ایڈوانس'۔'' (۲۰۰)

''اگلی صبح رجمنٹ وہاں سے ہٹا کر ہولی بیک کے شمال میں پوزیشن پر بھیجی گئی۔'' (۲۰۱)

''سیکنڈ بیویرین کارپس بھاری کورنگ فائر (Covering Fire) کے نیچے اس سیکشن پر جمع ہو رہی تھی جہاں پر تھرڈ کیولری بریگیڈ کا مورچہ تھا۔'' (۲۰۲)

''ہم اپنے 'آئیڈیلز' کے لیے لڑتے ہیں یا نہیں، اور کتنی دیر تک۔ ہم 'ڈس الوژن منٹ' کو کتنی دیر تک ٹال سکتے ہیں۔'' (۲۰۳)

دور مشرق میں، پہاڑ کے پیچھے گاڑی کی تیز وسل سنائی دی۔'' (۲۰۴)

''چار بجے جب دن والی شفٹ ختم ہوئی تو سب مزدور کام چھوڑ کر باہر نکل آئے۔'' (۲۰۵)

''ہم نے کل سائمن کمیشن کے لیے مظاہرہ کیا تھا۔'' (۲۰۶)

مغربی اور مشرقی ناول نگاروں سے تقابل:

مختلف نقادوں نے ان تینوں ناولوں کا تقابل مغربی اور مشرقی ناول نگاروں اور ان کے ناولوں سے کیا ہے۔

لندن کی ایک رات:

سجاد ظہیر کا جیمس جوائس کے ناول یولی سس پڑھ کر لندن کی ایک رات لکھنے والی بات اور اس کی

مماثلت۔اس کے تعلق سے ایک بات ہے جسے بہت کھل کر علی عباس حسینی نے کہا ہے کہ:

''سجاد ظہیر نے یہ ناولچہ جیمس جوائس کا یولی سس دیکھ کر لکھا ہے، وہاں ڈبلن کا ایک دن تھا یہاں لندن کی ایک رات، وہ تحت الشعور کی انسائیکلو پیڈیا ہے، یہ جیمس ڈکشنری۔''(۲۰۷)

خط کشیدہ الفاظ میں کہی گئی باتیں بلا شبہ غیر متنازعہ ہیں۔البتہ محض ڈبلن کے دن اور لندن کی رات کے حوالے سے یہ حکم لگا دینا کہ جیمس جوائس کا یولی سس دیکھ کر لکھا ہے ذرا غور طلب بات ہے۔لندن کی ایک رات ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔جوائس کا یولی سس فرانسیسی میں تو ۱۹۲۲ء میں شائع ہو گیا تھا لیکن انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ ۱۹۳۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔اس لیے جوائس کی فحش نگاری پر امریکہ اور برطانیہ میں ۱۹۳۱ء تک اس ناول کی اشاعت پر پابندی رہی۔یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ کیا ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۸ء تک کے دوران میں شعور کی رو کی تکنیک میں شائع ہونے اور شہرت پانے والا واحد ناول یہی ہے یا یہ کہ جیمس جوائس ہی ان دنوں اس تکنیک میں لکھنے والا اکیلا ناول نگار تھا؟ ان دونوں سوالات کا جواب نفی میں ہے۔جیمس جوائس سے بہت پہلے ہنری جیمس اور ڈورتھی رچرڈسن اور اس کے تقریباً ساتھ ہی لکھنے والی ورجینا وولف اس ہی تکنیک کے لکھنے والوں کی حیثیت سے جوائس کے عصر اس سے کم مشہور نہیں تھے۔پھر جوائس سے بہت پہلے ہینری جیمس کے ناول تو آ ہی چکے تھے۔یولی سس سے قبل ڈورتھی کے تین ناول پوائنٹڈ روف (Pointed Roofs.1915) بیک واٹر (Backwater.1916) ہنی کومب (Honeycomb.1917) آ چکے تھے۔اور فرانسیسی زبان میں یولی سس کے عین قریب یعنی ۱۹۲۳ء کے بالکل اوائل میں اس کا چوتھا ناول ری والونگ لائٹ (Revolving Lights) بھی شائع ہو چکا تھا۔اسی طرح ورجینا وولف (Virginia Woolf) کے چار ناول مسز ڈیلووے ۔۱۹۲۵ء(Mrs Dalloway) ٹو دی لائٹ ہاؤس ۔۱۹۲۷ء(To the Lighthouse) اور لینڈو ۔۱۹۲۸ء(Orlando) دی ویوز ۔۱۹۳۱ء(The Waves) لندن کی ایک رات سے قبل شائع ہو چکے تھے۔سجاد ظہیر کے متعلق یہ بات ان کے سب ہی دوست اور جان پہچان والے اصحاب لکھتے ہیں اور کہتے رہے ہیں کہ وہ بچپن ہی سے کتابیں پڑھنے کے بہت شوقین تھے اور ان کا یہ شوق مطالعہ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی رہا۔چنانچہ یہ تو کسی صورت قرین قیاس نہیں کہ انھوں نے صرف ایک ہی جدید ترین طرز کا ناول یعنی یولی سس پڑھ کر آگے مطالعہ بند کر دیا ہو اور اس کی تقلید میں ایک ناول خود بھی لکھ دیا۔بہت محتاط انداز میں بھی اگر ان کا مطالعہ محدود کیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ہنری جیمس اور ڈورتھی رچرڈسن کو نظر انداز کر دیا ہوگا لیکن ورجینا وولف کے ناولوں کا نہ پڑھنا قرین قیاس نہیں۔خاص طور پر اس طرز کی ناول نگاری میں جیمس جوائس کے بعد ورجینا وولف کا نام دوسرے نمبر پر آتا ہے۔اتنی بات صحیح ہے کہ تکنیک اور وقت کا دورانیہ میں ایک رات اور

ایک دن سے تو یولی سس اور لندن کی ایک رات کا ظاہری رشتہ قائم ہوتا ہے لیکن اگر یہی ایک دن کا قصہ سجاد ظہیر کے لیے محرک بنا فرض کرلیا جائے تو یولی سس، کے انگریزی زبان کے ترجمے کی اشاعت ۱۹۳۲ء سے بہت پہلے ورجینا وولف کے ناول مسز ڈیلو وے (۱۹۲۵ء) (۲۰۸) میں ایک دن کا قصہ کیوں محرک نہیں ہوسکتا؟ سجاد ظہیر ۱۹۲۷ء میں لندن میں پہنچ چکے تھے۔ یولی سس انگریزی زبان میں شائع نہیں ہوا تھا اور انھیں ان دنوں فرانسیسی زبان آتی نہیں تھی۔ مسز ڈیلو وے ابھی زیادہ پرانا نہیں ہوا تھا اور شعور کی رو کی تکنیک میں لکھے جانے والے اس ناول کی بہت دھوم تھی۔ یہ سب حقائق کس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں؟ دوسری اہم بات مسز ڈیلو وے کے حوالے سے یہ ہے کہ اس کا ڈیزائن (Form) وہی ہے جس ڈیزائن پر لندن کی ایک رات لکھا گیا ہے یعنی دوستوں کی پارٹی۔ یولی سس میں کہیں دور دور تک بھی پارٹی کا ذکر نہیں ہے۔ فرق اتنا ہے کہ مسز ڈیلو وے کی کہانی صبح سے شام تک، دوسرے دن ہونے والی دوستوں کی دعوت کی تیاریوں کے ساتھ چلتی ہے اور 'لندن کی ایک رات' دعوت کے شروع ہونے کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اس کے اختتام کے بعد شیلا گرین کی کہانی کے ساتھ ساتھ صبح ہونے تک جاری رہتی ہے۔ جب کہ مسز ڈیلو وے کی کہانی دعوت کی تیاریوں کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ علی عباس حسینی نے خود ہی ورجینا وولف کا تذکرہ اہم ناول نگاروں کے ضمن میں کیا ہے اور ان کے ناول مسز ڈیلو وے اور جیکس روم کو انگریزی ادب میں مستقل اضافہ مانے جانے کا تذکرہ بھی کیا ہے اور پھر بھی لندن کی ایک رات اور ڈیلو وے کے بنیادی محرک یعنی دوستوں کی دعوت کی اس مماثلت کو انظر انداز کر کے محض تقلیدی طور پر یولی سس کو آگے بڑھایا ہے۔ (۲۰۹)

گریز:

ڈاکٹر اسلم آزاد کے خیال میں عزیز احمد نے سب سے زیادہ اثر فارسٹر سے قبول کیا ہے، ان کے مطابق:

> ''عزیز احمد نے سب سے زیادہ اثر فارسٹر سے قبول کیا ہے۔ صرف کتابی ہی نہیں بلکہ ذاتی طور پر بھی فارسٹر نے اپنی تحریروں میں ذاتی تعلقات کو بطور فلسفۂ حیات پیش کیا ہے۔ کسی ملک، علاقہ، قوم یا نسل کے دو افراد اگر باہمی دوستی اور یگانگت کو راہ دیں تو یہ اس مادی اور مائل بہ انحطاط دنیا کے لیے امید کی ایک کرن ہے۔ عزیز احمد نے اس فلسفۂ حیات کی بنیاد پر ''گریز'' لکھی۔ ''گریز'' میں یوں تو ہر قدم پر زندگی سے گریز کا احساس ملتا ہے لیکن اس میں زندگی کے اثباتی پہلو کو بھی روشن کیا گیا ہے۔ نعیم، ہروشا، کرا کسلے، اور بلقیس کے کردار یگانگت اور باہمی تعلقات اس گریز کا مداوا ہیں۔'' (۲۱۰)

اداس نسلیں:

اسلوب احمد انصاری نے اداس نسلیں کا تقابل مختلف مشرقی اور مغربی ناولوں سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اداس نسلیں'' میں جو پھیلاؤ اور وسعت ہے، جو تنوع اور کثیر العناصری ہے، اس کے پیشِ نظر اسے ایک طرح کا Chronicle کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہاں وقت چند واقعات یا واردات تک محدود اور ان پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک بے حد وسیع تناظر کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا تقابل ڈرامائی ناول سے کیا جاسکتا ہے۔ جس میں وقت کی سمائی چند کرداروں یا چند مکانی نقطوں تک محدود رہتی ہے۔ یہاں شدت زیادہ ہوتی ہے اور ارتکاز بھی۔ یہاں صدیوں اور قرنوں کے گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ نہ وقت کے Over Flow کا۔ اس ناول کا موضوع ہمیں دو انگریزی ناولوں کی بے اختیار یاد دلاتا ہے یعنی گالزوردی (John Galsworthy) کا ناول The Forsyte Saga اور ڈی، ایچ، لارنس کا ناول The Rainbow۔ دونوں میں ہم دوران کی مختلف حد بندیوں اور کئی نسلوں کے نمائندوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں تاریخ کا تسلسل اتنا اہم نہیں، جتنا ان نسلوں کے ذہن و قلب کی مختلف کیفیتوں کی مصوری جو تاریخ کے راکب بھی ہیں اور مرکب بھی۔ اس مخصوص قسم کے ناول میں جسے ابھی ابھی Chronicle کہا گیا، ایسا لگتا ہے کہ وقت کرداروں، واقعات اور انسانوں کے ہجوم سے گذرتا چلا جارہا ہے اور ناول کے عمل کی حد بندی نہیں کی جاسکتی، یعنی وہ اسے خاطر میں نہیں لاتا۔ ڈرامائی ناول پر قانونِ سببیت کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن Chronicle اس پاس داری سے آزاد اور مستغنی ہے۔ 'اداس نسلیں' میں ہم کئی کئی نسلوں کو اپنے سامنے سے گذرتے دیکھتے ہیں۔ ان سب کے اپنے اپنے مطالبے اور کارگذاریاں ہیں، جو ہماری توجہ کو برابر اپنے اندر جذب کرتی ہیں۔ یہاں ہمیں جن کاروانوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ سب اپنے نشاناتِ راہ چھوڑتے چلے جاتے ہیں، لیکن وقت کا دھارا، جو بہرحال رواں دواں ہے، ان پر کوئی قدغن نہیں لگاتا یا لگاسکتا۔ اس ناول کے مصنف کی چابکدستی کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ ہم جس طرح کے لوگوں سے دوچار ہوتے ہیں، اور بوقلموں زندگی کی جو جھلکیاں ہمیں نظر پڑتی ہیں۔ انھیں کسی ایک وحدت یا اکائی میں نہیں ڈھالا جاسکتا، ایک واحد قبا کو ان پر چست نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں عمل کی رفتار میں ایک طرح کا تسلسل تو ضرور ہے، لیکن ریاضیاتی یا Astronomical (فلکیاتی) وقت کی پابندی اس کی حد تک نہیں ہے، جتنی کہ ڈرامائی ناول میں ہوتی ہے۔ ڈرامائی ناول اور کرونیکل میں وہی فرق ہے، جو ایملی برونٹے (Emily Bronte's) کے ناول Wuthering Heights اور ٹالسٹائے (Leo Tolstoy) کے ناول War and Peace کے درمیان ہے۔ یہی فرق 'آگ کا دریا' اور 'اداس نسلیں' میں نظر آتا ہے۔ وقت کی کارگزاریوں سے کہیں بھی مفر نہیں کہ زندگی کا سارا ہنگامہ، اس کی ہماہمی اور تموج و تلاطم ہمیشہ اس زد پر رہتا ہے۔ لیکن زندگی اور وقت کا ایک تصور یہ بھی ہے کہ وہ اس

کے زنداں سے بھی آگے بھی بڑھ سکتا ہے، اس کے گریبان کو چاک کر سکتا ہے، اور تمام تبدیلیوں اور حوادث کو اپنے دامن میں سمیٹ کر انھیں مبرم بننے سے روک سکتا ہے، اس ناول کو پڑھتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی انگریزی ناول پڑھ رہے ہیں۔ اس کا Sweep استجاب انگیز ہے، اور 'آگ کا دریا' سے بھی فزوں تر ہے۔ اس میں انسانیت کا وہ مدہم اور اداس نغمہ بھی سنائی دیتا ہے، جسے انگریزی شاعر ورڈز ورتھ (William Wordsworth) نے Still,Sad Music of Humanity کہہ کر ممیز کیا ہے، اور جواں مرگ شاعر کیٹس نے Agony of Mankind کا نام دیا ہے۔ اس کے لیے عام لوگوں کے دکھ درد کو اپنی نبضوں کی رفتار پر محسوس کرنے کے علاوہ اایک نوع کی حسیت اور بصیرت بھی لابدی ہے۔ اس ناول میں سماج کے مختلف طبقے بغیر کسی امتیاز کے نظروں کے سامنے آتے ہیں۔ وہ سب اپنے اپنے رنج والم، مسرتیں اور محرومیاں اور تعصّبات اور فروگذاشتیں بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہاں شدید، پرشور، عنصری تجربات کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔ جس میں حیرت انگیز توانائی اور کشش نظر آتی ہے، اور دوسرے سیاق وسباق میں توانا جذبوں کی تطہیر و تنظیم اور تہذیب بھی، یہاں عقل اور جذبے کی آویزش بھی بہت سی جگہوں پر نمایاں ہے۔ عبداللہ حسین کے لیے یہ زندگی ایک وسیع شاہراہ ہے، جس پر ان گنت لوگ اپنی اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ چل پھر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ زندگی میں آویزش اور کشمکش ہی نہیں ہے، بلکہ اس سارے الجھاوؤں اور فتنہ وفساد کو ایک وسیع تناظر میں رکھ کر دیکھنا بھی ضروری ہے۔ زندگی میں مجموعی طور پر جو تشدد ہے، جو تضادات ہیں، محبت، نرمی اور رواداری کی جو کمی ہے، اور جس مخمصے میں انسان جبلی طور پر گرفتار رہتا ہے، اس سے نکلنے کے لیے جسمانی جدوجہد بھی ضروری ہے اور ایمان وایقان بھی۔ اور تخلیقیت کا وہ سرجوش بھی جس کے فیضان سے زندگی اپنا چولہ بدل لیتی ہے۔ نعیم کے علاوہ اس ناول میں اور بھی کئی کرداروں کا المیہ بنیادی طور پر شخصیت کی اکائی کے منقسم ہو جانے کا المیہ ہے۔ اس پر فتح پانے کی ایک سبیل تو فلسفیانہ یا مذہبی یا متصوفانہ استغراق کا عمل ہے اور دوسرا ذریعہ فراواں، لازوال اور بے لوث محبت کے ساتھ وسیع انسانیت سے ہم آہنگ ہونے کی نیت اور جذبہ ہے، اور اس کی تلاش و جستجو کی امید۔ عبداللہ حسین نے ہمیں مکان میں پھیلے ہوئے وسیع حدود کی سیر کرائی ہے اور آنی اور فانی لمحات کی کار گذاریوں سے بھی اپنا سروکار رکھا ہے۔'' (۲۱۱)

نگینہ جبیں نے اپنے مقالے میں اداس نسلیں کا تقابل آگ کا دریا سے کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''جہاں تک 'اداس نسلیں' میں موت، زندگی، روح اور تنہائی کا سوال ہے تو ۱۹۵۰ء سے تقریباً ۱۹۷۰ء تک جتنے بھی اچھے ناول لکھے گئے ان میں سے بیشتر ناولوں میں تنہائی اور موت کا فلسفہ نظر آتا ہے۔ اس

کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے واقعات نے انسان کو موت کے اتنے قریب کر دیا تھا کہ اسے زندگی سے زیادہ موت پر یقین ہو گیا تھا۔اور اس افراتفری کے دور میں تنہائی کا احساس فرد کی زندگی میں شدت سے پیدا ہو گیا تھا۔تقسیم کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں میں یہ لہر قرۃ العین حیدر کے ناول سے شروع ہوئی۔'اداس نسلیں' کے بعض حصے۔۔۔ایسے ہیں جیسے 'آگ کا دریا' کے زیر اثر لکھے گئے ہوں۔'' (۲۱۲)

حوالہ جات/حواشی

۱۔ محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو (ہند)، بار اول دسمبر ۱۹۵۷ء، ص ۴۲ تا ۴۸

۲۔ R.C.Majumdar, *History of Freedom Movement in India*, vol 1, Calcutta: Firma K.L.Mukhopadhyay, 1971, P 16

۳۔ Ditto, P 17

۴۔ Ditto, P 94

۵۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: قوسین، بار چہارم ۱۹۸۴ء، ص ۲۴۷۔۲۴۸

۶۔ ایضاً، ص ۵۳

۷۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۸۔ ایضاً، ص ۱۶۹

۹۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۶۹۔۵۷۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۸۹

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۹۰

۱۳۔ سعادت حسن منٹو، سیاہ حاشیے، لاہور: مکتبہ جدید، اردو چوک انارکلی، بار دوم، اکتوبر ۱۹۵۲ء، ص ۶۴

۱۴۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: قوسین، بار چہارم ۱۹۸۴ء، ص ۵۷۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۵۷۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۷۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۴۸

۱۸۔ تنویر احمد علوی، ڈاکٹر، جنوب مغربی ایشیا میں ہمارا تہذیبی ورثہ، نئی دہلی: شاہد پبلی کیشنز، دریا گنج، ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۲

۱۹۔ آصف فرّخی، ڈاکٹر، نگاہِ آئینہ ساز میں، کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴۷

۲۰۔ عزیز احمد، گریز، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، ۱۹۸۲ء، ص ۱۰۵

۲۱۔ عابد حسین، سیّد، قومی تہذیب کا مسئلہ، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو، ۱۹۹۸ء، ص ۱۲۸

۲۲۔ شوکت علی فہمی، مفتی، انگریز کا شرمناک دور حکومت، دہلی: دین و دنیا پبلشنگ کمپنی، جامع مسجد دہلی، مطبوعہ دہلی پرنٹنگ ورکس، س۔ن، ص ۷۹

۲۳۔ عبداللہ یوسف علی، علامہ، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، الہ آباد: ہندوستانی اکیڈمی، یو۔پی، ۱۹۳۶ء، ص ۱۰۔۱۱

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۳

۲۵۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: قوسین، بار چہارم، ۱۹۸۴ء، ص ۵۰۸۔۵۰۹

۲۶۔ سرسید احمد خان، مضامین سرسید، مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، حصہ ہشتم، لاہور: مجلس ترقی ادب، ص ۴۵۔۴۶

۲۷۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، موجود نوآبادیاتی عہد کے اردو نصابات، مشمولہ مجلّہ ''معیار''، شمارہ ۸، اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، ص ۲۸

۲۸۔ عبداللہ یوسف علی، علامہ، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، الہ آباد: ہندوستانی اکیڈمی، یو۔پی، ۱۹۳۶ء، ص ۴۵

۲۹۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: قوسین، بار چہارم، ۱۹۸۴ء، ص ۵۴

۳۰۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، لکھنؤ: شیوشنکر بھارگو پریس، س۔ن، ابتدائیہ

۳۱۔ خورشید الاسلام، تنقیدیں، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، طبع اول، اکتوبر ۱۹۵۷ء، ص ۵۸

۳۲۔ Dorothy Richardson, *Pilgrimage (4 vol), London*: J.M.Dent and Cresset, 1938.

۳۳۔ James Joyce, *Ulysses*,Vintage International, 1990.

۳۴۔ عبدالسلام، پروفیسر، اردو ناول بیسویں صدی میں، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، بار اول، اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۵۴۱۔۵۴۳

۳۵۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، (خصوصی مطالعہ اور تجزیہ مع حیات و خدمات) مرتبہ

،ڈاکٹر محمد فیروز، دہلی: ساقی بک ڈپو، ۲۰۰۶ء، ص ۶۹

۳۶۔ ایضاً، ص ۷۰

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۵۱۔۱۵۲

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۳۹۔ کشن پرشاد کول، نیا ادب، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۴۹ء، ص ۲۸۹

۴۰۔ عزیز احمد، گریز، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، ۱۹۸۲ء، ص ۳۵

۴۱۔ ایضاً، ص ۷۷

۴۲۔ ایضاً، ص ۷۸۔۷۹

۴۳۔ ایضاً، ص ۳۵

۴۴۔ مضمون بعنوان: اردو ناول کے پچیس سال مشمولہ ساقی، جوبلی نمبر، ۱۹۵۵ء، ص ۴۵

۴۵۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ او رتنقید، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۷ء، ص ۳۷۱

۴۶۔ سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، لاہور: مکتبہ جدید، باراول، ۱۹۶۰ء، ص ۱۹۹

۴۷۔ عزیز احمد، گریز، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، ۱۹۸۲ء، ص ۴۷

۴۸۔ کشن پرشاد کول، نیا ادب، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۴۹ء، ص ۳۲۲

۴۹۔ ایضاً، ص ۳۱۲

۵۰۔ عزیز احمد، گریز، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، ۱۹۸۲ء، ص ۲۹۱

۵۱۔ ایضاً، ص ۲۳۳۔۲۳۴

۵۲۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، اردو ناول آزادی کے بعد، یوپی: نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، طبع اول، دسمبر ۱۹۸۱ء، ص ۱۰۶

۵۳۔ ایضاً، ص ۲۵۹

۵۴۔ نگینہ جبیں، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد، الہ آباد: کیشو پرکاشن، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۴۸

۵۵۔ ایضاً، ص ۵۳

۵۶۔ ایضاً،ص۵۳

۵۷۔ ایضاً،ص۹۲

۵۸۔ ایضاً،ص۹۳

۵۹۔ ایضاً،ص۱۳۵

۶۰۔ ایضاً،ص۱۰۹

۶۱۔ ایضاً،ص۱۱۰

۶۲۔ ایضاً،ص۱۱۱۔۱۱۲

۶۳۔ ایضاً،ص۱۱۳۔۱۱۴

۶۴۔ ایضاً،ص۱۳۶

۶۵۔ ایضاً،ص۱۴۳

۶۶۔ ایضاً،ص۱۷۲۔۱۷۳

۶۷۔ ایضاً،ص۱۶۳

۶۸۔ ایضاً،ص۱۰۲۔۱۰۳

۶۹۔ ایضاً،ص۱۹۲

۷۰۔ سلیمان اطہر جاوید، بحوالہ مضمون ''عزیز احمد کی ناول نگاری''، عزیز احمد :فکروفن اور شخصیت ، مرتبہ: اعظم راہی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۱ء، ص ۳۸

۷۱۔ ایضاً،ص۲۹۶

۷۲۔ ایضاً،ص۳۰۸

۷۳۔ ایضاً،ص۳۳۶۔۳۳۷

۷۴۔ ایضاً،ص۲۲۵۔۲۲۶

۷۵۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: قوسین، بار چہارم،۱۹۸۴ء، ص۱۴۵۔۱۴۶

۷۶۔ ایضاً،ص۴۳۱

۷۷۔ ایضاً،ص۴۶۱

۷۸۔ ایضاً،ص ۲۷۵۔۲۷۶

۷۹۔ ایضاً،ص ۵۶۱

۸۰۔ ایضاً،ص ۶۱۸ تا ۶۱۳

۸۱۔ ایضاً،ص ۶۲۔۶۳

۸۲۔ ایضاً،ص ۸۵۔۸۶

۸۳۔ ایضاً،ص ۷۲

۸۴۔ ایضاً،ص ۲۰۴ تا ۲۰۷

۸۵۔ سجاد ظہیر،لندن کی ایک رات،(خصوصی مطالعہ اورتجزیہ مع حیات و خدمات)مرتبہ:ڈاکٹرمحمد فیروز،دہلی:ساقی بک ڈپو،۲۰۰۶ء،ص ۶۶

۸۶۔ ایضاً،ص ۶۶

۸۷۔ ایضاً،ص ۶۶

۸۸۔ ایضاً،ص ۶۶

۸۹۔ ایضاً،ص ۶۶

۹۰۔ ایضاً،ص ۶۶

۹۱۔ ایضاً،ص ۶۶ تا ۶۹

۹۲۔ ایضاً،ص ۱۱۰

۹۳۔ ایضاً،ص ۱۵۰

۹۴۔ ایضاً،ص ۶۵

۹۵۔ ایضاً،ص ۷۲

۹۶۔ ایضاً،ص ۷۶

۹۷۔ ایضاً،ص ۱۵۴۔۱۵۵

۹۸۔ ایضاً،ص ۱۵۸

۹۹۔ ایضاً،ص ۱۵۸

۱۰۰۔ ایضاً،ص۱۰۹

۱۰۱۔ ایضاً،ص۱۰۹

۱۰۲۔ ایضاً،ص۱۱۴

۱۰۳۔ ایضاً،ص۱۱۴

۱۰۴۔ ایضاً،ص۱۵۳

۱۰۵۔ ایضاً،ص۱۵۳

۱۰۶۔ ایضاً،ص۱۵۳

۱۰۷۔ ایضاً،ص۱۴۳

۱۰۸۔ ایضاً،ص۱۴۳

۱۰۹۔ ایضاً،ص۱۲۶

۱۱۰۔ ایضاً،ص۱۰۸

۱۱۱۔ ایضاً،ص۱۰۸

۱۱۲۔ ایضاً،ص۶۹

۱۱۳۔ ایضاً،ص۶۹

۱۱۴۔ ایضاً،ص۷۹

۱۱۵۔ ایضاً،ص۷۹

۱۱۶۔ ایضاً،ص۸۲

۱۱۷۔ ایضاً،ص۸۲

۱۱۸۔ ایضاً،ص۸۳

۱۱۹۔ ایضاً،ص۸۲

۱۲۰۔ ایضاً،ص۸۲

۱۲۱۔ ایضاً،ص۸۱

۱۲۲۔ ایضاً،ص۱۱۵۔۱۱۶

۱۲۳۔ ایضاً،ص ۱۲۱

۱۲۴۔ عزیز احمد، گریز، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، ۱۹۸۲ء، ص ۱۳۹

۱۲۵۔ ایضاً،ص ۱۳۹

۱۲۶۔ ایضاً،ص ۱۷۱

۱۲۷۔ ایضاً،ص ۳۰۲

۱۲۸۔ ایضاً،ص ۳۰۲

۱۲۹۔ ایضاً،ص ۳۰۲

۱۳۰۔ ایضاً،ص ۱۷۷

۱۳۱۔ ایضاً،ص ۱۶۹

۱۳۲۔ ایضاً،ص ۱۸۰

۱۳۳۔ ایضاً،ص ۱۸۲

۱۳۴۔ ایضاً،ص ۱۸۲

۱۳۵۔ ایضاً،ص ۱۸۲

۱۳۶۔ ایضاً،ص ۱۸۲

۱۳۷۔ ایضاً،ص ۱۸۲

۱۳۸۔ ایضاً،ص ۱۸۲

۱۳۹۔ ایضاً،ص ۲۱۰

۱۴۰۔ ایضاً،ص ۲۷۲

۱۴۱۔ ایضاً،ص ۲۷۳

۱۴۲۔ ایضاً،ص ۲۷۴

۱۴۳۔ ایضاً،ص ۲۸۳

۱۴۴۔ ایضاً،ص ۱۵

۱۴۵۔ ایضاً،ص ۱۶

۱۴۶۔ ایضاً،ص ۱٦

۱۴۷۔ ایضاً،ص ۱٦

۱۴۸۔ ایضاً،ص ۱٦

۱۴۹۔ ایضاً،ص ۱٦

۱۵۰۔ ایضاً،ص ۱٦

۱۵۱۔ ایضاً،ص ۳۲۰

۱۵۲۔ ایضاً،ص ۳۲۰

۱۵۳۔ ایضاً،ص ۱۰۵

۱۵۴۔ ایضاً،ص ۳۱۷

۱۵۵۔ ایضاً،ص ۳۱۷

۱۵٦۔ ایضاً،ص ۳۱۷

۱۵۷۔ ایضاً،ص ۲۳۳

۱۵۸۔ ایضاً،ص ۲۳۴

۱۵۹۔ ایضاً،ص ۳۴

۱٦۰۔ ایضاً،ص ۵۳

۱٦۱۔ ایضاً،ص ۵۳

۱٦۲۔ ایضاً،ص ۵۳

۱٦۳۔ ایضاً،ص ٦۳

۱٦۴۔ ایضاً،ص ٦۳

۱٦۵۔ ایضاً،ص ٦۳

۱٦٦۔ ایضاً،ص ٦۳

۱٦۷۔ ایضاً،ص ٦۴

۱٦۸۔ ایضاً،ص ٦۴

۱۶۹۔ ایضاً،ص۶۴

۱۷۰۔ ایضاً،ص۹۲

۱۷۱۔ ایضاً،ص۹۳

۱۷۲۔ ایضاً،ص۱۰۲

۱۷۳۔ ایضاً،ص۱۰۹

۱۷۴۔ ایضاً،ص۱۰۹

۱۷۵۔ ایضاً،ص۱۷۲

۱۷۶۔ ایضاً،ص۱۷۲

۱۷۷۔ ایضاً،ص۱۷۲

۱۷۸۔ ایضاً،ص۱۷۲

۱۷۹۔ ایضاً،ص۱۷۳

۱۸۰۔ ایضاً،ص۱۷۳

۱۸۱۔ ایضاً،ص۱۰۳

۱۸۲۔ ایضاً،ص۱۹۲

۱۸۳۔ ایضاً،ص۲۸۸

۱۸۴۔ ایضاً،ص۲۹۶

۱۸۵۔ ایضاً،ص۲۲۵

۱۸۶۔ عبداللہ حسین،اداس نسلیں،لاہور:قوسین،بار چہارم،۱۹۸۴ء،ص۱۷

۱۸۷۔ ایضاً،ص۱۷

۱۸۸۔ ایضاً،ص۱۷

۱۸۹۔ ایضاً،ص۲۰

۱۹۰۔ ایضاً،ص۲۲

۱۹۱۔ ایضاً،ص۲۴

۱۹۲۔ ایضاً،ص۲۷

۱۹۳۔ ایضاً،ص۲۹

۱۹۴۔ ایضاً،ص۲۹

۱۹۵۔ ایضاً،ص۳۰

۱۹۶۔ ایضاً،ص۴۱۰

۱۹۷۔ ایضاً،ص۵۰۴

۱۹۸۔ ایضاً،ص۴۴۳

۱۹۹۔ ایضاً،ص۴۶۲

۲۰۰۔ ایضاً،ص۱۳۴

۲۰۱۔ ایضاً،ص۱۳۵

۲۰۲۔ ایضاً،ص۱۳۵

۲۰۳۔ ایضاً،ص۵۵۱

۲۰۴۔ ایضاً،ص۶۱۰

۲۰۵۔ ایضاً،ص۵۰۶

۲۰۶۔ ایضاً،ص۲۹۹

۲۰۷۔ علی عباس حسینی،ناول کی تاریخ او رتنقید،علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۸۷ء،ص۳۶۷

۲۰۸۔ Virgina Woolf, Mrs Dalloway, Oxford University Press, 2009.

۲۰۹۔ علی عباس حسینی،اردو ناول کی تاریخ اور تنقید،علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۸۷ء

۲۱۰۔ اسلم آزاد،ڈاکٹر،اردو ناول آزادی کے بعد،یوپی:نکھار پبلی کیشنز،مئوناتھ بھنجن،طبع اول،دسمبر۱۹۸۱ء،ص۸۱

۲۱۱۔ اسلوب احمد انصاری،اردو کے پندرہ ناول،علی گڑھ:یونیورسل بک ہاؤس،۳عبدالقادر مارکیٹ،شمشاد مارکیٹ،اپریل۲۰۰۳ء،ص۲۲۵ تا ۲۲۷

۲۱۲۔ نگینہ جبیں،اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد،الہ آباد: کیشو پرکاشن،دسمبر۲۰۰۲ء،ص۱۴۶

باب ششم

مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات

(ا) مجموعی جائزہ:

رُوئے زمین پر اِنسانی زِندگی کا ایک اہم نشان تہذیب وتمدُّن کی موجودگی ہے۔ زمین پر تہذیب کا آغاز کب ہوا ماہرین اِس کا جواب معلوم آثار کی مدد سے دیتے ہیں جو ہزاروں برس سے زیادہ پُرانے نہیں، تاہم یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تہذیب کا آغاز ہبوطِ آدم سے ہی ہو گیا تھا کہ زِندگی گزارنے کے طریقے اور لوازمات ہی تہذیب کے اہم مظاہر میں شُمار ہوتے ہیں لہٰذا جہاں زِندگی ہو وہاں تہذیب بھی کسی نہ کسی سطح اور شکل میں ضرور موجود رہی ہوگی۔ وقت گُزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں زِندگی کے طریقوں میں بہتری، نفاست اور شائستگی آتی چلی گئی وہیں تہذیبی مظاہر بھی زِیادہ نفیس اور ترقی یافتہ شکل اِختیار کرتے چلے گئے۔ آبادی بڑھنے کے نتیجے میں طرزِ رہائش بھی بدلنے لگا جنگلوں اور غاروں میں رہنے والا اِنسان بہتر سے بہتر رہائش اِختیار کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے گاؤں، قصبوں اور بالآخر شہروں کو بسانے لگا۔ آج تہذیب وتمدُّن کی جو جدید ترین اور اِنتہائی ترقی یافتہ صُورت ہم دیکھتے ہیں یہ ایک طویل عمل کا نتیجہ ہے اور وقت کے ایک طویل مگر نامعلوم دورانیے میں اِس کی صُورت گری ہوئی ہے۔

ادب اور تہذیب وتمدُّن میں لازم وملزوم کا رِشتہ ہے۔ ایک طرف ادب، تہذیب کا ایک مظہر ہے اور دوسری طرف ادب کی مُختلف اصناف میں تہذیب کی عکاسی کی جاتی ہے۔ ناول بھی تہذیب وتمدُّن کی عکاسی سے معمور ہے۔ مذکورہ ناولوں میں میں تہذیب کی بہت سی جہات کی تصویر کشی کی گئی ہے اور ہندوستانی تہذیب، ہند اِسلامی تہذیب کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کی عکاسی کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی اثرات بھی ملتے ہیں۔

ہندوستان کا نوآبادیات کا حصہ بننے میں ایک اہم سبب یہاں کا سیاسی خلفشار بھی تھا۔ ہندوستان کے سیاسی، معاشی اور سماجی منظر نامے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے قدیم زمانے میں سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔ یہ متعدد مذاہب اور تہذیبوں کا سرچشمہ رہا ہے۔ اپنی جغرفیائی اور معاشی اہمیت کے سبب یہ بیرونی طاقتوں، تاجروں اور سیاحوں کی توجہ کا بھی مرکز رہا۔ عرب سے ہندوستان کے تجارتی تعلقات بہت پرانے تھے۔ پروفیسر محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی کی روایت کے مطابق: ''ہندوستان میں سلطان محمود کی کارگزریوں (۹۹۹ء۔۱۰۳۱ء) کے بعد ڈیڑھ سو سالوں کے عرصہ میں راجپوت سلطنتوں کی ابتدا ہوئی۔۔۔ذات کے نظام میں اور شدت پیدا ہوئی۔۔۔راجپوتی نظام سیاست (Policy)

جاگیردارانہ اداروں کو وجود میں لائی۔ ذات کے نظام نے سماج کو الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور ایک مشترکہ شہریت کے احساس کو مٹا دیا۔۔۔راجپوت ریاستیں جاگیردارانہ نوعیت کی تھیں۔۔۔جب ترک ہندوستان میں داخل ہوئے اس وقت جاگیردارانہ نظام اپنی تاریخ کی آخری اور سب سے شورش انگیر داخل ہو چکا تھا۔۔ یہ نظام سیاست ملک کے سماجی نظام کی بنیادی کمزوری کی عکاسی کرتا تھا۔ ذات کے نظام نے جس پر گیارھویں اور بارھیوں صدی کا ہندوستانی سماجی نظام مبنی تھا، مشترکہ شہریت اور حب الوطنی کے تمام جذبات کو ختم کر دیا تھا۔ اس نظام کی ابتدا خواہ کسی بھی صورت حال میں ہوئی ہو، اس کے نتیجے کے طور پر شہریت اور ملک سے وفاداری کے احساس کا مکمل طور سے فقدان تھا۔''

محمد حبیب/خلیق احمد نظامی، جامع تاریخ ہند(عہد سلطنت)، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دوسرا ایڈیشن، ص ۲۰۰۔۲۰۲ معاشرے کے اس انتشار نے سنگین صورت حال پیدا کر دی اور دہلی سلطنت کے قیام(۱۱۹۲ء) کے لیے راہیں ہموار ہو گئیں۔ محمود غزنی اور غوری کے حملوں کے بعد ہندوستان کی زمامِ حکومت غلام خاندان (۱۲۰۶ء۔۱۲۹۰ء)، خلجی (۱۲۹۰ء۔ ۱۳۲۰ء)، تغلق(۱۳۲۰ء۔۱۴۱۴ء)، سید(۱۴۱۴ء۔۱۴۵۱ء)اور لودھی (۱۴۵۱ء۔۱۵۲۶ء) خاندانوں سے ہوتی ہوئی ۱۵۲۶ء میں مغلیہ سلطنت کے بانی بابر تک پہنچی جس کا اختتام ویسے تو بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری (۱۸۵۷ء) پر ہوا، لیکن اورنگ زیب کے انتقال (۱۷۰۷ء) کے بعد سے ہی مغلیہ سلطنت کے زوال کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ ہندوستان میں پرتگیز (۱۴۹۸ء)اور ڈچ (۱۶۰۲ء) قوم کے لوگوں نے یہاں اپنی تجارت کی جو بساط پھیلائی اس سے انگریزوں کو بھی تحریک ملی۔ انگلستان میں ملکہ ایلزبتھ اول(Elizabeth I) کی اجازت سے ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی (East India Company) قائم ہوئی جس کا مقصد ہندوستان میں اپنی تجارت کو فروغ دینا تھا۔ اس کمپنی نے ۱۶۱۳ء میں سورت (گجرات) میں اپنی فیکٹری قائم کی اور رفتہ رفتہ بمبئی، کلکتہ، مدراس اور ملک کے دیگر شہروں میں انگریزوں کی تجارت کا جال پھیلتا گیا۔ اورنگ زیب کے دربار سے ۱۶۹۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارتی ٹیکس(Custom duties) کی معافی کے ساتھ بنگال میں تجارت کے لیے ''فرمان'' حاصل ہو گیا۔ کمپنی نے آگے چل کر تجارت کے ساتھ ساتھ ملک کی سیاست میں بھی مداخلت شروع کی اور بالآخر ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس ملک پر حکمرانی کا موقع دیا۔ مغل صرف نام کے بادشاہ رہ گئے۔ کمپنی سرکار کی عمل داری میں ہندوستان کا زبردست استحصال ہوتا رہا۔ غربت اور افلاس کے ساتھ ساتھ غلامی کی سختی اور ہر طرح کی ذلت سے بھی اہلِ ملک کا سامنا رہا۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی اسی غلامی سے نجات کی ایک کوشش تھی۔ یہ نوآبادیاتی دور تینوں ناولوں لندن کی ایک رات، گریز اور اداس نسلیں میں مشترک ہے۔ جس کا احوال تاریخی، سیاسی، معاشی، تہذیبی اور معاشرتی

سطح پر ملتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت تاریخی، سیاسی، معاشی، تہذیبی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سانحہ خواہ بغاوت ہو یا بلوہ، نسلی تصادم ہو یا تہذیبی ٹکراؤ، سامراجیت اور جمہوریت کی کش مکش ہو یا پہلی جنگ آزادی، اس نے ہندوستانی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ وقتاً فوقتاً رونما ہونے والی علاقائی بغاوتوں کے باوجود ہندوستانی معاشرت اور تہذیب کی مثال ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامی واقعات نے اس میں پتھر اچھال دیا، جمود کو توڑ دیا۔ زندگی کے پرسکون تاروں کو چھیڑا اور بیداری کی ایک نئی لہر پیدا کی۔ فکر و نظر، تہذیب و معاشرت، سیاست و معیشت، علم و تمدن غرض زندگی کا ہر شعبہ انقلاب سے دوچار ہوا۔ اس سانحے کے بعد ملک ایک ایسی راہ پر چل پڑا جس کی منزل غلامی سے نجات اور بیرونی تسلط سے آزادی تھی۔

۱۸۵۷ء کی تباہی اور سناٹے سے نکل کر ملک عوام کی ذہنی و سماجی تعمیر کی طرف راجع ہوا۔ مختلف اوقات میں اٹھنے والی سماجی، مذہبی، علمی اور اصلاحی تحریکات و سیاسی تنظیمیں، سرکار کے ذریعہ کیے گئے سیاسی اور معاشی فیصلے، کسانوں کے اندر پیدا ہونے والی بے اطمینانی، نئی صنعتوں اور کارخانوں کے قیام، اخبارات کی اشاعت، ریل اور ڈاک و تار کے انتظام اور جدید مغربی علوم سے بہرہ ور نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے قومی بیداری کے عمل کو تیز کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ عوام کو بیدار کرنے اور انھیں ایک تار میں پرونے کا عمل بتدریج ہوا۔ ۱۸۷۵ء میں دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی۔ سرسید نے علی گڑھ تحریک کے مقاصد کی توسیع کرتے ہوئے ایم۔ اے۔ او کالج قائم کیا۔ سوامی وویکانند، گوپال کرشن گوکھلے، سریندر ناتھ بنرجی جیسے رہنما سماجی اور سیاسی افق پر نمودار ہوئے اور ملک میں بیداری کے ساتھ ساتھ نئے خیالات کی روشنی عام ہونے لگی۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین سول سروس کے ریٹائرڈ انگریز افسر اے۔ او۔ ہیوم (A.O.Hume) نے انڈین نیشنل کانگریس (Indian National Congress) قائم کی۔ مسلمانوں کو ملک کے سیاسی معاملات میں متحرک ہونے کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب ۱۸۹۲ء میں انڈین کونسل ایکٹ کے تحت برطانوی سرکار نے ہندوستان میں نمائندہ طرز حکومت (Representative form of Govt.) کی تشکیل کا ارداہ ظاہر کیا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قائم ہوا۔

بیسویں صدی کا ابتدائی دور ہندوستان میں بیداری کی لہر اور سیاسی سرگرمیوں کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خلافت عثمانیہ پر سامراجی طاقتوں کی یورش، کان پور مسجد کا واقعہ اور اس سے قبل بنگال کی تنسیخ یہ سب واقعات تھے جن سے مسلمانوں کی سیاست نے بھی ایک نیا رخ کر لیا۔ ۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر اینی بیسنٹ (Dr. Annie Besant) کی تحریک پر ہوم رول لیگ (Home Rule League) قائم ہوئی جس کی کمان بعد میں گنگا دھر تلک نے سنبھالی۔ ڈاکٹر اینی

بیسنٹ ''اداس نسلیں'' میں روشن آغا کی کوٹھی کی اس پارٹی میں شامل تھیں، جس میں ''نعیم'' نے تلک کا ذکر کیا تھا۔

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) کے آغاز سے اہلِ ملک کو یہ امید ہوگئی تھی کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے پر بھی غور وخوض کرے گی۔ یہ وہ عرصہ ہے جو ان تینوں ناولوں میں مشترک ہے، ملک کے سیاسی، سماجی، معاشی حالات، مشرقی اور مغربی تہذیب کی آویزش، نوآبادیاتی استعمار جیسے موضوعات پر ان ناولوں کے کردار بحث کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد روس کے انقلاب، مختلف ممالک میں کیمونسٹ پارٹیوں کا قیام اور اشتراکی تحریکات نے غلام ممالک کے عوام میں نیا شعور بیدار کر دیا تھا۔ مزدوروں، کسانوں میں نئی بیداری آچکی تھی۔ وہ اپنی قوت کو عالمی تناظر میں دیکھنے لگے تھے۔

بیسویں صدی سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطوح پر بڑی بڑی تبدیلیوں کی نقیب ثابت ہوئی۔ صدی کے آغاز میں تباہ کن عالمی جنگ اور ربع صدی سے بھی کم کے عرصے میں دوسری بڑی جنگ نے دُنیا کے امن، جغرافیے، اِقتصادی صُورتِ حال سمیت بہت کچھ تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ اِنسانی زِندگیاں اِنقلابی تبدیلیوں سے دوچار ہوئیں اور ایسے افکار نے غلبہ حاصل کر لیا جنھوں نے کائنات میں اِنسان کے وجود اور مقام کی حیثیت ہی بدل ڈالی۔ چارلس ڈارون، کارل مارکس، سگمنڈ فرائیڈ اور آئن سٹائن نے افکار و نظریات کو نیا رُخ دے ڈالا اور اِنسانی فکر کو نئے زاویوں سے آشنا کیا۔ اِس تغیر پذیر فضا میں ادب کا میدان بھی اِنقلابی تبدیلیوں سے دوچار ہوا بالخصوص برِصغیر میں تیس کی دہائی اِنقلابی نوعیت کی ادبی تبدیلیوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی اور ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ اِس تحریک کے نتیجے میں ادب فنی اور فکری ہر اعتبار سے یکسر تبدیل ہو کے رہ گیا سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ اُنہوں نے ایک ہی مختصر کینوس کا ناول لندن کی ایک رات لکھا، جو اپنے اِختصار کے باوجود اُردو ناولوں میں اہم مقام رکھتا ہے۔ ناول کو فنّی اور فکری جدّت سے آشنا کرنے والے سجاد ظہیر نے لندن کے ماحول میں چند پاکستانی طلبہ کی زندگی کے مُختلف پہلو دِکھانے کے لیے محض ایک رات کے دورانیے میں بہت سے اہم سروکار سمیٹے ہیں۔ حصولِ تعلیم کے لیے جانے والے طلبہ کو لندن کی آزاد فضاؤں کا اسیر بنتے دِکھایا ہے۔ مغربی آزاد خیالی اور بے راہروی نے اُن میں سے بعض کی راہ کھوٹی بھی کر دی ہے اور وہ محض شراب و شباب کی دُنیا میں کھو کر اپنے اصل مقصد سے ہٹ کر رہ گئے ہیں۔ جنہیں سول سروس میں شمولیت کی خواہش ہے وہ مغربی تہذیب کے خوشنما جال میں جکڑے جا چکے ہیں اور خود بھی انگریز نظر آنا چاہتے ہیں بالفاظِ دیگر 'براؤن صاحب' بننے کے لیے پوری طرح آمادہ ہیں۔ سجاد ظہیر نے مغرب کے نسلی اِمتیاز اور تہذیبی برتری کے غرور کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے۔ رنگ دار نسلوں سے روا رکھے جانے والے بدترین سلوک اور بالخصوص نوآبادیاتی غُلاموں کو بنظرِ حقارت دیکھنے کا مغربی رویہ پوری طرح لندن کی ایک رات کے ماجرے میں

نُمایاں ہے۔ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام اور اِستحصالی ہتھکنڈوں کی عکاسی خود مغربی مُعاشرے سے تعلق رکھنے والے کرداروں کی سوچ اور گفتگو سے کی گئی ہے۔ ہندوستانی طلبہ یوں تو لندن کے آزاد اور رنگین ماحول میں پوری طرح رچے بسے نظر آتے ہیں لیکن اُن میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو دو تہذیبوں کے مابین غالب کے اِس شعر کی تفسیر بن کر رہ گئے ہیں:

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

اور اِسی کا نتیجہ ہے کہ وہ کردار وعمل کی دُوئیت کا شکار ہو کر دُبدھا کی سی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ جدید تہذیب میں کشش بھی محسوس کرتے ہیں اور اور اس کی آزادہ روی اور اخلاقی حدود کی پامالی سے خود کو بچانے کی کوششوں میں اِس سے خائف بھی رہتے ہیں۔ رقص وموسیقی، ناؤنوش سے مُتنفر بھی ہیں اور اِسی ماحول میں کشش بھی محسوس کرتے ہیں۔ سجاد ظہیر نے مغرب کے سیاسی و معاشرتی رویوں، نوآبادیاتی نظام کی توسیع کے لیے مُلک گیری کی ہوس، رنگ ونسل کی بُنیاد پر اِنسانوں کی تقسیم کو واضح کیا ہے جبکہ مغربی تہذیب کے مادّی مظاہر بھی بکثرت دِکھائے ہیں۔ اُنہوں نے مغربی مجموعی طور پر مغربی سرمایہ دارانہ ذِہنیت اور سامراجیت کی کُھل کر عکاسی کی ہے۔ اُنہوں نے اِشتراکی فکر سے وابستہ لوگوں کا یورپ کی آزاد اور رنگین فضاؤں سے مسحور ہو کر رہ جانا بھی دِکھایا ہے جو مغربی تہذیب کی چمک دمک اور پُرکشش ہونے کی واضح دلیل ہے۔

لندن کی ایک رات کی اشاعت تصنیف کے دو سال بعد یعنی ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ یہ جس عہد اور جن حالات کی پیداوار ہے وہ بلاشبہ کس مکش کا دور تھا۔ یہ عہد دراصل سماجی ضوابط اور مذہبی عقائد سے بغاوت اور موجودہ نظام سے بے اطمینانی، ناآسودگی بلکہ بیزاری کا عہد تھا۔ اور اس کے اسباب تھے۔ بین الاقوامی حالات، صنعتی نظام اور سب سے بڑھ کر سائنسی انکشافات وایجادات۔ نومولود میکانکی نقطہ نظر نے مشاہدے اور تجربے کو سب سے اہم قرار دیا تھا۔ اور یہ ثابت کر دیا تھا کہ ساری کائنات ایک خودکار نظام کے تحت چل رہی ہے۔ چنانچہ پرانی قدروں کے تار و پود مکڑی کے جالے کی طرح بکھر کر رہ گئے تھے۔ غیر متزلزل عقیدوں کی جگہ تشکیک نے لے لی تھی۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا تصور چکنا چور ہو کے رہ گیا تھا۔ اس کی بے بضاعتی اور اس کے ساتھ ہی شکست اور موت کا احساس عام تھا۔ یہ احساس ہمیں ان تینوں ناولوں میں ملتا ہے۔

یہ تھے وہ حالات جن میں ترقی پسند تحریک نشوونما پا رہی تھی۔ البتہ مایوسی کے اس اندھیرے میں جس میں یہ ادب اور فن کار گھرے ہوئے تھے۔ امید کی کوئی کرن تھی تو وہ سرخ سویرا جو روس کے افق سے نمودار ہو رہا تھا۔ ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بھی یہی تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی اسے غیظ وغضب کی نظروں سے دیکھتا تھا تو کوئی امید بھری نظروں

ہے۔اشتراکیت پسندی کے علاوہ سائنسی عقلیت پسندی بھی اس عہد میں عام ہوئی۔ادیبوں اور شاعروں نے بے جھجک حقیقت نگاری کو فروغ دیا۔تینوں مذکورہ ناولوں میں یہ حقیقت پسندی اپنے اپنے انداز سے ملتی ہے۔ گریز میں یہ حقیقت پسندی ہمیں جنس کے روپ میں نظر آتی ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تصنع اور شائستگی سے معمور قدیم تصور ادب اب بھولی بسری چیز ہوگئی۔اس حقیقت نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حسن اور بدصورتی ،نیکی اور بدی کو جوں کا توں پیش کر دیتی ہے۔نہ وہ اچھے کو سراہتی ہے نہ برے کی مذمت کرتی ہے۔وہ اپنے ماحول کو من وعن پیش کر دیتی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ مختلف نقادوں نے اپنے اپنے انداز میں ان تینوں ناولوں پر تنقید کی ہے۔حقیقت نگاری اس وقت مکمل ہوتی ہے جب خارجی زندگی کے ساتھ داخلی زندگی کو بھی پیش کیا جائے۔خارجی زندگی کی پیش کش میں مارکس کے نظریات نے رہنمائی کی اور ماحول وسماج کا تجزیہ ضروری قرار پایا۔داخلی زندگی کی پیش کش میں فرائیڈ کے نظریات کا سہارا لیا گیا اور تحلیل نفسی ،نیز لاشعور اور تحت الشعور کی تفتیش ضروری قرار پائی۔یہ داخلی زندگی کی پیش کش کبھی لندن کی ایک رات میں شعور کی رو کی شکل میں ہمیں نظر آتی ہے تو کبھی گریز میں جنس کی شکل میں۔اور کبھی پیچیدہ نفسیاتی مسائل کا شکار ''اداس نسلیں'' کا نعیم اس کا نمائندہ بن جاتا ہے۔

لندن کی ایک رات کی اہم خصوصیت روح عصر ہے۔اس وقت عالمی سطح پر جو انقلابات رونما ہو رہے تھے اور ہندوستان جن حالات سے دوچار تھا لندن کی ایک رات میں مختلف مسائل پیش کرنے کے لیے سجاد ظہیر نے مختلف الخیال اور مختلف مسائل سے دوچار کرداروں کو پیش کیا ہے اور اس طرح نہ صرف ہندوستان کے رجحانات ومیلانات کا اس ناول میں احاطہ کیا گیا ہے، بلکہ اس دور کے تہذیبی اور نوآبادیاتی منظرنامے کو بھی پیش کیا ہے۔

مثلاً راؤ اشتراکیت کی طرف مائل ہے۔اور اس عہد کے انقلاب پسند نوجوانوں کی طرح اعتدال ،مفاہمت پرستی اور عدم تشدد کو مضحکہ خیز خیال کرتا ہے۔ چرخہ کاتنے میں اسے ملک اور قوم کی کوئی بھلائی نظر نہیں آتی۔سماجی اصلاح ،چھوت چھات کا خاتمہ سب اس کے لیے بے معنی ہیں۔گاندھی کے فلسفے میں اس کے لیے کوئی کشش نہیں۔وہ موجودہ نظام ،موجود حکومت اور اس کی ساری لعنتوں کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کے حق میں ہے۔اس کی طبیعت کا خاصہ ہے۔آمریت کے اس دور میں زندگی جتنی شکست خوردہ ہوگئی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مایوسی اس کی رگ وپے میں سرایت کرگئی اور انسان اسے زمین پر رینگنے والے حقیر بے بضاعت کیڑے نظر آنے لگے۔راؤ کے کردار والی مایوسی ہمیں کئی بار ''گریز'' کے نعیم اور اداس نسلیں کے نعیم میں بھی نظر آتی ہے۔ان تینوں ناولوں کا ایک مشترک رجحان تشکیک بھی ہے۔ لندن کی ایک رات کے احسان کی پہچان تشکیک نہیں۔مارکسزم کے عقیدے پر بھرپور ایمان ہے۔اور اس کی کامیابی پر اسے مکمل اعتماد ہے۔چنانچہ وہ پرامید اور باحوصلہ ہے۔یہ امید او حوصلہ مختلف شکلوں میں ہمیں گریز اور اداس نسلیں میں بھی مل جاتا

ہے۔احسان کو یقین ہے کہ معصوم انسانوں کا خون چوسنے والی جونکیں ایک نہ ایک دن کیفر کردار کو پہنچیں گی۔اداس نسلیں میں جب محاذ جنگ پر نعیم اور مہندر سنگھ کا مکالمہ ہوتا ہے تو یہی بات ملتی کہ مالکوں کے بھی آگے املک ہیں۔جیسے روشن آغا ان کے مالک، روشن آغا کے مالک نوآبادیاتی حکمران اوران کے بھی آگے مالک ہیں۔تینوں ناولوں میں اس بات کی امید ہے کہ ایک نہ ایک دن ضرور گہری نیند سوئے ہوئے ہندوستان کے باسی خواب خرگوش سے بیدار ہوں گے۔

لندن کی ایک رات کا عارف اور گریز کا نعیم آئی۔سی۔ایس۔کے نمائندے ہیں۔جونوآبادیاتی حکمرانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے اپنی زندگی گروی رکھ چکے ہیں۔ان دونوں کرداروں میں جنسی ناآسودگی کا پہلو یکساں ہے۔وہ ہر وقت اس کی تسکین میں مارے مارے پھرتے ہیں اور زندگی کی شراب سے آخری بوند تک کشید کرنا چاہتے ہیں۔ان کی ساری دنیا،آئی۔سی۔ایس۔کے امتحان میں کامیابی اور ایک اعلیٰ درجے کی نوکری تک محدود ہے۔لندن کی ایک رات کا اعظم عشق کے چکر میں پھنسا ہوا ہے،اسی عشق کا شکار گریز کا نعیم بھی ہے۔مشرقی تہذیب کے عشق اور مغربی تہذیب کے عشق میں جو بنیادی فرق ہے،وہ یہ ہے کہ مشرقی تہذیب کا عشق زیادہ تر افلاطونی ہے اور مغربی عشق میں اس میں جنس بھی شامل ہو جاتی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ اعظم کو خیالوں میں پیرس کی برہنہ طوائف کی طرح جین بھی کپڑے اترتی نظر آتی ہے،اور گریز کے نعیم کی نظر بھی ہر عورت کے کپڑوں کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتی ہے۔

لندن کی ایک رات کے نعیم کیا اپنے مسائل سے پریشان نہیں ہوتا،وہ دوسروں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتا ہے،ایسے انسان دوست کردار ہمیں گریز اور اداس نسلیں میں بھی مل جاتے ہیں۔

لندن کی ایک رات اصل میں اردو ناول کا ولی دکنی ہے،اس میں متنوع تجربات ہیں جو آنے والے ناولوں میں الگ الگ راستوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔جیسے ولی دکنی کی غزل میں صنعت گری جیسے صنعت مہملہ یا غیر منقوط بھی ملتی ہے جو آگے چل کر لکھنوی شاعری کے اسالیب میں ڈھل گئی اور جذبات نگاری جو دلی کی غزل کی پہچان بنی،اس طرح لندن کی ایک رات میں کئی اسالیب اور موضوعات جیسے شعور کی رو،جنس،شعر وادب،فلسفہ،سیاست،بے روزگاری کا خوف وغیرہ نہ صرف ہمیں گریز اور اداس نسلیں میں ملتے ہیں بلکہ یہ بعد میں آنے والے ناول نگاروں کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوا۔یہ پہلی جنگ عظیم کے اثرات ہوں یا جدید صنعتی ترقی،یا نیا شعور یہ ہمیں نہ صرف مشرقی اور مغربی تہذیب کے تضادات سے آشنا کرتا ہے بلکہ نوآبادیاتی استعمار کی واضح تصویر بھی ہمارے سامنے لاتا ہے۔

عزیز احمد اُردو کے اُن اہم ناول نگاروں میں شامل ہیں جو ترقی پسند تحریک کے عہد میں لکھ رہے تھے تاہم تحریک سے باقاعدہ طور پر وابستہ نہ ہوتے ہوئے بھی اِشتراکی فکر سے مُتاثر تھے اور اور اُن کے ناولوں میں بھی اس کے اثرات موجود

ہیں۔عزیز احمد نے مشرقی تہذیب کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب وتمدّن کی عکاسی بھر پور انداز میں کی ہے تاہم اِسے اِشترا کی نقطۂ نظر سے پیش نہیں کیا۔ گریز میں نوآبادیاتی اثرات بھی ملتے ہیں۔

گریز میں بالخصوص مغرب کی آزادہ روی اوراخلاقی قدروں کی پامالی کی عکاسی بکثرت نظرآتی ہے۔ گریز میں ہندوستان سے بغرضِ تعلیم یورپ جانے والے نوجوان نعیم نے وہاں کی تہذیب کا یہ پہلو بڑی جلدی اپنا لیا جبکہ دِیگر ہندوستانیوں کوبھی یورپ میں اِسی روش کا مُقلّد دِکھایا گیا ہے۔ وہ رقص وسرود کی محفلوں میں شامل ہوتے اور ناؤنوش سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔نعیم مےنوشی اورمخلوط محفلوں میں شمولیت کے علاوہ یورپی لڑکیوں سے آزادانہ مراسم رکھنےاور یہاں تک کہ قحبہ گاہوں کے چکرلگانے میں بھی کوئی عارنہیں سمجھتا۔نعیم مغربی تہذیب کے منفی پہلو کے اثرات سے خودکو بچانہیں پاتا بلکہ یہ کہنا بے جانہیں ہوگا کہ بچانے کا خواہش مند ہی نظرنہیں آتا۔ بُنیادی طور پراُس کی اُفتادِطبع آزادہ روی کی جانب مائل تھی،نتیجہ یہ کہ اِس معاملے میں وہ اپنے یورپی دوستوں سے کہیں بڑھ کرآزادخیال ثابت ہوتا ہےاوراخلاقی بےراہروی کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے، اُس میں اورکسی یورپی نوجوان میں اِمتیاز کرنا مُشکل ہوجاتا ہے۔ وہ مشرقی وفا اورمحبت کے تصوّر سے بھی بے بہرہ ہے۔لڑکیاں اُس کے لیے وقت گُزاری کا ایک مشغلہ ہیں جن سے کوئی پائیدارتعلّق بنانا اُس کی ترجیحات کا حصہ نہیں۔

عزیز احمد نے مغربی تہذیب کے جس دوسرے اہم پہلو کی عکاسی کی ہے وہ نسلی اِمتیاز اور رنگ دارنسلوں سے مُنافرت اورتعصب کا ہے۔ وہ بڑی تفصیل سے سفید فام نسلوں کے تہذیبی برتری کے احساس اورغرور وتفاخرکوناول کا حصہ بناتے ہیں۔ سفید فام اقوام کے نزدیک صرف یورپی تہذیب ہی تہذیب قرار دیے جانے کے لائق ہے اور باقی اقوام بالخصوص رنگ داراقوام غیرمہذب ہیں۔ یہاں یہ حقیقت فراموش کردی جاتی ہے کہ دُنیا کی اوّلین اورقدیم ترین تہذیبیں مثلاً سُمیری،مصری،چینی یاوادئ سندھ کی تہذیبیں سفید فام اقوام کی تہذیبیں نہیں تھیں۔نوآبادیاتی نظام کے پھیلاؤ اور سامراجی تسلط کی گرفت کی مضبوطی نے نسلی تفاخر کا احساس اوربھی گہرا کردیا۔خصوصاً ہندوستانیوں کوغُلام ملک کے افراد سمجھ کرمزید حقارت پرمبنی سلوک روارکھاجاتا تھا۔عزیزاحمد نے ناول گریز میں یورپی اورامریکی کرداروں کی گفتاروعمل سے نسلی اِمتیاز کی تکلیف دہ روش کونُمایاں کیا ہے۔ اُنہوں نے ایک طرف ایسےلوگوں کی سوچ، گفتگواوررویے دِکھائے ہیں جونسل پرستی کا مظاہرہ کرتے ہیں اوردوسری طرف یورپ اورامریکہ کی نوجوان نسل کے تغیّر پذیررویوں کی عکاسی کی ہے جو اِنسان دوستی کے راستے کی راہی ہےاور بتدریج اِنسانی مساوات کی منزل کی جانب گامزن ہوتے ہوئے باہمی تعلقات میں رنگ ونسل کے اِمتیازکورکاوٹ نہیں بننے دیتی۔نئی نسل پُرانی نسل کے تعصّبات سے چھٹکارا حاصل کررہی ہے۔ تاہم منگنی ہوجانے کے

باوجود ایلس سے نعیم کی شادی بھی اِسی بنا پر نہیں ہو پاتی کہ ایلس کے والد اِس شادی کے خلاف تھے اور وہ ایلس کو امریکا واپس لے جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ نعیم کے لیے غُلام مُلک کا رنگ دار باشندہ ہونا نا قابلِ معافی جُرم تھا جس کی وجہ سے ایک آزاد مُلک کی سفید فام لڑکی سے اُس کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مجموعی طور پر عزیز احمد نے یورپی ماحول کے سارے رنگ ڈھنگ، سماجی زندگی کے مُختلف پہلو، مے نوشی، رقص و موسیقی، لڑکیوں سے آزادانہ میل جول اور تعلقات، مخلوط محفلیں، گھریلو زِندگی کی ناپائداری اور ازدواجی زِندگی کے تقدس کو ملحوظ نہ رکھنے کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ جہاں مغربی نسل پرستی، تہذیبی برتری کا غرور، تعصّبات و منافرت کو بھی بخوبی ناول کا حصہ بنایا ہے جس سے مغربی تہذیب کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں وہاں مشرقی تہذیب میں اقدار کی تبدیلی اوران پر نو آبادیاتی اثرات کو سامنے لائے ہیں۔ تاہم عزیز احمد کا سب سے اہم سروکار مغرب کی اخلاقی بے راہروی کی عکاسی ہے جسے وہ بڑی تفصیل سے پیش کرتے ہیں۔ عزیز احمد مغربی آزادہ روی اور اخلاقی قدروں کی پامالی کو جوں کا توں پیش کر دیتے ہیں کہ اُن کے کرداروں کا غالب رویہ یہی ہے۔ اِس ضمن میں اِصلاح یا منفی پہلو کو اُجاگر کرنے کا مقصد اُن کے پیشِ نظر نہیں ہوتا، بلکہ یہ تو محض فطرت کا اِظہار ہے جو اُن کے افسانوی ادب میں کسی ضابطے یا قاعدے کا پابند نظر نہیں آتا یہاں تک کہ جغرافیائی پس منظر بھی بے معنی ہو جاتا ہے۔

گـــریـــز کی کہانی ایک ایسے آدمی کی کہانی ہے جو آئی۔ سی۔ ایس۔ کے امتحان کے لیے یورپ کا سفر کرتا ہے۔ ہندوستانی ماحول کا پروردہ ایک نوجوان انگلستان کو دیکھ کر کس طرح مرعوب اور متحیر ہوتا ہے اور اس کے اثرات اس کے ذہن پر کیا مرتب ہوتے ہیں۔ اس ناول کا نام گـریـز اس لیے منتخب کیا گیا ہے کہ اس میں زندگی سے گریز اور حقیقت سے فرار پیش کیا گیا ہے۔ عزیز احمد نے اس کردار کو بیسویں صدی کے اہم رجحانات کا نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کے یہاں پرانی قدریں شکستہ ہو چکی ہیں۔ اس کے لیے اب نہ اخلاقی معیار کوئی اہمیت رکھتے ہیں اور نہ ہی مذہبی معتقدات کی کوئی حیثیت ہے۔ نئے نظریات بھی ابھی اس کے گلے سے اتر نہیں پائے ہیں۔ چنانچہ اس کے ذہن میں صرف ایک چیز ہے سوالیہ نشان۔ وہ ہر چیز کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ تشکیک ہی اس کا ایمان ہے۔ دنیا میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، جو نظریات عام ہوئے ہیں، جن رجحانات اور میلانات کو دور دورہ ہے، وہ سب میں لـنـدن کـی ایک رات، گـریـز اور اداس نسلیں میں ملتے ہیں۔

گـریـز کا نعیم بھی ان سب سے واقف ہے لیکن پرانی قدروں سے اعتماد ہٹا تو یہ نئی چیزیں بھی اس اعتماد کو بحال نہ کر سکیں اور وہ روشنی طبع اس کے لیے بلا بن گئی۔ وہ بڑا ذہین انسان ہے۔ سماجی بیداری، تاریخی شعور، اور تہذیبی عوامل نے

نئے نظریاتی ادب کو جنم دیا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ غور و فکر عام ہو گیا۔ تعلیم کو فروغ ہوا تو اہم عالمی نظریات و میلانات کا علم بھی عام ہوا۔ سائنس کی ترقی نے فاصلوں کو کم کر دیا۔ دور دراز علاقوں میں رونما ہونے والے واقعات کی گونج ساری دنیا میں سنی جانے لگی۔ اس لیے اس عہد کے تعلیم یافتہ کردار میں ذہانت اور آگہی کا پایا جانا یقینی تھا۔ اور نعیم ان خصوصیات کا مجموعہ ہے۔

تکنیک کے اعتبار سے گریز بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ناول نگاری کا سب سے قدیم اور سب سے فرسودہ طریقہ یہ ہے کہ سارے واقعات صیغہ واحد غائب میں بیان کیے جاتے ہیں گویا ناول نگار ایسا عالم الغیب ہے جسے ہر ایک کی ذہنی کیفیت کا علم ہے۔ ہر جگہ وہ موجود ہے ابھی وہ ہیرو کو پیش آنے والے واقعات اس کے ذہن میں گزرنے والے احساسات کا بیان کر رہا ہے اور ابھی وہ ہیروئین کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کے بارے میں سب کچھ بتانے لگتا ہے۔ یہ بیانیہ طریقہ آسان تو ہے مگر ہے غیر سائنٹفک۔ اس کے برعکس وہ طریقہ جس میں واقعات و احساسات کو واحد متکلم کی شکل میں بیان کیا گیا ہو زیادہ قابل یقین اور سائنٹفک مگر اس کے ساتھ ہی زیادہ دشوار بھی ہے۔ اس تکنیک سے کام لیا جائے تو کہانی کو صرف ایک زاویہ سے پیش کیا جا سکتا ہے اور فن کار کے لیے مشکل ہوتا ہے کہ وہ کہانی کو ہمواری کے ساتھ جاری رکھ سکے۔ گـــریـــز میں اس تکنیک سے کلیۃً تو نہیں مگر بڑی حد تک کام لیا گیا ہے۔ نعیم کے شعور اور اس کے زاویے سے ہی سارے ناول کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ عزیز احمد کی توجہ کرداروں کی ذہنی کیفیات پر مرکوز رہی ہیں اور ان کی نفسیات کو براہ راست پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح فکر اور فن دونوں کے لحاظ سے گریز ایک ایسا ناول قرار پاتا ہے جسے اردو ناول کے ارتقا میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

لندن کی ایک رات اور گریز کا منظر نامہ آزادی سے قبل ختم ہو جاتا ہے، لیکن اداس نسلیں تقسیم ملک کا احاطہ بھی کرتا ہے۔

عبداللہ حسین اردو ناول میں ایک معتبر نام ہیں۔ اُنہوں نے اپنے ناول اُداس نسلیں میں دیگر اہم اور مرکزی سروکاروں کے ہمراہ جہاں مشرقی اور مغربی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کی بھی عکاسی کی ہے وہاں نوآبادیاتی اثرات کو بھی سامنے لائے ہیں۔ وہ جنگِ عظیم اوّل کے بعد کا ہندوستان دِکھاتے ہیں جس میں جاگیردار طبقہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے انگریز سرکار کی خیر خواہی اور بھرپور تقلید پر مجبور تھا۔ یہ مجبوری درحقیقت مجبوری نہیں بلکہ ایک نوع کے فخر پر مبنی تھی یعنی حکمرانوں کی تہذیبی و تمدّنی اقدار کی پیروی اُنہیں اپنے سے کمتر حیثیت کے ہندوستانیوں سے برتر ثابت کرنے اور سفید فام آقاؤں سے مماثل دِکھانے میں مددگار تھی جس سے اُن کی ممتاز سماجی حیثیت کا اندازہ لگایا جانا مُشکل نہ تھا۔

عبداللہ حُسین نے قُرۃ العین حیدر کے ناولوں میں پائے جانے والے نوجوانوں کے فیشن ایبل اور ماڈرن گروہ کی

طرز پر بہت سے نوجوان دِکھائے ہیں جو طبقۂ خواص کے مخصوص وقت گزاری کے مشاغل اِختیار کیے ہوئے ہیں، مصوّری، موسیقی، ادب، شاعری، کلچر پر بحث مباحثہ کرنے اور عملی طور پر اِن فنون کو اِختیار کرنے کے ساتھ ساتھ انگریزی اور انگریزوں سے بے حد و حساب مُتاثر اور مرعوب ہیں۔ اُن کا رہن سہن، سوچ، کھانا پینا، گفتگو سب مغرب سے مُتاثر ہونے کا پتا دیتے ہیں کیونکہ یورپی تہذیب کے سارے اہم مظاہر اِس طبقے کی زندگی میں موجود ہیں۔ یہی نہیں عبداللہ حُسین نے اُن کے رویوں اور گفتگو سے اِس طبقے میں پائی جانے والی ذہنی غُلامی کو بھی واضح کیا ہے جس میں مُعاملہ مذکورہ تہذیب کی تحسین یا تقلید سے کہیں آگے اندھی پیروی کی حد تک جا پہنچتا ہے۔

عبداللہ حُسین نے طبقاتی نظام اور مادیّت پرستی کو بھی ناول کا اہم سروکار بنایا ہے جبکہ صنعتی نظام کی بے حسی، اِنسانی احساسات اور ضروریات کے ضمن میں سرد مہری کے مُظاہرے اور سرمایہ دارانہ مفادات کے پالن کی عکاسی بھی ناول میں اہم مقام رکھتی ہے۔ انہوں نے صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کی مخصوص ذہنیت اور گوشت پوست کے مزدوروں پر دھاتی مشینوں کو ترجیح دیے جانے کو اِس عمدگی سے ماجرے کا حصہ بنایا ہے کہ صنعتی نظام کی آمد سے ہونے والی بے پناہ مادّی ترقی بھی بے معنی نظر آنے لگتی ہے اور معاملہ اِنسان بمقابلہ مشین کا روپ دھار کر بہت سے سوالات کو جنم دیتا ہے۔ مادّی ترقی کی چمک دمک نے روحانی قدروں کو پس منظر میں ڈال دیا اور پیش منظر پر مشینوں سے شکست پذیر اِنسان باقی رہ جاتا ہے جو آخری شکست سے پہلے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ یہ ویسی ہی صُورتِ حال ہے جس میں اِنتظار محض اُس وقت کا ہے جب مشینیں ہی مشینوں کو تخلیق کیا کریں گی اور اِنسان اُن مشینوں کے تابع ہوگا۔

اداس نسلیں کے دائرے میں آزادی بھی شامل ہے۔ حصول آزادی کے ساتھ اس حقیقت کے باوجود کہ فسادات اور ہجرت کے واقعات نے انسان کی بنیادی شرافت پر ایمان اور روایتی نظام اقدار کی جڑیں کمزور کر دی تھیں اور ایسی صورت میں مایوسی، گھٹن، جذباتی اشتعال اور اضطراب کی ایک ایک فضا کا ہونا بالکل فطری تھا۔ لیکن آزادی نے ہندوستانی اور پاکستانی معاشرے کو اعتماد کی ایک نئی قوت بھی بخش دی۔ اور وہ قوت نوآبادیاتی استعمار کے چنگل سے آزادی تھی۔ یہ آزادی کیا پوری ملی ہے یا اس کا کچھ حصہ ابھی باقی ہے یہ ایک الگ بحث ہے۔ لیکن یہاں کے لوگوں نے ہر مسئلہ کو اس کی حیثیت سے دیکھا اور اس کے حل کرانے کے لیے ملک کی سرحدوں کے باہر نظر دوڑائی، اپنے اپنے طور پر کوششیں شروع کیں۔ عبداللہ حسین نے نوجوان نسلوں کی اداسی کے اسباب ان کے بزرگوں کی غلطیوں میں تلاش کیے ہیں اور اس اداسی کو ایک گہری سماجی معنویت سے ہمکنار کیا ہے۔

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو ان تینوں ناولوں میں ایک بات مشترک ہے وہ یہ کہ جب ہندوستان پر انگریزوں کا

مکمل تسلط ہو گیا تو انھوں نے ہندوستانیوں کو مہذب بنانے کی کوشش کی، ان ناولوں میں جتنے بھی اہم کردار ہیں ان میں سے کوئی کردار مغربی تعلیم کے بغیر نہیں۔ اور جو لوگ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن معاشی طور پر خوشحال تھے ان کے رہن سہن اور طرز زندگی میں انگریزوں کی نقالی عام ہو رہی تھی۔ انگریزی کی اہمیت اس کا سرکاری استعمال تھا، انگریزی زبان کی تعلیم کے بغیر اچھی نوکری کا تصور محال تھا۔ لہٰذا وہ ہندوستانی جنھوں نے مشرقی علوم کی تعلیم پائی تھی بے کار ہو گئے۔ تجارت اور کاروبار پہلے ہی ان کے ہاتھوں سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا۔ اس طرح سیاسی بے چینی کے ساتھ ساتھ اقتصادی بے بسی بھی شروع ہو گئی تھی۔ یہی نہیں انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانیوں کو اپنا مذہب بھی خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ عیسائی مبلغ نہ صرف زور و شور سے اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے بلکہ ہندوستانیوں کے مذاہب پر بھی حملے کر رہے تھے۔ اسکول اور کالجوں میں عیسائی مذہب کی تعلیم اس طرح دی جا رہی تھی کہ جو طالب علم پڑھ کر نکلتے تھے وہ اپنے مذہب سے بالکل بے گانہ ہوتے تھے۔ ان ناولوں کے اہم کردار بھی ہمیں کٹر مذہبی نظر نہیں آتے۔ یہ جدید انگریزی تعلیم کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

بیسویں صدی تبدیلیوں کی صدی تھی، ان تینوں ناولوں میں ہمیں اس بحرانی دور کی تصویر کشی ملتی ہے، جس میں سیاست، سماج،، معاشرت غرض ہر شعبۂ زندگی میں تغیرات ہو رہے تھے۔ ان تغیرات کا اثر ہندوستانی تہذیب پر بھی پڑا، اور اس میں نو آبادیات کو عمل دخل بھی تھا، یہ مقالہ انھی اثرات کے محاکے کی ایک کوشش ہے۔

(ب) نتائج:

اداس نسلیں میں انگریزوں کے ظلم و ستم اور ہندوستانیوں کے تئیں ان کے بہیمانہ رویے کو ابھارا ہے۔ جہاں بھی ان کو ہندوستانیوں سے ہم کلام ہوتے دکھایا گیا ہے ان کا لہجہ تحکمانہ اور طرز تکلم نو آبادیاتی استعمار کی نشاندہی کرتا ہے۔

لندن کی ایک رات اور گریز میں تو مارکسی خیالات اور کرداروں کے درمیان طویل مکالمے اور بحث مباحثہ کے نمونے ملتے ہیں، اداس نسلیں میں بھی مارکسی خیالات اور ملک کی مختلف سیاسی تحریکات کے بنیادی اختلافات کی طرف واضح اشارے مل جاتے ہیں۔

مشرقی تہذیب اور مغربی تہذیب دونوں میں بعد المشرقین ہے، اس سے قبل جتنی تہذیبیں بیرونی حملہ آوروں کی آمد سے مقامی تہذیب میں شامل ہوئی تھیں، وہ اس تہذیب میں جذب ہو گئیں۔ لیکن مغربی تہذیب اور مشرقی تہذیب کا ملاپ کبھی پورے طور پر جذب نہ ہو سکا۔

گریز کئی اعتبار سے لندن کی ایک رات کی تمدید نظر آتا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے گریز اور لندن کی ایک رات میں ایک مماثلت یہ ہے کہ دونوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات موجود ہیں۔

لندن کی ایک رات اور گریز میں ایک مماثلت انگریزی اخبارات کا جانب دارانہ رویہ ہے۔لندن کی ایک رات کی طرح گریز میں بھی ہندوستانیوں کے تئیں انگریزوں اور انگریزی اخباروں کے رویہ پر روشنی پڑتی ہے ۔فرق یہ ہے کہ یہاں ہندوستانی عوام کو بالکل غیر مہذب اور پسماندہ تصور کیا جاتا ہے۔

گریز میں عزیز احمد نے مشرق اور مغرب کی تہذیبی کش مکش،متوسط طبقے کی نفسیاتی الجھنوں اور جنسی مسائل کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔لندن کی ایک رات کی طرح گریز بھی لندن کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔گریز کے کردار بھی زیادہ تر نوجوان ہندوستانی طالب علم ہیں۔لندن کی ایک رات کا ہیرو''نعیم'' ہے گریز میں بھی مرکزی کردار''نعیم'' ہی ہے۔اسی طرح اداس نسلیں کا ہیرو بھی نعیم ہے۔

نوآبادیاتی حکمران انصاف بھی اپنی پسند کا دیتے تھے،لندن کی ایک رات اور گریز میں اس دور کے سیاسی حالات تو ملتے ہیں لیکن نوآبادیاتی ماحول کی جامع عکاسی اداس نسلیں میں ہوئی ہے۔

تینوں ناولوں میں تکنیک کے لحاظ سے الگ الگ خوبیاں ہیں،کسی مصنف نے کسی ایک پہلو کو نمایاں کیا ہے تو کسی نے دورے کو،تینوں ناولوں کے تکنیکی تجربات کا محاکمہ کریں تو کچھ اس طرح کی صورت حال سامنے آتی ہے۔ان تینوں ناولوں میں لندن کی ایک رات تکنیک کے لحاظ سے دل چسپ ہے۔لندن کی ایک رات پہلا ناول ہے جس میں شعور کی رو کے بعض عناصر ملتے ہیں اور یہ کہ قرۃ العین حیدر سے پہلے سجاد ظہیر نے شعور کی رو کا تجربہ کیا۔سجاد ظہیر نے لندن کی ایک رات میں شعور کی رو کا سب سے موثر اور فن کارانہ طریقہ'بلاواسطہ داخلی کلام' اپنایا ہے۔

لندن کی ایک رات میں لمحۂ موجود کی معاشرتی،تہذیبی،اخلاقی اور سیاسی فضا سے لے کر ماضی کے طویل عرصوں بلکہ مدتوں تک کی ان ہی کیفیات اور حالات کو سامنے لایا گیا ہے۔لندن ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی تاریخ کے حوالے سے بیک وقت برطانوی سامراج کی چیرہ دستیوں اور ان کی تعلیم وتہذیب کے پھیلاؤ کے اچھے اور برے یعنی مثبت اور منفی اشارہ بنتا ہے۔

عزیز احمد تکنیک کے سلسلے میں کس قدر الڈس ہکسلے (Aldos Huxley) سے متاثر ہیں۔ہکسلے کی طرح ان کے بھی ناولوں میں وقت اور مقام کی ان حدود کر ختم کر کے وہ ایک دل فریب اور جاذب تکنیک پیش کرتے ہیں اس تکنیک کی خوبی یہ ہے کہ وقت اور مقام کا تسلسل بالکل ٹوٹ جاتا ہے کوئی واقعہ پیش کرتے ہوئے یا کسی کردار کا ذکر کرتے ہوئے منظر کو یوں بدل دیتے ہیں کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔

جو فلسفہ ای ایم فاسٹر (E.M.Foster) نے (A passage to India) میں پیش کیا ہے وہی ہمیں گریز

میں ملتا ہے۔ فاسٹر نے ہندوستان اور انگلستان کی دونوں قوموں کا مطالعہ کیا تھا اس کا خیال تھا کہ دونوں کے افراد رنگ و نسل کی قیود سے آزاد ہو کر انسان دوستی کا سہارا لے کر ایک دوسرے کے قریب آ جائیں اور دونوں مل کر اس نسلی امتیاز کے خلاف احتجاج بلند کریں۔ عزیز احمد نے بھی گــریــز میں نعیم، ہروشا، جمیز کرا کسلے اور میری پاول کے تعلقات سے اس فلسفے کی تصدیق کی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جب تک نسلی امتیاز قائم رہے گا نفرت کا وجود قائم رہے گا اور ایسی حالت میں جو لوگ انسان دوستی کا نعرہ لگاتے ہیں اس میں صداقت نہیں ہو سکتی لیکن عزیز احمد کا ہیرو چونکہ ایک غلام ملک کا باشندہ تھا۔ انگلستان کے مختلف لوگوں سے مل کر جب اسے نسلی امتیاز کے تجربے ہوتے ہیں تو نفرت کے ساتھ وہ احساس کمتری میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس کا یہ شدید احساس کہ وہ ایک غلام ملک کا باشندہ ہے اسے بے حد مایوس کرتا ہے۔ پھر بھی عزیز احمد نے تمام مشرق اور مغرب کی اور مختلف نسلوں کی دوستی پر زیادہ زور دیا ہے۔ اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ خارجی داخلی معاملات کو پوری وسعت اور پورے توازن کے ساتھ مل کر سیاہ اور سفید کے نسل فرق کو جب تک بالکل ختم نہیں کر دیا جائے گا اس وقت تک نہ تو وہ مکمل ہے اور نہ انسان دوستی ہی قائم رہ سکتی ہے۔ مجموعی طور پر گریز ایک کرداری ناول ہے جس میں ایک مخصوص کردار بدلتے ہوئے ماحول سے گذرتا ہے۔

عزیز احمد نے گریز میں شعور کی رو کو باضابطہ نہیں برتا۔ تاہم قاری کو بعض مواقع پر اس کا احساس ہوتا ہے۔ شعور کی رو کے علاوہ ڈائری اور مکتوبات کی ہیئت (Form) کو بھی عزیز احمد نے گریز میں اپنایا ہے۔ جس کے باعث ناول کے تاثر میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ موضوعات کے پیش نظر ہیئت کی تبدیلی بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ عزیز احمد نے گریز میں جنسی حقیقت نگاری کو پیش کرنا اپنا شعار بنایا ہے۔ نفسیاتی حوالے سے دیکھا جائے تو گــریــز کے خاص کرداروں کے اعمال و افکار پر جنس کی مضبوط گرفت موجود ہے۔ اور جہاں عزیز احمد نے ان کے لاشعور کو پیش کیا ہے وہاں بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ اُن کے لاشعور میں ناآسودہ جنسی خواہشات کے سوا اور کچھ نہیں کیونکہ یہی وہ خواہش ہے کہ جس پر سماجی اجتناب کی قدغن لگتی ہے اور نتیجہ کے طور پر یہ ردعمل کے دوسرے طریقوں کا پیش خیمہ بن کر انسانی وجود پارہ پارہ کر دیتی ہیں اور ذہنی و جذباتی سطح کے امراض پیدا کرتی ہے۔ گریز میں اس میلان کی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو آئی اے ایس کے لیے منتخب ہوتا ہے اور امتحان دینے کے سلسلے میں انگلستان اور یورپ کی سیر کرتا ہے یورپ کے نئے ماحول میں رہ کر اُس کی زندگی میں عیش کوشی اور لذت پرستی داخل ہو جاتی ہے وہ زندگی کے تلخ حقائق سے گریز کرتا ہے وہ اخلاقی قدروں کی پاسداری نہیں کرتا ہے اور نہ ہی مذہبی بندشیں اُسے لذت کوشی سے روکنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ ناول میں شروع سے آخر تک مرکزی کردار نعیم کی داخلی اور نفسیاتی حالت کو پیش کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی خارجی زندگی

کی وہ تمام باتیں جو نفسیاتی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں وہ بھی بڑی عمدگی سے پیش کی گئی ہیں۔

لندن کی ایک رات کے بیش تر کردار بھی اس نفسیاتی کش مکش کا شکار ہیں۔ اعظم، عارف، وغیرہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔ جذبات نگاری میں عزیز احمد کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ چونکہ انھوں نے انسانی نفسیات کا بڑا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ لہٰذا کرداروں کے جذبات واحساسات کی پیشکش میں بڑی ژرف بینی اور فنی بصیرت کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کی جذبات نگاری بڑی فطری اور حقیقت پسندانہ ہوتی ہے۔ لہٰذا کہیں کہیں عریاں صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ ناول کے مطالعہ کے دوران محسوس ہوتا ہے کہ عزیز احمد ایسے مواقع پر بے حجابانہ اور بے تکلفانہ بس کچھ کر دینا چاہتے ہیں جو انھوں نے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔

اداس نسلیں میں بھی شعور کی رو کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی جزیات نگاری ہے۔ اداس نسلیں کی ایک اور خوبی ماضی کی یادیں ہیں۔ یادآوری (Reminiscing) کے اس عنصر کو اداس نسلیں میں ایک تکنیک کے طور پر برتا گیا ہے۔ نعیم جگہ جگہ اس معمول کا کام کرتا ہے جن سے ماضی سے وابستہ یادیں گذرتی ہیں۔ وہ ماضی کے پردوں کو بار بار اٹھا کر دیکھتا ہے، اس کے دھندلکوں میں اسے وہ نقوش نظر آتے ہیں جو کبھی جیتی جاگتی حقیقت تھے، مگر اب وہ گرد آلود ہو گئے ہیں۔ اس سے ملحق ایک مسئلہ ایک طرح کی واہمہ کی تصویروں کا ہے۔ یہ بھی دراصل ماضی کو زندہ رکھنے اور ان کا رشتہ حال سے جوڑنے ہی کا ایک وسیلہ ہے۔ یہ عنصر ہمیں ناول کے تخئیلی ڈھانچے سے رابطہ قائم کرنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے، اور یہ تصویریں ہمیں برابر Haunt بھی کرتی رہتی ہیں۔ تخیلی طور پر یادوں کے نقوش کو تازہ کرنے کے مماثل ایک متوازی عمل ایک طرح کے واہمے یا Phantasy کو سامنے لاتا ہے۔

اداس نسلیں کا اہم پہلو یادوں کی یہی کائنات ہے جو بعض کرداروں کے لیے ایک وقیع سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ماضی سے وابستگی اور اس کے لیے وہ کشش ہے جسے Nostelgia کا نام دیا گیا ہے شامل ہے۔ حال کا وجود ایک سراب کی مانند ہے، جو لمحہ لمحہ ہماری گرفت سے نکلتا رہتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی ایک بے معنی تعطل اور میکانکی تسلسل سے عبارت ہے۔ ذہن میں محفوظ چھوٹے چھوٹے واقعات سے متعلق غیر اہم معروض، تجربات اور وابستگیاں عمل اور ردِ عمل کے مختلف النواع پیٹرن انفرادی برتاؤ کے مختلف اوضاع اور تلخ و شیریں محسوسات کے شیرازے اور ضابطے، ان سب سے وابستہ تابناکی اور اداسی بھی، حال کی بے معنی گردش سے پیدا شدہ بے کیفی اور بدحظی میں اجلاپن لے آتی ہے، اور ان یادوں کے محافظ کو Sustain کرتی ہے۔ یادوں کی برانگیختگی ان جانے طریقے پر ہمیں دوبارہ زندہ رہنے کا حوصلہ دلاتی ہے اور ہم اپنی ذات کی دریافتِ نو کے عمل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ عمل کے موجودہ محرکات غیر

شعوری طور پر ان محرکات اور ہیجانات سے وابستہ ہوتے ہیں، جو ماضی میں ایک زندہ حقیقت یا واقعے کے طور پر موجود تھے۔گوموضوع کے اعتبار سے اداس نسلیں میں عبداللہ حسین بھی ماضی کی تاریخی وتہذیبی فضا میں ہی سانس لیتے ہیں۔انھوں نے بھی تقسیم سے قبل کی مشترکہ معاشرت اور تہذیب وثقافت کی ہی تصویر کشی اپنے ناول میں کی ہے،لیکن ماضی کی جانب ان کا رویہ ناسٹلجیاتی مراجعت کا نہیں بلکہ احتساب کا ہے اور اس احتسابی عمل میں انھوں نے تنگ نظری،تعصب، جذباتیت اور پاسداری سے بلند ہونے کی کوشش کی ہے۔

''لندن کی ایک رات'' میں جنس کے مناظر نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن گریز میں شاید تکنیک کی وجہ سے اسے زیادہ استعمال کیا گیا ہے،اداس نسلیں میں بھی کچھ مناظر مل جاتے ہیں۔اداس نسلیں کے نعیم میں بھی حسن پرستی اور بوالہوسی ہر جگہ موجود ہے۔

لندن کی ایک رات میں نہ صرف انگریزی الفاظ کا استعمال ہے بلکہ اس کے کردار بھی انگریزی زبان کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔گریز کے اسلوب میں انگریزی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی الفاظ کا بھی استعمال ملتا ہے،نہ صرف ناول نگار نے اس زبان کو استعمال کیا ہے بلکہ کرداروں کے مکالموں میں بھی اسے استعمال کیا گیا ہے۔ان دونوں ناولوں کے برعکس اداس نسلیں میں تو انگریزی الفاظ کا استعمال ملتا ہے لیکن اس کے کرداروں کی زبان میں انگریزی الفاظ کا استعمال کم ہے،شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ لندن کی ایک رات تو لکھا ہی لندن کے پس منظر میں گیا ہے جب کہ گریز میں کردار جس مقام پر رہتے ہیں وہ ہندوستان بھی ہے اور ہندوستان سے باہر بھی۔لندن کی ایک رات اور گریز میں زیادہ تر کردار پڑھے لکھے ہیں لیکن اداس نسلیں میں پڑھے لکھے کرداروں کے ساتھ ساتھ ان پڑھ کردار بھی ہیں اور یہ ناول روشن پور نامی گاؤں کے پس منظر میں لکھ گیا ہے،اس لیے اس میں ہندوستان کی شہری زندگی کے ساتھ ساتھ زیادہ تر دیہات کی زندگی کی تفصیلات ملتی ہیں۔

مذکورہ تینوں ناولوں میں نہ صرف اس اس دور کی زبان میں بولے جانے والے بدیسی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے بلکہ ان کے کردار بھی جدید تعلیم کے زیر اثر بدیسی زبانیں بولتے یا استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔لندن کی ایک رات کی جیمس جوائس کے ناول یولی سس سے مماثلت۔یا اس پر دیگر مغربی ناولوں کے اثرات۔عزیز احمد پر فارسٹر کا اثر ہوا۔ اداس نسلیں پر آگ کا دریا کا اثر۔اور بالواسطہ طور پر دیکھا جائے تو یہ بھی مغربی نظریات کا اثر ہے۔نو آبادیاتی استعمار چاہے مہذب بنانے کی کوشش ہو یا اس کی کوئی اور صورت اس نے نہ صرف ہماری تہذیب پر اثر ڈالا بلکہ اس سے ہماری زندگیاں بھی متاثر ہوئیں۔

(ج) سفارشات:

تحقیق کے لیے مواد اکھٹا کرتے ہوئے اور بعد ازاں اس کا تجزیہ کرنے کے دوران میں ایسی کئی باتیں نظر سے گزریں جو زیرِ نظر مقالے کے دائرۂ کار سے باہر لیکن تحقیقی اعتبار سے بے حد اہم ہیں۔ اس ضمن میں جو مختلف قابلِ توجہ پہلو نظر میں آئے انہیں ذہن میں رکھتے ہوئے ذیل میں چند سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ اِس مقالے میں صرف تین ناولوں کا تہذیبی ونو آبادیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اِس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ ایم فل یا پی ایچ ڈی کی سطح پر دیگر ناولوں کے بھی تہذیبی ونو آبادیاتی مطالعات کیے جائیں۔

۲۔ اردو افسانے کا بھی تہذیبی ونو آبادیاتی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ یہ موضوع بہت وسیع ہو جائے گا، اس لیے منتخب افسانہ نگاروں کے افسانوں کا تہذیبی ونو آبادیاتی مطالعہ کیا جائے تو بہتر ہوگا۔

۳۔ اردو شاعری کا تہذیبی ونو آبادیاتی مطالعہ کیا جا سکتا ہے، اس میں دبستانوں کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے، لکھنوی شاعری کا تہذیبی ونو آبادیاتی مطالعہ، دہلوی شاعری کا تہذیبی ونو آبادیاتی مطالعہ، اسی طرح دیگر دبستانوں کا تہذیبی ونو آبادیاتی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ اسی طرح دیگر اصناف نظم ونثر کا بھی تہذیبی ونو آبادیاتی مطالعہ کیا جا سکتا ہے جس میں خاص طور پر سفرناموں پر کام سے مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں ۔

کتابیات

بُنیادی مآخذ:

۱۔ سجاد ظہیر،لندن کی ایک رات،لکھنؤ:شیو شنکر بھارگو پریس،س۔ن

۲۔ ایضاً،(۲۰۰۵ء)روشنائی،کراچی:دانیال

۳۔ ایضاً،(۲۰۰۶ء)لندن کی ایک رات،(خصوصی مطالعہ اورتجزیہ مع حیات و خدمات)مرتبہ،ڈاکٹر محمد فیروز،دہلی:ساقی بک ڈپو

۴۔ عبداللہ حسین،(۱۹۸۴ء)اداس نسلیں،لاہور:قوسین،بار چہارم

۵۔ عزیز احمد،(۱۹۵۱ء)ہوس،بدتر از گناہ،لاہور:مکتبہ جدید،تیسری بار

۶۔ ایضاً،(۱۹۸۲ء)گریز،نئی دہلی:موڈرن پبلشنگ ہاؤس،۹ گولا مارکیٹ،دریا گنج

۷۔ ایضاً،ترقی پسند ادب،دہلی:چمن بک ڈپو،اردو بازار،س۔ن

ثانوی مآخذ:

(ا) تحقیقی،تنقیدی،علمی کُتب:

۱۔ آرتھر ہیسال،(۱۹۲۶ء) توازن قوت یعنی تاریخ یورپ،مترجم مولوی حمید احمد انصاری،حیدرآباد دکن: دارالطبع عثمانیہ سرکاری،

۲۔ آصف فرخی،ڈاکٹر،(۲۰۰۹ء)نگاہِ آئینہ ساز میں،کراچی:شہرزاد

۳۔ آل احمد سرور، (۱۹۲۵ء) تنقید کیا ہے،نئی دہلی:مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

۴۔ آل احمد سرور،(۱۹۷۳ء)مرتب،اردو فکشن کی تنقید،علی گڑھ:یونیورسٹی پبلی کیشنز

۵۔ آلیور تھیچر،(۱۹۲۳ء)تاریخ یورپ :دور جدید،حصہ دوم،مترجم تلمذ حسین،حیدرآباد دکن:دارالطبع عثمانیہ سرکاری

۶۔ آلیور تھیچر،(۱۹۳۲ء)تاریخ یورپ ،حصہ اول،مترجم مولوی عبدالماجد،حیدرآباد دکن:دارالطبع عثمانیہ سرکاری

۷۔ ابواللیث صدیقی،ڈاکٹر، (۱۹۷۰ء)آج کا اُردو ادب،لاہور:فیروز سنز

۸۔ احسن فاروقی،ڈاکٹر،(۱۹۶۲ء)اردو ناول کی تنقیدی تاریخ،لکھنؤ:ادارۂ فروغ اردو،امین آباد،دوسرا اڈیشن،اگست

۹۔ ارشد کریم سید،(۱۹۸۹ء)پاکستان ،معاشرت،سیاست وحکومت ،معیشت ،کراچی:مئی

پبلی کیشنز،فروری

۱۰۔ اسلم آزاد،ڈاکٹر،(دسمبر۱۹۸۱ء)اردو ناول آزادی کے بعد،یو پی:نکھار پبلی کیشنز،مئوناتھ بھنجن،طبع اول

۱۱۔ اسلوب احمد انصاری،(اپریل۲۰۰۳ء)اردو کے پندرہ ناول علی گڑھ:یونیورسل بک ہاؤس،۳۰عبدالقادر مارکیٹ،شمشاد مارکیٹ

۱۲۔ اشتیاق احمد،(۲۰۰۷ء)مرتب،کلچر۔ منتخب تنقیدی مضامین،لاہور:کتاب سرائے

۱۳۔ انور پاشا،ڈاکٹر،(۱۹۹۲ء) ہندوپاک میں اردو ناول(تقابلی مطالعہ) ،نئی دہلی:پیش رو پبلی کیشنز،بی۔ای ۲/ڈی ڈی اے فلیٹس،منیرکا

۱۴۔ انیس ناگی،(۱۹۸۸ء)ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری،لاہور:فیروز سنز،طبع اوّل

۱۵۔ ایچ مورس اسٹیفنس،(۱۹۲۶ء) انقلابی یورپ یعنی تاریخ یورپ،مترجم مولوی حسن عابد جعفری،حیدرآباد دکن:دارالطبع عثمانیہ سرکاری

۱۶۔ ایشوراٹوپا، (۱۹۴۵ء)ہندوستانی قومیت کا تمدنی پہلو،حیدرآباد:ادارہ مطبوعات ادبیات اردو،جامعہ عثمانیہ

۱۷۔ اے۔ایچ جانسن،(۱۹۳۸ء)یورپ سولھویں صدی عیسوی میں ،مترجم مولوی رحیم الدین، حیدرآباد دکن:دارالطبع عثمانیہ سرکاری

۱۸۔ تاراچند،ڈاکٹر،(دسمبر۱۹۶۴ء)تمدن ہند پر اسلامی اثرات،لاہور:مجلس ترقی ادب

۱۹۔ تنویر احمد علوی،ڈاکٹر،(۲۰۰۰ء)جنوب مغربی ایشیا میں ہمارا تہذیبی ورثہ ،نئی دہلی:شاہد پبلی کیشنز،دریا گنج

۲۰۔ جعفر حسن،ڈاکٹر، (فروری۱۹۵۵ء)ہندوستانی سماجیات،علی گڑھ:انجمن ترقی اردو ہند

۲۱۔ جعفر علی،سید،ڈاکٹر، (۲۰۰۵ء)مرتب،سجاد ظہیر۔ شخصیت اور فکر ،کراچی:مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبرز۲

۲۲۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، (۱۹۷۳ء)پاکستانی کلچر،کراچی:الیٹ پبلشرز لمیٹڈ

۲۳۔ جی۔پی۔گوچ،(۱۹۳۶ء)یورپ کا عصر جدید ،جلد چہارم،مترجم سید ہاشمی فرید آبادی،حیدرآباد دکن: دارالطبع عثمانیہ سرکاری

۲۴۔ حمیرا اشفاق،(۲۰۱۰ء)جدید اردو فکشن عصرف تقاضے اور بدلتے رجحانات ،لاہور:سانجھ پبلیکیشنز،شرکت پریس لاہور

۲۵۔ خالد شریف،ڈاکٹر،(۱۹۹۴ء)برصغیر میں اردو ناول ،دہلی:اردو مجلس ۲۲۱،غالب اپارٹمنٹس،پیتم پورہ،دہلی ۱۱۰۰۳۴

۲۶۔ خلیفہ عبدالحکیم،(۱۹۶۹ء)مقالات حکیم،جلد سوم،لاہور:ادارۂ ثقافت اسلامیہ

۲۷۔ خلیل الرحمان اعظمی،(۲۰۰۲ء)اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ،علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس

۲۸۔ خورشید الاسلام،(اکتوبر ۱۹۵۷ء)تنقیدیں ،علی گڑھ:انجمن ترقی اردو ہند،طبع اول

۲۹۔ ڈبلیو۔ایلیسن فلپس،(۱۹۲۵ء)تاریخ یورپ جدید،مترجم رشید احمد صدیقی،حیدرآباد دکن:دارالطبع عثمانیہ سرکاری

۳۰۔ رشید اختر ندوی،(دسمبر ۱۹۸۶ء)ارض پاکستان کی تاریخ،جلد اول،راولپنڈی:گڈول پرنٹرز

۳۱۔ رشید امجد،فاروق علی،(۱۹۸۲ء)مرتبین،پاکستانی ادب جلد پنجم(تنقید)،راولپنڈی:فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج،طبع اول

۳۲۔ سبط حسن،(۱۹۷۷ء) پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء،کراچی: مکتبہ دانیال،طبع اول

۳۳۔ سعادت حسن منٹو،(اکتوبر ۱۹۵۲ء) سیاہ حاشیے ،لاہور: مکتبہ جدید،اردو چوک انارکلی،بار دوئم

۳۴۔ سلطان محمد صابر،(۱۹۷۷ء) تاریخ قدیم پشتو اور پشتون،کوئٹہ:پشتو اکیڈمی

۳۵۔ سلیمان اطہر جاوید،(۲۰۱۱ء) بحوالہ مضمون ''عزیز احمد کی ناول نگاری''، عزیز احمد :فکروفن اور شخصیت،مرتبہ:اعظم راہی،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

۳۶۔ سہیل بخاری،(۱۹۶۰ء)اردو ناول نگاری،لاہور: مکتبہ جدید،بار اول

۳۷۔ سی۔اے۔فائف،(۱۹۳۰ء)یورپ کا عصر جدید ،جلد سوم،مترجم سید ہاشمی فرید آبادی،حیدرآباد دکن: دارالطبع عثمانیہ سرکاری

۳۸۔ سید احمد خان،سر،مضامین سرسید،مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی،حصہ ہشتم،لاہور:مجلس ترقی ادب

۳۹۔ سید احمد خان،سر،(جون ۱۹۹۲ء)مقالاتِ سرسیّد ،حصہ دہم،مُرتّب،مولانا محمد اسماعیل پانی پتی،لاہور: مجلسِ ترقی ادب،طبع دوم

۴۰۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن،(۲۰۰۶ء) تہذیبوں کا تصادم، تلخیص وترجمہ:عبدالمجید طاہر،لاہور: نگارشات پبلشرز

۴۱۔ شمیمہ بیگم،ڈاکٹر،(۱۹۸۷ء)ترقی پسند تنقید کا ارتقاء اور احتشام حسین،کراچی:اردو اکیڈمی

۴۲۔ شوکت علی فہمی،مفتی،انگریز کا شرمناک دور حکومت،دہلی:دین ودنیا پبلشنگ کمپنی،جامع مسجد دہلی، مطبوعہ دہلی پرنٹنگ ورکس،س۔ن

۴۳۔ شہزاد منظر،(فروری۲۰۱۴ء) پاکستان میں اُردو ادب کی صُورتِ حال ،ترتیب وتہذیب:ڈاکٹر اسد فیض،اِسلام آباد:پورب اکادمی،طبع اوّل

۴۴۔ شہزاد منظر،(مئی۱۹۸۲ء)جدید اُردو افسانہ،کراچی:منظر پبلی کیشنز

۴۵۔ صغیر اِفراہیم،(۱۹۹۴ء) نثری داستانوں کا اِرتقا،علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس

۴۶۔ عابد حسین،سیّد،(۱۹۹۸ء) قومی تہذیب کا مسئلہ،نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغِ اُردو

۴۸۔ عبدالسلام،پروفیسر،(اکتوبر۱۹۷۳ء)اردو ناول بیسویں صدی میں ،کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،باراول

۴۹۔ عبداللہ یوسف علی،علامہ،(۱۹۳۶ء)انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ،الہ آباد: ہندوستانی اکیڈمی،یو۔پی

۵۰۔ عبداللہ،سیّد،ڈاکٹر،(۲۰۰۱ء) کلچر کا مسئلہ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور

۵۱۔ علی عباس حسینی،(۱۹۸۷ء)ناول کی تاریخ او رتنقید،علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس

۵۲۔ غلام علی حداد عادل،ڈاکٹر،(۲۰۰۸ء) تمدُّنِ برہنگی اور برہنگیٔ تمدُّن ،مترجم،یونس جعفری،ڈاکٹر، اِسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،طبع دوم

۵۳۔ فاروق عثمان،ڈاکٹر،(۲۰۰۲ء)اردو ناول میں مسلم ثقافت،ملتان:بیکن بکس

۵۴۔ فردوس انور قاضی،ڈاکٹر،(۱۹۹۹ء)اردو افسانہ نگاری کے رجحانات،لاہور:مکتبہ عالیہ

۵۵۔ فرزانہ سید،(۱۹۹۸ء)نقوش ادب،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز

۵۶۔ فیض احمد فیض،(۱۹۸۸ء)پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش ۔مرتبہ شیما مجید، لاہور:فیروز سنز

۵۷۔ فیض احمد فیض،(فروری۱۹۷۶ء)ہماری قومی ثقافت،کراچی:ادارۂ یادگارِ غالب

۵۸۔ قاضی جاوید، (دسمبر ۱۹۷۶ء) فلسفہ ثقافت اور تیسری دنیا، لاہور: میری لائبریری

۵۹۔ قاضی جاوید، (۱۹۸۳ء) ہندی مسلم ثقافت، لاہور: وین گارڈ بکس لمیٹڈ

۶۰۔ قمر رئیس، پروفیسر، (۱۹۹۴ء) سید عاشور کاظمی، مرتبہ، ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، لاہور: مکتبہ عالیہ ایبک روڈ

۶۱۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، (اپریل ۱۹۶۸ء) تلاش و توازن، دہلی: ادارۂ خرم پبلی کیشنز، حوض قاضی، دہلی ۶، بار اول

۶۲۔ کارل مارکس، (۲۰۰۸ء) ہندوستان کا تاریخی خاکہ، ترتیب و تعارف: احمد سلیم، لاہور: تخلیقات

۶۳۔ کشن پرشاد کول، (۱۹۴۹ء) نیا ادب، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان

۶۴۔ کیرل رینسم، (۱۹۳۷ء) تاریخ انگلستان، حصہ اول، مترجم، سید ہاشمی فرید آبادی، حیدرآباد دکن: دار الطبع عثمانیہ سرکاری

۶۵۔ گستاؤلی بان، ڈاکٹر، (۱۹۶۲ء) تمدن ہند، مترجم علی بلگرامی، سید مولوی (دیباچہ مترجم)، لاہور: مقبول اکیڈمی

۶۶۔ گوپی چند نارنگ، (۲۰۰۸ء) مرتب، سجاد ظہیر، ادبی خدمات اور ترقی پسند تحریک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز

۶۷۔ مبارک علی، ڈاکٹر، (۲۰۰۵ء) تاریخ اور تحقیق، لاہور: فکشن ہاؤس

۶۸۔ محمد اشرف، ڈاکٹر، (۲۰۱۴ء) ترقی پسند تحریک اور اردو فکشن، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

۶۹۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، (اپریل ۲۰۰۹ء) اردو ناول میں سماجی شعور، اسلام آباد: پورب اکادمی، طبع اول

۷۰۔ محمد اکرام، شیخ، (نومبر ۱۹۹۷ء) رود کوثر، ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور: ۲ کلب روڈ

۷۱۔ محمد تقی، سید، (۱۹۶۸ء) ہندوستان پس منظر و پیش منظر، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان

۷۲۔ محمد عارف، ڈاکٹر، (۲۰۰۶ء) اردو ناول اور آزادی کے تصورات، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، طبع اول

۷۳۔ محمد عاصم بٹ، (۲۰۱۶ء) عبداللہ حسین: شخصیت و فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان

۷۴۔ محمد عتیق صدیقی، (دسمبر ۱۹۵۷ء) ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) علی گڑھ: انجمن ترقی اردو (ہند)، بار اول

۷۵۔ محمد عثمان، پروفیسر، (۱۹۸۷ء) فکر اسلامی کی تشکیل نو، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز

۷۶۔ محمد مجیب،(۱۹۸۶ء)تاریخ تمدنِ ہند،لاہور:پروگریسو بکس،طبع اوّل

۷۷۔ محمد یحییٰ تنہا،(۱۹۳۰ء) تاریخ امریکہ،لکھنؤ:الناظر پریس

۷۸۔ مظہر جمیل،سیّد،(دسمبر۲۰۰۵ء) انگارے سے پگھلا نیلم تک-نئے گوشے نئے تناظر،کراچی:اکادمی بازیافت،پہلی اِشاعت

۷۹۔ ملک عبداللہ،بنگالی مسلمانوں کی صدسالہ جہدآزادی: ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۷ء،لاہور،مجلس ترقی ادب

۸۰۔ ممتاز احمد خان،ڈاکٹر، (۲۰۱۲ء)اُردوناول کے ہمہ گیرسروکار،لاہور:فکشن ہاؤس

۸۱۔ ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،(۱۹۹۷ء)آزادی کے بعد اردو ناول،کراچی:انجمن ترقی اردو

۸۲۔ میر کرامت اللہ،(۱۸۸۵ء)انتخاب تاریخ انگلستان ،لاہور:وکٹوریہ پریس

۸۳۔ ناصرعباس نیر،ڈاکٹر،(۲۰۱۳ء)مابعد نو آبادیات اُردو کے تناظر میں،کراچی:آکسفورڈ

۸۴۔ ناصرعباس نیر،ڈاکٹر،(۲۰۰۹ء)لسانیات اور تنقید،اسلام آباد:پورب اکادمی

۸۵۔ نصیراحمد ناصر،(۱۹۸۴ء)ڈاکٹر،اسلامی ثقافت،لاہور:فیروزسنزلمیٹڈ

۸۶۔ نگینہ جبیں،(دسمبر۲۰۰۲ء)اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد،الہ آباد:کیشو پرکاشن

۸۷۔ والیئر،(۲۰۱۱ء)اوراق ہند،مترجم:جمیراشفاق،لاہور:سانجھ

۸۸۔ وحید عشرت، (۱۹۷۷ء)پاکستانی ثقافت کی تشکیل،لاہور:پاکستان فلسفہ اکیڈمی

۸۹۔ وحید قریشی،ڈاکٹر،(۱۹۸۵ء) پاکستانی قومیت کی تشکیل نو،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز

۹۰۔ وقار عظیم،سید،(۱۹۹۰ء)داستان سے افسانے تک،کراچی:اُردواکیڈمی سندھ

۹۱۔ وقار عظیم،سیّد، نیا افسانہ،دہلی:ساقی بک ڈپو،سنہ ندارد

۹۲۔ یوسف سرمست،ڈاکٹر،(دسمبر۱۹۷۳ء)بیسویں صدی میں اردو ناول ،حیدرآباد:نیشنل بک ڈپو،مچھلی کمان،پہلی بار

(ب) لُغات:

۱۔ اردو ادبی لغت، دہلی: نور محمد تاجران کتب لال کنواں دہلی، مطبوعہ، سن رائز پریس عیدگاہ روڈ، دہلی س۔ن
۲۔ اردو انسائیکلو پیڈیا، جلد اول، مدیر اعلا پروفیسر فضل الرحمٰن، نئی دہلی: قومی کونسل برائے ترقی اردو
۳۔ اُردو لغت (تاریخی اُصول پر)، جلد پنجم، اُردو ڈکشنری بورڈ، کراچی، ۱۹۸۳ء
۴۔ اُردو لغت (تاریخی اُصول پر)، جلد ششم، اُردو ڈکشنری بورڈ، کراچی، ۱۹۸۳ء
۵۔ جامع اردو انسائیکلو پیڈیا، جلد۱، ادبیات، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۳ء
۶۔ جمال الدین محمد، ابی الفضل، مؤلف۔لسان العرب، قم ایران: نشر ادب الحوزۃ، ۱۴۰۵ھ ۱۳۶۳ق
۷۔ جمیل جالبی ،قومی انگریزی اردو لغت، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء
۸۔ خواجہ عبدالمجید، جامع اللغات، جلد اول، لاہور: اردو سائنس بورڈ طبع اول، مارچ ۱۹۸۹ء
۹۔ روحی البعلبکی، الدکتور، المورد، قاموس عربی۔ انکلیزی، دار العلمی للملایین، بیروت، لبنان، طبع ہفتم، ۱۹۹۵ء
۱۰۔ عبدالواحید، عالمی جنگوں کا انسائکلو پیڈیا، ۲۰۰۷ء، لاہور، نگارشات
۱۱۔ فیروز سنز اردو انسائیکلوپیڈیا، لاہور: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، تیسرا ایڈیشن، جنوری ۱۹۸۴ء
۱۲۔ محمد التونجی، الدکتور، المعجم المفصل الادب، جلد اوّل، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان
۱۳۔ محمد مرتضٰی الزبیدی، مؤلف۔تاج العروس من جواھر القاموس، بیروت لبنان: منشورات دار مکتبہ الحیاۃ
۱۴۔ نُور الحسن نیر، مولوی، نُور اللغات، جلد اوّل، نیلاب پرنٹرز، راولپنڈی طبع سوم، ۲۰۰۶ء

(ج) رسائل/اخبارات:

۱۔ اردو دنیا، ماہنامہ، دہلی، ستمبر 2015
۲۔ اُردو، اکتوبر ۱۹۴۴ء
۳۔ ساقی، جوبلی نمبر ۱۹۵۵ء
۴۔ فنون، لاہور، ۱۹۸۸ء
۵۔ معیار، شمارہ ۸، اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی
۶۔ نفرات، ماہنامہ، کراچی مارچ ۱۹۶۴ء
۷۔ نیا ادب، جنوری فروری ۱۹۴۰ء

۸۔ نیرنگ خیال،راولپنڈی:جلد۵۹،شمارہ۶۵۹،ستمبر/اکتوبر۱۹۸۲ء

(د) غیرمطبوعہ مقالہ جات برائے پی ایچ۔ڈی/ڈی فل

۱۔ حمیرااشفاق، عزیز احمد کا تصور تاریخ و تہذیب ،مقالہ پی ایچ ڈی،اسلام آباد:بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی،۲۰۱۲ء

۲۔ عقیلہ بشیر،ڈاکٹر، اُردو ناول میں عورت کا تصور،مقالہ برائے پی ایچ ڈی،بہاءالدین زکریایونیورسٹی

English Books:

۱۔ Alexander Dow, *The History of Hindustatn*. 3 Vols. London ,1772

۲۔ Alfred Kroeber, *Anthropology*, Harcourt, Brace and Company, New York, second edition, 1948 (footnote 4).

۳۔ Alfred Kroeber, *Style and Civilizations*, Cornell University Press, New York, 1957

۴۔ Alfred L. Kroeber, *Clyde Kluckhohn, Culture: A Critical Study of Concepts and Definitions*, The Peabody Museum, Cambridge, Mass., 1952

۵۔ Arnold Toynbee, *A Study of History*, Vol. 1, London: Oxford University Press, 1934

۶۔ Bronislaw Malinowsky, *A Scientific Theory of Culture*, North Carolina: Chapel Hill, 1944

۷۔ Clyde Kluckhohn, *The Science of Man in the World Crisis*, R. Linton, Concept of Culture, Columbia University Press, Ed., 1945

۸۔ Dorothy Richardson, *Pilgrimage* (4 vol), London: J.M.Dent and Cresset, 1938.

٩_ Edward B. Tylor, *Primitive Culture*, vol.1, John Murray, London, sixth edition, june 1920

١٠_ Felipe Fernandez-Armesto,*Civilizations, Culture, Ambition, and the Transformation of Nature*, New York: A Touchstone Book, 2001.

١١_ Felix M. Keesing, *Cultural Anthropology*, New York: Rinehart and Co. Inc., 1958

١٢_ James Joyce, *Ulysses*,Vintage International, 1990.

١٣_ Kevin Avruch, *Culture and Conflict Resolution*, Washington-DC: United States Institute of Peace, 4th edition, 2004

١٤_ *Key Concepts in postcolonial Literature*. New York: Palgrave Macmillian, 2007, P.if.

١٥_ M. Apte, *Language in Sociocultural Context*, In: R. E. Asher, Matthew Melko, *The Nature of Civilizations*, Boston,MA: Porter Sargent Publisher, 1969.

١٦_ Narayani Gupta:" *Between two Empires 1803-1931*", Dehli: Oxford University Press, Second edition, 1999

١٧_ Nicholas B.Dirks, *"Foreword" to colonialism and its forms of knowledge*. Bernard S.cogn New Jersey: Princeton university Press. 1996

١٨_ Oswald Spengler, *The Decline of the West, one volume edition*, Tr. Charles Francis Atkinson, 1980, Reprint of 1932

١٩_ Pennycook, Alastair, *English and the Discourses of Colonialism*

.London and New York : Routledge, 1998

٢٠ـ Philip Bagby, *Culture and History, Berkeley and California*: University of California Press, 1959.

٢١ـ R.C.Majumdar,*History of Freedom Movement in India*, vol 1, Calcutta: Firma K.L.Mukhopadhyay, 1971

٢٢ـ Stephen Blaha, *The Life Cycle of Civilizations*, Auburn,NH: Pingree-Hill Publishing, 2002

٢٣ـ Sugata Bose & Aysha jalal, *Modern south Asia: History, Culture Political, Economy*. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1998

٢٤ـ T.S.Eliot, *Notes Towards the Defition of Culture*, London: Faber and Faber, 1961

٢٥ـ . Talcott Parsons, *Essays in Sociological Theory*, Glencoe, IL., 1949

٢٦ـ Tara chand: *Influence of Islam on Indian Culture*, Lahore: Al-Biruni, Reprinted in Pakistan , 1978

٢٧ـ Victor Henri Brombert,*The Intellectual Hero*: Studies in the French Novel, 1880-1955 (Philadelphia and New York: Lippincott, 1961; Chicago: University of Chicago Press, 1964)

٢٨ـ Virgina Woolf, *Mrs Dalloway*, Oxford University Press,

٢٩ـ William A. Haviland, *Cultural Anthropology*, Orlando, Florida: Harcourt Brace Jovanovich Publishers, , Sixth edition, 1990,

٣٠ـ William Crook, *the north westerm provinces of india*; Their History, Ethrology, and Administration. London: Methuen & co, 1897

Dictionaries/Encyclopedias:

١ـ Elias Antoon Elias, al-Qamus al-`asri, Inkilizi-`Arabi (*Elias' modern dictionary, English-Arabic*), Cairo:Elias' Modern Press, 10th ed.,1956.

٢ـ *Longman Dictionary of English language*, 1984

٣ـ *Oxford English Dictionary*, London. in Ania Loomba (1998) Colonia lism/ Postcolonialism, London: Routledge.

٤ـ Raymond Williams, Keywords: *A Vocabulary of Culture and Society*, New York:Oxford University Press, Revised Edition, 1983

٥ـ *The Encyclopedia Americana*, Vol.8, International Edition, New York: American Corporation, 1974

٦ـ *The Encyclopedia of Language and Linguistics*, vol. 4, Oxford: Pergamon Press, 1994

٧ـ Thomas Benjamim (ed.)(2007) *Encyclopedia of western colonialism* since 1450

Web Sources:

١ـ *Dario Fernandez-Morera in private correspondence to Joseph Drew*: http://www.wmich.edu/iscsc/civilization.html

٢ـ *Online Etymology Dictionary*, at: http://www.etymonline.com/ index.php? term=culture & allowed_in_frame=0 Retrieved on: 17 June, 2016, 12:38p.m.

٣ـ http://www.merriam-webster.com/dictionary/*civilization*

٤ـ http://www.merriam-webster.com/dictionary/*culture*

۵۔ Joseph Drew, *Civilization Defined*,http://www.wmich.edu/iscsc/civilization.html, Retrieved on: 15 July, 2016, 10:35a.m.

۶۔ https://ur.wikipedia.org/wiki/%D8%B9%D8%A8%D8%AF_%D8%A7%D9%84%D9%84%DB%81_%D8%AD%D8%B3%DB%8C%D9%86#cite_note-ReferenceA-1 ۳۰/ستمبر۲۰۱۶ء،رات گیارہ بج کر پینتالیس منٹ